
گھر کے ہر فرد کے لیے
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
اکتوبر 2017
نگران اعلیٰ
معراج رسول
شیریں حیدر و رفعت سراج کے پر لطف ناول
اسما قادری، نگہت سیما و صبیحہ شاہ کی خصوصی تحریریں
اداکارہ مدیحہ رضوی سے دلچسپ باتیں



ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

نگرانِ اعلیٰ : معراج رسول

مدیرۂ اعلیٰ : عذرا رسول

مدیرہ : نزہت اصغر

معاون : آمنہ حماد

MEMBER APNS

CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

منیجر اشتہارات

محمد شہزاد خان

0333-2256789

سرکولیشن منیجر

سید منیر حسین

0333-3285269

قیمت فی پرچا (پاکستان) 60 روپے

قیمت فی پرچا (سعودی عرب) 12 ریال یا مساوی متحدہ عرب امارات

زرسالانہ (اندرون [illegible]) ... 800 ... 45 ... 2014

اداریہ

سلسلے وار ناول

منی ناول

ناولٹ

مکمل ناول

افسانے

خصوصی مضامین

پبلشر و پرو پرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی



مستقل عنوانات

Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi.
Postal Address: Box No. 662, G.P.O. , Karachi-74200
Phone: (021)35895313, Fax: 35802551, E-mail address: jdpgroup@hotmail.com

مجھے کچھ کہنا ہے......!

قارئین کرام! السلام علیکم......

گھڑی کی سوئیاں ٹک، ٹک کرتی گزرتی چلی جاتی ہیں اور یہی لمحات گھنٹوں سے دنوں، ہفتوں اور مہینوں میں ڈھلتے، ڈھلتے بالآخر ایک اور سال کی آمد کی نوید سنا دیتے ہیں اور ہم ایک دم حیرانی سے کہہ اٹھتے ہیں "تو ایک سال اور گزر گیا، پتا بھی نہیں چلا"۔

نئے قمری، ہجری سال ۱۴۳۹ کا آغاز ہو چکا ہے اگرچہ ہمارا روز مرّہ کا کاروبار تو عیسوی سال کی تاریخوں سے ہی مربوط ہوتا ہے لیکن بحیثیت مسلمان قمری تاریخوں کی فضیلت و اہمیت بہر حال مسلم ہے۔

ہمارے تمام مذہبی ایام و تہوار انہی تاریخوں سے منسوب ہوتے ہیں اور اسلامی سال کا پہلا مہینہ محرم الحرام اس عظیم واقعہ کی یاد دلاتا ہے کہ جسے گزرے اگرچہ چودہ سو برس ہو چکے ہیں مگر اس کے دیرپا انقلابی اثرات افکارِ انسانی پر ایسے مرتب ہوئے کہ قیامت تک کے لیے یہ واقعہ حق و باطل میں امتیاز کی کسوٹی بن گیا۔

واقعۂ کربلا سے سبق لیتے ہوئے آج ضرورت اس امر کی ہے کہ معاشرے میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور دینی و ملی یگانگت کی فروغ کے لیے ہر قسم کے تعصبات سے بالاتر ہو کر رواداری، مساوات، اخوت اور تحمل و برداشت جیسے اعلیٰ ترین خواص کو اپناتے ہوئے مضبوط و مستحکم اسلامی معاشرے کی تعمیر میں عملی طور پر کوشاں رہیں...... جہاں مظلوم کی دادرسی ہو...... حق داروں کو اپنا جائز حق ملے اور یہ تب ہی ممکن ہے کہ جب ہم قرآن پاک اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کے ساتھ، ساتھ خلفائے راشدین ؓ کی زندگیوں کی عملی روشن مثالوں سے بھرپور استفادہ کریں۔ جبھی ایک مثالی اسلامی عدل و انصاف سے پُر معاشرہ تشکیل پا سکتا ہے۔

پروردگارِ عالم کے حضور دعا گو ہیں کہ تمام مسلمانانِ عالم کو ایسی قوتِ ایمانی نصیب ہو کہ سب متحد ہو کر اسلام مخالف قوتوں کا ڈٹ کا مقابلہ کر سکیں۔ (الٰہی آمین)

مدیرہ

نزہت اصغر

دین کی باتیں



اے اولادِ آدمؑ! ہر نماز کے وقت اپنی زینت کیا کرو۔ اور کھاؤ اور پیو، اور فضول خرچی نہ کرو۔ بے شک وہ فضول خرچی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔(۳۱) کہہ دو کہ جو زینت اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہے، اور رزق کی پاک چیزوں کو کس نے حرام کیا ہے؟ تم کہہ دو کہ جو لوگ دنیا کی زندگانی میں ایمان لائے قیامت کے دن یہ (نعمتیں) خاص طور پر انہیں کے لیے ہوں گی۔ اسی طرح ہم آیتوں کو ان کے لیے تفصیل سے بیان کرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔(۳۲) کہہ دو ماسوا اس کے نہیں ہے کہ میرے پروردگار نے بے حیائیوں کو وہ کھلی ہوں یا چھپی ہوں، اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کرنے کو، اور یہ کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرو، جس کی اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری، اور یہ کہ تم اللہ تعالیٰ کے خلاف وہ چیز کہو جو تم نہیں جانتے، حرام قرار دیا ہے۔(۳۳) اور ہر گروہ کے لیے ایک وقت معین ہے۔ پس جب ان کا مقررہ وقت آجائے گا تو وہ ایک ساعت کے لیے (بھی) نہ پیچھے رہیں گے اور نہ آگے بڑھیں گے۔(۳۴) اے اولادِ آدم! اگر تمہارے پاس تم میں سے رسول آئیں جو میری آیتوں کو تم پر بیان کریں۔ پس جس کسی نے تقویٰ اختیار کیا، اور نیکو کار ہو گیا تو ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غم کریں گے۔(۳۵) اور جن لوگوں نے ہماری آیتیں جھٹلائیں، اور ان سے تکبر کیا۔ وہی (دوزخ کی) آگ والے ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔(۳۶) پس اس سے زیادہ ظالم کون ہے جس نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بہتان باندھا یا اس کی آیتوں کو جھٹلایا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو ان کا لکھا ہوا حصہ ملے گا۔ یہاں تک کہ جب ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) انہیں پورا، پورا لے جائیں گے تو کہیں گے کہ وہ کہاں ہیں جنہیں تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر پکارا کرتے تھے۔ وہ (جواب میں) کہیں گے کہ وہ ہم سے گم ہو گئے، اور وہ اپنے خلاف آپ ہی گواہی دیں گے کہ بے شک وہ کافر تھے(۳۷) (خدا) فرمائے گا کہ ان قوموں میں جو تم سے پہلے جنوں اور انسانوں میں گزر چکی ہیں، تم بھی دوزخ کی آگ میں داخل ہو جاؤ۔ جس وقت کوئی امت داخل ہو گی، دوسری امت پر لعنت کرے گی۔ یہاں تک کہ وہ سب کے سب اس میں داخل ہو جائیں گے۔ تو ان کی پچھلی جماعتیں ان کی پہلی جماعتوں کو کہیں گی، اے ہمارے پروردگار ان لوگوں نے ہی ہمیں گمراہ کیا تھا۔ پس تو انہیں آگ کا دگنا عذاب دے۔ (خدا) کہے گا ہر ایک کے لیے دگنا ہی ہے، لیکن تم نہیں جانتے ہو۔(۳۸) اور ان کے پہلے ان کے پچھلوں کو کہیں گے کہ تمہیں ہم پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ پس جو کچھ تم کمائی کیا کرتے تھے اس کے بدلے عذاب کا مزہ چکھو۔(۳۹) یقیناً وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیتیں جھٹلائیں، اور ان سے تکبر کیا۔ ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور نہ وہ جنت میں داخل ہوں گے۔ جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں نہ داخل ہو جائے۔ اور اسی طرح ہم مجرموں کو بدلہ دیا کرتے ہیں۔(۴۰)

(سورۂ اعراف ۷، پارہ ۸۔ آیات ۳۱ تا ۴۰)

دین کی باتیں



آنحضرت ﷺ کے اسمائے گرامی

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدِنِ سَیِّدِالنَّاھِیْنَ ط

افضل الانبیا، ختمی مرتبت، سید المرسلین رسول اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صفاتی اسمائے مبارکہ میں سے ایک نام "سیدنا ناہ" بھی ہے جس کے معنی و مفہوم منع کرنے والے کے ہیں۔

1۔ **القرآن:** (۱) ترجمہ: اور جو چیز تمہیں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دیں وہ لے لو اور جس سے منع کریں اس سے باز رہو اور خدا سے ڈرتے رہو۔ بے شک خدا سخت عذاب دینے والا ہے۔ (سورۂ حشر آیت ۷)

(۲) ترجمہ: اس نبی امی و رسول جس کے بارے میں وہ تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے منع کرتا ہے۔ (سورۂ اعراف، آیت ۱۵۷)

2۔ **الحدیث:** کسی غزوہ میں ایک صحابی کا ایک غار پر گزر ہوا۔ جس میں پانی تھا اور آس پاس کچھ بوٹیاں تھیں۔ وہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کی۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھ کو ایک غار مل گیا ہے جس میں ضرورت کی سب چیزیں ہیں میرا دل چاہتا ہے کہ وہاں گوشہ نشین ہو کر ترک دنیا کر لوں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ "میں یہودیت و نصرانیت لے کر نہیں آیا۔ میں آسان اور سہل ابراہیمی مذہب لے کر آیا ہوں۔"

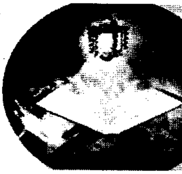
3۔ **الرائے:** (۱) بلاشبہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات عربوں کی زندگی میں ایک عظیم پیش رفت (انقلاب) لائیں خصوصاً عائلی زندگی اور حفظان صحت کے معاملے میں جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ عورت کی حالت بہت بہتر ہوگئی۔ بدکاری، وقتی شادیاں، سرعام محبت اور قیدی عورتوں کو بدکاری پر مجبور کرنا تاکہ وہ اپنے آقاؤں کو امیر بنا سکیں۔ سختی سے منع کیا گیا۔ (ای۔ ڈرمنگھم)

۲: جسمانی اور ذہنی پاکیزگی کے نقطہ نظر کے مطابق محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر لحاظ سے نمایاں تھے۔ ان کے نزدیک نہ صرف جسمانی صفائی مکمل طور پر ضروری تھی بلکہ ذہنی پاکیزگی بھی...... اعمال قبیحہ اور دوسری بداخلاقیاں جن کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جانتے تھے مثلاً غیر منصفانہ تشدد اور دوسری اخلاقی برائیاں (ظاہراً و باطناً) خدا کی حدیں توڑنے کے ضمن میں سختی سے منع کی گئی تھیں۔ (لیونارڈ)

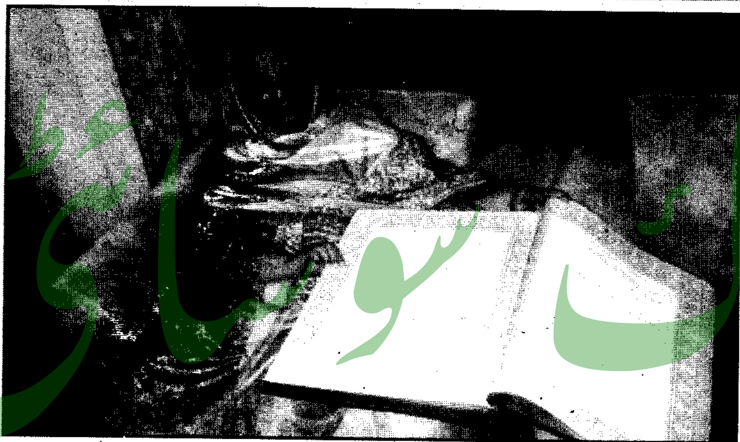
الفضائل: (۱) ۵۶ مرتبہ روزانہ صبح شام اس اسم مبارک "سیدنا ناہ" کا ورد کرنے والا گناہوں سے محفوظ رہے گا نیز اسے لوگوں میں اچھی شہرت حاصل ہوگی۔

(۲) روزانہ نماز فجر کے بعد ایک سو مرتبہ یہ اسم پاک پڑھنے سے اللہ تعالیٰ اپنی عبادت کی توفیق عطا فرمائے گا نیز شر شیطان سے محفوظ رکھے گا۔

قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسما النبی ﷺ سے اقتباس



اللہ اور اس کا نور



قرآن پاک سے عشق کی پرنور داستان ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کے قلم سے

باب نہم

خصوصی نوٹ

قارئین کرام ماہِ ستمبر میں شائع ہونے والے ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کے مضمون اللہ اور اس کا نور کے آخری پیراگراف میں جہاں وراثت، ترکے میں تقسیم کے عمل کی وضاحت کی گئی تھی۔ وہاں کتابت کی غلطی سے لڑکی کے حصے کے بارے میں کچھ غلط چھپ گیا تھا جس کے لیے معذرت......ذکیہ آپا نے بطور خاص تصحیح فرمائی ہے کہ یہ قرآن پاک کا معاملہ ہے۔ قارئین نوٹ فرمالیں اب درست لکھا جارہا ہے۔

قرآن کریم میں تقسیم: تقسیم کا عمل اور طریقہ ترکے کے سلسلے میں بتایا گیا ہے اور ہر فرد کا حصہ مقرر کردیا گیا ہے۔

(1) مرنے والے کی دو لڑکیاں ہیں تو انہیں ترکے کا دو تہائی ملے گا۔ 2/3

(2) مرنے والے کی ایک لڑکی ہے تو اسے ترکے کا نصف ملے گا۔ 1/2

(3) ماں، باپ دونوں کا حصہ چھٹا ہوگا (ماں کا بھی اور باپ کا بھی) 1/6+1/6

(4) بیوی کا حصہ 1/8

(5) شوہر کا حصہ 1/4

یہ تمام اور کچھ مزید تفصیل سورۂ نساء (4) میں مل جائے گی۔ وہاں سے پڑھی جاسکتی ہے۔ یہاں مکمل تفصیل بتانا مقصد نہیں۔

☆☆☆

قرآنی آیات

پورے قرآن پاک میں کل 7 منزلیں، 30 پارے 114 سورتیں، 558 رکوع اور 6236 آیات ہیں۔

قرآنی آیات میں ایک تسلسل، ایک ہم آہنگی اور ایک خوب صورت زیروبم ہے۔ ایک ایسے نغمے کی گونج ہے جس سے انسانی ذہن اور روح مسحور ہوجاتے ہیں۔ یہ ایک ایسا جھرنا ہے جو چودہ سو سال سے بہہ رہا ہے قرآن پاک کی تمام

سورتوں میں آیات عام طور پر ایک مخصوص حرف پر ختم ہوتی ہیں۔ بعض سورتوں میں تمام آیات صرف ایک ہی حرف پر ختم ہوتی ہیں اور بعض میں بہت مختلف حروف پر۔

مجھے یہ شوق تھا کہ معلوم کروں قرآن پاک کی آیات کن، کن حروف پر ختم ہوتی ہیں اور کون سے حروف ایسے ہیں جن پر کوئی آیت ختم نہیں ہوتی۔ اس کام کے لیے میں نے بہت محنت اور لگن سے تحقیق کا کام مکمل کیا اور نتائج مرتب کیے جو حسبِ ذیل ہیں۔

(1) قرآنی آیات ''ن'' پر سب سے ختم ہوتی ہیں۔ کل 6236 آیات میں سے 3121 آیات حرف ''ن'' پر ختم ہوتی ہیں۔ (آدھی سے زیادہ)

(2) ''ن'' کے بعد سب سے زیادہ تعداد حرف ''الف'' پر ختم ہونے والی آیات کی ہے۔ (809)

(3) حرف ''م'' پر 670 آیات ختم ہوتی ہیں۔ یہ تعداد ''الف'' کے بعد سب سے زیادہ ہے۔

(4) حرف ''ح'' پر صرف ایک آیت ختم ہوتی ہے۔ (سورۂ نصر (۱۱۰) آیت 1)

(5) حرف ''ض'' پر صرف ایک آیت ختم ہوتی ہے۔ (سورۂ سجدہ (41) آیت 51)

(6) صرف دو آیات حرف ''ث'' پر ختم ہوتی ہیں۔

(7) صرف دو آیات حرف ''ذ'' پر ختم ہوتی ہیں۔

(8) صرف دو آیات حرف ''ش'' پر ختم ہوتی ہیں۔

(9) صرف تین آیات حرف ''ف'' پر ختم ہوتی ہیں۔

(10) حروف خ، غ، و پر کوئی آیت بھی ختم نہیں ہوتی۔

ایسی سورتیں جن کی آیات ایک مخصوص حرف پر ختم ہوتی ہیں

(1) سورۂ قمر (54) میں 55 آیات ہیں جو سب کی سب ''ر'' پر ختم ہوتی ہیں۔

(2) سورۂ منافقون (13) میں 11 آیات ہیں جو سب کی سب ''ن'' پر ختم ہوتی ہیں۔

(3) سورۂ جن (72) میں 28 آیات ہیں جو سب کی سب ''الف'' پر ختم ہوتی ہیں۔

(4) سورۂ شمس (91) میں 15 آیات ہیں جو سب کی سب ''الف'' پر ختم ہوتی ہیں۔

(5) سورۂ لیل (92) میں 21 آیات ہیں جو سب کی سب ''ی'' پر ختم ہوتی ہیں۔

(6) سورۂ قدر (97) میں 5 آیات ہیں جو سب کی سب ''ر'' پر ختم ہوتی ہیں۔

(7) سورۂ بینہ (98) میں 8 آیات ہیں جو سب کی سب ''ہ'' پر ختم ہوتی ہیں۔

(8) سورۂ عصر (103) میں 3 آیات ہیں جو سب کی سب ''ر'' پر ختم ہوتی ہیں۔

(9) سورۂ ھمزہ (104) میں 9 آیات ہیں جو سب کی سب ''ہ'' پر ختم ہوتی ہیں۔

(10) سورۂ فیل (105) میں 5 آیات ہیں جو سب کی سب ''ل'' پر ختم ہوتی ہیں۔

(11) سورۂ کوثر (108) میں 3 آیات ہیں جو سب کی سب ''ر'' پر ختم ہوتی ہیں۔

(12) سورۂ اخلاص (112) میں 4 آیات ہیں جو سب کی سب ''د'' پر ختم ہوتی ہیں۔

(13)۔ سورۂ ناس (114) میں 6 آیات ہیں جو سب کی سب ''س'' پر ختم ہوتی ہے۔

وہ سورتیں جن کی آیات ''ن'' اور ''م'' پر ختم ہوتی ہیں۔

1۔ سورۂ فاتحہ (1) ن 4، م 3
2۔ سورۂ انبیاء (21) ن 109، م 3
3۔ سورۂ مومنون (23) ن 115، م 3
4۔ سورۂ نمل (27) ن 86، م 7
5۔ سورۂ دخان (44) م 15
6۔ سورۂ جاثیہ (45) ن 7، ص 30
7۔ سورۂ جمعہ (62) ن 8، م 3
8۔ سورۂ قلم (68) ن 42، م 10
9۔ سورۂ مطففین (83) ن 27، م 9
10۔ سورۂ تین (95) ن 7، م 1
11۔ سورۂ ماعون (107) ن 6، م 1

وہ سورتیں جن کی آیات ل، م ن پر ختم ہوتی ہیں

1۔ سورۂ یونس (10) ل 1، م 10، ن 98

2۔سورۂ حجر(15)ل2،م16،ن81
3۔سورۂ شعرا(26)ل3،م29،ن195
4۔سورۂ سجدہ(32)ل1،م2،ن27
5۔سورۂ زخرف(43)ل1،م10،ن78

سورۂ نساء(4)میں 176 آیات ہیں جن میں 143 آیات حرف ''الف'' پرختم ہوتی ہیں۔

سورۂ کہف(18)میں 110 آیات ہیں جن میں 96 ''الف'' پرختم ہوتی ہیں۔

سورۂ احزاب(33)میں 73 آیات ہیں جن میں 55 ''الف'' پرختم ہوتی ہیں۔

سورۂ طلاق(65)میں 12 آیات ہیں جن میں 11 ''الف'' پرختم ہوتی ہیں۔

سورۂ نوح(71)میں 28 آیات ہیں جن میں 23 ''الف'' پرختم ہوتی ہیں۔

سورۂ طٰہٰ(20)میں 134 آیات ہیں جن میں 107 ''ی'' پرختم ہوتی ہیں۔

سورۂ اعلیٰ(87)میں 19 آیات ہیں جن میں 18 ''ی'' پرختم ہوتی ہیں۔

سورۂ ہود(11)کی آیات 12 مختلف حروف پرختم ہوتی ہیں۔

ص1،ر11،ن56،ل2،م5،ظ3،د23،ب13،ز2،ذ2،ط4،ق1=123

سورۂ حج(22)کی آیات 11 مختلف حروف پرختم ہوتی ہیں۔

ط1،ز2،م12،د15،ر25،ج1،ق6،ن12،ظ1،ء1،ب2=78

سورۂ ابراہیم(14)کی آیات 10 مختلف حروف پرختم ہوتی ہیں۔

د11،م7،ر11،ب4،ن6،ظ1،ز1،ص1،ء6،ل4=52

سورۂ ص کی آیات 10 مختلف حروف پرختم ہوتی ہیں۔

ر15،ق6،ص2،ب35،د6،ط1،ج1،ل1،م3،ن15=88

سورۂ سجدہ(41)کی آیات 10 مختلف حروف پرختم ہوتی ہیں۔

م8،ن3،د7،ر6،ز1،ب1،ص1،ط2،ظ1،ص1=54

سورۂ آل عمران(3)کی 9 آیات مختلف حروف پرختم ہوتی ہیں۔

ب10،د9،ر23،ق1،ل4،م29،ن120،ء3،ط1=200

سورۂ شوریٰ(42)کی آیات 9 مختلف حروف پرختم ہوتی ہیں۔

م11،ق1،ل4،ر20،ب5،د4،ز1،ن6،ص1=53

سورۂ معارج(70)کی آیات 9 مختلف حروف پرختم ہوتی ہیں۔

ع2،ج1،الف6،ل1،ن21،ہ5،ی4،م3،لا1۔

قرآنی آیات جن حروف پر ختم ہوتی ہیں ان کی تعداد اور تفصیل پورے قرآن میں

نوٹ: اکثر معلوماتی کتابوں اور ایک ڈائجسٹ کے قرآن نمبر میں رکوع کی تعداد 540 اور آیات 6666 دی ہوئی ہیں۔ یہ تعداد درست نہیں ہے۔ صحیح

الف	ب	ت	ث	ج	ح	خ	د
809	161	34	2	9	1	o	202
ذ	ر	ز	س	ش	ص	ض	ط
2	445	10	11	2	10	1	12
ظ	ع	غ	ف	ق	ک	ل	م
13	13	0	3	41	8	67	670
ن	و	ہ	ء	لا	ی		
3121	0	171	11	140	267	6236	

تعداد رکوع 558 اور آیات 6236 ہے۔(حوالہ قرآن پاک) (آپ خود بھی قرآن پاک سے تحقیق کر سکتے ہیں)

برائی کا بدلہ اور معافی

اللہ تعالیٰ دونوں جہانوں کا رب ہے۔ اس نے کائنات کو تخلیق کیا۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور وہ ہر چیز سے واقف ہے۔ وہ سب کے دلوں کے بھید بھی خوب جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو اشرف المخلوقات بنایا اور وہ ان سے 70 ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بندہ جب کوئی گناہ کرے اور اس سے معافی طلب کرے تو وہ معاف کر دیتا ہے۔ وہ بہت زیادہ درگزر کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ہر وقت توبہ استغفار کرتے رہنا اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتے رہنا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور وہ لوگ جو دوسروں کو معاف کر دیتے ہیں، وہ اللہ کے بہت نزدیک ہوتے ہیں۔

گناہ معاف کر دینے کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے سورۂ زمر (39) آیت 53 میں ارشاد فرمایا۔

''(اے پیغمبر میری طرف سے لوگوں سے) کہہ دو کہ اے میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہونا۔ خدا تو سب گناہوں کو بخش دیتا ہے (اور) وہ تو بخشنے والا مہربان ہے۔''

شرک ایسا گناہ ہے جسے اللہ تعالیٰ کسی حال میں معاف نہیں کرتا۔ باقی کیسا ہی گناہ ہو اور انسان صدقِ دل سے توبہ کرے اور پھر اس برائی سے کنارہ کش ہو جائے تو اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا اور رحمٰن و رحیم ہے۔

سورۂ بقرہ آیت 160 میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

''ہاں جو توبہ کرتے ہیں اور اپنی حالت درست کر لیتے ہیں اور (احکام الٰہی) میں صاف بیان کر دیتے ہیں تو میں ان کے قصور معاف کر دیتا ہوں اور میں بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہوں۔''

اسی طرح سورۂ آل عمران آیت 135 میں ارشاد فرمایا۔

''اور وہ کہ جب کوئی کھلا گناہ یا اپنے حق میں کوئی برائی کر بیٹھتے ہیں تو خدا کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں اور خدا کے سوا گناہ بخش بھی کون سکتا ہے۔ اور جان بوجھ کر اپنے افعال پر اڑے نہیں رہتے۔

اسی طرح ایک اور جگہ سورۂ نسا آیت 110 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

''اور جو شخص کوئی برا کام کر بیٹھے یا اپنے حق میں ظلم کر لے پھر خدا سے بخشش مانگے تو خدا کو بخشنے والا، مہربان پائے گا۔''

اگرچہ اللہ کے بہت سے بندے ناانصافیاں کرتے ہیں اور حق بات پر قائم نہیں رہتے پھر بھی اللہ تعالیٰ انہیں معاف کرتا ہے..... جبکہ سورۂ رعد آیت 6 میں فرمایا۔

''اور تمہارا پروردگار لوگوں کو باوجود ان کی بے انصافیوں کے معاف کرنے والا ہے۔'' اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا بلکہ انسان خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔ کیونکہ جو بھی مصیبت اس پر نازل ہوتی ہے وہ اس کی اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے ہوتی ہے پھر بھی اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دیتا ہے۔

سورۂ شوریٰ آیت 30 میں ارشاد ہوتا ہے۔

''اور جو مصیبت تم پر واقع ہوتی ہے، تمہارے اپنے فعلوں سے اور وہ بہت سے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔''

سورۂ شوریٰ کی آیت 25 میں ارشاد ہوتا ہے۔

''اور وہی تو ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا اور ان کے قصور معاف فرماتا ہے اور جو تم کرتے ہو (سب) جانتا ہے۔''

اوپر بیان کی گئی تمام آیات سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت بہت بڑی ہے، وہ ہر حال میں اپنے گناہ گار بندوں کی فریاد سنتا ہے۔ ان کی دعا کو قبول کرتا ہے، بخشش مانگنے والوں کو بخش دیتا ہے اور ان کی تمام خطائیں معاف کر دیتا ہے۔ جبکہ انسان کا یہ حال ہے کہ وہ خود تو اللہ تعالیٰ سے معافی کا طلب گار ہوتا ہے لیکن دوسروں کو ہرگز معاف کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ آج جو معاشرے کی حالت ہے اور بے سکونی اور افراتفری ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ کوئی شخص دوسرے کو معاف کرنے کو تیار نہیں ہے۔ بغض، کینہ، حسد، نفرت نے دلوں کو تاریک کر دیا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر ایک دوسرے سے ناراض ہو جانا اور برا بھلا کہنا، غصے سے بے قابو ہو جانا اب عام بات ہو گئی ہے۔ جو نہایت ہی افسوس ناک بات ہے۔

(جاری ہے)

......یہ کہاں کی بچیں کہ دل ہے

رفعت سراج

بنی اسرائیل کا سونے کا بچھڑا آج ڈالر، پونڈ، یورو، درہم و دینار کی شکل اختیار کر چکا ہے۔
دل جذبات کا استعارہ ہے مگر اب وہ دل کہاں...
سونے کے بچھڑے میں دل بھی سونے کا ہے...
دل کو رویا جاتا ہے، جگر کو پیٹا جاتا ہے...
کبھی ناقدروں کے حوالے کر دیا جاتا ہے، یاریاں ٹوٹ جاتی ہیں۔
الزام تراشیوں کا ایک طوفان بد تمیزی برپا ہو جاتا ہے۔
دل سے دل کو راہ بھی ہوتی ہے...
آج کا انسان بہ راہ سٹیلائٹ کے ذریعے search کرنے کی کوشش کرتا ہے۔
دل اور سونے کا بچھڑا...
عبادات، معاملات...
جنتِ گم گشتہ کے بے دخل باسیوں کی ازلی کہانی...

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا — جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے — غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا — نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

قسط 15

زارا کو بڑی عزت و احترام سے ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا گیا اور لیڈی صاحبہ کا انتظار کرنے کے لیے کہا گیا۔ ساتھ ہی وضاحت بھی کر دی گئی کہ لیڈی صاحبہ شیڈول سے چلتی ہیں اور آنے والے ملاقاتی سے تب ہی ملاقات کرتی ہیں جب ان سے پہلے سے وقت لیا گیا ہو۔ ساتھ ہی اسے خوش نصیب بھی گردانا گیا کہ حیرت انگیز طور پر وہ اس ملاقات پر راضی ہو گئی ہیں۔

تب زارا کو بھی طوہاً و کرہاً وضاحت کرنا پڑی تھی کہ ایکچوئیلی پرنس نے اس کی بہن کو پرپوز کیا ہے اس لیے وہ عام ملاقاتی نہیں ہے۔ اس وضاحت کے بعد ہی اسے وی آئی پی پروٹوکول دیا گیا تھا۔ منیجر اور دیگر ملازمین اس کی آؤ بھگت کر رہے تھے۔

زارا کا دل مچل، مچل کر خواہش کر رہا تھا کہ کسی طور پرنس کو اس کی آمد کی خبر پہنچ جائے اسے یقین تھا کہ وہ سن کر



والہانہ اس سے ملنے آئے گا۔
مگر اسے احتیاط کرنا پڑ رہی تھی...... شطرنج کے رسیا جانتے ہیں کہ فتح سے پہلے بہت سوچ سمجھ کر مہروں پر ہاتھ رکھتے ہیں...... ورنہ پلک جھپکتے میں ''شہ'' کے طلبگار کو ''پیدل'' پر گزارہ کرنا پڑتا ہے۔

☆☆☆

''جلدی میں میرا ذہن ساتھ چھوڑ دیتا ہے...... میری قوتِ فیصلہ بہت کمزور پڑ جاتی ہے پھر بھی تمہارے خیال میں کیا اس وقت میں نے مناسب ساڑی چوز کی ہے؟'' لیڈی صوفیہ زرد، آسمانی، گلابی پرنٹ کی شیفون کی ساڑی کا آنچل سنبھالتے ہوئے مخمصے کی کیفیت میں اپنی خادمۂ خاص انجیلا کی رائے لے رہی تھیں۔
''میم آپ بہت خوب صورت لگ رہی ہیں...... سارا ماحول تروتازہ محسوس ہونے لگا ہے۔ انجیلا نے نہایت شستہ انگریزی میں لیڈی صوفیہ کو مطمئن کیا۔
''اوہ...... تھینک یو......'' لیڈی صوفیہ نے بچوں کی طرح خوش ہو کر کہا۔ ''میرے خیال میں اس کے ساتھ مجھے saphire (نیلم) کی جیولری پہننا چاہیے۔''
''اوہ یس...... آف کورس......'' انجیلا کو خود اس وقت عجلت میں کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہاں میں ہاں ملانا اس کی مجبوری بن رہی تھی۔
اسی وقت دوسری خادمہ اندر داخل ہوئی۔ لیڈی صوفیہ نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔
''میم...... آپ کے لیے خاص اطلاع ہے کہ گیسٹ بہت اسپیشل ہے۔'' خادمہ نے مؤدبانہ عرض کی۔
''اسپیشل......؟'' لیڈی صوفیہ نے آنکھیں سکیڑ کر خادمہ کی طرف قدرے تعجب سے دیکھا تھا۔
''یس میم...... گیسٹ نے اپنا نام زارا بتایا ہے، وہ میم سفینہ کی چھوٹی بہن ہیں۔ انہوں نے یاد دلایا ہے کہ دو دن پہلے آپ ان کی بہن سفینہ کو پرنس کے لیے پروپوز کر چکی ہیں۔''
''اوہ......!'' خادمہ سے تفصیل سن کر لیڈی صوفیہ کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں...... یادداشت کام کرنے لگی۔
''اوہ...... بھئی یہ تو اسے آتے ہی بتانا چاہیے تھا......'' وہ پُرمسرت انداز میں اپنی خادماؤں کی طرف یوں دیکھ رہی تھیں جیسے غیر متوقع طور پر وہ خوش خبری ملی ہو جس کا پل، پل تڑپتے ہوئے انتظار کیا ہو۔
''دیکھو اس کے لیے چائے کی ٹیبل تیار کرو...... اس سے مل کر پتا کرتی ہوں، وہ ہمیں کتنا ٹائم دے سکتی ہے اس کے بعد ہی لنچ کے بارے میں کچھ بتا سکوں گی۔'' بولتے ہوئے انہوں نے انجیلا کو پرفیوم اسپرے کرنے کا اشارہ بھی کر دیا تھا۔ جو بڑی مستعدی سے آگے بڑھی اور ان کا پسندیدہ پرفیوم جو وہ دن میں استعمال کرنا پسند کرتی تھیں اٹھا لائی اور اسپرے کرنے لگی۔
''ویسے یہ خوشی کے ساتھ، ساتھ بہت حیرت ناک ہے...... وہ یوں اچانک ملنے چلی آئی......'' لیڈی صوفیہ نے قدِ آدم آئینے میں اپنا سراپا دیکھا حتمی طور پر اپنا جائزہ لیتے ہوئے اسی طرح مسرت سے سرشار لہجے میں اور خود کلامی کے انداز میں کہا۔
انجیلا نے ان کی قیمتی چھڑی ان کے ہاتھ میں تھمائی اور گویا ان کو یاد دلایا کہ بس اب ان کو یہ کمرا چھوڑ دینا چاہیے۔
لیڈی صوفیہ چھڑی مضبوطی سے تھام کر باہر کی طرف بڑھیں۔ دونوں خادمائیں سائے کی طرح ساتھ ہو لیں۔

☆☆☆

تاجور کی طلبی پر وہ آدھے گھنٹے کی میٹنگ کے لیے حاضر ہوا تھا۔ آتے ہوئے عجلت و ذہنی دباؤ کی وجہ سے سیتا سے ٹک کر خیر خیریت نہیں پوچھ سکا تھا لیکن واپسی کے وقت قدرے پُرسکون تھا۔ تاجور نے بہت خوشگوار موڈ میں



میٹنگ کی تھی......اور یہ جاننے کے بعد کہ سول انجینئر کو ارجنٹ کیش چاہیے۔ تاجور نے ہزار کے نوٹوں پر مشتمل پانچ پیکٹ بھی اس کے حوالے کردیے تھے کہ جس بندے پر بینک سے کیش لانے کی ذمے داری تھی وہ چھٹی پر تھا اور دوسرا متبادل دستیاب نہ تھا۔

نئے کڑک، کڑک نوٹوں کے پانچ، پانچ پیکٹ کی خوشبو دنیا کے بہترین پرفیوم پر حاوی تھی۔ مال پرایا تھا مگر خوشبو اپنی لگ رہی تھی۔

وہ بڑی ترنگ میں سیتا سے چھیڑ چھاڑ کرنے آیا تھا مگر یہ دیکھ کر زوردار جھٹکا لگا کہ سیتا ٹشو پیپر سے اپنے آنسو صاف کررہی تھی۔ ساحل کو یک دم سامنے پاکر خجل سی ہوگئی......اور عجلت بھرے انداز میں آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

''خیریت....! آج تو بہت خوش نظر آرہی ہو...... مارے خوشی کے آنسو نکل پڑے ہیں۔'' بظاہر ساحل مذاق کررہا تھا درحقیقت تشویش میں مبتلا تھا۔

سیتا کچھ کہنے کے بجائے سر دائیں بائیں ہلانے لگی جیسے کہہ رہی ہو کہ کوئی مسئلہ نہیں بس ویسے ہی......

''میں کون سا تم سے ادھار مانگ رہا ہوں جو نہ، نہ کررہی ہو...... بائی داوے ہوا کیا ہے؟''

سیتا کی آنکھیں رونے کے باعث متورم ہورہی تھیں...... ساحل کا سوال سنتے ہی پھر چھلک پڑیں۔

''یار میرے پاس بالکل وقت نہیں...... جلدی سے بتاؤ کیا ہوا ہے...... شاید میں تمہاری کوئی ہیلپ

کر سکوں...... تمہارے آنسو دیکھ کر اسٹریس لے رہا ہوں...... مجھے بہت کام کرنا ہے۔‘‘

’’میرے ہزبینڈ کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے...... بہت مہنگے انجیکشن لگ رہے ہیں...... میں تو بالکل خالی ہوگئی ہوں۔‘‘ اس کی آواز رُندھی ہوئی تھی۔

’’مسٹر ساحل، کیا آپ مجھے ٹوئنٹی تھاؤزینڈ ادھار دے سکتے ہیں۔ آپ کو ہر مہینے فائیو تھاؤزینڈ واپس کردوں گی۔ four month میں سارا لون اتار دوں گی۔‘‘

’’ٹوئنٹی تھاؤزینڈ......؟‘‘ اسے مشکلوں سے جوڑے ہوئے ڈیڑھ لاکھ روپے یاد آگئے...... ’’بیس ہزار نکل گئے تو ایک لاکھ تیس ہزار بچیں گے...... اور اس کا نکما شوہر بیس ہزار میں ٹھیک نہیں ہوا تو یہ کہیں اور سے مزید بیس ہزار لے گی، اس سے بھی واپسی کا وعدہ کرے گی...... کوئی تاریخ دے گی...... اگر اس کو پہلے واپس کرے گی تو اس کی رقم پھنس جائے گی...... اگر وہ ہڈحرام لمبا لیٹ گیا تو یہ دفتر سے بھی رحم کی اپیل کرے گی...... لون لے گی جو اس کی تنخواہ میں سے منہا ہوا کرے گا۔ اس طرح تنخواہ کم ملے گی، تنخواہ کم ملے گی تو گزارہ مشکل ہوگا...... قرض واپس کرنے میں بہانے کرے گی۔ نہ بابا نہ...... اس جاب کی ٹینشن کم ہے جو ایک نئی ٹینشن پر چیز کروں۔‘‘

’’بیس ہزار کے لیے اتنا سوچ رہے ہیں؟ آپ کی تو فیملی بھی نہیں ہے، اکیلے ہیں...... آپ کو کوئی فرق نہیں پڑے گا...... مگر میں آپ کی مہربانی ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ اور پھر اب تو آپ پروموٹ ہوگئے ہیں، سیلری بھی زیادہ ہوگئی ہے...... بھگوان کی دیا سے اب آپ کی ساری پرابلم ختم ہوگئی ہیں۔‘‘ سیتا بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔

’’دیکھو...... اب یہ میری سیلری کو بھی نظر لگائے گی......‘‘ ساحل چیں بہ چیں ہوا۔ اسے افسوس ہوا کہ آخر وہ رکا ہی کیوں...... روتے ہوئے کے پاس تو ویسے بھی رکنا نہیں چاہیے۔

جب اللہ نے بے بھاؤ کی سنانے والی ’’باس‘‘ سے نوازا ہوا ہے تو اوروں کے دکھڑے سننے کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

’’بات یہ ہے سیتا...... اس وقت میں فنانشلی بہت پرابلم میں ہوں، اپارٹمنٹ کی قسط جاتی ہے...... میری سسٹر کو پیسوں کی ضرورت تھی میں انہیں heavy amount دے چکا ہوں...... سمپل...... لون اپلائی کردو... میں آج ہی اپروو کرا دوں گا... اکاؤنٹ سے تھوڑا کیش فوری دلوا دوں گا۔ میں لیٹ ہو رہا ہوں سی یو۔‘‘ وہ ہاتھ لہراتا بڑی سنگدلی کا مظاہرہ کرتا آگے بڑھ گیا...... سیتا دم بخود تھی...... آنسو بھری آنکھوں سے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

’’اماں نے سیٹ کنفرم کرادی ہے۔‘‘ سفینہ یونیورسٹی سے باہر نکل کر ہاسٹل کی طرف گامزن تھی، اپنے آئی فون پر میسج پڑھتے ہوئے ماہین کو مطلع کر رہی تھی۔

’’مائی گاڈ...... یہ دو دن کیسے گزریں گے تمہارے بغیر......‘‘ ماہین نے چلتے، چلتے سفینہ کے کاندھے پر سر ڈال دیا...... انداز بہت دکھیارا تھا مگر درونِ خانہ ایک خوشگوار لطافت کا احساس پوشیدہ تھا۔

سفینہ نے فوری طور پر اپنے کاندھے کو بوجھ سے آزاد کرالیا تھا۔

’’آسٹریلیا میں میرے بغیر جب دو ہزار دن گزارو گی تب پوچھوں گی۔‘‘ اس نے ماہین کے بازو میں چٹکی بھری۔

ماہین اپنا بازو سہلانے لگی...... عین اسی وقت کسی گزرنے والی کلاس فیلو نے بھی مسکراہٹ کا تحفہ ہوا کے دوش پر ارسال کیا...... تو ہاتھ لہرا کر اس کے جذبات کا احترام بھی کرنا پڑا...... مگر فوراً ہی سفینہ کی طرف متوجہ ہوگئی۔

’’اگر تم نے میرے بغیر انگیج منٹ کی تو دیکھنا میں تمہارا کیا حشر کروں گی۔‘‘ اس کی آنکھوں میں شرارت اور لہجے میں دھمکی تھی۔

''ارے تم تو اس پورے پلے کا لیڈ کیریکٹر ہو.....تم نہ ہوتیں تو پرنس سے ملاقات نہ ہوتی.....ملاقات نہ ہوتی تو آج اماں ائرٹکٹ نہ بھیجتیں.....'' سفینہ کھلکھلا کر ہنس رہی تھی اور بہت پیار سے ماہین کی کمر میں بازو حمائل کر دیا تھا۔

''میں نے آج سے پہلے کبھی تمہیں اتنا خوش نہیں دیکھا سفینہ.....اور میں یہ بھی نوٹ کر رہی ہوں کہ تم ہنستی ہوئی کتنی کیوٹ لگتی ہو.....اُف مائی گاڈ تم کتنی کنجوسی سے ہنستی تھیں.....یہ تو اب یاد آ رہا ہے.....'' ماہین نے پھر شوخی کا مظاہرہ کیا اور اپنا سر بھی پکڑ لیا۔

''کتنی جلدی یاد آ گیا ہے تمہیں.....واہ.....تم تو منیر نیازی بن کر ہی دم لو گی۔'' سفینہ نے پھر کھلکھلاتے ہوئے ماہین کی کمر پر ایک دھپ جڑا تھی۔

''کہ.....؟'' ماہین نے گھورا۔

''وہ یہ کہتے رہے کہ ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں.....مگر جانے میں بڑی جلدی کی۔''

''اوہ.....آئی سی.....'' ماہین کو بات سمجھ آ گئی.....تیز دھوپ کی تپش سے دونوں کے چہرے تمتما رہے تھے مگر خوشگوار احساسات تپش پر حاوی ہو رہے تھے۔ فطری مسکراہٹوں سے ماحول گل وگلزار ہو رہا تھا۔

ماہین کی خوشگوار حیرت بجا تھی۔

سفینہ بہت سنجیدہ قسم کی طالبہ تھی.....ٹائم ضائع کرنے والی ہر ایکٹویٹی سے دور بھاگتی تھی.....زیادہ وقت کتابوں کے ساتھ گزارتی تھی.....دیکھا جائے تو اس دوستی کو قائم اور مضبوط رکھنے میں ماہین کا حصہ زیادہ تھا۔ سفینہ اور لڑکیوں سے بہت مختلف اور نیچرل (فطری) نظر آتی تھی۔ ماہین نے خود اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا اور آج تک بہت خوش اسلوبی سے نباہ رہی تھی۔

سفینہ میں ایک حیرت انگیز خوشگوار تبدیلی پا کر وہ یوں خوش تھی جیسے ایک معصوم بچہ پورے چاند کو دیکھ کر انگلی سے اشارہ کر کے مسرت کا اظہار کرے یا پھولوں کے قطعے دیکھ کر بے وجہ خوشی مناتا دکھائی دے۔

ابھی وہ اس ذہن رسا کی مالک نہیں تھی جو اسے باور کراتا کہ جو فطری رویّوں کا حامل ہوتا ہے وہی فطرت کا بے ساختگی سے مظاہرہ کرنے کا اہل ہوتا ہے۔ عورت کی فطرت میں ہے کہ اسے چاہے جانے کی خواہش ہوتی ہے اور جب یہ لاشعوری تقاضا تکمیل کے مرحلے سے گزرتا ہے تو ساری کائنات رنگ ونور میں ڈھل جاتی ہے.....سفینہ تبدیل نہیں ہوئی تھی.....فطرت اپنا اظہار کر رہی تھی۔

☆☆☆

''تم کتنی خوب صورت باتیں کرتی ہو.....اور کتنی بھولی بھالی ہو.....'' لیڈی صوفیہ، زارا کی معذرت، شرمندگی کے اظہار کو کسی اور معنی میں لے کر بے ساختہ تعریف کر رہی تھیں۔

''میں آپ کو کیا کہہ کر ایڈریس کر سکتی ہوں میم؟'' زارا کو بات کرتے، کرتے کسی الجھن یا کمی کا احساس ہو رہا تھا بار، بار الجھ جاتی تھی۔

''تم مجھے گرینڈ مام کہہ سکتی ہو.....آفٹر آل سفینہ بھی تو مجھے گرینڈ مام ہی کہے گی۔'' لیڈی صوفیہ نے کھلے دل سے اسے گرینڈ مام کہنے کی اجازت دی۔

''آپ کی پرسنالٹی میں جادو ہے.....میں آپ سے دوستی کرنا چاہتی ہوں.....میں نے آج تک اتنی شاندار اولڈ لیڈی نہیں دیکھی.....I swear'' زارا نے تعریف کے پل باندھے اور اچھل کر نشست تبدیل کی، مزید قریب آ کر بیٹھ گئی۔ اسے یقینِ واثق تھا کہ اتنی بھرپور تعریف سننے کے بعد اسے ہر طرح کی رعایت مل جائے گی اور اس کا خیال غلط بھی نہیں تھا۔ لیڈی صوفیہ نے نہال ہو کر اس کا ہاتھ تھام لیا تھا.....اتنی بے تکلفی کا مظاہرہ ان کا مزاج

نہ تھا مگر ایک خوب صورت بظاہر بھولی بھالی لڑکی نے چند منٹوں میں ان کا دل موہ لیا تھا۔
''او...... ہو...... ہو......'' وہ بے ساختگی سے ہنسیں...... ساری زندگی دوسروں پر پوری قوت سے اثر انداز ہونے کی لاشعوری اور مسلسل خواہش کو اس ستائش سے بڑی تقویت پہنچی تھی۔ یوں جیسے خواب میں چاند کو چھو لیا ہو۔
''بھئی اب ہم مزید قریب ہونے جا رہے ہیں...... ان لاز فیملی ممبر ہی بن جاتے ہیں...... تم مجھے اپنا قیمتی وقت دے سکتی ہو...... میرے لیے بہت امیزنگ ہے۔ یوتھ تو اولڈ سے بہت بیزار ہوتی ہے۔ مجھے تمہارے خیالات جان کر بہت خوشی ہوئی مگر......'' وہ اچانک بہت زیادہ افسردہ ہو گئیں۔
''مگر......؟'' زارا کا دل دھڑکا۔
''مگر تم بچی ہو...... بچے بہت ایموشنل ہوتے ہیں...... اگر یہ تمہاری وقتی کیفیت ہے تو آنے والے دنوں میں میرے لیے مینٹلی ٹارچر بن سکتی ہے۔'' لیڈی صوفیہ کو مسرت کی انتہا پر اندیشے نے آلیا۔
''ارے نہیں...... میں اتنی بھی بچی نہیں ہوں...... اپنی مرضی سے آپ سے ملنے آئی ہوں۔ مجھے کسی نے نہیں، میرے دل نے پریشرائز کیا تھا۔'' زارا نے گھبرا کر وضاحت کی وہ بھی طولانی...... مبادا لیڈی صوفیہ راہ و رسم بڑھانے سے ہاتھ ہی اٹھالیں۔
''اف...... دل......'' لیڈی صوفیہ نے اب دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔
زارا بری طرح گھبرا گئی۔
''I have never found a companion that was so companionable as solitude (گوشہ نشینی سے اچھا ساتھی کسی کو نہ پایا) اس دل نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا...... تنہائی کو میرا ساتھی بنا دیا...... یہ الفاظ میرے نہیں...... ہنری ڈیوڈ کے ہیں جو انیسویں صدی کا نامور مصنف اور شاعر تھا...... دل کا کوئی زمانہ ہوتا ہے نہ صدی...... دل ٹائم اور اسپیس سے آزاد ہے۔ جوانی، بڑھاپے کے الفاظ دل کے لیے ہرگز ایجاد نہیں ہوئے۔ پیاری سی لڑکی...... دل کو مانتی ہو تو میری اچھی companion بن سکتی ہو...... otherwise...... solitude پر تو میرا ایمان ہے......'' بولتے، بولتے اب لیڈی صوفیہ کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں جیسے کسی کارِ مشقت سے گزری ہوں۔
زارا اندر سے سہم گئی تھی...... اسے یوں لگا لیڈی صوفیہ ابنارمل ہوں...... اور جانے کب ایک دم سے اس کی بے عزتی کر دیں...... عالیشان گھر کی عظیم الشان آرائش نے تو اسے پہلے ہی مبہوت کر کے رکھا ہوا تھا...... جس طرف نظر جاتی مادی قوت اپنے کمال کا اظہار کرتی دکھائی دیتی تھی...... درجہ دوئم، درجہ سوئم کی اشیا کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، درجہ اول کے تصور سے بھی آگے کچھ تھا۔
اس کے گھر میں بھی نعمتیں، سہولتیں خودرو گھاس کی طرح اگتی تھیں...... مگر یہ نظارہ نظر کو خیرہ کر کے رکھ دینے والا تھا۔
کم مائیگی کا ایسا احساس خود بخود تخلیق ہوا تھا جو کسی مزدور کے دل میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ کسی رئیس کے گھر میں جا کر اپنا غریبانہ غرور و محنت کش ہونے کا افتخار وقتی طور پر کھو دیتا ہے...... الفاظ گم ہو جاتے ہیں آئیں بائیں شائیں ہو جاتا ہے، حواس ساتھ چھوڑتے محسوس ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ کتنی بڑی حقیقت ہے کہ دولت مند کی دولت اس کے اپنے لیے ہوتی ہے۔ متاثر ہونے والے کو انعام و اکرام سے نہیں نوازا جاتا۔ بے شمار دولت مند ایسے ہیں جن کے ملازمین جان بچانے والی دواؤں کے لیے ترستے مر جاتے ہیں۔
''میں آپ کی اجازت سے ویک اینڈ پر آپ کے ساتھ بہت سارا وقت گزار سکتی ہوں...... یقیناً مجھے آپ

سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملے گا۔'' زارا نے خاص طور پر یہ جملہ انگریزی میں ادا کیا تھا۔

لیڈی صوفیہ تو یہ الفاظ سن کر زارا پر فدا ہی ہو گئیں...... جبکہ بزرگوں کو ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ وہ نوجوان کو اپنے تجربات سے بہت کچھ سکھانا چاہتے ہیں مگر وہ کان ہی نہیں دھرتے۔

''exellent تم بہت سمجھدار بچی ہو...... میں سمجھتی ہوں جس بچے میں بھی جاننے، سیکھنے کا شوق ہوتا ہے وہ اپنی قوم کا asset (اثاثہ) ہوتا ہے۔''

خوشی سے زارا کا دل دھڑکا...... وہ کامیاب ہونے جا رہی تھی...... لیڈی صوفیہ اس کا حوصلہ بڑھا رہی تھیں۔

''مجھے آرٹ سے بہت لگاؤ ہے اور میں آرٹ ہی پڑھ رہی ہوں...... میرے پاس بہت کلیکشن ہے، آپ کو یہ جان کر بہت خوشی ہوگی کہ میں نے پرنس کی ایک بہت خوب صورت پینٹنگ پرچیز کی تھی اور اپنے بیڈروم میں لگائی ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک دن میں پرنس کے گھر جاؤں گی، ان کی شاندار سی گرینڈ مام سے ملوں گی۔''

''اوہ پیاری لڑکی، تم نے تو میرا دل ہی جیت لیا۔'' یہ کہتے ہوئے لیڈی صوفیہ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے مزید قریب آنے کو کہا۔

زارا سرک کر مزید قریب ہو گئی...... لیڈی صوفیہ نے اسے اپنے بازو کے گھیرے میں لے لیا اور اس کے گال پر بوسہ دیا۔ زارا پھولی نہیں سمائی۔

''پرنس مصروف ہوگا...... میں اسے اچانک یہاں آنے کے لیے نہیں کہہ سکتی...... جب وہ پینٹنگ میں مصروف ہوتا ہے تو وہ کسی اور جہان میں ہوتا ہے...... لیکن خیر کوئی بات نہیں...... تم میرا پرسنل نمبر ہاؤس مینیجر سے لے لینا اور next time فون کر کے آنا...... پھر وہ تمہیں ضرور وقت دے گا۔''

''شیور...... میں ضرور ایسا کروں گی کیونکہ میں ان کا اسٹوڈیو دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''بالکل، تمہیں اسٹوڈیو دیکھ کر بہت خوشی ہوگی...... کیونکہ وہ پرنس کی طرح ہی بہت خوب صورت ہے۔''
لیڈی صوفیہ کی آنکھیں روحانی مسرت سے روشن ہو رہی تھیں۔ جیسے طاقوں میں چراغ جل رہے ہوں۔
ایک خادمہ اندر داخل ہوئی وہ یہ بتانے کے لیے آئی تھی کہ چائے کی ٹیبل تیار ہے۔
''چائے...... بھری دوپہر میں...... تھوڑی دیر بعد تو بہت سے لوگ لنچ کر رہے ہوں گے۔'' زارا کو عجیب سی کوفت ہوئی...... بھری دوپہر میں کبھی چائے پیتی بھی تھی تو اتوار کو کہ اٹھ کر ظہر سے پہلے پی لیتی تھی۔ بہر حال اس نے اپنی مسکراہٹ کو اندرونی کیفیت سے متاثر ہونے نہیں دیا۔

☆☆☆

سیتا کو مفت کا مشورہ دے کر تو وہ آ گیا تھا مگر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کچھ غلط ہو گیا ہے۔ اپنی کرسی سنبھالنے کے بعد بھی فوری طور پر ذہن کام کی طرف متوجہ نہیں ہو سکا تھا۔
کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر...... سر ٹکا کر اس نے چند ثانیے کے لیے آنکھیں موند لیں اور سانس کی مشق کرنے لگا...... یعنی سانس روک کر منہ سے نکالنے لگا، دو تین منٹ بعد قدرے پُرسکون ہو گیا...... پُرسکون ہوتے ہی زور سے انگڑائی لی اور اپنا لیٹر پیڈ کھینچ کر وارد ہونے والے اشعار لکھنے لگا۔

اے پیارے سے سنسار
اے دلارے نیارے سنسار
میری پرابلم کی دوا کہیں نہیں
مر گئے ڈاکٹر، حکیم، وید، پنسار
ناؤ کھینا آتی نہیں چڑھ بیٹھے
کیا کریں گے؟ جو پڑے گا منجدھار
لون لے کر گھر بناتے ہیں
لون لے کر اتاریں گے ادھار
قرض پریم کی مقراض ہے یارو
بھلے برا مانو نہیں دیتے ادھار

اشعار لکھ کر اس نے قلم پھینکنے کے انداز میں رکھا پھر ہاتھوں کا تکیہ بنا کر سر کے نیچے رکھا اور جھولنے لگا...... چند ثانیے اس حالت میں رہنے کے بعد بہت مستعد انداز میں اندازِ نشست تبدیل کیا اور لینڈ لائن نمبر ملانے لگا...... وہ اکاؤنٹ سیکشن میں بات کرنے کا ارادہ کر چکا تھا...... اسے خود سے الجھن ہو رہی تھی کہ ذہن کے پردے پر روتی ہوئی سیتا نمودار ہو جاتی۔
''ہاں...... زاہد...... ساحل بات کر رہا ہوں...... یار وہ ذرا سیتا کا کیس ہینڈل کر لینا، اسے لون کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ بتا رہی تھی کہ اس کا ہزبینڈ بیمار ہے۔''
''لیکن ابھی تو ان کا پچھلا لون ختم نہیں ہوا......'' دوسری طرف سے اکاؤنٹنٹ کہہ رہا تھا۔
''اسی وجہ سے تو وہ اپلائی کرتے ہوئے ڈر رہی ہے...... دیکھ لو یار...... بہت پریشان ہے، تم تو ایسے چھوٹے موٹے کیس سنبھال سکتے ہو...... غریب کی مدد ہو گی ثواب تمہیں ملے گا...... اوکے......؟'' یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا...... اور ایک گہری سانس پوراز ور لگا کر پھیپھڑوں سے آزاد کی پھر ہاتھ اٹھا کر اللہ کا شکر ادا کیا۔
خوش رہو...... اپنے خرچے پر کی وہ زندہ مثال تھا...... اور ان لوگوں میں سے تھا جو اپنی ذات پر کھل کر خرچ

کرتے ہیں اور اپنے علاوہ کسی پر خرچ کرنے کے خیال سے ہی پریشان ہو جاتے ہیں...... کہ اپنا پیسہ تو اپنے لیے ہوتا ہے۔ لامحدود خواہشات ہی انسان کو بخیل، مادہ پرست بناتی ہیں۔ بخل، کنجوسی کی وہ انتہا ہے جہاں انسان اپنے جوڑے ہوئے مال سے اپنے لیے نکالتے ہوئے بھی دس بار سوچتا ہے۔

مال کی شدید محبت خود غرض بناتی ہے۔ خود غرض کسی کے لیے تکلیف نہیں اٹھاتا۔ لوگوں کے خلوص سے محروم رہتا ہے۔ دعاؤں سے محروم رہتا ہے، اس لیے روحانی مسرت سے بھی محروم ہوتا ہے۔

ساحل کا موڈ بات، بات پر بگڑ جاتا تھا...... یہ خصوصیت انہی لوگوں میں ہوتی ہے جو اپنے سوا کسی سے پیار نہیں کرتے۔ سیتا سے دوستی کی وجہ سے اسے الجھن ہو رہی تھی کیونکہ ہر انسانی ضمیر بلا روک ٹوک اپنا فرض انجام دیتا رہتا ہے۔ کبھی احساس جگاتا ہے کبھی ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ جاتا ہے۔ بہر حال اس نے کمالِ ہوشیاری سے اس الجھن کا حل نکال ہی لیا تھا۔

☆☆☆

زارا کی پرنس سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی مگر اسے چنداں ملال نہیں تھا...... آج کے بعد وہ اس گھر کے لیے اجنبی نہیں رہی تھی۔ جب مرضی فون کر کے جا سکتی تھی۔ پرنس سے ملاقات شہر بھر کو مسئلہ ہو سکتی تھی، اس کو نہیں...... کار سڑک پر دوڑ رہی تھی اور وہ خود ہواؤں میں اُڑ رہی تھی۔

''سفینہ میں بہت صبر ہے...... وہ کسی بھی شے کے بغیر آرام سے رہ سکتی ہے۔ کچھ ہونے نہ ہونے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا...... لیکن مجھے پڑتا...... اگر پرنس کی دادی پہلے مجھ سے ملی ہوتیں تو مجھے پروپوز کرتیں...... یہ تو اتفاق ہے کہ پہلے مجھ سے نہیں مل پائیں۔ پرنس میرا ڈریم ہے...... جب وہ میری اپروچ میں ہے تو میری سیکنڈ چوائس کیوں ہو...... فرسٹ اینڈ لاسٹ......'' وہ خود کو اسی طرح بہلا رہی تھی جیسے مجرم جواز در جواز میں الجھا رہتا ہے۔ ''یہ میری محبت کی انتہا نہیں ہے کہ میں اپنا وقت ایک بوڑھی عورت کو دیا کروں گی...... کوئی جوک تو نہیں ہے...... کسی بوڑھی آدھی پاگل عورت کے ساتھ وقت گزارنا......'' اسے آنے والی کوفت کی آہٹیں بھی محسوس ہو رہی تھیں۔

☆☆☆

''تم کس کی اجازت سے وہاں گئیں؟'' تاجور کو زوردار جھٹکا لگا تھا...... چند ثانیے تو انہیں کچھ سجھائی نہیں دیا۔ کتنا حساس معاملہ تھا...... اس گھرانے نے ان کی لاڈلی بیٹی کے لیے پیام دیا تھا...... وہ خاندان جس کی طرف بڑے، بڑے خاندان دیکھ رہے تھے۔ اور یہ زارا ایک نمبر کی بے وقوف...... خدا معلوم کیا بک، بک کر کے آئی ہو۔

''اماں...... مجھے بہت گلٹی فیل ہو رہا تھا۔ مجھے ایسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ بہت اسپیشل گیسٹ تھے...... ان کی بہت improtance ہے...... انہوں نے سفینہ کو پروپوز کیا ہے...... مجھے فکر ہو گئی کہ میری وجہ سے کہیں بات خراب نہ ہو جائے اگر کچھ ہوا تو آپ اور سفینہ مجھے کبھی معاف نہیں کریں گی۔''

وہ چھوٹے چھوٹے نرم و گداز ہاتھ جوڑ کر تاجور کے سامنے کھڑی بول رہی تھی۔ چہرے سے ندامت تھی کہ بس پھوٹی جا رہی تھی رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ تاجور کے اندر اٹھتے جھاگ آناً فاناً بیٹھ گئے۔

اب غصے کے بجائے انتہائی حیرت سے زارا کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''یہ بے وقوف منہ پھٹ سی لڑکی اتنی گہرائی تک بھی سوچ سکتی ہے؟'' انہیں یقین آ کر نہیں دے رہا تھا۔

''اتنی حساس ہے...... سفینہ کے لیے اس طرح بھی سوچ سکتی ہے؟''

''اماں معاف کر دیں۔'' زارا نے تقریباً گڑگڑا کر کہا۔

معافی مانگنے کا یہ انداز بھی نیا، نیا سا تھا۔ اس سے قبل تو اپنا قصور ہوتے ہوئے بھی اسے منہ پھلانے اور

پاؤں پٹخنے کی عادت تھی۔
''وہاں جا کر تم نے کیا بات کی......؟'' وہ اب مکمل طور پر اپنی تسلی کرنے کے موڈ میں آگئیں اور صوفے کے ہتھے پر ہاتھ کا دباؤ ڈال کر یوں بیٹھیں گویا بیٹھنا محال تھا۔
''میں نے ان سے سوری کہا اور reason بھی بتایا۔ لیڈی صوفیہ صاحبہ تو اتنی نائس ہیں کہ انہوں نے سب کچھ اگنور کر دیا اور کہنے لگیں تم بہت اچھی لڑکی ہو...... جب تمہارا دل چاہے مجھ سے ملنے آسکتی ہو...... بس آنے سے پہلے مجھے فون ضرور کرنا...... اماں انہوں نے مجھے اپنا پرسنل نمبر بھی دے دیا ہے۔'' زارا بول رہی تھی اور تاجور ایک ٹک اس کی صورت تک رہی تھیں۔
''او کے......'' چند سیکنڈ کی گہری خاموشی ٹوٹ گئی۔
''مگر تم مجھے بتائے بغیر وہاں نہیں جاؤ گی...... یہ ان کا بڑا پن ہے کہ وہ تمہیں allow کر رہی ہیں مگر اب اس فیملی سے ہمارا رشتہ قائم ہونے جا رہا ہے...... ہمیں بہت محتاط رہنا ہوگا...... اب وہ لوگ ہمیں ہر اینگل سے چیک کریں گے۔ بہت خاموشی سے...... اور ایسا وہ جان بوجھ کر نہیں کریں گے۔ یہ رشتہ ہی ایسا ہے کہ ہر بات تنقیدی نظر سے تولی جائے گی۔ in laws کے ساتھ معاملات ہمیشہ بہت sensitive ہوتے ہیں۔'' تاجور اب بہت شفقت و نرمی سے سمجھانے لگیں...... لاشعوری طور پر وہ اپنے سر سے ایک بوجھ اترتا محسوس کر رہی تھیں...... گھوم پھر کر ایک خیال جو اِن کو تنگ کرنے کسی بھی وقت آدھمکتا تھا اس سے جان چھوٹ گئی تھی...... زارا اتنی قابل سفارت کار ثابت ہو سکتی ہے...... یہ تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔
''وعدہ اماں، میں آئندہ آپ کو بتائے بغیر وہاں کبھی نہیں جاؤں گی۔'' زارا نے بڑی معصوم شکل بنا کر وعدہ کیا۔
اس وعدے نے تو تاجور کے انگ، انگ میں مسرت کی لہر دوڑا دی...... آج کی اس بات چیت نے تو وہ سرمئی دھوئیں کے بادل اڑا دیے جو اس کی حماقتوں پھر مزید حماقتوں کے سبب ذہن پر چھائے رہتے تھے۔ اب وہ اس کی طرف یوں دیکھ رہی تھیں جیسے ماں دیکھا کرتی ہے...... محبت، اپنائیت اور جان صدقہ کرنے کی کیفیت کے ساتھ۔

☆☆☆

''یہ تو سرپرائز ہے گرینڈ مام......'' پرنس اپنی محبوب رشین بلی کو گود میں لیے اور اس کے نرم روؤں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بہت حیرت آمیز مسرت کے ساتھ لیڈی صوفیہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔
''ویری کیوٹ......'' لیڈی صوفیہ کو زارا کی کوئی بات یا ادا یاد آئی تو برجستہ منہ سے نکلا۔
''ایک بات بتاؤں گرینڈ مام......''
''اوہ یس...... میں ضرور سننا چاہتی ہوں۔'' لیڈی صوفیہ نے پرنس پر نگاہیں جما کر اپنے متوجہ ہونے کا یقین دلایا۔
''زارا کو دیکھ کر پہلا خیال یہی آیا تھا جیسے وسیع سمندر...... جس پر بادلوں کی تہ...... تہ سے اوپر سفید جھاگ اور جھاگ کو create کرتی اونچی، اونچی لہریں...... جو بتاتی ہیں کہ سمندر کے نیچے ایک طوفان برپا ہے...... اور یہ لہریں اس طوفان کا ردِعمل ہیں۔''
''معصوم سی لڑکی کو اتنا مشکل بنا کر پیش کر رہے ہو...... مجھے حیرت ہو رہی ہے۔'' لیڈی صوفیہ بہت لطف اندوز ہو رہی تھیں۔
''اتنا غور و خوض تو تمہیں سفینہ پر کرنا چاہیے تھا......'' وہ مسکرا رہی تھیں جیسے کسی گہرے دوست سے چھیڑ چھاڑ کر رہی ہوں۔

''میں نے بالکل بھی غور نہیں کیا...... میں تو ایک نظر کی بات کر رہا ہوں...... یہ میں نے ایک نظر میں catch کیا تھا۔''

''میں اس کو بالکل بھی اہمیت نہیں دے سکتی...... بعض اوقات ہم برسوں کسی کے ساتھ رہتے ہیں اور اسے نہیں سمجھ پاتے...... emotions ...kill کرتے ہیں...... فیلنگز ہرٹ کرتے ہیں۔''

پرنس نے گھبرا کر لیڈی صوفیہ کی طرف دیکھا۔ یقیناً اب وہ اپنے مرحوم سسر کی طرف متوجہ ہو رہی تھیں۔

''محبوب اور جانی دشمن ...... دل کا آسیب ہوتے ہیں...... بہترین یادداشت ہوتے ہیں...... خود فراموشی میں بھی فراموش نہیں ہوتے......شہ رگ میں اٹکی ہیرے کی کنی ہوتے ہیں......شدید محبت اور شدید نفرت......احساسات کی آخری حد کے دو نام ہیں۔'' پرنس نے فوراً پیش بندی کی اور سیلابی ریلے کا رخ موڑنے کا تہیہ کر لیا۔

''ہم سفینہ اور اس کی مدر کو کب ڈنر پر انوائٹ کر رہے ہیں؟'' اس نے بلی کو گود سے اتار کر دو تین مرتبہ چٹکی بجائی...... پھر سُریلی سیٹی بھی بجائی۔ سفینہ کا نام ذہن میں آتے ہی روح میں سُر تو ویسے ہی پھوٹنے لگتے تھے اور اس وقت تو وہ بے حد خوش تھا...... کیونکہ اس کے اندر یقین کی موجیں موجزن تھیں کہ سفینہ اس وقت بہت خوش ہے...... جب اس کی طرف توجہ کرتا ہے، احساسات ہلکے پھلکے اور خوشگوار ہو جاتے ہیں۔

''تم کتنے معصوم اور جذباتی ہو میرے پیارے بیٹے۔'' لیڈی صوفیہ نے اب وکٹورین لہجے میں مکمل انگریزی میں بات کی۔

''ہم نے سوال کیا ہے...... وہ جواب دیں گے...... اس کے بعد ہی ساتھ کھانا کھائیں گے...... اصول تو یہی ہے۔ آج میں تاجور سے فون پر بات کروں گی۔''

''گرینڈ مام...... اتنی جلدی...... ! میرا خیال ہے یہ بہت جلدی ہوگا۔ ہمیں تھوڑا انتظار کرنا چاہیے۔'' یہ سن کر لیڈی صوفیہ کھلکھلا کر ہنسیں۔

''silly...... ایسے ہی ہیلو ہائے کروں گی...... انہیں کچھ کہے بغیر یاد دلاؤں گی کہ آپ ہمیں ویٹ کرا رہے ہیں۔''

''واہ...... شاید اس کو ڈپلومیسی کہتے ہیں......؟'' پرنس بھی کھل کر ہنس دیا۔

یوں بھی آج کل تو بات، بات پر کھل اٹھتا تھا...... اور کھل کر ہنستا تھا۔

''اس کو دادی کی پوتے سے محبت کہتے ہیں۔'' لیڈی صوفیہ حیرت انگیز طور پر حاضر دماغی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔

خوشی و مسرت کی کیفیت کمال ہے کہ روح چشم زدن میں توانائی حاصل کرتی ہے...... اعصابی ٹوٹ پھوٹ کا عمل رک جاتا ہے۔

''کیا بات ہے محبت کی...... وہ جو شاعر نے کہا ہے

جو بھی کچھ ہے محبت کا پھیلاؤ ہے''

پرنس نے آگے بڑھ کر لیڈی صوفیہ کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور ہاتھ کی پشت پر محبت بھرا بوسہ ثبت کیا...... وہ ٹکٹکی باندھ کر پرنس کی طرف دیکھنے لگیں۔

''پرنس کیا تمہیں خود پر اعتماد ہے کہ تم سفینہ کو خوش رکھ سکو گے......؟'' پرنس بے ساختہ مسکرا پڑا۔ ''میرے پاس دینے کے لیے لامحدود اور غیر مشروط محبت ہے گرینڈ مام...... اگر کوئی یہ عظیم تحفہ پا کر بھی خوش نہیں ہوا تو سمجھیں خوشی اس کے مقدر میں نہیں......''

''absoluotely تم نے بہت مناسب جواب دیا...... مجھے تم سے یہی امید تھی۔'' وہ پیار بھری نظروں سے تکتے ہوئے گویا ہوئیں۔

''ہم زارا کی بات کر رہے تھے...... اور آپ بتا رہی تھیں کہ وہ آپ کو دوست بنا کر خوش ہے اور آپ کو کمپنی دینے کے لیے willing ہے......'' پرنس کو نشست برخاست کرنے کے خیال کے ساتھ ہی یہ خیال آیا...... کیونکہ کچھ ادھورا پن سا محسوس ہو رہا تھا۔

''لیں...... وہ ایسا ہی کہہ گئی ہے...... مگر ابھی وہ بچی ہے اپنے وقتی جذبات کو اہمیت دیتی ہے...... دور اندیشی کی کمی ہے۔ میں اسے ہرگز نہیں آزماؤں گی مگر اس کا دل بھی نہیں توڑوں گی۔''

''آپ بہت حساس ہیں گرینڈ مام...... دوستی بڑھانے میں احتیاط کیجیے گا۔''

''میں اس سے زیادہ امید نہیں لگاؤں گی...... اسے کم عمری کا مارجن ضرور ملنا چاہیے مگر...... مجھے خوشی ہے کہ وہ اچھی لڑکی سفینہ کی بہن ہے...... کسی، کسی وقت بات کرتے ہوئے یونہی ایک خیال آتا رہا جیسے میں نے پہلے بھی کبھی اسے دیکھا ہے...... کہاں...... یہ یاد نہیں......''

لیڈی صوفیہ کی بات سن کر پرنس بری طرح چونک پڑا تھا...... عمر رسیدہ کمزور یادداشت کی حامل پردادی کی طرف سے اسے اس بات کی کوئی فکر نہیں تھی کہ وہ ان کو رف اسکیچ کے ذریعے زارا سے متعارف کرا چکا ہے۔ دل قدرے سکڑا سمٹا پھر پوری قوت سے پھیلا۔

اس نے مسکراہٹ کی آڑ میں سنبھلنے کی مہلت لی۔

''اس دنیا میں بے شمار شکلیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں...... شاید کسی بوفے میں آپ نے کوئی زارا سے ملتی جلتی لڑکی دیکھی ہو اور recall ہو رہا ہو...... اب یہ بے معنی سی باتیں ہیں...... آج کی گڈ نیوز یہ ہے کہ آپ کو ایک بہت اچھا companion مل گیا ہے۔''

پرنس نے لیڈی صوفیہ کی بات ہوا میں یوں اڑائی جیسے دونوں ہاتھوں سے منہ میں دبی سگریٹ کا دھواں اڑا رہا ہو۔

لیڈی صوفیہ بھی یوں مسکرائیں جیسے کوئی بات ہی نہیں کی ہو۔

☆☆☆

تاجور کا رویہ بحیثیت ماں ہمیشہ بہت محتاط رہا...... وہ اپنی بے پناہ مصروفیت کے باوجود کان کھڑے اور نگاہ مرتکز رکھتی تھیں...... ہائی جینٹری موو کرنے کی وجہ سے یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ طبقۂ اشرافیہ کا حصہ ہونے کی وجہ سے وہ اس طبقے کی خود ساختہ لبرٹی یا روشن خیالی سے جس میں رشتوں و رویوں کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا...... اندر سے بہت خوفزدہ رہتی تھیں۔

ان کا ایک واضح خاندانی پس منظر تھا۔ عورت کی عفت و عصمت کو خاندان کا سب سے بڑا اثاثہ سمجھا جاتا تھا محفلوں میں شرکت سے احتراز کیا جاتا تھا۔ بزرگوں کی روک ٹوک کھانے پینے سونے کی طرح ضروری اور معمول کی بات تھی۔ بڑوں کا ادب، چھوٹوں پر مہربانی کے اصول یاد کرائے جاتے تھے۔

کسی گھرانے میں بہن، بھائی الجھ پڑتے تو اس معاملے کو بہت سنجیدگی سے لیا جاتا تھا...... بیٹھک لگتی تھی...... معاملے کی جڑ، بنیاد ٹٹولی جاتی۔ گھر کے تمام بڑے سارے ضروری کام چھوڑ یہ قضیہ دیکھتے۔

خاندان کے بزرگوں کا کہنا تھا...... جب خون کے رشتوں کو رشتے کی اہمیت کا احساس نہیں ہوگا تو بیرونی مداخلت بڑھے گی۔ ملنے جلنے والے مفت کے مشوروں سے نوازیں گے مگر مشوروں کے نتائج میں حصہ نہیں لیں گے۔ اس لیے بچوں کو شروع ہی سے احساس دلانا چاہیے کہ اللہ نے انہیں ایک گھر میں بے مقصد پیدا نہیں

کیا......اور اللہ کوئی کام بے مقصد و بے معنی کرتا ہی نہیں......ایسا کرنا اس کی شانِ ربوبیّت کے خلاف ہے۔
ایک گھر میں پیدا ہونے والوں نے زندگی بھر اپنا، اپنا کردار نبھانا ہے......تربیت میں عملی نمونے بھی پیش کیے جاتے...... بڑا بھی غلطی کرتا تو غلطی مانتا تھا چھوٹے سے چُوک ہوتی تو اسے چوک پر ذلیل کرنے کے بجائے تنہائی میں بلا کر اس کے دل کی باتیں جاننے کی کوشش کی جاتی......اور مناسب مشورہ و تاکید سے نوازا جاتا...... ہر چھوٹے بڑے عمل کی بنیاد محبت پر رکھی جاتی اب یہ تاجور کی بدقسمتی تھی یا آزمائش کہ شوہر کا پھلتا پھولتا کاروبار اس عمر میں سنبھالنا پڑا جب جوانی پھل پھول رہی تھی۔

جب کاروبار ہوتا ہے تو کاروباری تعلقات بھی پیدا ہوتے ہیں......یہ تعلقات بسا اوقات حقیقی رشتوں کی جگہ پر قابض ہو جاتے ہیں......اور ان کا طرزِ معاشرت، رہن سہن کا کچھ نہ کچھ اثر لازماً آتا ہے......بچوں کو بہترین اسکول بھیجنا......جہاں بچوں کے اپنے سماجی تعلقات پیدا ہوتے ہیں۔ جوان کی ذہنی حالت پر یک دم نہیں مگر مرحلہ وار اثر انداز ہوتے ہیں۔

سفینہ کی مثال تو ایسی تھی کہ ''مچھلی کے بچے کو کون تیرنا سکھائے؟'' اس کے خون میں پچھلوں کی محنت کا اثر واضح طور پر محسوس ہوتا تھا۔ اسے روک ٹوک ہمیشہ اپنی توہین لگی......وہ اتنی احتیاط کرتی تھی کہ روک ٹوک کی نوبت ہی نہیں آئے......ماں کی ہمدرد بھی تھی اور قدردان بھی......اسے اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ اس کی ماں کے کندھوں پر بہت بھاری بوجھ ہے، ایسا بوجھ جو مرد اٹھاتے ہیں تو احسان بھی جتاتے ہیں۔

طبیعت آزاد خیالی کی جانب مائل ہو تو پرانی شراب سے تھکاوٹ اتارتے ہیں......بیوی نکتہ چیں ہو تو نشے کو تھکاوٹ اتارنے کا جواز بناتے ہیں۔ تاجور تو چائے، کافی بھی بہت نپی تلی لیتی تھیں......سگریٹ تو دور کی بات تھی لیکن آج انہیں زارا پر دل کھول کر پیار آ رہا تھا۔

''بہت سیدھی اور معصوم ہے......'' اس کی خود اعتمادی پر بھی خوشگوار حیرت تھی......وہ بہت عرصے بعد بہت اچھے موڈ میں دفتری امور نمٹا رہی تھیں۔

سفینہ کا بھی شدت سے انتظار تھا۔

''جب سفینہ کو پتا چلے گا تو بہت انجوائے کرے گی......شاید بے وقوف لوگ ہی اتنے بولڈ ہو سکتے ہیں......'' وہ نئی فائل اٹھاتے ہوئے زارا کی محبت میں ڈوب کر سوچ رہی تھیں۔

☆☆☆

سفینہ گھر میں داخل ہوئی تو زارا نے یوں لپٹ کر اس کا استقبال کیا گویا سالہا سال بعد ملاقات ہو رہی ہو۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے ناں تمہاری......؟'' سفینہ اس کی وحشت بھری (اس کے حساب سے) قربت سے حیرت زدہ نظر آ رہی تھی کہ اس کی یادداشت کے کسی کونے میں ایسے لمحات محفوظ نہیں تھے کہ یاد پڑتا پہلے بھی کبھی اس کا ایسا استقبال ہوا ہو......وہ پوری قوت سے خود کو زارا کی بانہوں سے آزاد کرانے کی جدوجہد بھی کر رہی تھی۔

''ایسی ویسی......وہ ایک اردو سونگ ہے ناں جس میں پھول کی طرح کھلنے کا ذکر ہے......مگر اس وقت مجھے وہ سونگ یاد نہیں آ رہا......'' وہ مایوسی سے گویا ہوئی......آنکھیں شرارت کے باعث چمک رہی تھیں۔

''تھینک گاڈ، بچ گئی......ورنہ تمہاری بھیانک آواز میں اردو سونگ بھی سننا پڑتا......'' سفینہ نے دونوں ہاتھوں سے زارا کو پرے دھکیلا۔ ''اور ہاں ایک پیار بھری ایڈوائز ہے......غور سے سنو......'' اب سفینہ کے انداز میں بھی بلا کی شوخی و شرارت تھی۔

''جلدی سے بتاؤ......'' زارا بے چین ہوئی۔

''وعدہ کرو تم زندگی میں کبھی غلطی سے بھی بادام نہیں کھاؤ گی۔'' سفینہ نے وعدہ لینے کے لیے ہاتھ پھیلایا۔

''وہ کیوں......؟ تمہیں میرے بادام کھانے سے کیا پرابلم ہے۔'' زارا نے دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے یوں کیے مبادا خطرہ ہو کہ سفینہ جبراً ہاتھ پکڑ کر وعدہ لے۔ لے گی۔

''اگر تمہاری میموری اچھی ہوگئی اور تمہیں سونگ یاد آگیا......تو تمہاری خوفناک ڈرم جیسی آواز سے مجھے کون بچائے گا؟'' یہ کہہ کر سفینہ زور سے ہنسی اور زارا کے ہاتھ پیچھے بندھے ہونے کا فائدہ اٹھا کر اسے گدگدایا......اور اندر کی طرف بھاگ گئی۔

زارا کوئی شوخ ردِعمل دینے کے بجائے اب گم صم نظروں سے اندر جاتی سفینہ کو دیکھ رہی تھی۔

''تم نے شاید مجھے گدگدی کی......نہیں ہوئی......یہ suddenly تمہیں کیا ہوگیا؟ بہت change لگ رہی ہو واؤ......امیزنگ، تم تو لطیفہ بھی سناتی ہو تو پوچھنا پڑتا ہے کہ ہنسنا کہاں تھا......'' سفینہ کی فطری و روحانی مسرت کیسے پوشیدہ رہ سکتی تھی......سورج کو چمکنے سے بھلا کوئی روک سکتا ہے......؟ بادل بھی تپش سے گھبرا کر بھاگنے لگتے ہیں۔

زارا اسی ان دیکھی آگ میں گیلی لکڑی کی طرح سلگنے لگی......جس آگ میں نیکیاں پرانے کاغذ کی طرح جلتی ہیں۔

☆☆☆

اس سے پیشتر کہ تاجور، لیڈی صوفیہ کو فون کر کے سفینہ کے کراچی پہنچنے کی اطلاع دیتیں، ان کا خود فون آگیا......وہ بھی جاننا چاہ رہی تھیں کہ سفینہ کا کیا پروگرام ہے۔ وہ تاجور کو اپنے گھر لنچ یا ڈنر پر مدعو کرنا چاہ رہی تھیں اور ساتھ ہی اس کی وجہ بھی بتادی تھی کہ ایک ملاقات میں بہت اہم باتیں ممکن نہیں ہوسکتیں، اس لیے ایک ملاقات سفینہ کی موجودگی میں بھی ہونی ضروری ہے۔

تاجور نے تو سفینہ کو اس لیے بلایا تھا کہ اہم موضوع پر براہِ راست بات ہونی چاہیے۔ لیکن لیڈی صوفیہ ان سے وعدہ لے کر اٹھی تھیں کہ جب بھی سفینہ کراچی آئے تو ان کو ضرور مطلع کیا جائے......تاجور نے سوچا......چلو یہ بھی ٹھیک ہے......سفینہ کے ذہن میں اگر کوئی الجھن ہوگی تو وہ سامنے آجائے گی۔

تمام خوشگواریوں کے بیچ ایسا کچھ ضرور تھا جیسے سوئی دھاگے سے کچھ سیتے، سیتے اچانک دھاگے میں گرہ پڑ جائے۔ انہوں نے فوری ہامی تو نہیں بھری......اپنا شیڈول چیک کرنے کا بہانہ کر کے مہلت مانگی......الجھن صرف اتنی تھی کہ کیا پروپوز کیے جانے کے بعد سفینہ کو وہاں جانا چاہیے؟ جبکہ ابھی پیام منظور کیے جانے کا کوئی عندیہ بھی نہیں دیا ہو۔ انہیں سفینہ کے گھر پہنچنے کی اطلاع مل گئی تھی......دیر ہونے کے باعث وہ کام کرنے کی نہیں، نپٹانے کی عجلت میں مبتلا ہو رہی تھیں۔ ایسے میں ساحل کے بھی مسلسل فون آرہے تھے۔

چلتے، چلتے انہوں نے سوچا ساحل کو کال بیک کر کے پتا کرلیں کہ وہ کیوں فون کررہا ہے جبکہ وہ خود لیٹ تھیں، اسّی فیصد لوگ آف ٹائم ہوتے ہی جاچکے تھے۔ طوعاً و کرہاً انہوں نے ساحل کو فون کیا، پتا چلا وہ کوئی اپنا مسئلہ لیے بیٹھا ہے۔ چلتے، چلتے کہہ دیا کہ صبح گھر آکر بات کرے......کیونکہ وہ کل آفس لیٹ آئیں گی۔ رات کو سفینہ سے دیر تک بات ہوگی تو نیند کہاں ہوگی......کھٹ سے صبح ہو جائے گی......وہ اپنی عالیشان پراڈو میں بیٹھتے ہوئے سوچ رہی تھیں۔

☆☆☆

''سفینہ لاہور سے آچکی ہے۔'' لیڈی صوفیہ نے پرنس کو اسٹوڈیو میں جالیا تھا جو واش روم میں ہاتھوں میں لگ جانے والا رنگ رگڑ، رگڑ کر اتارنے میں محو تھا۔

پرنس کو سماعت کا دھوکا ہو۔
اسے یوں لگا جیسے لیڈی صوفیہ کہہ رہی ہوں کہ باہر آؤ دیکھو سفینہ آئی ہے......واش روم کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ پرنس بڑے سے آئینے میں اپنے ساتھ، ساتھ لیڈی صوفیہ کو بھی دیکھ رہا تھا......آئینے میں دیکھتے ہوئے ہی مسکرا کر گویا ہوا۔
''سفینہ آگئی ہے تو آپ یہاں کیوں آگئیں......؟ وہ ڈرائنگ روم میں اکیلی بور ہو رہی ہوگی۔''
''مذاق کر رہے ہو یا واقعی ٹھیک سے نہیں سنا۔'' لیڈی صوفیہ دونوں ہاتھ چھڑی پر مضبوطی سے جمائے بغور پرنس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔
''جب سفینہ کا نام سن لیا تو پھر سب کچھ ٹھیک ہے۔'' پرنس ہاتھ ڈرائیر کے نیچے خشک کرنے لگا......ماحول میں شوں، شوں کی آواز حاوی ہوگئی۔
لیڈی صوفیہ نے اندازہ کر لیا کہ وہ باہر آیا ہی چاہتا ہے تو وہاں سے ہٹ گئیں اور چھڑی کے سہارے آہستہ، آہستہ اپنی اس کرسی کی طرف بڑھیں جو برسا برس سے ان کے لیے مخصوص تھی۔ اونچی پشت کی صندل کی لکڑی سے بنی جس پر پیتل اور اوپل پتھر کا بہت دلکش کام نگاہ کو مبہوت کرتا تھا۔ نشست سنبھال کر انہوں نے اس طرف دیکھا جس طرف سے پرنس نے آنا تھا۔ پرنس ہولے، ہولے قدم رکھتا ان کی طرف آرہا تھا وہ مطمئن ہوگئیں۔
''گرینڈ ماما ایک بات مجھے کنفیوز کر رہی ہے۔'' پرنس نے ان کے مقابل رکھی لیدر کی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
''تمہارا کنفیوژن بہت اہم ہے کیونکہ تم کبھی، کبھی کنفیوزڈ ہوتے ہو۔'' لیڈی صوفیہ نے قدرے متفکر انداز میں پرنس کی طرف دیکھا۔
''ہم سفینہ کو انوائٹ کر رہے ہیں لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں کہ اس کا کیا فیصلہ ہے کیا یہ مناسب نہیں کہ ہم ان کے جواب کا انتظار کرتے اور پھر اس خوشی کو سیلی بریٹ کرتے۔''
''اوہ، یہ تو بہت خاص بات کی تم نے......مگر میں بہت پُراعتماد ہوں کہ فیصلہ ہمارے حق میں ہوگا۔ کوئی تمہیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ پھر سفینہ تمہارا انتخاب ہے، مجھے امید ہے تمہاری محبت کی قدر کی جائے گی۔ میں کھانے کی میز پر ان سے جواب لے سکتی ہوں، اصرار کر سکتی ہوں اس لیے کہ مجھے تذبذب میں زیادہ دیر رہنا پسند نہیں اور میں خاصی بولڈ ہوں اس کی وجہ حضرت علیؓ کا ایک قول ہے جو میں نے کبھی فراموش نہیں کیا۔ آپؓ فرماتے ہیں کہ ''جس امر کی بابت تمہیں ڈر ہو اسے کر گزرو تاکہ حقیقت سامنے آجائے۔''
"true" (بالکل سچ ہے) پرنس نے بے ساختہ کہا یعنی اتفاق کیا۔
''آپ کیوں انتظار کریں جبکہ حقیقت جاننا آپ کی مجبوری ہو۔'' لیڈی صوفیہ نے پرنس کے چہرے پر نگاہ جمائی۔
''یوں بھی میرے پاس ضائع کرنے کے لیے بالکل بھی وقت نہیں ہے۔ میری عمر کا تقاضا ہے کہ ایک، ایک سیکنڈ کو fruit FUl بناؤں......formalities تو میں افورڈ ہی نہیں کر سکتی......اس وقت میں جو کچھ کر سکتی ہوں......مجھے ضرور کرنا چاہیے۔''
"......done" پرنس کو دادی پر اس لیے بھی ٹوٹ کر پیار آیا کہ وہ اس کی بے قراریوں کو قرار دے...رہی تھیں......اسے بے سبب انتظار کی اذیتوں سے بچا رہی تھیں۔
''پھر تو یہ ڈنر ضرور ہونا چاہیے......'' اس نے خوش دلی سے مسکرا کر کہا اور دادی سے ہاؤس منیجر کو طلب کرنے کی اجازت چاہی۔

''کیا مجھے کچھ ضروری کام کرنے کی اجازت ہے گرینڈ مام......؟''
''اوہ شیور! میں بھی اس وقت اپنی فیورٹ بک پڑھنا چاہتی ہوں۔'' انہوں نے یوں چونک کر جواب دیا گویا کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی ہو۔
پرنس نے انجیلا کو طلب کرنے کے لیے اٹھ کر انٹر کام کا بٹن پش کیا۔
''اس وقت آپ کیا پڑھ رہی ہیں؟'' اس نے انجیلا کی آمد تک دادی کو اپنی موجودگی کا احساس دینا چاہا۔
''اردو لٹریچر......ممتاز مفتی کی ''ان کہی......'' subcons ious کو الفاظ سے پینٹ کر کے مفتی نے کمال کیا ہے...... 1975ء سے لے کر اب تک میں یہ کتاب بیسویں مرتبہ پڑھ رہی ہوں۔'' وہ بول رہی تھیں کہ ان کی ملازمۂ خاص اسٹوڈیو میں داخل ہوئی۔
''اوکے گرینڈ مام......آل دا بیسٹ......'' پرنس احتراماً کھڑا ہو گیا اور دادی کے ہاتھ کی پشت پر بوسہ ثبت کیا۔

☆☆☆

''تم بہت لکی ہو سفینہ......نوابوں، مہاراجوں کا زمانہ ختم ہو گیا مگر تمہیں ڈیموکریسی کے اس زمانے میں بھی پرنس مل گیا......یار......ان کا لائف اسٹائل دیکھ کر تو ذرا بھی شک نہیں ہوتا بلکہ یقین ہو جاتا ہے کہ کوئی رائل فیملی ہے......واہ......گھر ہے یا سپنوں کا محل......'' زارا کی بات کا اختتامیہ بہت چونکانے والا تھا......اس وقت وہ دونوں تاجور کے ساتھ ڈنر کر رہی تھیں۔
''گھر......؟ تم نے ان کا گھر دیکھا ہے......مگر کب......؟'' سفینہ نے ہاتھ میں پکڑا فورک آہستگی سے پلیٹ میں رکھ دیا۔
''ارے......اس لڑکی سے ہر طرح کی امید رکھی جا سکتی ہے......یہ کبھی بھی کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتی ہے۔''
تاجور کا پیار بھرا خوشگوار لہجہ محسوس کر کے سفینہ کی حیرانی مزید بڑھ گئی۔
''یہ صرف گھر ہی دیکھ کر نہیں آئی، پرنس کی دادی سے اچھی سی دوستی بھی بنا کر آئی ہے۔'' تاجور نے سلاد کی پلیٹ اپنی طرف سرکاتے ہوئے سابقہ انداز میں کہا۔
''تم کیوں گئی تھیں؟'' سفینہ کو ایک بے نام سی پریشانی نے آ لیا۔
''کیوں، مجھے نہیں جانا چاہیے......؟ تمہارے اِن لاز میرے بھی کچھ لگتے ہیں۔'' زارا نے بظاہر بڑی اپنائیت سے کہا۔
''لیکن ابھی وہ grand mother in law نہیں ہیں۔'' سفینہ نے ٹوکا اور تاجور کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔
''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ویسے مجھے بھی نہیں پتا تھا کہ یہ اتنی اچھی ڈپلومیٹ (سفارت کار) ہے......بہت اچھا امپریشن چھوڑ کر آئی ہے۔''
''کہ......؟'' سفینہ نے اب الجھن بھری نظروں سے دونوں کو باری، باری دیکھا......تاجور کھانے کی میز پر سفینہ کو الجھن میں دیکھ کر فوراً حل کی طرف آئیں اور مختصراً سارا قصہ گوش گزار کر دیا۔
سفینہ نے سب کچھ جاننے کے بعد بڑی حیرت سے زارا کی طرف دیکھا......اس کے احساسات تاجور سے مختلف نہ تھے۔
''تم اتنی سمجھدار، ذمے دار کب سے ہو گئیں؟'' اب وہ بھی زارا سے مسکرا کر پوچھ رہی تھی۔
''میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں...... you can't imag ine'' زارا نے پلیٹ پر جھک کر

اپنی نظروں کا دوغلہ پن چھپانے کی کوشش کی۔
”یہ تو ہے...... کتنی فکر ہوئی بہن کی...... باتیں بنانے دوڑ گئی...... ذرا دیر نہ لگائی......“ تاجور نے پہلے پیار سے زارا کی طرف دیکھا پھر تائید حاصل کرنے کی نیت سے سفینہ پر نگاہ کی۔
”کچھ بہت اچھا سا کر کے تو نہیں آ گئیں جو آنے والی نسلوں کو بھی یاد رہے اور ہسٹری بن جائے......؟“ سفینہ اب ہلکی پھلکی ہو کر شوخی پر اتر آئی۔ اس کے اطمینان کے لیے یہی کافی تھا کہ ماں مطمئن تھیں۔
”اتنا اچھا کر کے آئی ہوں کہ تم بھی کیا یاد کرو گی۔“ زارا نے معنی خیز لہجے میں کہا اور کھانے میں جُت گئی۔
”بہت اچھی ہو...... بس تھوڑی سی بے وقوف ہو۔“ تاجور نے چھیڑا۔ پرنس اور لیڈی صوفیہ نے ان کی زندگی میں داخل ہو کر اچانک ہی موڈ اور ماحول بے حد خوشگوار بنا دیا تھا۔ سفینہ کے لیے اچھے گھرانے کے رشتے کے لیے سوچتے، سوچتے شاید وہ خاصی متفکر دکھائی دینے لگی تھیں۔ جو رشتہ آتا تھا بس لڑکے کا سنہری مستقبل سوچ کر ہی آتا تھا مگر اب...... آنے والا لڑکا خود کسی کے سنہری مستقبل کی ضمانت دکھائی دیتا تھا۔
زارا نے آنکھیں بھینگی کر کے سفینہ کی طرف دیکھا۔
”اماں اگر میں پاکستان کی وزیراعظم بن کر اس ملک کو ترقی یافتہ ملک بھی بنا دوں تو مجھے یقین ہے کہ آپ اپنا دیا ہوا ٹائٹل کبھی مجھ سے واپس نہیں لیں گی۔“ زارا کی بات پر تاجور کو بے ساختہ ہنسی آئی تھی۔ سفینہ بھی خوشگوار احساسات کے حصار میں قید مسکرا رہی تھی۔
”لیڈی صاحبہ ڈنر کے لیے کہہ رہی ہیں اور تمہارے پاس صرف دو دن ہیں۔“
”اماں میں بھی جاؤں گی ناں؟“ زارا پھر درمیان میں کود پڑی۔
”بھئی تمہیں لے جانا تو بہت ضروری ہو گیا ہے ورنہ لیڈی صاحبہ ہمیں کھانا نہیں دیں گی۔“
زارا نے خوشی کی کیفیت میں انگوٹھے سے done کا اشارہ دیا۔ پھر ہاتھ اونچا کر کے دو انگلیوں سے وکٹری کا نشان بنایا۔
”اماں جو کرنا ہے، آپ نے کرنا ہے...... میں تو آپ کے کہنے سے آ گئی ہوں۔“
”بس مجھے کچھ الجھن سی ہے کہ ہم نے اپنی طرف سے کوئی رسپانس نہیں کیا۔ وہاں جائیں گے تو شاید وہ ہم سے کسی جواب کی توقع بھی کریں گی۔ جس انداز میں انہوں نے پرپوز کیا اسی انداز میں شاید جواب بھی چاہتی ہوں گی۔ میں یہ چاہتی ہوں تم اچھی طرح سوچ لو۔“
”ہیں......؟ اب کیا سوچنا؟ ایسے پروپوزل پر بھی کیا کوئی سوچنے میں ٹائم ضائع کر سکتا ہے۔“ زارا سے رہا نہ گیا پھر بول پڑی۔
”اماں آپ سوچیں۔“ سفینہ نے زارا کی بات نظر انداز کر کے تاجور کو جواب دیا کیونکہ اب وہ پرنس کے خیال سے رنگ کشید کر رہی تھی، مسکرا رہی تھی۔ تاجور نے ایک عمیق نگاہ سفینہ کے چہرے پر کی۔
جب لڑکی شادی کی بات پر مطمئن اور خوش دکھائی دے تو ماں کو خود ہی سمجھ جانا چاہیے کہ اسے کوئی اعتراض نہیں...... بس پھر نکاح کے دن ”قبول ہے“ کہلوانے تک اس سے الفاظ میں کچھ کہنے کا اصرار نہیں کرنا چاہیے۔
انہوں نے اب قدرے پُرسکون ہو کر آنے والے دن کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔
زارا بھی بہت سکون سے کھانا کھا رہی تھی...... سب تدبیروں پر بھروسا کرنے والوں کی طرح اسے بھی اپنی ”ذہانت“ پر ناز تھا...... بظاہر کم عمر تھی مگر جتنی زمین کے اوپر تھی اتنی زمین کے اندر...... اور تمام شاطروں کی طرح اللہ نے اس کے چہرے پر بھی وہ کمال معصومیت بکھیری تھی جو اُن کا سب سے کارآمد ہتھیار ہوتی ہے۔

وہ اپنی will کی قوت سے آشنا تھی...... وہ اندھی ضد جسے وہ will سمجھتی تھی۔
سفینہ کے چہرے پر بہت خوب صورت رنگ بکھرے ہوئے تھے...... ماہین کے دلچسپ جملوں کی بازگشت اس کے ہمراہ تھی۔

☆☆☆

ساحل کو احساس تھا کہ آج تاجور کے درِ دولت پر حاضری ہے، وہ بہت اہتمام سے تیار ہوا تھا۔ اپنا وہ خاص سوٹ جو وہ کسی بہت اہم تقریب میں ہی پہنا کرتا تھا، آج زیب تن کیا تھا۔ اور وہ ٹائی لگائی تھی جو کسی حسینہ کے ریشمی بالوں کی طرح ہاتھ سے پھسل پھسل جاتی تھی۔ ڈارک براؤن کوٹ پینٹ، ریڈ اور براؤن پرنٹڈ ٹائی، جیب میں سرخ رومال کھلے پھول کی طرح اٹکا تھا...... اور آج تو اس نے خوشبوؤں کا طوفان برپا کر کے رکھ دیا تھا...... امپورٹڈ جیل سے غسل فرمایا...... باڈی اسپرے، پرفیوم، ہیئر کریم ہر طرح کی خوشبو اس کے وجود سے پھوٹ رہی تھی...... وہ بہت ہوشیار وزیرک تھا...... بخوبی جانتا تھا کہ خوشبو کا ایک نفسیاتی اور گہرا تاثر ہوتا ہے...... ملاقاتی بار، بار خوشبو میں الجھتا ہے...... زیرِ اثر آتا ہے...... نرم گوشہ پیدا ہوتا ہے۔ غصے کے امکانات زائل ہو جاتے ہیں...... بات پُراثر ہوتی ہے...... بعدِ رخصت بھی اثرات جلدی ختم نہیں ہو جاتے۔
شکل صورت کی رعایت تو اسے روزِ پیدائش سے مل رہی تھی...... اور اسی بنیاد پر وہ معاشرے کی پُراثر شخصیت بننے کے خواب دیکھا کرتا تھا...... بہت سے لوگ اسے نااہل نظر آتے تھے...... ہائی اسٹیٹس ڈیزرو ہی نہیں کرتے تھے۔ اب تو نیچے ایئر کنڈیشنڈ لگژری گاڑی بھی کھڑی تھی...... مزے سے سفر کرو، چمکتے ہوئے بیٹھو، دمکتے ہوئے اترو...... نہ بال پریشان، نہ دھول مٹی سے اٹ جانے کے اندیشے...... نہ دھواں چھوڑتی گاڑیوں کو گالیاں دینے کی ضرورت...... وہ جوس کا گلاس پی کر بغیر ناشتے کے روانہ ہوا...... کہ نظروں کے سامنے تاجور جیسے گھروں میں لدی پھندی ٹرالی متحرک تھی...... ٹی ٹرالی اتنی لدی ہوئی ہوتی ہے...... فوٹو کھینچنے کے لیے تو نہیں......
پھر ہر شے امپورٹڈ...... ہائی جینک، فریش...... وہ ایک سرمستی کی کیفیت میں ڈرائیو کر کے تاجور کے گھر پہنچا تھا...... سارے راستے ذہن کے پردے پر زارا رقصاں رہی۔
نواب کی اولادیں...... اتنی صبح صبح کب اُٹھتی ہیں...... وہ تو ابھی پلنگ توڑ رہی ہوگی۔
جب سے اس کی انا زخمی ہوئی تھی...... زارا اس کے لیے چیلنج بن چکی تھی۔ ساری دنیا بھاڑ میں جائے...... اپنا آپ اسی 50kg کی لڑکی سے منوانا ہے۔ یہ ضد اس کے لاشعور میں جڑیں پکڑتی جارہی تھی۔
نوکر نے بصد احترام اسے پُرشکوہ ڈرائنگ روم میں لا بٹھایا، یہ کہہ کر کہ بیگم صاحبہ دس منٹ میں آتی ہیں...... انتظار کیجیے۔
ساحل نے ایک نگاہِ غلط ڈرائنگ روم میں دوڑائی مگر متاثر ہونے کی کوئی رمق بھی نگاہ میں نہ تھی...... یوں...... گویا یہ سب کچھ اسی کا ہو...... ڈرائنگ روم اس کے وجود سے اُٹھتی خوشبوؤں سے معمور ہو چکا تھا۔
''اُف...... بڑی خوشبو ہے بھئی...... ایسا کیا ہوا ہے چمن خان، کیا ڈرائنگ روم میں کوئی گیسٹ ہے؟'' بلاشک وشبہ یہ آواز زارا ہی کی تھی...... ساحل چونک پڑا تھا۔ اس نے اپنی رسٹ واچ پر بے اختیار نظر دوڑائی تھی...... صبح کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے...... تاجور نے اسے یہی ٹائم دیا تھا۔
''یہ کیسے جاگ پڑی...... اوہ...... سنڈے تو کل ہے...... شاید آج کالج جارہی ہوگی......'' وہ یونہی سنبھل کر بیٹھا گویا وہ اس سے ملنے آرہی ہو۔
''آفس سے ساحل صاحب آئے ہیں بی بی۔'' چمن خان کی آواز آئی پھر خاموشی چھا گئی...... ساحل کا دل و

دماغ سماعت میں ڈھل گیا۔
وہ چوکنا تھا...... مبادا وہ آہی دھمکے...... وہ عاجزانہ نظریں جھکا کر نہیں بیٹھا بہت اعتماد سے داخلی دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔
body language پر فطری دست گاہ رکھتا تھا اور اپنی body language کو شعوری طور پر استعمال کرتا تھا۔
اس کی قوتِ ارتکاز کا کرشمہ تھا یا کچھ اور...... زارا واقعی اس کے سامنے تھی اور بہت مغرور انداز میں قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔
''ارے آپ وہی ہیں...... بیمار بائیک والے...... کیا حال ہیں اس بیچاری کے' ICU میں ایڈمٹ تو نہیں ہے۔'' اس کے رسیلے ابھرے ہوئے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ دوڑ رہی تھی...... اپنی دانست میں اس نے گیسٹ کو وقت دے کر بڑی اخلاقیات کا مظاہرہ کیا تھا۔
''جی...... میں وہی ہوں...... تھینک یو آپ نے میری پیشنٹ کی خیریت معلوم کی۔'' ساحل کوئی اس سے کم تو نہیں تھا...... اسی ٹون میں جواب دے مارا۔ زارا کھلکھلا کر ہنسی۔
''آج تو آپ ہمارے گھر کے کونے کونے میں گھس گئے ہیں...... کون سا پرفیوم انڈیل کر آئے ہیں......''
زارا نے اس کی طرف غور سے دیکھا...... کس قدر شاندار پرسنالٹی ہے اس کی...... بس بیچارہ غریب ہے۔
آج اس کے رویے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ گزشتہ تلخ لمحات اس کے حافظے سے محو ہو چکے ہیں...... مگر احساسِ برتری، غرور، بے نیازی ویسے کا ویسا ہی تھا...... اندازِ تخاطب وہی تھا...... تیز و تند...... غیر محتاط، بے رحم......
''بہت قیمتی ہے...... عام نہیں ملتا......''
''قیمتی......؟ you mean expensive تو پھر انسٹالمنٹ پر لیا ہوگا......'' پھر تکبرانہ کلمات نے آگ سلگانے کا اہتمام کیا اسی وقت تاجور کی آواز آئی۔
''زارا...... آپ یہاں کیا کر رہی ہو......؟''
زارا چونک کر پلٹی...... خفیف سا مسکرائی۔
''کچھ نہیں اماں...... مجھے نہیں پتا تھا کہ گیسٹ آئے ہوئے ہیں...... دیکھ لیا تو سوچا wish time کر لیتی ہوں......'' وہ تاجور کو راستہ دیتے ہوئے ساحل کی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔
تاجور کو ساحل کے سامنے بیٹی کو ٹوکنا اچھا نہیں لگا...... اس سے پہلے وہ کئی مرتبہ اسے ٹوک چکی تھیں کہ مسلمان سلام کرتے ہیں ''ٹائم وش'' نہیں کرتے۔
''بائے اماں...... میں کالج جا رہی ہوں...... آج صرف ایک کلاس ہے جلدی آجاؤں گی۔''
تاجور صوفے کی طرف بڑھ رہی تھیں...... باہر سے زارا کی آواز آرہی تھی۔ ساحل کی ساری محنت تو وہ اکارت کر گئی تھی۔
وہ ساری توانائی مجتمع کر کے خود کو میٹنگ کے لیے تیار کر رہا تھا۔

☆☆☆

پرنس دیدۂ دل فرشِ راہ کیے سفینہ کا منتظر تھا......
سفید جھاگ، جھاگ نفیس لان کا کرتا، تنگ پاجامہ چہرے پر تازہ شیو کی نیلاہٹیں آنکھوں کی الوہی چمک جو دیانتدار اور سچے لوگوں کا خاصہ ہوتی ہے۔

وہ کبھی اتنا بے قرار نہیں ہوا تھا۔
''سفینہ...... میں نے خود سے کچھ بھی نہیں کیا...... یہ سب اسی طرح ہوا...... جس طرح تخلیق کے بعد دریا نے بہنا شروع کر دیا...... تم ملیں...... جیسے سب ملتے ہیں...... کبھی اہتمام سے کبھی اتفاق سے...... مگر تم تو میری آنے والی زندگی کی تفصیل بن گئیں...... بڑے آرام سے...... میں نہیں جانتا یہ کیسے ہوا...... بس اتنا پتا ہے کہ یہاں وہاں...... اِدھر اُدھر دور تک تم نظر آ رہی ہو......'' وہ خود کو آئینے میں دیکھ کر مسکرایا۔ وہ حتمی جائزہ لے رہا تھا۔
''یہ قدرت کا ایک گہرا راز ہے...... کوئی، کسی کے لیے کچھ بھی نہیں ہوتا اور کبھی کے لیے سب کچھ ہوتا ہے...... میں...... اللہ سے کبھی ''کیوں'' کہنا پسند نہیں کرتا...... میری مجال نہیں...... اس لیے کہ میں ''نہیں'' تھا...... اب ہوں...... پہلے کیوں نہیں تھا؟ اب کیوں ہوں...... قدرت مجھے یہاں لاجواب کرتی ہے...... اور میں سر جھکا لیتا ہوں...... زمین و آسمان، کہکشائیں پیدا ہوئیں...... اور سفینہ بھی۔'' پرنس بڑی معصومیت سے مسکرا دیا۔

☆☆☆

زارا نے تو لیڈی صوفیہ سے ملنے کے بعد اندازہ لگا لیا تھا کہ اسے کس طرح تیار ہو کر ان کے سامنے جانا چاہیے۔ آج اس کی تیاری قابلِ دید تھی، سلک کی میرون گھیر دار، لانگ فراک جس پر اورنج ریشم کا کام بنا ہوا تھا۔ اورنج تنگ پاجامہ، اورنج چنا ہوا دوپٹا...... روبی جڑے نیکلس، چاند بالیاں...... اورنج و میرون کے امتزاج سے کلائیوں میں ڈھیروں چوڑیاں پہنیں۔
''کیا شادی میں جا رہی ہو؟'' سفینہ نے سامنے آتے ہی برجستہ پوچھا۔
وہ خود پیازی شلوار قمیص دوپٹے میں ملبوس تھی جس پر آتشی گلابی ریشم کی کڑھائی تھی...... ہونٹوں پر پیازی لپ اسٹک کی چمک، پلکوں پر مسکارا، کانوں میں آتشی گلابی نگینوں سے مرصع ٹاپس...... کھلے ہوئے سیدھے بال...... بس یہ اس کا اہتمام تھا۔
''ارے لیڈی صاحبہ تو مجھ سے زیادہ بن ٹھن کر بیٹھی ہوں گی...... یار مقابلہ تو کرنا چاہیے۔'' وہ ناقدانہ سفینہ کو دیکھ رہی تھی...... لاشعوری طور پر اپنا اور سفینہ کا تقابلی جائزہ لے رہی تھی۔
''تم کیوں مقابلے پر اتر آئی ہو؟ انہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا......'' سفینہ نے بے پروائی سے کہا اور ماں سے پتا کرنے آگے بڑھ گئی کہ اب روانگی میں کتنی دیر ہے؟
زارا نے اس کی پشت پر نظریں جما دیں۔
''سفینہ کے بال بہت خوب صورت ہیں...... آئندہ سے میں ہیئر کٹنگ نہیں کراؤں گی۔ میرا خیال ہے میرے بال لمبے ہو سکتے ہیں۔'' اس نے اپنے تراشیدہ بالوں پر غیر ارادی طور پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچا۔

☆☆☆

پرنس اور لیڈی صوفیہ نے مین گیٹ پر مہمانوں کا استقبال کیا تھا۔ پرنس کی نظریں سفینہ کا طواف کرنے کو...... بے چین تھیں مگر طبعی احتیاط غالب تھی۔ ابھی وہ مین گیٹ سے اندر کی طرف پلٹنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ گارڈ نے بڑی سرعت سے چلتے ہوئے پرنس کے قریب آ کر آہستہ آواز میں مطلع کیا کہ ایک بچہ ثوبان اس سے ملنا چاہتا ہے۔ اس نے مزید کہا کہ اس نے بچے کو ٹالنے کی کوشش کی مگر وہ ملنے کی ضد کر رہا ہے۔
پرنس آناً فاناً ماحول سے کٹ گیا۔
''ثوبان......؟'' رو رو کر دعائیں مانگنے والے بچے کی تصویر نگاہوں میں گھوم گئی۔

(جاری ہے)


English®
تیرا روپ
بہت خوب
English
UBTAN TURMERIC CREAM

بدصورت

اسما قادری

"اُف یہ لال جوڑا.....لگتا ہے کوئلے کی کان میں آگ لگ گئی ہو۔"

"پیلی میکسی اور رافعہ کے لیے..... بالکل ایسا لگے گا جیسے سرسوں کے کھیت میں بھینسا گھس آیا ہو......"

"یہ آسمانی ستاروں بھرا آنچل اور ایسی سیاہ رات، کیا کہنے ہیں ذوق کے۔"

یہ اور اس جیسے کئی تمسخرانہ طنزیہ جملے تھے جنہیں سنتے ہوئے میں جوان ہوئی تھی اور اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ...



بدصورت انسان، خصوصاً عورت کی زندگی میں کچھ نہیں ہوتا۔ میں رافعہ جمال جو پانچ بہن، بھائیوں میں تیسرے نمبر پر تھی شکل صورت کے معاملے میں بالکل اپنے ابا جمال احمد پر گئی تھی۔ میری اماں بہت خوب صورت خاتون تھیں اور صرف اس وجہ سے ابا سے بیاہی گئی تھیں کہ مرد کی شکل نہیں کمائی دیکھی جاتی ہے اور کمائی ابا کی بہت اچھی تھی۔ اسی لیے وہ ایک عدد خوب صورت بیوی کے اہل ٹھہرے تھے۔ خوب صورت بیوی کی بدولت انہیں خوب صورت بچوں کا تحفہ بھی ملا تھا۔ میرے بڑے دونوں بھائی اور اکلوتی بہن مدیحہ بالکل اماں کی طرح تھے، تیکھے نقوش اور گلابی رنگت والے...... سب سے چھوٹا ارمغان، اماں اور ابا کا مکسچر تھا چنانچہ خوب صورت تو نہیں لیکن قبول صورت لگتا تھا لیکن میں یعنی رافعہ جمال تو بالکل ابا کا پرتو تھی...... موٹے، موٹے نقوش سے لے کر گہری سانولی رنگت اور جسمانی بھدے پن تک سب کچھ ابا سے ورثے میں لیا تھا۔ مرد ہونے کی رعایت سے ابا تو پھر بھی کافی بہتر لگتے تھے لیکن میں...... مجھے تو ہر روز آئینہ منہ ہی چڑایا کرتا اور جو تھوڑی بہت کسر رہ جاتی اسے لوگوں کے طنز، تمسخر اور تاسف سے بھرے تبصرے پورا... کردیتے۔ یوں میری شخصیت میں ایک خلا سا رہ گیا تھا۔ میں اندر سے عدم اعتماد اور عدم تحفظ کا شکار تھی۔ عزیز، رشتے دار اور احباب سمیت راہ چلتے لوگوں تک کا یہ حال تھا کہ چھوٹی مدیحہ کو نثار ہوتی نظروں سے دیکھتے تھے اور بھینچ بھینچ کر پیار کرتے تھے اور میں...... میں تو جیسے کسی کو نظر تک نہیں آتی تھی اور اگر کبھی کسی کو نظر بھی آجاتی تھی تو یہ میرے لیے مزید تکلیف دہ ثابت ہوتا تھا جو زبان سے کچھ نہ کہہ پاتے ان کی نظروں کا ترحم، تحیر، تاسف یا تمسخر مجھ سے بہت کچھ کہہ دیتا تھا۔ غیر تو غیر میرے لیے ماں، باپ کا رویہ بھی باعثِ تکلیف تھا۔ ابا جن کا میں پرتو تھی بڑے عجیب سے انداز میں اماں سے کہتے تھے۔

''بھئی ساجدہ! یہ کیوں باقی بچوں سے الگ ہوگئی۔ اسے دیکھ، دیکھ کر تو مجھے ڈپریشن ہونے لگتا ہے۔'' جواب میں اماں ایک سرد آہ بھرتیں اور غم زدہ لہجے میں کہتیں۔

''پریشان تو میں بھی بہت رہتی ہوں اس کے لیے۔ آج کل تو اچھی، اچھی لڑکیوں کے ڈھنگ کے بر جڑنا مشکل ہوگیا ہے ایسے میں اس بیچاری کو کون پوچھے گا۔''

میں یہ سب سنتی، دیکھتی، سہتی اور اس فکر میں مبتلا ہوجاتی کہ کیسے لوگوں کے لیے خود کو قابلِ قبول بناؤں۔ ابتدائی جماعتوں میں، میں بالکل عام سی طالبہ تھی لیکن خود کو قابلِ توجہ بنانے کے لیے میں نے پڑھائی میں جان مارنا شروع کردی اور نتیجتاً نمایاں طالبات میں شمار ہونے لگی۔ میں زیادہ ذہین نہیں تھی اس لیے اس مقصد کے حصول کے لیے مجھے بہت محنت کرنا پڑتی تھی اور میں گھنٹوں کے حساب سے کتابوں میں سر کھپاتی رہتی تھی۔ اماں خوب صورت تھیں لیکن تعلیم واجبی سی تھی۔ مجھے کتابوں میں مگن دیکھتیں تو انہیں ہول اٹھنے لگتے کہ لڑکی شکل صورت کی پہلے ہی ماٹھی ہے کتابوں میں سر کھپا، کھپا کر بالکل ہی چہرے کی رونق ختم ہوئی جارہی ہے۔ ہوسکتا ہے اماں کی اس طرح کی باتیں مجھے ایک بار پھر تعلیمی میدان میں پیچھے لے جاتیں لیکن نمایاں طالبہ کی حیثیت سے مجھے اساتذہ اور ساتھیوں میں جو اہمیت ملنے لگی تھی اس نے میرے حوصلوں کو پست نہیں ہونے دیا اور میں اچھے نمبروں سے انٹر کرنے کے بعد ایک معیاری تعلیمی ادارے میں بی اے میں داخلہ لینے میں کامیاب ہوگئی۔ یہ میرا کو ایجوکیشن میں پڑھنے کا پہلا موقع تھا اور میں کچھ، کچھ گھبرائی ہوئی تھی۔ یوں بھی ہمارے خاندان میں لڑکیوں کے زیادہ تعلیم حاصل کرنے کا رواج نہیں تھا۔ یہ نہیں کہ کوئی پابندی تھی بس ماحول ہی کچھ ایسا تھا کہ لڑکیاں زیادہ تعلیم کا رجحان نہیں رکھتی تھیں اور ان کی زیادہ توجہ جلد از جلد شادی شدہ خواتین کی فہرست میں شامل ہونے پر مرکوز رہتی تھی...... میں ایسا کوئی شوق رکھتی تو بھی کوئی فائدہ نہیں تھا کہ کسی کی نظرِ انتخاب مجھ پر پڑنا کافی مشکل امر تھا۔ البتہ مجھ سے سال دو سال بڑی یا ہم عمر کزنز تیزی سے شادی شدہ یا منگنی شدہ کی فہرست میں شامل ہوتی جارہی تھیں اور اسی رفتار سے ابا کے ڈپریشن اور اماں کی آہوں میں بھی اضافہ ہوتا جارہا تھا۔

یہ میرے بی بی اے کی کلاسز شروع ہونے کا ابتدائی زمانہ تھا جب خاندان کی ایک تقریب میں، میں ہم عمر کزنز کے ٹولے کے بیچ پھنس گئی۔

''بھئی رافعہ......! پڑھائی تو ہوتی رہے گی تم کم از کم منگنی شنگنی ہی کر ڈالو'' سمعیہ نے یوں مجھ سے فرمائش کی جیسے میرے لیے رشتوں کی قطار لگی ہوئی ہو اور مجھے صرف اشارہ کرنے کی دیر ہو، میں کیا کہتی صرف مسکرا کر رہ گئی۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی چپ رہنے والی نہیں تھی اور سب اپنی، اپنی بولیاں بول رہی تھیں۔

''میں نے سنا ہے کہ ساجدہ ممانی خاندان کے رشتوں سے مایوس ہو کر اب رشتے والوں کے ذریعے تمہارا بر ڈھونڈنے کے چکر میں ہیں۔ کیا وہاں سے بھی کوئی کامیابی نہیں مل رہی۔'' پھپی زاد ناعمہ بولی تھی۔

اتنی اندر کی خبر اس کے علم میں ہونے پر مجھے دھچکا تو لگا لیکن خود کو بے نیاز اور پُراعتماد ظاہر کرنے کے لیے ایک بار پھر خاموش رہ کر مسکراتا رہنے کی پالیسی پر عمل پیرا رہی۔

''ارے چھوڑو بھی یہ رشتے والیوں کے چکر...... یہ رشتے کم کرواتی ہیں اور پیسے زیادہ کھاتی ہیں، میری مانو تو اپنے کو ایجوکیشن میں ہونے کا فائدہ اٹھاؤ اور وہیں کوئی ڈھنگ کا لڑکا دیکھ کر سیٹنگ کرلو۔'' میری چچا زاد فاکہہ نے ایک آنکھ دبا کر مشورہ دیا تھا تو میں دم بخود سی رہ گئی۔ ایسا تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ میں نے تو ابھی تک اپنے کسی کلاس فیلو لڑکے کی شکل بھی توجہ سے نہیں دیکھی تھی۔

''چھوڑو یار! اپنی رافعہ میں لڑکا وڑکا پھنسانے والے گُن کہاں ہیں، اس جیسی لڑکیوں کو تو لڑکے پہلی فرصت میں بہن بنا کر اپنی محبوباؤں تک حالِ دل پہنچانے کی ڈیوٹی سونپ دیتے ہیں۔'' صالحہ کے اس تبصرے پر ایک فلک شگاف قہقہہ پڑا اور میرے اندر دور تک سناٹا پھیل گیا۔ کسی کے واضح طور پر کہے بغیر بھی میں نے جان لیا تھا کہ میری شکل صورت کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس بار بھی میں خاموش تو رہی لیکن مسکرا نہ سکی۔

☆☆☆

یونیورسٹی میں، میں ایک لیے دیے رہنے والی لڑکی تھی جس کی چند کلاس فیلوز سے ہیلو ہائے سے زیادہ بات چیت نہیں تھی۔ میرا نام بھی شاید بہت کم لوگوں کو معلوم تھا لیکن پہلے سمسٹر کے بعد ہی صورتِ حال بدل گئی۔ میرے سیکنڈ ہائیسٹ مارکس تھے جبکہ پہلے نمبر پر حسن تھا۔ حسن شروع سے کلاس میں نمایاں رہا تھا اور سب کو اندازہ تھا کہ اس کا نتیجہ بہترین رہے گا لیکن مجھ جیسی خاموش اور سب سے الگ تھلگ رہنے والی لڑکی کے اتنے نمایاں نمبروں نے سب کو حیران کردیا۔ حیرانی ختم ہوئی تو وہ سب باری، باری مبارک باد دینے میرے پاس آنے لگے۔ میری طرف دوستی کے لیے ہاتھ بڑھانے لگے۔ ان میں لڑکے بھی شامل تھے۔ میں جو ان دنوں شدید محنت کے باعث کچھ اور بھی بے رونق سی ہوگئی تھی۔ اتنی پزیرائی پر گھبرانے لگی اور کسی کو بھی ایسا ردِعمل نہیں دے سکی جسے دوستانہ رویے پر محمول کیا جاتا۔ آہستہ، آہستہ سارے بڑھے ہوئے ہاتھ پیچھے ہٹنے لگے اور کلاس فیلوز نے تصور کرلیا کہ میں بس اپنی کتابوں میں مگن رہنے والی آدم بیزار سی لڑکی ہوں، جسے تعلقات بنانے سے کوئی دلچسپ نہیں ہے۔ لیکن شاہ ویز نام کا وہ لڑکا پیچھے نہیں ہٹا۔ اور آنے بہانے اس نے مجھ سے دوستی کرنے کی کوششیں جاری رکھیں اور آخر کار اس میں کامیاب بھی ہوگیا۔ میں نہ تو مغرور تھی اور نہ ہی آدم بیزار...... میں تو بس بے یقینی کا شکار تھی کہ لوگ مجھ سے بھی بھلا دوستی کے خواہاں ہوسکتے ہیں؟ شاویز نے مسلسل کوشش سے مجھے یہ یقین دلا دیا۔ وہ جتنی توجہ اور دلچسپی سے میری باتیں سنتا تھا کبھی کسی نے نہیں سنی تھیں۔ لے دے کے ایک سہیلی ناعمہ تھی جس سے میں کچھ دل کی کہہ سن لیتی تھی لیکن وہ بھی فرسٹ ائیر میں ہی بیاہ کر سسرال چلی گئی تھی اور اس کے ساتھ سسرال کے اتنے بکھیڑے تھے کہ کسی سے کچھ کہنے سننے کی اول تو فرصت ہی نہیں تھی اور جو بھی قسمت سے فرصت میسر آتی تھی تو وہ اس بات کی خواہاں ہوتی تھی کہ کوئی اس کی داستانِ غم سننے والا ہو، ایسے میں، میں بالکل تنہائی کا شکار ہوگئی تھی۔ شاہ ویز کی دوستی میرے لیے تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوئی۔ وہ میری شکل ہی سے بھانپ لیتا تھا کہ میں کب زیادہ اداس ہوں، اداسی کی

سب سے بڑی وجہ تو یہی تھی کہ میرا ابھی تک کہیں رشتہ نہیں ہوا تھا۔ اور ابا کا ڈپریشن اور اماں کی اداسی بڑھتی جارہی تھی۔ اماں کو اور کچھ سمجھ نہیں آتا تھا تو وہ میری پڑھائی کی ہی دشمن بن جاتی تھیں کیونکہ ان کے خیال میں۔ پڑھائی کے چکر میں، میں نے اپنی شکل زیادہ بد رونق بنائی تھی۔ اس میں کافی حد تک سچائی بھی تھی۔ بہت زیادہ ذہین نہ ہوتے ہوئے بھی اعلیٰ نمبرز کے حصول کے لیے مجھے سخت محنت کرنی پڑتی تھی جس کے لازمی اثرات میری شکل صورت پر بھی پڑتے تھے۔ میں روز بروز..... بے رونق اور بے کشش ہوئی جارہی تھی۔ لیکن میں نے اپنی روش اس لیے نہیں بدلی تھی کہ میری قابلیت ہی میرا واحد سرمایہ بن چکی تھی۔

اسی قابلیت کی وجہ سے مجھے شاہ ویز جیسا دوست ملا تھا جو میرے دکھ سنتا مجھے حوصلہ دیتا۔ اس کی حوصلہ افزا باتیں مجھے پہلے سے زیادہ محنت پر اکساتی تھیں۔ میرا ارادہ تھا کہ اس بار حسن کو بھی پیچھے چھوڑ دوں گی لیکن سیکنڈ سیمسٹر کا نتیجہ بھی پہلے والا ہی تھا۔ حسن ذہین اور محنتی دونوں ہی تھا اس لیے اپنی پوزیشن بچا گیا۔ شاہ ویز کی کوئی نمایاں پوزیشن نہیں تھی۔ لیکن نمبر ٹھیک آئے تھے۔ اس جیسے مزاج کے لڑکے کے لیے اتنا بھی بہت تھا۔ وہ ٹک کر پڑھتا ہی کہاں تھا؟ ہر ایک سے اس کی دوستی تھی اور ان دوستیوں کو نبھانے کے چکر میں بعض اوقات وہ کلاسز بھی اٹینڈ نہیں کرتا تھا۔ اس کے کئی اسائنمنٹ میں نے تیار کر کے دیے تھے اور نوٹس تو میں ہی اسے فراہم کرتی تھی۔ ہمارے مضامین رٹا لگانے سے زیادہ سمجھ کر پڑھنے والے تھے۔ شاویز کی مس ہو جانے والی کلاسز کا نقصان پورا کرنے کے لیے میں یہ کام بھی سرانجام دیتی تھی۔ وہ میرا بہت ممنون ہوتا تھا کہ میں اس کے لیے اتنا کچھ کرتی ہوں اور میں اسے ہمیشہ سے یہی کہتی تھی کہ وہ میرا دوست ہے اور دوست کا خیال تو رکھنا پڑتا ہے۔ وہ بھی میرا خیال رکھتا تھا، نوٹس فوٹو کاپی کروانا ہوں یا پھر لائبریری سے کتابیں ایشو کروانی ہوں تو ہر کام میں وہ میری مدد کر دیتا تھا۔ خیال اور مدد کے اس سلسلے میں کب ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا مجھے اندازہ ہی نہیں ہو سکا۔ وہ دوست سے دلدار بن گیا اور میری دھڑکنیں اس کے نام کا راگ الاپنے لگیں۔ وہ کہتا تھا۔ ”تمہارا دل بہت خوب صورت ہے رافعہ.....“ اور میں مان لیتی تھی کہ جس دل کا مکین اس جیسا خوب صورت شخص تھا اس کے خوب صورت ہونے میں بھلا کیسے شک کیا جا سکتا تھا۔

وہ کہتا تھا۔

”تم خوب صورت نہیں لیکن باوقار ہو اور چھچھوری لڑکیوں کی طرح الٹے سیدھے فیشن کرنے اور گپیں مارنے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنا فیوچر بنانے پر دھیان رکھتی ہو اس لیے میں تمہیں بہت پسند کرتا ہوں۔“ تو میں ہواؤں میں اڑنے لگتی، وہ کہتا۔ ”خوب صورت ہونا اتنا اہم نہیں لیکن باکردار ہونا اہم ہے اور مجھے خوشی ہے کہ تم ایک باکردار لڑکی ہو۔“ اور میں یوں کھل اٹھتی جیسے مجھے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ اس کی محبت نے مجھے اتنا مگن کر دیا تھا کہ مجھ سے چار سال چھوٹی مدیحہ کی منگنی میں سب مجھے ترحم بھری نظروں سے دیکھتے رہے اور مجھے کوئی فرق نہیں پڑا۔ میں اپنے دل کی دنیا میں خوش تھی اور کمال یہ تھا کہ میری اس تبدیلی کا میری تعلیم پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ میں مستقل اپنی پوزیشن برقرار رکھے ہوئے تھی اور اس میں بھی بڑا ہاتھ شاہ ویز کا تھا۔ وہ مجھے نصیحت کرتا رہتا تھا کہ مجھے خود کو تعلیمی میدان میں ہمیشہ نمایاں رکھنا ہے۔ وہ خود اتنی محنت سے نہیں پڑھتا تھا لیکن میری پڑھائی کی اسے بہت فکر رہتی تھی، یہ اس کی حوصلہ افزائی ہی تھی کہ آخر کار میں حسن کی ذہانت کو شکست دے کر پہلی پوزیشن حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ میری اس کامیابی کو شاہ ویز نے بھرپور طریقے سے سیلی بریٹ کیا۔ اس نے مجھے ایک خوب صورت ڈیزائنر سوٹ کے ساتھ نفیس جیولری اور میچنگ پرس گفٹ کیا اور ایک مہنگے ریستوران میں لنچ کی دعوت دینے کے ساتھ، ساتھ فرمائش کی کہ میں اس کے گفٹ کیے ہوئے سوٹ میں ہی دعوت میں شرکت کروں.....وہ میرون اور آف وہائٹ کنٹراسٹ کا ایمبرائڈرڈ سوٹ تھا جس میں میرون رنگ زیادہ نمایاں تھا۔ اپنی دبتی ہوئی رنگت کی وجہ سے میں گہرے

رنگ پہننے سے اجتناب کرتی تھی لیکن شاہ ویز کا گفٹ کیا ہوا سوٹ پہننے سے کیسے انکار کرسکتی تھی۔

دعوت سے ایک دن پہلے میں نے بطور خاص پارلر کا چکر لگا کر اپنے بے رونق چہرے کو تھوڑی سی رونق دینے کی کوشش کی اور میک اپ کے فن میں طاق مدیحہ سے دوپہر کی مناسبت سے تیار ہو کر دعوت میں شرکت کے لیے پہنچی...... گھر والوں کو میں نے یہی بتایا تھا کہ میری کامیابی کی خوشی میں کچھ دوستوں نے مجھے لنچ پر دعوت دی ہے۔ خوشحالی کے باوجود ہمارے ہاں ایسی آزاد خیالی کا تصور نہیں تھا کہ لڑکیوں کی لڑکوں سے دوستی کو قبول کرلیا جاتا۔ شاہ ویز نے لنچ پر دعوت بھی اسی لیے رکھی تھی کہ ڈنر میں شرکت کے لیے مجھے رات کو اکیلے گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں مل سکی تھی۔ میں وہاں پہنچی تو... شاہ ویز پہلے سے میرا منتظر تھا مجھے دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا اور پھر جیسے سکتہ زدہ سا ہو کر مجھے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کے اس انداز پر میں گھبرا سی گئی کہ جانے میرے کون سے سینگ نکل آئے ہیں جو وہ مجھے اس طرح دیکھ رہا ہے لیکن پھر اس کی زبان سے نکلنے والے جملے نے مجھے عرش پر پہنچا دیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”یو آر لکنگ ویری پریٹی رافعہ...... آئی ڈونٹ بلیو اٹ کہ یہ تم ہی ہو۔“ میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی میری تعریف کررہا تھا۔ میں ہواؤں میں اڑنے لگی۔ عورت چاہے جیسی بھی ہو سراہے جانے کی خواہش رکھتی ہے اور میں تو اس معاملے میں بالکل پیاسی تھی۔ مجھے کہاں کبھی کسی سے تعریف کے دو بول سننے کو ملے تھے اور آج تعریف کررہا تھا تو وہ شخص جسے میرا دل چپکے، چپکے چاہنے لگا تھا۔

”تم تو اچھی خاصی ہو یار بس اپنا خیال نہیں رکھتیں اس لیے لوگوں کو فضول ریمارکس دینے کا موقع مل جاتا ہے۔ دیکھو آج کیسی نکھری، نکھری سی لگ رہی ہو۔“ میرے بیٹھ جانے کے بعد بھی وہ مجھ سے اس طرح کی باتیں کرنے لگا۔ مجھے اس کی باتیں اچھی لگ رہی تھیں لیکن ایک بے یقینی سی تھی اس لیے مسکرا کر بولی۔

”اب زیادہ بنانے کی کوشش مت کرو...... میں بھی آئینہ دیکھ کر ہی گھر سے نکلی ہوں۔ مجھے تو اپنے اندر کوئی خاص بات محسوس نہیں ہوئی۔“

”وہ اس لیے کہ تم نے آئینے میں خود کو میری نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ تم میری نظروں سے خود کو دیکھتیں تو تمہیں دنیا میں خود سے پیاری لڑکی نظر ہی نہیں آتی۔ میں ظاہری نہیں باطنی حسن دیکھنے والوں میں سے ہوں اور تمہارا باطنی حسن تمہارے چہرے پر جھلکتا دیکھ سکتا ہوں۔ تم نے لوگوں کی باتوں میں آکر خود کو کچھ زیادہ ہی انڈر اسٹیمیٹ کرلیا ہے ورنہ ظاہر میں بھی تم ایسی گئی گزری نہیں ہو کم از کم مجھے تو تم میں کوئی خامی نظر نہیں آتی۔“ وہ جیسے مجھے یقین دلانے پر تلا ہوا تھا۔ میں نے بھی زیادہ مزاحمت نہیں کی کہ میں خود بھی خوش ہونا چاہتی تھی۔ ہم نے ہلکی پھلکی باتوں کے دوران بہت خوشگوار ماحول میں لنچ کیا۔ اس روز میرے خیال میں، میں روئے زمین پر سب سے زیادہ خوش نصیب لڑکی تھی اور اس وقت تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب شاہ ویز نے مجھے بتایا کہ وہ مجھے اپنی بہن سے ملوانا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ ہمارے درمیان اتنے مراسم ہوجائیں کہ ایک دوسرے کے گھروں میں آنے جانے کی راہ کھل جائے۔ میں نے ایک روز باتوں، باتوں میں اسے بتایا تھا کہ ہمارے ہاں پسند کی شادی کا رواج نہیں اور اس بات کو خاصی حد تک معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اس نے مجھے پروپوز نہیں کیا تھا لیکن بہن سے دوستی کروانے والی خواہش پر میرے کان کھڑے ہوگئے تھے اور میں نے خود ہی سمجھ لیا تھا کہ وہ کس مقصد کے لیے راہ ہموار کررہا ہے۔ اس روز میں گھر واپس لوٹی تو اکیلی نہیں تھی بہت سے خواب بھی میرے سنگ چلے آئے تھے۔

☆☆☆

”وہ آپ سے مخلص نہیں ہے رافعہ...... وہ صرف آپ کو استعمال کررہا ہے۔ میں عرصے سے اسے جانتا ہوں وہ کسی پیرا سائٹ کی طرح ہے جو خود محنت کیے بغیر دوسروں کی محنت پر پھلنے پھولنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں اسے کئی بار آپ کی طرح دوسروں کو بھی استعمال کر کے فائدہ اٹھاتے ہوئے دیکھ چکا ہوں لیکن کبھی دخل اندازی

نہیں کی۔ آپ کے معاملے میں، میں صرف اس لیے آپ کو ہوشیار کرنے آیا ہوں کہ مجھے لگتا ہے کہ وہ کوئی لمبی پلاننگ کر رہا ہے جس سے آپ کو صرف جذباتی دھچکا ہی نہیں لگے گا بلکہ آپ کی زندگی بھی خراب ہوجائے گی اور میں ایک قابل لڑکی کو ضائع ہوتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا اس لیے آپ سے یہ سب کہنے چلا آیا ہوں۔'' اس دن میں لائبریری میں بیٹھی کچھ نوٹس بنا رہی تھی کہ اچانک حسن وہاں آ گیا اور مجھ سے اس قسم کی گفتگو کرنے لگا۔

اس کی باتوں نے مجھے حیران کر دیا۔ میری اس سے اتنی دوستی کب تھی کہ وہ اتنے ذاتی معاملے میں مجھ سے بات کرتا اور وہ بھی ایسی بات جو میرے لیے قابلِ قبول ہی نہیں تھی۔ وہ میری زندگی میں آنے والے سب سے مخلص شخص سے مجھے بدگمان کرنے کی کوشش کر رہا تھا حالانکہ جو دھوکے باز ہوں ان کے رنگ ڈھنگ شاہ ویز جیسے نہیں ہوتے۔ وہ فلرٹ نہیں تھا کہ مجھ سے ڈائلاگز بول، بول کر مجھے بے وقوف بناتا رہتا...... وہ مجھے حاصل کرنے کے لیے عملی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی بہن شازیہ سے میری اچھی خاصی دوستی ہوگئی تھی۔ اور وہ میرے گھر آنے جانے لگی تھی۔ ایک بار بہت اصرار کر کے اس نے اماں اور مدیحہ کو بھی اپنے گھر دعوت دی تھی۔ وہ لوگ ایک عام سے علاقے کے چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے لیکن گھر آ کر اماں اور مدیحہ بھی ان لوگوں کے اخلاق اور مہمان نوازی کی تعریف کرتی رہی تھیں تو جو دھوکے باز ہوتے ہیں وہ یوں اپنے گھر تک کسی کو رسائی نہیں دیتے اور حسن مجھ سے کہہ رہا تھا کہ شاہ ویز دھوکے باز تھا۔ میں بھلا کیسے اس کی بات مان لیتی۔

''مجھے اندازہ ہے کہ آپ میری بات پر آسانی سے یقین نہیں کریں گی لیکن پھر بھی میں آپ کو اس کی حقیقت بتا رہا ہوں۔ پہلے ہم ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ اس نے میری کزن کو بھی بے وقوف بنایا تھا اور وہ اس قدر اس کی دیوانی ہوگئی تھی کہ اس کے نوٹس، جرنلز اور اسائنمنٹ کی تیاری کے علاوہ گھر سے پیسے اور چھوٹی موٹی جیولری تک چرا کر اسے پہنچانے لگی تھی۔ ہم جوائنٹ فیملی میں رہتے تھے، ایک دن شاہ ویز اور میری کزن چھپ کر ملتے ہوئے پکڑے گئے تو ہمارے گھرانے کی بڑی بے عزتی ہوئی اور ہمیں محلہ چھوڑنا پڑا۔ میری کزن کم عمری کی اس حماقت پر آج تک شرمندہ ہے کیونکہ اس وقت شاہ ویز نے اس کا بالکل بھی ساتھ نہیں دیا تھا اور الٹا اس بیچاری پر ہی الزام لگا دیا تھا کہ وہ زبردستی اس کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ میری کزن کی تو اس سے جان چھوٹ گئی لیکن میں آپ کو ہوشیار کرنا چاہتا ہوں۔''

''آپ کا بہت شکریہ حسن صاحب......! اب اگر آپ اجازت دیں تو میں یہ نوٹس مکمل کر لوں......'' میں نے پوری گفتگو میں پہلا جملہ ادا کیا جس نے حسن کو سمجھا دیا کہ میں اس کی کسی بات پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ وہ مایوسی سے وہاں سے ہٹ گیا لیکن میرے ذہن کو الجھا گیا۔ میری سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہ سب کہنے کیوں آیا تھا۔ میں یہ الجھن سلجھا نہیں پائی تھی کہ شاہ ویز چلا آیا۔

''یہ حسن تم سے کیا کہہ رہا تھا؟'' اس نے مجھ سے دریافت کیا۔

''کچھ نہیں بس ایسے ہی پڑھائی وغیرہ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔'' میں شاہ ویز کو ٹال گئی۔

''اس سے ذرا ہوشیار ہی رہنا...... تم نے اس سے فرسٹ پوزیشن چھین لی ہے۔ اس لیے وہ تم سے خار کھائے بیٹھا ہے اور کوئی بھی ترکیب لڑا کر تمہیں خود سے نیچا دکھانے کی کوشش کر سکتا ہے۔ بہت خود پسند انسان ہے کسی کو اپنے سے اوپر جاتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔'' شاہ ویز نے مجھے نصیحت کی تو یک دم ہی میری سمجھ میں آ گیا کہ حسن اچانک میرا ہمدرد بن کر کیوں آ گیا تھا۔ وہ اس طرح کی باتیں کر کے میرے ذہن کو ڈسٹرب کرنا چاہتا تھا تاکہ میں پورے ارتکاز سے اس کا مقابلہ نہ کر سکوں میں نے ٹھان لی کہ اب بھی حسن کو اپنے سے آگے نہیں نکلنے دوں گی۔ محنت میں پہلے بھی بہت کرتی تھی لیکن شاہ ویز کی محبت نے میرے لیے انرجی ٹانک کا کام کیا اور میں بہت زیادہ ذہین نہ ہونے کے باوجود صرف اور صرف محنت کے بل بوتے پر سب کو پیچھے چھوڑتی چلی گئی۔

اتنی نمایاں کامیابی کے بعد بہترین جاب کا حصول میرے لیے یوں بھی مشکل ثابت نہیں ہوا کہ ابا کے تعلقات تھے اور ان کے ایک دوست نے مجھے ایک بہت اچھی کمپنی میں ملازمت دلوادی تھی۔ ہمارے ہاں لڑکیوں کے ملازمت کرنے کا بھی کوئی رواج نہیں تھا لیکن ابا کے ان ہی دوست نے ابا کو سمجھایا تھا کہ اتنی قابل لڑکی کو گھر بٹھالینا اس کے ساتھ زیادتی تھی۔ یوں میں خاندان کی پہلی لڑکی تھی جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ، ساتھ ملازمت پیشہ بھی بن چکی تھی لیکن اماں کو ایک ہی غم کھائے جا رہا تھا کہ میری ساری ہم عمر کزنز کے ساتھ، ساتھ مجھ سے چھوٹی مدیحہ بھی بیاہتا ہو چکی ہے اور میں ہنوز کنواری ہوں۔ اپنی ملازمت میں قدم جماتے ہی میں نے اس مسئلے کے تدارک کے لیے بھی ہاتھ پیر مارنے شروع کردیے اور بالآخر شاہ ویز کو بھی ایک جگہ کھپانے میں کامیاب ہوگئی۔ وہ بہت زیادہ اچھے نمبروں سے پاس نہیں ہوا تھا اس لیے اس کی ملازمت کے لیے مجھے خاصے جتن کرنے پڑے تھے لیکن مجھے اطمینان تھا کہ میری یہ محنت رائگاں نہیں جائے گی اور شاہ ویز کی زندگی کی ساتھی بن کر میں اپنے حصے کی ساری خوشیاں پالوں گی۔ شاہ ویز کو اپنی چار عدد بہنیں نمٹانی تھیں، اس لیے اس کی ملازمت کے بعد فی الحال ہماری منگنی کردی گئی۔ اس منگنی پر میرے بعد سب سے زیادہ اماں خوش تھیں۔

گھر والوں کو اندازہ ہو چلا تھا کہ اس رشتے میں میری پسند شامل ہے اور شازیہ سے دوستی راہ ہموار کرنے کے لیے کی گئی تھی لیکن ...سب ہی بہت خاموشی سے اس حقیقت کو پی گئے۔ جس لڑکی کے رشتے کے لیے اتنی پریشانی ہو اس کا کہیں بر جڑ جائے تو اس بات کو ہی کافی سمجھا جاتا ہے اور رسم و رواج کے علاوہ دوسری باتیں بھی نظر انداز کرنی پڑتی ہیں۔ جیسا کہ میرے گھر والوں نے شاہ ویز کی کمزور مالی پوزیشن پر ذرا تشویش کا اظہار کرنے کے بعد اس دلیل سے نظر انداز کر دیا تھا کہ ابھی لڑکے کا کیریئر اسٹارٹ ہوا ہے آگے جا کر ترقی کرلے گا اور پھر رافعہ بھی تو اچھی ملازمت کرتی ہے، دونوں میاں، بیوی کی کمائی سے اچھا گزارہ ہو جائے گا۔ میرا اپنا بھی یہی

خیال تھا اور اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ مجھے شاہ ویز کے گھر میں اپنے گھر جیسی آسائشات میسر نہیں ہوں گی۔ میرے لیے شاہ ویز اور اس کی محبت کافی تھی۔ پھر شاہ ویز کے گھر والے بھی مجھ سے بہت محبت کرتے تھے اور مجھے ان کے گھر میں بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ ہمارے رواج کے برخلاف شاہ ویز کی امی نے میری اپنے گھر آمدورفت کی اجازت لے لی تھی۔ شروع میں، میں وہاں جانے سے جھجکتی تھی لیکن میری ہونے والی نندیں اور ساس اتنے اصرار سے بلاتیں کہ مجھے جانا ہی پڑتا اور پھر یہ جھجک بھی ٹوٹ گئی۔ میں جب بھی وہاں جاتی ڈھیروں چیزیں ساتھ لے جاتیں۔ شاہ ویز کی اماں پیار بھری خفگی کا اظہار کرتیں کہ میں اتنا تکلف کیوں کرتی ہوں لیکن میں نے بھی اپنی یہ روش نہیں بدلی کہ مجھے احساس تھا کہ وہ لوگ چھوٹی، چھوٹی چیزوں کے لیے ترستی ہیں اور شاہ ویز کے حوالے سے وہ سب مجھے عزیز تھے۔ یوں بھی میری اچھی خاصی بھاری بھرکم تنخواہ تھی جس کی میری گھر میں کسی کو ضرورت نہیں تھی۔ الٹا ابھی تک مجھے گھر سے ماہانہ پاکٹ منی ملتی تھی۔ ابا کو بھلے میری شکل دیکھ کر ڈپریشن ہوتا ہو انہوں نے میرے ساتھ ڈنڈی کبھی نہیں ماری تھی۔ مدیحہ کی طرح میرے نام بھی ایک اچھے علاقے میں پلاٹ موجود تھا اور اماں نے بتا رکھا تھا کہ وہ شادی سے پہلے خاموشی سے اس پلاٹ پر میرے لیے مکان بنوادیں گی تاکہ مجھے شاہ ویز کے معمولی سے گھر میں نہ رہنا پڑے۔ دوسرے لوگوں پر یہی ظاہر کیا جاتا کہ مکان میں نے اپنی تنخواہ سے بنوایا ہے۔ یہ احتیاط صرف اس لیے تھی کہ مدیحہ اور میری بھابیوں کو برا نہ لگے۔ اماں اپنی محبت سے مجبور ہو کر یہ سب کرنے کا ارادہ رکھتی تھیں ورنہ تو میں شاہ ویز کے معمولی سے مکان میں بھی بخوشی رہنے کو تیار تھی۔ شاہ ویز کے نام کی انگوٹھی انگلی میں پہننے کے بعد مجھے دنیا میں سب کچھ بہت اچھا لگنے لگا تھا۔

میری وہ کزنز جو مجھ سے بہت پہلے شادی شدہ اور بچوں والی ہونے پر نازاں رہتی تھیں اب مجھ پر رشک کرنے لگی تھیں کہ میں نے اپنے لیے ایک اعلیٰ مقام بھی حاصل کرلیا تھا اور میرا منگیتر بھی شاندار شخصیت کا مالک تھا۔ انہیں اب میرے لائف اسٹائل میں کشش محسوس ہوتی تھی اور پچھتاتی تھیں کہ انہیں بہت کم عمری میں ایسے جھمیلوں میں پھنسا دیا گیا جو اب ساری زندگی ہی چلنے تھے۔ ان کے خیال میں، میں اپنی زندگی سے بھرپور لطف اٹھا رہی تھی اور واقعی ایسا ہی تھا۔ رات سونے سے پہلے شاہ ویز سے ہونے والی ٹیلیفونک گفتگو، دن کے مختلف حصوں میں جاری رہنے والے ایس ایم ایس کے سلسلے اور کبھی، کبھی کہیں باہر لنچ پر ہونے والی ملاقاتوں نے میری زندگی کو بہت خوب صورت بنادیا تھا۔ میری منگنی کے چند ماہ بعد ہی شازیہ کی شادی ٹھہر گئی۔ اس موقع پر میں نے شازیہ کو اس کی پسند سے بہترین فرنیچر گفٹ کرنے کے علاوہ شاہ ویز کی بھی بھاری مالی معاونت کی کیونکہ وہ پریشان تھا کہ شادی کے اخراجات کیسے پورے ہوں گے اور میں اسے پریشان نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اماں نے بھی اپنی طرف سے شازیہ کو سونے کا سیٹ تحفے میں دیا اور یوں شازیہ بخوبی اپنے گھر کی ہوگئی۔ شادی کی تقریبات میں مجھے خصوصی اہمیت دی گئی اور ہر جگہ شازیہ نے مجھے بہنوں سے زیادہ اپنے ساتھ رکھا۔ ان دنوں میں اتنی خوش تھی کہ شاہ ویز کے خاندان والوں کے اوپر کیے جانے والے تبصرے بھی کانوں میں پڑ جاتے تو پروا نہیں کرتی تھی۔ میں شاہ ویز کے دل کی مالکہ تھی میرے لیے یہی کافی تھا۔ کہنے والے ہمارے جوڑ کو.... بے جوڑ کہتے تھے تو کہتے رہیں۔ جسے اچھا لگنا چاہیے تھا، میں اسے اچھی لگتی تھی۔ یہ کافی تھا۔

شازیہ کی شادی کے چھ مہینے بعد اس سے چھوٹی نازیہ کا رشتہ بھی طے پا گیا۔ اس موقع پر اماں ہٹرک گئیں کہ اپنی امانت بھی لے جاؤ۔ اول، اول تو شاہ ویز کی امی نے انہیں سمجھایا کہ وہ بیٹیوں کے بوجھ سے فارغ ہونے کے بعد ہی بہو گھر لے جانا چاہتی ہیں لیکن اماں نے دلائل کی بھرمار کردی اور اپنا اصرار جاری رکھا آخرکار انہوں نے اس بات پر غور کرنے کا وعدہ کرلیا۔ شاہ ویز نے میرے سامنے اماں کے اصرار پر احتجاج کیا تو میں نے اس سے اپنی مجبوری بیان کردی کہ میں اپنے طور

پراماں کو سمجھا چکی ہوں لیکن وہ اس معاملے میں میری کوئی بات سننے کو تیار نہیں ہیں۔ سچی بات تو یہ تھی کہ میں خود بھی شادی کی خواہش مند تھی اور سمجھتی تھی کہ شاہ ویز کے ساتھ رہ کر اس کے مسائل کے حل کے لیے زیادہ بہتر طور پر جدوجہد کر سکتی ہوں لیکن وہ اتنی ساری ذمے داریوں میں شادی کی ذمے داری کا اضافہ نہیں چاہتا تھا.....

بہرحال اماں کے بے حد اصرار پر ان لوگوں کی طرف سے ہامی بھر لی گئی اور طے پایا کہ نازیہ کے ساتھ ہی ہماری شادی کی تاریخ بھی رکھ دی جائے گی لیکن اس کی نوبت یوں نہیں آسکی کہ وہ وقت آنے سے دو ماہ پہلے ہی شاہ ویز کی ملازمت ختم ہوگئی۔ بِنا ملازمت کے وہ شادی کرنے کے لیے تیار نہیں تھا اور یہ ایک معقول بات تھی جس پر اماں کو بھی ہتھیار ڈالنے پڑے۔ نازیہ کی شادی البتہ طے شدہ وقت پر ہی نمٹادی گئی کہ اس کے بیرون ملک مقیم جیٹھ اس شادی میں شرکت کے لیے خاص طور پر پاکستان آئے تھے اور دوبارہ ان کی جلد آمد ممکن نہیں تھی۔

نازیہ کی شادی میں مجھے شازیہ کی شادی سے بھی زیادہ رقم خرچ کرنی پڑی کیونکہ شاہ ویز کی ملازمت نہ ہونے کی وجہ سے حالات پہلے سے بھی زیادہ گمبھیر ہو چکے تھے اور ان حالات کو سدھارنے کے چکر میں میرا اکاؤنٹ بالکل خالی ہوگیا تھا۔ مجھے اس کی اتنی فکر نہیں تھی لیکن شاہ ویز کی ملازمت کی طرف سے میں ضرور پریشان تھی اور اپنے رابطوں کو استعمال کر کے اس کی ملازمت کے لیے کوشش کر رہی تھی لیکن پتا نہیں کیا بات تھی کہ ابھی تک کامیابی نہیں مل پا رہی تھی۔ ایک آدھ دفعہ تو مجھے ایسی باتیں بھی پتا چلیں جن سے لگا کہ شاہ ویز خود جاب کرنے میں دلچسپی نہیں لے رہا اس لیے انٹرویو بھی ڈھنگ سے نہیں دیتا۔ میں نے اس سلسلے میں دبے لفظوں میں اس سے بات کی تو وہ بیزاری سے بولا کہ اسے یہاں چند ہزار کی نوکری کرنے اور گھٹ گھٹ کر جینے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے اور وہ بیرون ملک جانا چاہتا ہے تاکہ مجھے اور اپنی فیملی کو ایک اچھی زندگی دے سکے۔

اس کے بعد تو جیسے بیرون ملک جانا شاہ ویز کا جنون بن گیا۔ کسی ذریعے سے اس نے تو سارا انتظام بھی کر لیا لیکن بات رقم پر آ کر رک گئی۔ ملک سے باہر جانے اور وہاں سروائیو کرنے کے لیے اچھی خاصی رقم کی ضرورت تھی جو شاہ ویز کے پاس نہیں تھی اور میرا اکاؤنٹ بھی خالی پڑا ہوا تھا۔ ان دنوں شاہ ویز بہت زیادہ ڈپریشن کا شکار رہنے لگا تھا اور مجھ سے اس کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی تھی سو میں نے اس کی خاطر اپنے نام موجود پلاٹ بیچنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس پلاٹ پر وہ گھر بننا تھا جس میں، میں شاہ ویز کے ساتھ رہنے کے خواب دیکھا کرتی تھی لیکن میں نے اپنے خوابوں کی قربانی بھی دے ڈالی اور اماں، ابا سے بالا ہی بالا وہ پلاٹ بھی فروخت کر دیا۔ اماں اتنی پڑھی لکھی تو تھیں نہیں اور اس طرح کے... ڈاکومینٹس میں ہی سنبھالتی تھی اس لیے کسی کو کان و کان خبر نہیں ہو سکی۔ اماں نے احتیاطی تدبیر کے طور پر شاہ ویز کے جانے سے پہلے نکاح پر اصرار کیا اور اپنی یہ بات منوا کر چھوڑی یوں سادہ سی ایک تقریب میں ہم نکاح کے بندھن میں بندھ گئے۔ اور رخصتی شاہ ویز کی واپسی تک موخر کر دی گئی۔ مجھے شاہ ویز کے دور جانے کا دکھ تھا لیکن ساتھ ہی یہ خوشی بھی تھی کہ اب ہم پہلے سے بھی زیادہ مضبوط رشتے میں بندھ چکے ہیں اور اب ہمارے درمیان شرعی و قانونی رشتہ ہے۔ شاہ ویز بھی جانے سے پہلے مجھے ڈھیروں خواب دکھا کر گیا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ میرے لیے اتنا شاندار گھر بنوائے گا کہ میں دیکھتی رہ جاؤں گی۔ وہ گیا تو اس کے جہاز سے زیادہ بلند پرواز میرے خوابوں کی تھی اور ان خوابوں کے سنگ، سنگ میں بھی بلندی پر اڑی جا رہی تھی۔

☆☆☆

اور آج میں نفسیاتی اسپتال میں ہوں، انسان جتنی بلندی پر اڑتا ہے گرنے پر اسے اتنی ہی زوردار چوٹ لگتی ہے۔ مجھے بھی اتنی زور کی چوٹ لگی تھی کہ میں اپنا دماغی توازن برقرار نہیں رکھ پائی تھی۔ اپنے تو اپنے غیر بھی میری حالت پر روتے تھے۔ میرا ذہن قبول ہی نہیں کرتا تھا کہ میں شاہ ویز کی دلہن بن کر اس کے گھر نہیں جا سکی تھی اس لیے کسی بھی دن سرخ جوڑا پہن کر الٹی سیدھی تیاری کے ساتھ اس کے گھر جا دھمکتی تھی۔ اس کی امی

میری یہ حالت دیکھ کر کبھی زار و قطار روتی تھیں اور کبھی مجھے گالیاں دینے لگتی تھیں لیکن مجھے کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا اور میں شاہ ویز کی دلہن بنی ان کے گھر میں بیٹھی رہتی تھی۔ پھر اس کے گھر کا کوئی فرد میرے گھر فون کرتا تھا اور میرے گھر والے مجھے وہاں سے جا کر لے آتے تھے۔ آپ سوچتے ہوں گے میرے ساتھ کیا ہوا تھا تو جان لیں کہ شاہ ویز مر گیا تھا۔ وہ اپنی شاندار گاڑی میں تیز رفتاری سے کہیں جا رہا تھا کہ حادثے کا شکار ہو گیا اور پھر اس کی ڈیڈ باڈی ہی پاکستان آئی لیکن میں نے شاہ ویز کی موت کے صدمے سے تو اپنا ذہنی توازن نہیں کھویا تھا۔ اس کی موت پر تو میں نے شکر کا کلمہ ادا کیا تھا کہ میرے رب نے میری آن قائم رہنے کا ایک بندوبست کر دیا۔ حادثہ تو مجھ پر اس سے بہت پہلے اور دھیرے، دھیرے بیتا تھا۔ شاہ ویز کے کینیڈا جانے کے بعد ابتدائی چند ماہ تو معمول کے مطابق ہی گزرے تھے اور اس کے گھر والوں کا رویّہ بھی پہلے جیسا ہی تھا لیکن جوں، جوں گھر میں مال آنے لگا ان کے رویّوں میں بھی تبدیلی آنے لگی۔ پہلے گرم جوشی نے دم توڑا، رابطے کم ہونے لگے پھر سرد مہری چھانے لگی۔ شاہ ویز نے شروع ہی سے مجھ سے بہت کم رابطہ رکھا تھا۔ اس کے مطابق وہ وہاں سخت جدوجہد کر رہا تھا اس لیے اس کے پاس وقت کی قلت ہوتی تھی اسکائپ پر اس کی شکل دیکھ کر مجھے بھی اس کی بات کا یقین آ جاتا تھا، تھکا ہوا بے خوابی کا شکار اور کمزور ہوتا شاہ ویز مجھے بہت دکھی کرتا تھا لیکن پھر بھی اس کی حالت میں تبدیلی آنے لگی۔ وہ ایک بار پھر نکھرنے لگا اور جوں، جوں وہ نکھرتا گیا رابطے اتنے ہی کم ہوتے چلے گئے۔ بہانہ اب بھی مصروفیت ہی کا تھا۔

تین سال...... پورے تین سال میں اندر ہی اندر گھلتی رہی اور اپنے ساتھ، ساتھ اپنے گھر والوں کو بھی بہلاتی رہی کہ ایک دن شاہ ویز لوٹ کر آ جائے گا لیکن وہ تو جیسے پنجرے سے اڑا پرندہ تھا جو کبھی لوٹتا ہی نہیں۔ اس کے گھر والوں کے رویّے کی تبدیلی کو بھی محسوس کیا جاتا تھا لیکن ہماری طرف سے کوئی سخت ردِّعمل دینا اس لیے ممکن نہیں تھا کہ نکاح کی وجہ سے سب مجبور تھے۔ اماں کبھی، کبھی پچھتاتی بھی تھیں کہ انہوں نے ناحق نکاح کی ضد کی۔ منگنی ہوتی تو توڑ کر کہیں اور میرا رشتہ کرنے کی کوشش کی جا سکتی تھی لیکن میں ایسا کچھ نہیں چاہتی تھی۔ شاہ ویز میری زندگی میں آنے والا پہلا اور آخری مرد تھا اسی لیے، اس کا اپنی زندگی سے نکل جانا مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ اس روز بھی میں ڈھیٹ بن کر شاہ ویز کے گھر پہنچی ہوئی تھی۔ شازیہ بھی میکے آئی ہوئی تھی اور شاید اسی سبب میرا وہاں ذرا ڈھنگ سے استقبال ہوا اور چائے کے ساتھ چند لوازمات بھی پیش کیے گئے۔ ان سب چیزوں سے فارغ ہونے کے بعد شازیہ مجھے اپنے اسمارٹ فون پر کچھ تصویریں دکھانے لگی۔ ان تصویروں میں ایک کینیڈین عورت اور اس کی چند ماہ کی ایک بچی کی تصویریں... نمایاں تھیں پھر ایک تصویر میں وہ دونوں مجھے شاہ ویز کے ساتھ نظر آئیں۔ تصویر خود بہت کچھ کہہ رہی تھی پھر بھی میں نے مبہم سی امید کے سہارے شاید سے عورت اور بچی کے سلسلے میں استفسار کیا...... شازیہ نے کہا۔

''یہ شاہ ویز بھائی کی بیوی اور بیٹی ہے، ڈیڑھ سال پہلے انہوں نے وہاں شادی کر لی تھی۔ ان کی بیوی کی وجہ سے انہیں بھی کینیڈا کی شہریت مل گئی ہے اور وہ پاکستان واپس آنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ تمہارے سلسلے میں انہوں نے کیا فیصلہ کیا ہے اس کا تم ان ہی سے معلوم کر لینا۔ میں یا دیگر گھر والے اس رشتے کے سلسلے میں ذمے دار نہیں ہیں، ہم نے یہ رشتہ تمہاری اور بھائی کی مرضی کی وجہ سے جوڑا تھا اور آگے بھی تم دونوں نے ہی فیصلہ کرنا ہے۔''

اس نے بہت آسانی سے اپنا دامن چھڑا لیا تھا اور اب کہہ رہی تھی کہ فیصلہ تم دونوں نے کرنا ہے حالانکہ یہاں میری تو کوئی گنجائش ہی نظر نہیں آ رہی تھی اور شاہ ویز ... خود ہی فیصلہ کر چکا تھا۔ میں خاموشی سے وہاں سے لوٹ آئی اور شازیہ سے یہ بھی نہیں کہا کہ جس رشتے کا فائدہ اٹھا کر تم لوگوں نے مجھ سے لاکھوں کے تحائف بٹورے ہیں آج خود کو اس سے قطعی بری الذمہ کیسے قرار دے سکتی ہو۔ ان لوگوں کی آنکھوں کی سرد مہری اور.... بیگانگی میں عرصے سے پڑھ رہی تھی، میں شکوہ کرتی بھی تو

کیا حاصل ہوتا جن کی آنکھوں کا پانی مر جائے اور جو ڈھٹائی اختیار کرلیں ان کے لیے ایسے شکوؤں کی کہانی کی کہاں اہمیت ہوتی ہے ہاں شاہ ویز سے میں ضرور بہت کچھ کہنا چاہتی تھی اس لیے گھر آکر میں نے اس سے رابطہ کیا اور بہت دنوں بعد ایسا ہوا کہ اس نے میری کال فوراً ریسیو کرلی۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ بولا۔

”سوری رافعہ...... مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے اس وقت دھوکے باز اور جانے کیا کچھ سمجھ رہی ہوگی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے تمہیں کوئی دھوکا نہیں دیا۔ میں سچ مچ تمہیں اپنانے کا ارادہ رکھتا تھا، تم سے محبت کی وجہ سے نہیں تمہاری خوبیوں کی وجہ سے۔ تم ایک خوش حال گھر کی باصلاحیت لڑکی تھیں، اس لیے میں نے تمہاری معمولی شکل صورت کو نظر انداز کر کے تمہارے ذریعے ایک خوش حال زندگی گزارنے کا سوچا تھا، یہ دھوکا نہیں تھا بس ایک سودا تھا۔ تمہیں زندگی کا ساتھی مل جاتا اور مجھے زندگی کو انجوائے کرنے کے لیے تھوڑی سی آسائشات لیکن جب میں کینیڈا آیا اور یہاں میری جینی سے ملاقات ہوئی تو مجھے احساس ہوا کہ میں نے اپنی بہت کم قیمت لگائی۔ کمائی کرنے والی بیوی، ایک ڈیڑھ کروڑ کا جہیز اور تمہارے باپ کے مرنے کے بعد ان کی جائداد میں سے ملنے والا حصہ...... یہ سب تو اس کے مقابلے میں کچھ نہیں تھا جو مجھے یہاں جینی کے ساتھ مل رہا تھا۔ اس لیے میں نے جینی سے شادی کرلی اور اپنے اندر تمہیں یہ اطلاع دینے کی ہمت پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ میں تمہیں ساری زندگی لٹکا کر نہیں رکھ سکتا رافعہ...... تمہارے بھلے کے لیے تمہیں طلاق دے رہا ہوں۔ چند دنوں میں تمہیں طلاق کے کاغذات اور حق مہر کا چیک مل جائے گا۔“ اس نے زبانی مجھے تین بار طلاق دی اور رابطہ منقطع کردیا۔ میں جو جانے کیا کچھ کہنے کا سوچے بیٹھی تھی، مجھے ایک لفظ بھی بولنے کا موقع نہیں ملا۔ یہ ایسا حادثہ تھا کہ اس پر میں رو بھی نہیں سکی تھی اور ساکت سی اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی تھی۔ یہ سکتہ اسی رات اس وقت ٹوٹا جب اماں نے میرے کمرے میں آکر مجھے اطلاع دی کہ شاہ ویز کے گھر سے اطلاع آئی ہے کہ شاہ ویز کینیڈا میں ایک روڈ ایکسیڈنٹ کا شکار ہو کر جان سے چلا گیا ہے۔ اماں نے یقیناً یہ سوچ کر مجھے اطلاع دی ہوگی کہ اس خبر کو سن کر میں رونا پیٹنا شروع کردوں گی اور انہیں مجھے سنبھالنا مشکل ہوجائے گا لیکن ان کی توقعات کے بالکل برعکس میں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور پھر لگاتی ہی چلی گئی۔ مجھے اس بات پر ہنسی آرہی تھی کہ شاہ ویز جو چند گھنٹے قبل جینی کی دولت پر عیش کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا اب زندگی کی دولت سے بھی محروم ہوگیا تھا۔ میرے قہقہوں سے اماں نے سمجھا کہ میرا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے اور وہ سچ مچ بگڑ گیا تھا لیکن اس وقت میں خود نہیں سمجھ پائی تھی۔

میں نے شاہ ویز کو بہت شدت سے چاہا تھا اور اس کی.... بے وفائی نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ دیوانگی کے عالم میں، میں کبھی خود کو دلہن کی طرح سجا کر اس کے گھر جا پہنچتی اور کبھی اسے کوسنے لگتی کہ وہ کیوں مجھے چھوڑ کر چلا گیا اس کی ماں، بہنوں کو بھی اس کے مرنے کے بعد اس بات کا احساس ہوگیا تھا کہ میرے ساتھ زیادتی ہوئی ہے اس لیے وہ میری حالت پر رو پڑتی تھیں لیکن کبھی، کبھی اس کی امی کو لگتا تھا کہ میں نے شاہ ویز کو بددعا دی تھی اس لیے وہ اپنی جان سے چلا گیا تب وہ مجھے گالیاں اور کوسنے دیتی تھیں۔ شاہ ویز کی کینیڈا میں شادی اور مجھ سے تعلق توڑنے کی بات وہ لوگ بھی زبان پر نہیں لائی تھیں کہ اس میں ان کے اپنے بیٹے ہی کی بدنامی تھی۔ اِدھر میرے بڑھتے ہوئے دوروں اور بھابیوں کے خراب موڈ کو دیکھ کر اماں اور ابا نے مجبوراً مجھے نفسیاتی اسپتال میں داخل کرادیا تھا۔ یہاں میرا علاج کرنے کی بھرپور کوشش کی جارہی ہے جس کے نتیجے میں، میں کافی وقت کے لیے ہوش و حواس کی دنیا میں واپس بھی آجاتی ہوں لیکن یہ عرصہ میرے لیے بہت اذیت ناک ہوتا ہے۔ میں ٹھیک نہیں ہونا چاہتی، میں دیوانی ہی رہنا چاہتی ہوں کیونکہ ٹھیک ہو کر مجھے دوبارہ اس بدصورت دنیا میں جانا پڑے گا جہاں ایک بدصورت لڑکی کی کوئی گنجائش نہیں اور اب میری زخم، زخم روح میں اتنی ہمت نہیں کہ میں اس پر طنز، تحقیر، تمسخر حتیٰ کہ ترحم کا بھی کوئی تیر سہہ سکوں۔

ناولٹ

میری دھوپ کی تم ہی چھاؤں

سحرش فاطمہ

دوسرا اور آخری حصہ



معظمہ، راحم کے پیار کے اظہار سے سرشار ہوتی تھی، اسے اپنے اوپر رشک آتا تھا کہ کوئی اسے یوں بھی چاہ سکتا ہے، کوئی اس کے لیے دوسروں سے لڑے، کوئی اس کا مذاق اڑائے یہ تک گوارا نہ تھا راحم کو...... ایسے میں راحم جب بھی اس سے پیار کا اظہار مانگتا تو وہ شرما جاتی، راحم کو معظمہ کی یہ ادا بہت بھاتی تھی۔

لیکن اب راحم کے آگے میشل نے ایک سوال چھوڑ دیا تھا جسے وہ اب ہر وقت سوچنے لگا...... اس کا بھی



دل کرتا تھا کہ کبھی تو معظمہ اظہار کرے خود سے۔ پر وہ اس کی فطرت سے واقف تھا اس لیے خود کو تسلی دیتا تھا کہ جو بھی ہے معظمہ بھی اسے چاہتی ہے ورنہ وہ گھر والوں کو اس کے بارے میں نہ بتاتی۔

اگلے دن حسبِ معمول وہ سب اسپتال پہنچے تھے۔

''معظمہ ذرا میرے ساتھ باہر تو آنا۔''

راحم نے معظمہ سے کہا جو انیلا کے ساتھ ایک کیس ڈسکس کر رہی تھی۔

''جی۔'' اثبات میں سر ہلاتی وہ انیلا کو چھوڑ کر راحم کے پاس چلی گئی۔

''اگر میں تمہیں چھوڑ دوں کسی بھی وجہ سے تو تم کیا کرو گی؟'' راحم نے بے حد سنجیدگی سے اسے دیکھا اور پوچھا۔

''کیوں ارادہ ہے کیا ایسا؟'' معظمہ نے مسکرا کر پوچھا۔

''پتا نہیں... لیکن حالات ایسے لگ تو رہے ہیں۔'' راحم نے زیرِ لب مسکرا کر کہا۔

''اوہ اچھا، حالات ایسے لگ رہے ہیں۔ یہ کہیں اس وجہ سے تو نہیں کہ میں آپ کے ساتھ نائٹ ڈیوٹی نہیں کر رہی؟''

''ہائے۔'' راحم نے وہیں اپنے دل کی جانب ہاتھ رکھا اور گہری سانس لی۔

''انسان بنیں راحم۔'' معظمہ جھینپ گئی۔

''تو کیا میں جانور میں منتقل ہو گیا ہوں؟'' راحم ایک دم سیدھا ہوا اور اس کے نزدیک ہو کر پوچھا۔

''اچھا مجھے جانا ہے کام ہے۔'' معظمہ بوکھلائی۔

''تم ایک بار میرے ہاتھ لگ جاؤ معظمہ۔ تمہارا صحیح والا علاج کروں گا۔''

''اچھا، تو یہ نہ بھولیں کہ ساتھ میں، میں بھی ڈاکٹر پھر مجھ سے کون بچائے گا آپ کو؟'' معظمہ نے بھی راحم کی نقل اتاری۔

''فی الحال تو آپ لوگ راہ چلتے اپنی محبت کا اظہار نہ کریں، یہ اسپتال ہے آپ لوگوں کے ملنے جلنے کی جگہ نہیں۔ جائیں جا کر اپنے اپنے وارڈز میں کام کریں فوراً۔'' یہ ڈاکٹر عباس تھے۔ جنہیں سب ڈاکٹر ہٹلر کے نام سے جانتے تھے۔

''جی، جی ڈاکٹر... سوری۔'' راحم نے سر جھکا کر کہا اور معظمہ کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔

''اُف اب یہ ہر جگہ ہمیں ستاتے رہیں گے۔'' معظمہ نے جھرجھری لی۔

''تو کیا ہوا، بھئی ہم منگیتر ہیں اب یہاں تھوڑا کام کے ساتھ، ساتھ وقت گزاری کر لیتے ہیں تو حرج ہی کیا ہے۔''

''راحم، سدھر جائیں آپ۔''

''اچھا مجھے سدھرنے کا کہہ رہی ہو۔ کبھی اپنی کزن کو سدھارنے کا سوچا ہے؟'' راحم نے بھویں سکیڑ کر معظمہ کو دیکھا۔

''وہ کہاں سے آ گئی؟'' معظمہ نے ناسمجھی سے پوچھا۔

''چھوڑو۔ وہ شاید پاگل ہے۔ دماغ خراب کر دیا ہے روز میسجز اور کالز کر، کر کے۔'' راحم نے ہاتھ باندھ کر اسے دیکھا۔

''اوہ اچھا۔ خیر..... وارڈ میں چلتے ہیں۔''

☆☆☆

''میشل۔'' نعیمہ دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے کمرے میں آئیں تو چونک گئیں۔

''جی امی۔'' کچھ دیر کے بعد اس نے سلام پھیرا اور جانماز لپیٹ کر رکھی اور ماں سے مخاطب ہوئی۔

''یہ تم نماز کب سے پڑھنے لگ گئیں؟'' نعیمہ کی حیرت بجا تھی۔

''بس ایسے ہی شروع کر دی۔'' میشل نے مسکرا کر جواب دیا۔

''جیتی رہو میری جان، میرا بچہ...... شکر ہے تم نے نمازیں تو شروع کیں۔'' نعیمہ اس پہ واری جا رہی تھیں۔

''اچھا کوئی کام تھا کیا؟'' میشل نے آنے کی وجہ پوچھی۔

''ہاں، وہ علینہ کے ہاں ڈنر ہے، ہم سب کو بلایا ہے اور علینہ نے خاص کہا ہے کہ میشل کو بھی آنا

ہے۔''نعیمہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا
''امی......میرا موڈ نہیں......آپ لوگ جائیں......
بس۔''میشل بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔
''میشو...... یہ کیا بات ہوئی؟ علینہ آتی ہے تو تم اس کے ساتھ بیٹھتی تک نہیں ہو......اسے بھی برا لگتا ہوگا ناں۔''وہ اس کے پاس آ ئیں۔
''اچھا اب وہ میری شکایتیں بھی کرنے لگ گئی ہے؟ ابھی بہو بن کر گھر آئی بھی نہیں اور شروع ہوگئی۔''میشل نے ابرو اچکا کر غصے سے کہا۔
''وہ کیا شکایت کرے گی؟ میری آنکھیں نہیں؟ میں دیکھتی نہیں کیا؟ تم جو مرضی آئے کرو۔''نعیمہ نے کہا اور چلی گئیں۔
''بس ان کے آگے معظمہ اور علینہ ہی بھولی ہیں باقی میں تو......''وہ دونوں کو برا بھلا کہنے لگی۔
گھر والے علینہ کے ہاں گئے ہوئے تھے اور میشل گھر پہ ہی تھی......علینہ نے یہ بات آذر سے کہی لیکن آذر کہاں میشل کے لیے برا سوچتا......

☆☆☆

''جانتے ہو راحم میں اب ہر وقت اللہ سے دعا مانگتی ہوں کہ تم میرے ہو جاؤ۔''میشل نے راحم کو فون کیا تھا۔
''میشل......کیوں کر رہی ہو یہ سب تم؟''
''کیونکہ میں واقعی تمہیں چاہنے لگی ہوں اور تمہیں پانے کے لیے میں اب ہر وقت دعائیں کرتی ہوں۔''
راحم کے سوال پہ میشل نے گلوگیر آواز میں کہا۔
''دیکھو......میشل۔''ابھی راحم کہہ ہی رہا تھا کہ میشل نے رونا شروع کر دیا۔
''تم پاگل ہو میشل۔''راحم جو اچھے لہجے میں بات کر رہا تھا ایک دم غصہ کر گیا اور اور فون ہی سوئچڈ آف کر دیا۔
''راحم......میں کچھ بھی کر جاؤں گی پر تمہیں معظمہ کا ہونے نہیں دوں گی۔''میشل ہنسی اور کچھ چیزیں نکالیں جو رمشا نے دی تھیں اسے ماچس سے ہلکا سا جلایا اور اس کے دھویں میں کچھ پڑھنا شروع کر دیا۔
گھر والے دعوت سے آچکے تھے۔نعیمہ اس کے کمرے کی طرف گئیں تو کمرا لاکڈ پا کر واپس اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

☆☆☆

ہفتے کا روز تھا میشل سو رہی تھی، گھر میں اس کی خالہ اور کزنز آئے ہوئے تھے صبح سے ہی رونق تھی اب دوپہر ہو چلی تھی پر میشل اٹھی نہیں تو نیلم نے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔
''کیا مصیبت ہے بھئی......سونے دو۔''میشل نے کروٹ لیتے ہوئے چلا کر کہا۔
''ارے ہم آئے ہوئے ہیں اور تم سوتی ہی رہو گی۔ اٹھو گی نہیں تو دروازہ توڑ ڈالوں گی۔'' نیلم دروازہ پیٹتی ہی رہی بادلِ ناخواستہ میشل کو اٹھنا ہی پڑا۔میشل نائٹ سوٹ میں جمائیاں لیتی دروازے تک آئی۔
''حد ہے یار ویک اینڈ کا مطلب یہ نہیں کہ بس سوتی ہی رہو۔''
''یہیں کھڑے کھڑے لیکچر دو گی؟ اندر آ جاؤ میں فریش ہونے جاتی ہوں۔''میشل نے اسے اندر بلایا اور خود واش روم میں گھس گئی۔
''میشو......اسپتال کیسا چل رہا ہے؟''بیڈ پہ بیٹھتے ہی اس نے اونچی آواز میں پوچھا۔
''اچھا چل رہا ہے۔''میشل برش کرتے ہوئے موٹی آواز میں بولی۔
''آرام سے فریش ہو جاؤ، میں تمہارے ہی کمرے میں ہوں۔''نیلم نے اس کے موبائل کو اٹھایا اور دیکھنے لگی۔
''حد ہے موبائل بھی لاکڈ۔''بیزاری سے موبائل واپس رکھ دیا۔
میشل باہر آ گئی تھی۔
''اوئے ہوئے حسینہ ماہ جبینہ۔''نیلم نے سیٹی بجائی۔

''کیا بات ہے آج میری تعریف؟ مان لو میں معظمہ سے خوب صورت ہوں، ہے ناں۔'' میشل اپنے بال بنانے لگی۔

''اُف...... خدا کی بندی بنو...... معظمہ کو کیوں بیچ میں لے آتی ہو؟'' نیلم کو برا لگا۔

''اچھا دفع کرو...... بتاؤ کیا پلان ہے آج کا؟'' میشل اب لپ بام لگا رہی تھی۔

''باہر چلتے ہیں کچھ کھانے پینے یا موی دیکھتے ہیں۔'' نیلم نے آئیڈیا دیا۔

''یہ صحیح ہے۔ سچی اسپتال کے چکر میں آؤٹنگ بھی نہیں کر پاتی۔'' میشل اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''تو ٹھیک ہے پھر میں علینہ بھابی کو بھی کہہ دیتی ہوں اور معظمہ، منال کو بھی۔'' نیلم اپنے موبائل پر کچھ کرنا شروع ہو گئی۔

''تو راحم کو بھی کہہ دو...... وہ بھی تو اب ہماری فیملی کا حصہ ہونے جا رہا ہے۔'' میشل نے اپنے مطلب کی بات کی اور نیلم نے تائید کی اور سب کو کال کرنے لگی۔

راحم آنا نہیں چاہتا تھا میشل کی وجہ سے لیکن نیلم نے اصرار کیا اور معظمہ کے نام سے بلوایا جبکہ معظمہ کو اس کے آنے کا پتا ہی نہیں تھا۔

موی کے ٹکٹ کے سیٹ نمبر کے حساب سے راحم اور میشل ساتھ تھے راحم نے ٹکٹ بدلنے کا کہا لیکن معظمہ نے منال کے ساتھ بیٹھنے کا فیصلہ کیا۔

''کتنا اچھا لگ رہا ہے ناں...... ہم ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں۔'' میشل نے ہلکی آواز میں اس کے کان میں کہا۔

''موی دیکھو، باتیں نہ کرو۔'' راحم نے چڑ کر کہا۔

''مجھے تو تم سے باتیں کرنی ہیں۔ تمہیں بلوایا بھی اسی لیے تھا کہ تمہیں دیکھ سکوں، تمہارے ساتھ وقت گزارنے کا دیکھو خود بخود یہ موقع مل گیا...... بہت اچھا لگ رہا ہے مجھے۔'' سنیما میں اندھیرا تھا میشل نے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ دیا...... راحم نے چھڑایا۔

''تمہاری منگیتر کو تو فکر ہی نہیں ورنہ وہ اس وقت تمہارے ساتھ بیٹھی ہوتی...... یہ میری محبت ہے تبھی ہم ساتھ ہیں۔''

''خدا کے لیے چپ ہو جاؤ!'' راحم کی آواز ہلکی لیکن سختی لیے ہوئے تھی۔

انٹرول کے دوران سب باہر آ چکے تھے......

''معظمہ تم میشل کے ساتھ بیٹھ جانا یا منال کو بٹھا دینا۔'' راحم نے معظمہ سے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں بیٹھ جاؤں گی۔'' اس نے کہا تو راحم کو چڑ سی ہونے لگی۔

''کیسی منگیتر ہے واقعی میری، میرے ساتھ تو بیٹھنا اسے پسند ہی نہیں۔'' راحم میشل کی بات یاد کر کے معظمہ پہ ہی اندر ہی اندر غصہ ہونے لگا۔ سر جھٹک کر وہ پاپ کارن لے کر منال کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''آذر یہ راحم اور معظمہ ساتھ، ساتھ کب ہوتے ہیں؟ ہمارے سامنے تو نہیں ہوتے بلکہ ابھی تک تو وہ میشل کے ساتھ تھا اور اب منال کے ساتھ...... کیا بات ہے؟'' علینہ نے فقرہ پھینکا جس پہ آذر نے چپ کر کے موی دیکھنے کو کہا۔

رات کا کھانا کھا کر واپسی پر نیلم نے میشل کے پاس رکنے کی بات کی جس پہ میشل خوش ہو گئی...... نیلم ناول پڑھنے کی بہت شوقین تھی۔ وہ ساتھ لے کر بھی آئی تھی۔ دونوں میشل کے کمرے میں تھیں، میشل موبائل پہ اور نیلم ناول پڑھنے میں مصروف تھی۔

''اُف خدایا۔'' نیلم نے بیزاری سے کہا تو میشل چونکی۔

''کیا ہو گیا؟''

''تنگ آ گئی ہوں یہ دوسرا ناول ہے اس میں بھی وہی میری پسند کی شاعری۔''

''کون سی؟'' میشل نے کچھ سوچ کے پوچھا۔

''وہی یار...... رات یوں دل میں تیری کھوئی ہوئی......''

''تو کیا ہوا خوش ہو جاؤ تمہاری پسند ہے۔'' میشل نے ہنستے ہوئے کہا۔

''نہیں یار ایسا لگتا ہے جیسے ان رائٹرز کے پاس

اور کوئی کلیکشن نہیں...... ہنہ!"
"پاگل ہی ہو قسم سے۔" میشل نے نیلم کو گھور کے کہا۔
"ویسے ایک بات ہے۔" نیلم نے توجہ پوری میشل کی طرف کی۔
"وہ کیا؟"
"یہ تو وہی بات ہوئی ناں کہ جیسے کوئی اپنی پسند کا گانا یا کوئی میوزک ٹون کو الارم میں سیٹ کردے اور کچھ ہی دن میں بیزار ہو جائے حتیٰ کہ کہیں آ بھی رہا ہو تو بدل دے گا کہ سن، سن کہ کان ہی پک جاتے ہیں۔" میشل نے جس انداز سے بات کی نیلم کی ہنسی نکل گئی نیلم اسے قہقہے لگاتے دیکھ رہی تھی۔
"بس، بس بہت ہوا اب یا تو ناول...... پڑھو یا سونے کی کرو!"
"ہاں یار سو جاتے ہیں پر تم اپنے موبائل سے کھیلنا تو بند کرو۔"
"ہاں کچھ دیر رکو۔" اور میشل پھر موبائل میں لگ گئی۔
"یار کیا کروں؟ نیلم ہے کمرے میں کیسے کام کروں۔" میشل نے رمشا کو میسج بھیجا۔
"جب تمہیں پتا ہے کہ آج کے آج یہ کام کرنا تھا تو کیوں روکا اسے؟" غصے والے انداز میں رمشا نے میسج بھیجا۔
"اچھا وہ سو جائے پھر کچھ کرتی ہوں۔" میشل نے میسج بھیج کر موبائل سائڈ پہ رکھ دیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ اس کی آنکھ لگ گئی، صبح اٹھی تو موبائل چیک کرنے پر اس نے میسجز پڑھے اور سر پر زور سے ہاتھ مارا۔
"اُف...... میں کیسے بھول گئی تھی یار!"
"ارے تم جاگ گئیں...... تمہارا ہی انتظار تھا، مجھے کوئی ڈریس دے دو اپنا پہننے کو۔" نیلم ناشتا کر کے کمرے میں آئی تھی۔
"نکال لوناں خود ہی مجھ سے کیا پوچھنا؟ میرے کپڑے پورے آئیں گے بھی تمہیں؟"
"اب میں اتنی بھی موٹی نہیں ہوں۔" میشل کی بات پہ نیلم نے جواب دیا اور الماری کھول دی۔
کچھ کپڑے ٹنگے ہوئے تھے اور کچھ تہ ہوئے رکھے تھے، نیلم نے تہ شدہ کپڑوں میں سے ایک اٹھایا تو اس کے نیچے سے کچھ دھاگے اور کاغذ سے ملے۔ اس نے فوراً میشل کو آواز دی۔
"یہ سب کیا ہے یار؟" نیلم نے حیرانی سے پوچھا اور میشل نے اس کے ہاتھ سے وہ سب جھپٹ لیا۔
"تم کپڑے لو اور جا کر بدلو میری جاسوسی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" میشل نے گھور کر کہا وہ جانے لگی پر اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔
میشل نے اس دن پورا وقت نیلم سے کوئی بات نہیں کی۔ شام میں جاتے ہوئے نیلم نے میشل کو کمرے میں بلایا۔
"تم ان چیزوں میں کب سے آگئی ہو جانتی ہو یہ سب غلط ہے اور تم تو اب نمازیں بھی پڑھنا شروع کر چکی ہو اس پہ بھی تم ایسی چیزوں میں ملوث ہو حیرت ہے۔" ہاتھ باندھے اس نے میشل سے کہا۔
"میری لائف ہے میں جو چاہے کروں، تمہیں کوئی ضرورت نہیں کچھ کہنے کی۔"
"ٹھیک ہے پھر میں کسی سے کہوں گی تو تم بھی مجھے کچھ مت کہنا کہ کیوں کہا۔" اس کی بات پہ نیلم نے کہا اور باہر چلی گئی۔
"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میشل گھبرائی۔
"میں تمہیں تنبیہہ کر رہی ہوں میشل۔ اگر تم نے یہ سب نہیں چھوڑا تو میں واقعی گھر والوں کو بتا دوں گی۔" نیلم نے دھمکایا۔
"جو چاہے کرلو، میں نہیں ڈرتی کسی سے۔" میشل نے مٹھیاں بھینچیں اور دوبدو جواب دیا۔
"ٹھیک ہے، اب تم بھی اس پل کا انتظار کرنا۔" نیلم یہ کہہ کر باہر آگئی۔
"اُف میرے خدا...... اگر نیلم نے واقعی سب کو بتا دیا تو کیا ہوگا؟" میشل کو ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔
نیلم نے سب کو بتا دیا تھا۔ حتیٰ کہ آذر کو معلوم ہوا

کہ میشل ان تعویذات میں گھر چکی ہے اس نے کمرے کی تلاشی لی اور اس طرح کی چیزیں برآمد ہونے پر آذر نے اسے زوردار تھپڑ رسید کیا۔

''آذر یہ کیا کر رہے ہو؟'' ماں نے آکر روکا۔

''اس کی حماقتیں ایسی ہیں کہ تھپڑ بھی کم ہے، کس کے کہنے پہ یہ سب کر رہی ہو اور کیوں؟ جواب دو۔'' آذر شدید غصے میں تھا۔

''تم جواب دے کیوں نہیں رہی ہو؟'' آذر نے اسے جھنجوڑا تو نعیمہ نے آکر روکا۔

''آرام سے...... کیا اس کی جان لے لو گے؟''

''بس اب تو یہی رہ گیا ہے، میشل سے یہ امید نہیں تھی کہ ان خرافات میں ملوث ہو سکتی ہے، امی یہ سب کہاں سے آیا، کس نے اس کے دماغ میں ڈالا یہ جاننا ضروری ہے۔'' آذر نے اس کا موبائل جو بیڈ پر رکھا ہوا تھا وہ لے لیا۔

''بھائی وہ......''

''مجھے ایک لفظ بھی نہیں سننا، تمہارے منہ سے بھائی لفظ کتنا گندا لگ رہا ہے۔ جب تک مجھے ساری بات نہیں بتاؤ گی میں تمہیں گھر سے کیا اس کمرے سے باہر بھی قدم رکھنے نہیں دوں گا۔''

''بھائی...... میں کچھ نہیں بتا سکتی۔''

''ٹھیک ہے تو یہیں رہو تم۔ ایک قدم بھی باہر نکالا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''

''آذر یہ کیا کہہ رہے ہو۔ یہ ڈاکٹر بن رہی ہے ایسے کیسے گھر میں بیٹھی رہے گی؟ لوگ کیا سوچیں گے؟'' نعیمہ نے فکرمندی سے کہا۔

''لوگ کیا سوچیں گے؟ آپ کو اندازہ بھی ہے نیلم نے یہ بات سب کو بتا دی ہے۔'' آذر کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ میشل کا گلا ہی گھونٹ دے اسے حقارت سے دیکھا۔

''نیلم کو میں عقلمند سمجھتی تھی لیکن بجائے ہم بڑوں کو بتانے کے اس نے بھی جا کر بچوں کو بتا دیا۔'' نعیمہ نے تاسف سے سر ہلایا۔

''امی؟ آپ فی الحال یہ سوچیں کہ آپ کی کلوتی اور لاڈلی بیٹی کا اب علاج کیا کرنا ہے؟''

''میں سمجھاؤں گی میشل کو۔ تم اب جاؤ اپنے کمرے میں۔'' آذر کو جانے کا کہہ کر وہ اس کے پاس آکر بیٹھیں۔

''یہ سب کیا ہے میشو؟ تم تو میری پیاری سی بیٹی ہو، اب تو نمازیں بھی شروع کر دیں پھر یہ سب؟''

''امی میں کچھ نہیں بتا سکتی فی الحال۔'' میشل نے اکڑتے ہوئے جواب دیا۔

''مجھے تو لگا تھا تمہیں شرمندگی ہوگی یا شاید میرے سامنے صحیح بات کہو گی تمہارے انداز دیکھ کر مجھے اب افسوس ہو رہا ہے بیٹھی رہو گھر پر اب۔''

☆☆☆

''ہیلو معظمہ!'' رمشا نے کاریڈور سے گزرتے ہوئے معظمہ کو آواز دی۔

''اوہ رمشا، کیسی ہو؟''

''ہاں میں ٹھیک ہوں، یہ میشل کہاں ہے؟ آج دکھ نہیں رہی۔'' رمشا نے نظریں گھما کر پوچھا۔

''اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، صبح ہی چاچی امی نے بتایا تھا۔'' معظمہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

''اچھا، شاید اسی لیے فون بھی بند کیا ہوا ہے۔ چلو خیر۔ میں ملنے آؤں گی گھر۔''

''ہاں ضرور۔''

رات میں آذر، ماں باپ کے ساتھ بیٹھا کھانا کھا رہا تھا اور میشل کمرے میں تھی۔

''میشل کو کھانا دیا آپ نے؟''

''ہاں دے دیا تھا۔'' نعیمہ نے بتایا۔

''ٹھیک ہے۔''

''آذر بیٹے، میرے خیال سے ہمیں اس کے ساتھ اس طرح نہیں کرنا چاہیے۔''

''پاپا تو آپ بتائیں کیا کریں؟ اس کی یہ حرکت ناقابلِ برداشت ہے۔ وہ اِس طرف آ بھی کیسے سکتی ہے؟''

''ہو سکتا ہے کسی نے اسے بہکا دیا ہو آذر۔''

شیراز صاحب نے کہا تو آذر سوچ میں پڑ گیا۔
''خیر جو بھی ہو۔ ہمیں اس سے دوبارہ تحمل سے بات کرنی چاہیے۔''
''ٹھیک ہے، میں بات کروں گا جا کر۔'' آذر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔
''آذر ذرا سوچ سمجھ کر بات کرنا اس سے۔'' نعیمہ نے کہا۔
''کیا مطلب؟'' آذر نے بھویں سکیڑیں۔
''میرا مطلب ہے ایسا نہ ہو کہ وہ بات کرتے ہوئے کچھ ایسا کہہ جائے اور تمہیں غصہ آجائے۔''
''کوشش کروں گا امی۔'' آذر یہ کہہ کر اٹھا اور میشل کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔
''میشل؟''
''ج......جی بھائی۔'' وہ جو کسی کتاب کا مطالعہ کر رہی تھی۔ آذر کو دیکھ کر سیدھی ہو کر بیٹھی۔
''دیکھو، میں یہاں زیادہ بات کرنے نہیں آیا ہوں۔ بس یہ بتادو کس کے کہنے پر اور کیوں کر رہی تھیں یہ سب؟''
''بھائی! میں اِس کا جواب نہیں دے سکتی۔'' میشل نے نظریں چرائیں۔
''جانتی ہو تمہارا موبائل میرے پاس ہے؟ میں چاہوں تو تمہارے میسج پڑھ سکتا ہوں یہ جاننے کے لیے کہ شاید کہیں کسی میسج میں کوئی بات چھپی ہو۔'' آذر نے اسے گھورا۔
''پلیز بھائی، میری یہ پہلی اور آخری غلطی تھی، میں آئندہ ایسا کچھ نہیں کروں گی۔'' میشل نے رونا شروع کر دیا۔ ''مجھے پتا ہی نہیں چلا اور بس کسی کے کہنے پر میں یہ سب کرنا شروع ہو گئی۔''
''کیوں، تمہاری عقل نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا کہ کسی کے بھی کہنے میں تم آ گئیں؟'' آذر کی بات پر وہ نادم سی کھڑی رہی لیکن دل میں نیلم کو برا بھلا کہتی رہی۔
''دیکھو تم اچھی لڑکی ہو اور ڈاکٹر بننے جا رہی ہو اس پر بھی ان فضولیات میں......؟ مجھے تو اب بھی یقین

یادِ بارش

جب بھی گرتی ہے تیری یاد کی بارش دل پر
وہاں کا ہر نقش، ہر اک لفظ مٹا دیتی ہے
جیسے آوارہ و منہ زور لہر
گھر کا ہر نقش مٹا دیتی ہے
اور جب یاد کی یہی بارش
رک بھی جاتی ہے، ٹوٹ جاتی ہے
پھر سے تختی پر ابھرتا کوئی نقش
یاد کے سیلِ رواں میں بہہ کر
منہ چڑاتا سا نظر آتا ہے
روح کو گھاؤ لگا جاتا ہے

کاوش: شبانہ نواز، لیہ

کون پھل دار

مثبت رویوں کا حامل شخص ایسا درخت ہوتا ہے جو ہر موسم میں سرسبز و شاداب اور پھل دار رہتا ہے موسم کی سختیاں اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتیں۔

از: فصیحہ آصف خان، ملتان

سنہری کرنیں

☆ بچہ دنیا میں صرف ایک ہنر لے کر آتا ہے اور وہ ہنر ہے رونا۔
اس کے علاوہ اسے اور کچھ نہیں آتا اور وہ اس ایک ہنر سے اپنی ماں سے سب کام کروالیتا ہے۔ اس لیے اپنے رب کے سامنے رونا سیکھو اور اپنے رب کو منالو بے شک تمہارا رب ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والا ہے۔ (قول امام جعفر صادقؓ)
☆ تقویٰ یہ نہیں کہ آپ نیک عمل کتنے کرتے ہیں
بلکہ
تقویٰ تو یہ ہے کہ آپ برے اعمال سے کتنا بچتے ہیں۔

مراسلہ: زرمین کمال، کوٹ اڈو

نہیں ہو رہا۔ خیر تم اب نارمل ہو جاؤ، اسپتال جانا شروع کر دو اور اب مجھے اس حوالے سے پھر کوئی بات پتا چلی تو تمہاری خیر نہیں ہو گی۔'' آذر کا اب بھی انداز روکھا سا ہی تھا لیکن میشل اب ریلیکس ہو گئی تھی۔

☆☆☆

''اوہو...... زہے نصیب یہ آج کون آیا ہے اسپتال اتنے دن بعد۔'' رمشا نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''زیادہ دن تو نہیں البتہ تم نے تو پوچھنے کی توفیق بھی نہیں کی ہو گی۔ نہ گھر پر فون کیا نہ ملنے آئیں؟'' میشل نے ملتے ہی شکوہ کیا۔

''میں نے معظمہ سے پوچھا تھا پتا چلا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔ ملنے بھی آنا تھا لیکن بس......'' رمشا نے مسکرا کر جواب دیا۔

''شکر کرو یار آگئی ورنہ اس نیلم کی بچی نے سب گڑبڑ کر دی تھی۔'' میشل نے ہلکی آواز میں قدرے اداسی سے کہا۔

''کیا مطلب؟ تمہاری کزن نیلم؟ کیا کر دیا اس نے؟''

''یہ پوچھو کیا نہیں کیا؟'' میشل نے اب غصے سے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟'' رمشا اسے لے کر کیفے ٹیریا آگئی تھی۔ پھر اس نے پوری بات بتا دی۔

رمشا سے باتوں کے دوران ہی میشل نے راحم کا فون ملا لیا۔

''راحم مجھے ابھی، ابھی تم سے ملنا ہے بس۔'' میشل نے تڑپ کر کہا۔

''میں ابھی ڈیوٹی پہ ہوں آدھے گھنٹے بعد ملوں گا۔''

''اچھا کہاں ڈیوٹی ہے، میں بھی وہیں آجاتی ہوں۔'' میشل کی آواز میں بے قراری تھی جسے راحم نے محسوس کیا۔

''ارے ریلیکس چندا...... کہا ناں میں بتا دوں گا۔'' راحم نے کہا اور فون کاٹ دیا۔

''کس کا فون تھا؟'' قریب کھڑی معظمہ نے پوچھا۔

''ہاں...... وہ کزن کا تھا یہیں کہیں آیا ہوا ہے تو ملنے کا کہہ رہا تھا۔'' راحم نے صفائی سے جھوٹ بولا۔

''اور اسے چندا بھی کہا واہ یہ کون سا کزن ہے ملوانا مجھے بھی۔'' معظمہ کی بات پہ راحم کو کھانسی لگ گئی۔

''بس کر دو یار...... اب مجھ پہ بھی شک کرو گی؟'' کھانستے ہوئے ہنسا۔

''اچھا ذرا میڈم مجھے دیکھ کر آج مسکرا کر کچھ کہو گی؟'' راحم کا موڈ کچھ اور ہو گیا تھا اور معظمہ منہ پھلائے دوسرے طرف کیے ہوئے تھی۔

''کوئی نہیں...... جس کے پاس جا رہے ہو اسی سے کہلوانا۔'' منہ موڑے ہی جواب دیا۔

''او لڑکی ایسا کچھ نہیں ہے، تم ایک دفعہ تو کہہ دو...... جب سے منگنی ہوئی ہے ایک دفعہ بھی نہیں کہا۔'' راحم نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''مجھے نہیں کہنا...... آپ جائیں جس سے ملنے جانا تھا۔'' معظمہ اٹھ کر جانے لگی۔

راحم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''میرا ہاتھ چھوڑیں راحم...... سب دیکھ رہے ہیں، اچھا نہیں لگتا۔''

''کیوں، اس میں کیا برائی ہے سب کو پتا ہے ہمارا۔''

''مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔''

''ٹھیک ہے جاؤ اب بات نہ کرنا مجھ سے۔'' راحم نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا اور غصے سے وہاں سے چلا گیا معظمہ نے روکا بھی نہیں۔

راحم کے دل میں معظمہ کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا تھا اور اس بات پر کہ معظمہ اظہار بھی نہ کرے راحم اسے چھوڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن میشل کی وجہ سے اس کے دل میں یہ بات آگئی تھی کہ جب وہ پاگلوں کی طرح اظہار کر سکتی ہے اور راحم بھی معظمہ سے کر سکتا ہے تو معظمہ کیوں نہیں کر سکتی۔

وہ اسی غصے میں تھا اور میشل سے ملنے جا رہا تھا۔

''اوہ راحم...... کتنے دنوں بعد دیکھا ہے تمہیں...... سچ بہت مس کیا تمہیں......'' میشل نے والہانہ انداز میں اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''ہاں......تم اتنے دنوں سے آ کیوں نہیں رہی تھیں؟'' راحم کو اس دفعہ اس کا ہاتھ پکڑنا برا نہیں لگا۔

''وہ......بس طبیعت ٹھیک نہیں تھی، تم نے تو پوچھا بھی نہیں، ایک دفعہ بھی میرا۔'' میشل کی ادائیں اسے بھانے لگیں۔

''اچھا بابا معاف کردو پلیز......آئندہ نہیں ہوگا۔'' راحم نے ایک ہاتھ سے اپنا کان پکڑا اور میشل مسکرادی۔

''یہ کس کا فون بار، بار آرہا ہے جو کاٹ رہے ہو؟'' راحم مسلسل آنے والی کال کو کاٹ رہا تھا۔

''نہیں بس وہ ایسے ہی کوئی دوست ہے، یہ لو میں نے فون ہی بند کردیا......بس خوش۔'' راحم نے فون سوئچڈ آف کردیا تھا دوسری طرف معظمہ بار، بار فون کررہی تھی کہ شاید اب اٹھالے۔

''مجھے آج احساس ہو رہا ہے کہ تم واقعی مجھ سے پیار کرتی ہو۔'' راحم نے جیسے ہی کہا میشل حیرانی سے اسے دیکھنے لگی اسے یقین ہی نہیں آیا کہ راحم ایسا بھی کہہ سکتا ہے۔

''راحم۔'' میشل کا دھیمی آواز میں راحم کا نام لینا اسے اچھا لگا۔

''سچ کہہ رہا ہوں یار......تم اتنی بری بھی نہیں ہو۔'' راحم کی باتوں سے میشل کا شرما جانا اسے لطف اندوز کررہا تھا۔

''مجھے تو واقعی یقین نہیں آرہا راحم......کیا تم بھی مجھ سے پیار کرنے لگے ہو؟''

''ہاں، ہاں......تمہیں اب تو یقین ہی نہیں آئے گا ہے ناں!'' راحم نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

''نہیں راحم ایسی بات نہیں بلکہ میں تو......مجھے سمجھ نہیں آرہا کیا کروں۔'' میشل اس کی باتوں میں کھو سی گئی تھی اور وہ اسے اب چھیڑنے لگا۔

وہ معظمہ کے لیے مسلسل منفی سوچ رہا تھا۔

''راحم؟'' معظمہ نے میسج کیا۔

''کیا مسئلہ ہے؟'' بالآخر راحم نے کئی دفعہ کے بعد جواب دیا۔

''مجھ سے بات کیوں نہیں کررہے ہو؟'' معظمہ نے بھیگی پلکوں سے میسج ٹائپ کیا اور بھیجا۔

''میرے پاس وقت نہیں ہوتا مصروف رہتا ہوں۔'' اس کے میسج سے معظمہ نے رونا شروع کردیا۔ بِنا مزید کچھ کہے وہ موبائل تکیے کے سرہانے رکھ کرلیٹی رہی جب تک آنکھیں تھک ہار کر خود بند نہ ہوئیں۔

اگلے دن بیزاری سے اٹھی اور ناشتا بنا کر ٹیبل پہ رکھا۔

''کیا بات ہے؟ سب ٹھیک تو ہے ناں؟ اسپتال میں کام زیادہ کررہی ہو کیا؟'' ماں نے پوچھا۔

''ہاں شاید تھکاوٹ کی وجہ سے۔'' معظمہ نے بِنا انہیں دیکھے جواب دیا۔

''ایسے تو نہ کرو، آرام بھی ضروری ہے۔ تمہاری شادی ہونے والی ہے کچھ ماہ میں اور تم ابھی سے یہ حالت بنارہی ہو؟'' جویریہ نے جوس کا گلاس اسے دیا۔

''شادی تو تب ہوگی ناں جب ہماری ہاؤس جاب مکمل ہوگی۔''

''ہاں میں بھی انتظار ہی کررہی ہوں بس اب تو۔'' جویریہ نے گہری سانس لی اور اسے دیکھا۔

معظمہ حسب معمول اپنی روٹینز میں مگن تھی، وارڈز کے چکر لگانا۔ راحم نے آہستہ، آہستہ اپنے آپ کو معظمہ سے دور کردیا تھا۔ ان لوگوں کی ڈیوٹیز بدلتی رہتی تھیں اور ٹیمز بھی اس لیے معظمہ نے اس بات کی پروا نہیں کی البتہ راحم نے رابطہ ختم کیا ہوا تھا اس بات کی الجھن اسے ستاتی رہتی تھی۔

☆☆☆

''معظمہ!'' انیلا معظمہ کو اکیلا دیکھ اس کے پاس چلی آئی۔

''ہاں کہو۔''

''تم نے بیڈ نمبر ۲۰۷ کو انجکشن لگایا تھا؟''

''ہاں شاید لگایا تو تھا، کیوں؟''

''نہیں بس ایسے ہی پوچھا۔'' انیلا نے کندھے اچکائے۔

''چلو روم میں چلتے ہیں۔ مجھے رپورٹ بھی بنانی

ہے اور کافی کی طلب بھی ہو رہی۔‘‘ معظمہ نے کہا اور انیلا اس کے ساتھ چلی گئی۔

’’یہ راحم نے اپنی ڈیوٹی خود بدلی ہے یا ڈاکٹر ابراہیم نے ایسا کیا ہے؟‘‘ انیلا کے سوال پہ کافی بناتی ہوئے معظمہ یک دم ٹھٹک گئی۔

’’راحم کیوں اپنی ڈیوٹی بدلے گا۔ اب ضروری تو نہیں کہ ہم ہر وقت ایک ہی ٹیم میں ساتھ ہوں۔‘‘ خود کو کمپوز کرتے ہوئے معظمہ نے جواب دیا۔

’’ہاں یہ بات بھی ہے۔ لیکن سنا ہے آج کل راحم اور میشل بہت ساتھ گھوم پھر رہے ہیں اور اب تو ڈیوٹی بھی ساتھ ہوتی ہے چاہے صبح کی ہو یا رات کی۔‘‘

’’تو کیا ہوا انیلا؟ ویسے بھی میشل میری کزن ہے تو اس لحاظ سے یہ دونوں رشتے دار بھی ہوئے اور پھر ہم ایک اسپتال میں کام کر رہے ہیں تو دوستی بھی ہوئی ناں۔‘‘ معظمہ نہ جانے خود کو کیا باور کروانا چاہتی تھی۔

’’معظمہ، میری بات کا برا نہ منانا۔ لیکن تم راحم کی خبر لیتی رہا کرو تو اچھا ہے۔‘‘

معظمہ نے انیلا کی بات سنی اور جیسے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔

’’ہاں، ہاں...... بے فکر رہو۔ وہ مجھے بتاتا رہتا ہے۔‘‘ اب وہ کیا بتاتی کہ وہ جس کی بات کر رہی ہے وہ اب اس سے بات تک نہیں کرتا۔

اس بات کو کافی دن گزر چکے تھے۔ معظمہ بھی راحم سے رابطہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنے کے بعد بس اپنی سسرال سے ہی رابطے میں رہتی۔

ان کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں راحم کی امی معظمہ کو لے کر شاپنگ پہ جاتی تھیں، ایک دن شاپنگ کرتے ہوئے ہی معظمہ نے راحم اور میشل کو ساتھ دیکھ لیا تھا اور جس طرح راحم، میشل کے آگے پیچھے پھر رہا تھا معظمہ کو قطعی اچھا نہیں لگا۔

’’یہ میں نے کیا دیکھ لیا؟‘‘ معظمہ جو راحم کی امی کے ساتھ تھی ایک دم گھبرا گئی۔

’’آنٹی میرے خیال سے ہمیں اب گھر چلنا چاہیے۔‘‘

’’لیکن ابھی تو اور بھی چیزیں......‘‘

’’میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ اسپتال کے چکروں میں مجھ میں اب زیادہ ہمت نہیں رہتی۔‘‘ معظمہ نے فوراً بات کاٹی۔

’’ٹھیک ہے، باقی کام پھر کرلیں گے۔ گھر چھوڑ دیتی ہوں تمہیں آرام کرنا جا کر سمجھیں۔‘‘ انہوں نے معظمہ کے گال تھپتھپائے۔ معظمہ کو گھر چھوڑ کر جویریہ سے مل کر وہ چلی گئیں۔

☆☆☆

’’مجھ سے ایک دفعہ بات تو کرو راحم، پتا تو چلے کیا بات ہے جو ایسا کر رہے ہو؟‘‘ معظمہ نے کچھ دن ٹھہر کر میسج کیا لیکن اس کا جواب راحم نے نہیں دیا۔ اس بات کو دو تین دن گزرے ہی تھے کہ راحم ان کے گھر آ گیا۔ اس کے کمرے میں گیا جہاں وہ اکیلی تھی۔ وہ جانتا تھا جویریہ اور منال اس کی امی کے ساتھ بازار گئی ہوئی ہیں۔

’’ارے راحم آپ...... آئیں ناں۔‘‘ معظمہ اسے دیکھ کر خوش ہو گئی تھی۔

’’تمہیں جواب دینے آیا ہوں۔‘‘ راحم کا انداز روکھا تھا جس پہ معظمہ نے پوچھا۔

’’کس بات کا جواب راحم؟‘‘

’’یاد نہیں تم نے ایک میسج کیا تھا مجھے، خیر...... اب میں یہ منگنی ختم کرنا چاہتا ہوں۔‘‘ راحم کی بات سن کر معظمہ کو گہرا صدمہ لگا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی راحم ایسا کچھ کہہ سکتا ہے۔

’’یہ...... یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ ہماری تو ش...... شادی ہونے والی ہے ناں۔‘‘ معظمہ شاید اسے یاد دلا رہی تھی۔

’’مجھے اب تم میں کوئی دلچسپی نہیں رہی معظمہ...... شاید تم میری وقتی پسند تھیں، خیر یہ لو انگوٹھی۔‘‘ راحم اپنی انگلی سے انگوٹھی نکال ہی رہا تھا کہ معظمہ نے روکا۔

’’ایسا، مذاق تو نہ کرو میرے ساتھ...... ہوا کیا ہے بتاؤ تو...... تم آج کل میشل کے ساتھ گھوم رہے

ہو، میں نے دیکھا تھا...... دیکھو جو بھی ہے پلیز بتا دو۔''
''اب جب تم نے مجھے اس کے ساتھ دیکھ ہی لیا ہے تو بات تو سمجھ ہی گئی ہوگی۔'' اس نے انگوٹھی اس کے بیڈ پہ پھینک دی اور واپس چلا گیا۔
معظمہ کی سمجھ میں ہی نہ آیا وہ روئے، چیخے، چلاّئے کیا کرے، گھر والوں کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو انہیں بھی اس حرکت پہ شدید جھٹکا لگا، معظمہ جو پہلے ہی کم بولتی تھی مزید چپ چپ سی ہوگئی، دوسری جانب راحم نے میشل کے لیے رشتہ بھجوا دیا تھا۔
جہاں راحم کے گھر والوں کو شرمندگی ہوئی رشتہ توڑ کر اسی گھر کی دوسری بیٹی کو بھیجا وہیں نعیمہ کو خاص کر برا بھی لگا لیکن بیٹی کی پسند اور ضد کے آگے ایک ماں بے بس ہوگئی تھی۔ آذر کو تو میشل پہ شدید غصہ تھا خاندان بھر میں یہ بات پھیل چکی تھی۔
علینہ نے آذر کو فون کیا اور اس سے میشل کے حوالے سے بات کی تو.... آذر نے اسے بھی ٹھیک ٹھاک سنا دی تھیں۔
''رمشا......رمشا...... میں آج بہت خوش ہوں...... راحم کو میں نے پا لیا ہے، معظمہ سے میں نے چھین لیا...... بے انتہا خوش ہوں میں آج۔'' میشل نے رمشا کو فون کیا تھا۔
''ہاں بھئی اب تو مانتی ہو ناں کہ محنت کرنے پر ہی کچھ ملتا ہے۔'' رمشا کا اشارہ کس طرف تھا وہ سمجھ گئی تھی۔
''لیکن رمشا اس کے علاوہ بھی میں نے کتنی دعائیں کی تھیں، یہ ان کا بھی تو نتیجہ ہو سکتا ہے۔'' میشل نے اپنی نمازوں اور دعاؤں کے لحاظ سے کہا۔
''ہاں وہ تو ٹھیک ہے پر اس سے بڑھ کر بھی تو کیا ہے ناں تم نے ورنہ آج راحم یوں تمہارے پیچھے لٹو نہ ہوتا۔''
''ہاں یار واقعی...... کہہ تو تم صحیح رہی ہو، گھر والے تو مان کے ہی نہیں دے رہے تھے، میں نے بھوک ہڑتالیں کر کر کے غصہ وغیرہ کر کے منایا ہے اوپر سے حد دیکھو صرف نکاح ہوگا وہ بھی سادگی سے' یہ بھی کوئی شادی ہوئی بھلا۔'' میشل گھر والوں کے شکوے شکایتیں لے بیٹھی، اسے اس بات سے کوئی لینا دینا نہیں تھا کہ خاندان اس کے لیے کیا کہہ رہا ہے، اسے راحم چاہیے تھا وہ بھی معظمہ سے سو وہ اسے مل رہا تھا، میشل کو اس سے کون سا پیار تھا ضد تھی جو نکاح کی صورت میں پوری ہو رہی تھی۔
نکاح چونکہ سادگی سے رکھا تھا اس لیے جلد از جلد تاریخ رکھنے کا سوچا گیا۔

☆☆☆

''جویریہ، مجھے اندازہ ہے کہ تمہیں کتنا برا لگ رہا ہوگا لیکن یقین مانو ہم لوگ بھی اس رشتے سے دل سے خوش نہیں لیکن اولاد کی خاطر کرنا پڑتا ہے۔ یوں سمجھو میں نے ایک بیٹی کا دل توڑ کر دوسری بیٹی کو دل دے دیا ہے۔''
''ایسا نہ کہیں۔ بس قسمت میں نہیں تھا میری بیٹی کا اور راحم کا ساتھ تو یہیں ختم ہوگئی بات۔ آپ دل پر نہ لیں اور تیاری کریں۔'' جویریہ نے نعیمہ کو مسکرا کر جواب دیا۔
''تم لوگ کس دل سے اس شادی میں شامل ہوگے؟ اور خاص کر میری بچی معظمہ؟'' نعیمہ کو حقیقتاً دکھ ہو رہا تھا۔
''معظمہ ٹھیک ہے اب۔ بس جو قدرت کو منظور تھا اس نے بھی اس بات کو قبول کر لیا ہے۔ بے فکر رہیں ہم سب شامل ہوں گے شادی میں۔''
گھر میں سادگی سے نکاح کا اہتمام کیا ہوا تھا اور یہیں سے رخصتی ہونی تھی۔ سب آئے ہوئے تھے اسپتال کے دوست بھی لیکن معظمہ شامل نہیں تھی۔ کیسے ہوتی اس پر تو دکھ کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا جس شخص نے اسے عزت دی' اسے چاہا اسی نے اپنا کر چھوڑ دیا...... سب آپس میں چہ مگوئیاں کرنے میں لگے ہوئے تھے۔
''بھائی۔'' میشل نے رخصت ہونے سے پہلے آذر سے بات کرنا چاہی۔
''مت کہو مجھے بھائی، تم میں ذرا سی بھی شرم باقی ہوتی ناں تو یہ سب نہ کرتیں۔''
''بھائی اس میں میری کیا غلطی؟ راحم کی اپنی پسند

اور خواہش سے ہوا ہے جب اسے معظمہ سے شادی نہیں کرنی تو اس نے ختم کرلی اور میرے لیے رشتہ بھیج دیا بس بات ختم۔'' میشل اپنے اوپر کوئی الزام کوئی بات لے کر آ بھی کیسی سکتی تھی۔

''مجھے معظمہ سے کوئی لینا دینا نہیں لیکن اس نے ایک ہی خاندان کی بیٹی سے منگنی کر کے عین شادی سے پہلے توڑ کر اسی خاندان کی دوسری بیٹی سے شادی کرنے کا پروگرام بنالیا، تمہیں اندازہ بھی ہے خاندان بھر میں کتنی تھوتھو ہوئی ہے۔'' آذر نے غصے سے کہا۔

''خاندان والے تو بولتے رہیں گے اور معظمہ کی ہی بات کرلیں جب وہ ہمیں ہی پسند نہیں تو اب راحم کو بھی نہیں آرہی اس میں میرا تو قصور نہیں ہوا ناں؟''

رخصتی ہوگئی تھی۔ جویریہ اور انس نے بھی اپنی بیٹی کی طرح دعائیں دی۔ محفل میں موجود لوگ معظمہ کی غیر حاضری کی وجہ جاننے میں زیادہ دلچسپی لے رہے تھے۔ بے حد اصرار کرنے کے باوجود اس روز معظمہ اسپتال میں رہی۔

☆☆☆

''کافی دن ہوگئے ہیں آذر، علینہ سے بات ہی نہیں ہوئی پہلے شادی کا چکر رہا اس کے بعد اچانک میشل کی شادی...... علینہ سے پھر ملاقات بھی نہیں ہوئی، تمہاری بات ہوتی رہتی ہے ناں؟'' نعیمہ نے ناشتے کے دوران آذر سے پوچھا۔

''جی امی کبھی، کبھی بات ہوجاتی ہے۔'' آذر ناشتا کرنے میں مصروف تھا۔

''مجھے تو معظمہ کی فکر ہونے لگی ہے بیچاری معصوم سی بچی، نظر لگ گئی اسے۔'' نعیمہ اداس ہوگئی تھیں۔

''امی کیا ہوگیا ہے آپ کو، اس کے ویسے بھی کالج میں دوست وغیرہ تھے ایک راحم کے جانے سے کچھ نہیں ہوتا۔''

''چپ ہی رہو تم، شرم تو آتی نہیں ہے ناں کسی کی بیٹی کے لیے ایسا کہنا، دیکھ لو میشل کیا حرکت کرگئی ہے اور تم اب بھی معظمہ کو کہتے رہتے ہو۔'' نعیمہ کا دل تڑپ ہی اٹھا تھا۔

''امی خدا کا واسطہ ہے میشل جیسی تھی پاہے یا اس نے جو بھی کیا اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ معظمہ کچھ نہیں کرسکتی یا کچھ کیا ہی نہیں ہوگا؟'' آذر نے چڑتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' نعیمہ نے پوچھا۔

''میشل غلط تھی مانتا ہوں پر راحم تو معظمہ سے پیار کرتا تھا ناں پھر ایسا کیا ہوا ہوگا جو وہ منگنی توڑ بیٹھا اور میشل سے کر بیٹھا؟'' آذر کو اب بھی کہیں نہ کہیں بہن ہی ٹھیک لگ رہی تھی۔

''جو بھی تھا بات ساری یہ ہے کہ میشل ہی کیوں؟ لوگ کیا کہتے ہوں گے ایک بہن نے دوسری بہن کا گھر بسنے سے پہلے اجاڑ دیا۔'' نعیمہ کا دل کس طرح اپنی بیٹی کے لیے یہ الفاظ بول رہا تھا وہ ہی جانتی تھیں۔

''آپ کو معظمہ ہی اچھی لگتی ہے اپنی بیٹی تھوڑی ناں اچھی لگے گی، آپ کا تو بس چلتا میرے نہ کرنے کے باوجود بھی مجھے مجبور کر کے معظمہ سے شادی کروادیتیں۔'' آذر کرسی زور سے پیچھے دھکیلتا ہوا اٹھا۔ ''میں جارہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے بیٹا، فی امان اللہ۔'' نعیمہ اٹھیں اور علینہ کو فون کرنے چلی گئیں۔

''ارے، بہن کیا بتاؤں، بس یہ آج کل کے بچے ہیں ناں ان کی اپنی مرضیاں ہی چلتی ہیں، خود پسند کرتے ہیں پھر خود ہی ختم کردیتے ہیں۔''

''ہاں...... دل سے تو ہم بھی راضی نہ تھے لیکن بچوں کی پسند کیا کرتے ماننا ہی پڑا۔''

''اللہ کا شکر ہے کہ علینہ اور اس کے گھر والوں نے اس بات کو زیادہ اچھالا نہیں تھا۔'' نعیمہ فون کرنے جارہی تھیں کہ خاندان ہی میں سے کسی خاتون کا فون آ گیا تھا۔

☆☆☆

''آذر مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا میشل ایسا بھی کرسکتی ہے۔'' علینہ اور آذر کافی دن بعد ملے تھے اور

علینہ حسبِ عادت میشل کے حوالے سے ہی بات کررہی تھی۔

''علینہ ......اور کوئی بات کرلو، جب دیکھو تم میری بہن ہی کی بات کرتی رہتی ہو۔'' آذر نے رکھائی سے کہا۔

''ہاں تو اور کیا بات کروں؟ تمہاری بہن تو ہے ہی ایسی تو اور کیا......''

''بکواس بند کرو اپنی۔'' آذر نے دانت پیستے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔

''علینہ مجھ سے رشتہ رکھنا ہے تو مہربانی کر کے مجھ تک ہی رہو میری بہن کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔''

''ارے واہ! بہن صاحبہ کے کرتوت کے باوجود منع مجھے کررہے ہو؟'' علینہ بھی آگے سے چلائی۔

''مجھے سمجھ نہیں آتا کہ تم اس کا ذکر کرتی بھی کیوں ہو مجھ سے؟ ہمارے بیچ کیا بس میشل ہی کی باتیں ہوا کریں گی؟ ہماری باتیں نہیں؟''

''جو بھی ہے، تمہاری بہن غلط ہے تو ہے۔'' علینہ بھی باز نہ آئی۔

''اور اگر تم ہمارے بارے میں یا ہمارے رشتے کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہو تو تمہیں کل تک جواب مل جائے گا۔'' علینہ مزید کچھ اور کہے وہاں سے چلی گئی اور آذر نے ٹیبل پہ ہاتھ دے مارا۔

دونوں کے بیچ کہا سنی ہوئی جس کی وجہ سے گھر والے بھی بیچ میں آئے۔ علینہ کا جواب مل چکا تھا، آذر خود بھی شاید یہی چاہتا تھا لیکن نعیمہ نے دونوں کو سمجھایا جس کا نتیجہ مثبت نکلا۔ راحم اور میشل شادی کے بعد گھومنے گئے ہوئے تھے۔ راحم کو کوئی ملال نہ تھا وہ میشل کے ساتھ خوش تھا جیسے کبھی معظمہ اس کی زندگی میں آئی ہی نہ ہو۔ اسپتال کے کولیگز بھی حیران تھے لیکن نارمل رہے معظمہ بھی کام سے کام رکھتی اور کسی سے اتنی بات چیت نہیں کرتی۔

''معظمہ، ویسے حیرت ہے تمہاری تو پہلے دن سے راحم سے دوستی تھی اور پھر......؟''

''انیلا! میرے خیال سے ہم یہاں مریضوں کے حوالے سے کام اور بات کریں تو زیادہ بہتر نہیں ہوگا؟''

''ہاں کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو لیکن یہاں اسٹاف کے لوگ جس طرح باتیں کررہے ہیں......'' انیلا بولتے، بولتے چپ ہوگئی۔

''لوگ جو کہتے ہیں انہیں کہنے دو۔ راحم سے میری دوستی تھی یہی کافی تھا شاید ہم نے ہی اپنے رشتے کو صحیح طور پر سمجھا نہیں۔ خیر بہرحال۔'' معظمہ نے کندھے اچکائے اور مسکرا کر جواب دیا۔

''عامر بھی تم لوگوں کے ساتھ تھا کالج میں؟''

''ہاں، ہمارے ساتھ ہی تھا لیکن تمہیں تو پتا ہے میری کسی سے خاص دوستی نہیں تھی۔ میشل کے گروپ میں بس نام کی حد تک ان کے ساتھ ہوتی تھی۔''

''اوہ اچھا، میں نے سنا ہے کہ عامر، میشل کو پسند کرتا تھا لیکن میشل نہیں۔''

انیلا نے معظمہ کو کن انکھیوں سے دیکھا۔

''انیلا، میں نے کہا ناں مجھے واقعی اس حوالے سے کوئی خبر نہیں اور اگر پسند کرتا بھی تھا تو یہ ان دونوں کا آپسی معاملہ ہے۔''

''چلو بس۔ تم تو ہر بات پہ ہی......چلو تم یہاں بیٹھ کر رپورٹس پڑھو میں وارڈ کا چکر لگا کر آتی ہوں۔'' معظمہ نے اثبات میں سر ہلایا اور فائلز میں لگ گئی۔

☆☆☆

جویریہ، معظمہ کی وجہ سے پریشان رہتی تھیں اس لیے اکثر ان کی طبیعت خراب رہتی تھی، اس دن بھی ان کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے آذر، معظمہ کو لینے اسپتال آیا تھا۔

معظمہ کسی لڑکے سے بات کررہی تھی، آذر کو دیکھ کر اس نے لڑکے سے ملوایا۔

''آذر بھائی یہ عامر ہیں ڈاکٹر عامر ہمارے ساتھ ہوتے ہیں اور کالج میں بھی ساتھ تھے میشل کے دوست۔''

آذر اس کا نام سنتے ہی چونک گیا تھا یاد کرنے کی

کوشش کرنے لگا کہ کیسے جانتا ہے۔

''شاید میں آپ کو جانتا ہوں۔'' آذر نے کہا

''جی......ایک دفعہ میشل کو چھوڑنے آیا تھا کالج تب۔'' عامر نے مسکرا کر کہا آذر کو سب یاد آنے لگا

''آ...ہاں......صحیح، صحیح......چلیں معظمہ؟'' آذر، عامر سے بات بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''جی بھائی، اوکے عامر......اللہ حافظ۔'' دونوں گاڑی میں آکر بیٹھ گئے۔

''یہ میشل کا دوست تھا یا تمہارا سچ، سچ بتانا۔'' اچانک سے خاموشی ٹوٹی جو اتنی دیر سے دونوں چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے۔

''میشل اور رمشا کا دوست تھا عامر، میں ان کے ساتھ ہوتی ہی نہیں تھی، نہ مجھے دوست بنانے کا اتنا شوق ہے۔'' معظمہ کو یہ سوال عجیب لگا۔

''اچھا پر میں نے تو سنا تھا کہ یہ تمہارا گہرا بلکہ بہت ہی قریبی دوست رہا ہے تحفے تحائف کے تبادلے ملنا جلنا وغیرہ۔'' آذر کا انداز طعنے دینے جیسا تھا لیکن معظمہ سمجھ ہی نہیں پائی۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ آذر بھائی؟ میرا عامر سے ایسا کوئی رشتہ تو دور کی بات جب دوستی ہی نہیں تھی تو یہ سب بھی کیوں ہوتا؟'' معظمہ...اب رو دینے والی تھی۔ ''اور آپ کو یہ سب کہا کس نے؟''

''میشل نے جو اس کام میں تمہاری راز دار تھی۔'' آذر نے صاف گوئی سے کام لیا۔

''کمال کے بھائی بہن ہیں آپ دونوں بھی، میشل کی حرکتیں کیا تھیں اس کے باوجود بھی اس کی اس حرکت کا بھی میرے اوپر الزام لگ گیا؟'' معظمہ کا صبر آج جیسے ختم ہو گیا تھا۔

''میں نہیں جانتی کہ اس نے اپنے اور عامر کے حوالے سے آپ کو کیا کہا اور میرا نام کیوں لگایا لیکن اس نے جو کچھ کیا ابھی میرے ساتھ راحم کو مجھ سے دور کر دیا، میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا چپ چاپ تماشا دیکھتی رہی۔ اس کے باوجود آپ اپنی بہن کو ہی فوقیت دیں گے ناں آخر......!'' آذر کو معظمہ کی بات بری نہیں لگی لیکن وہ تلخی میں جو کہہ گئی تھی آذر کو اندازہ ہوا کہ اس کے ساتھ غلط ہوا ہے لیکن آذر پھر بھی چپ رہا۔

''میں نے کبھی کسی سے شکایت نہیں کی۔ حتیٰ کہ راحم سے بھی پوچھنا چاہا لیکن اس نے بھی مجھے جواب دینے کے بجائے منگنی توڑ دی، میری کہاں غلطی تھی۔ میں یہ بھی نہیں جانتی، خیر مجھے آپ سے اس حوالے سے تو کیا اپنے حوالے سے بھی کوئی بات نہیں کرنی، آپ کی بات آپ کی سوچ اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ آپ انسان کو اپنی نہیں دوسروں کی نظر سے دیکھتے پھر جج کرتے ہیں اور اپنے فیصلے کی مہر لگا دیتے ہیں۔''

یہ معظمہ ہی تھی جو ہمیشہ چپ رہی کبھی کسی کو جواب نہیں دیا، جو دیا تو آگے سے اسے اور سنا کر چپ کرا دیا جاتا تھا پر آج وہ بولی اور آذر کو چپ کرا دیا۔

پھر مزید دونوں میں سے کسی نے کچھ نہیں کہا اور سفر تمام ہوا......گھر پہنچ کر وہ سیدھا ماں کے کمرے میں گئی اور ان کے گلے لگ گئی۔

''ارے کیا ہوا میری گڑیا کو؟'' جویریہ نے اسے ہٹانا چاہا پر وہ زور سے چمٹی رہی۔

''کیا ہوا ہے بیٹا بتاؤ تو؟'' جویریہ نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

''آپ کو اپنی طبیعت خراب کرنے کے علاوہ کچھ آتا بھی ہے؟'' معظمہ نے کہا تو جویریہ مسکرا دیں۔

''اتنا پیار کرو گی ناں تو ماں کو چھوڑ کر جانا مشکل ہو جانا ہے لڑکی۔'' نعیمہ ماں بیٹی کا پیار دیکھ رہی تھیں۔

''کوئی نہیں چاچی' میں امی کے پاس ہی رہوں گی مجھے یہ اب بھگا کے تو دکھائیں۔'' معظمہ سیدھی ہو کر بیٹھی۔

''کوئی نہیں دیکھنا آئے گا ایک شہزادہ اور لے جائے گا۔'' جویریہ نے چھیڑا، آذر سب کچھ سن ضرور رہا تھا لیکن وہ دیکھ معظمہ کو رہا تھا۔

''مجھے اب کسی کی ضرورت نہیں، ایک دفعہ چوٹ کھالی کافی ہے۔'' معظمہ نے کہا اور آذر نے اسے غور

سے دیکھا وہ معمولی سے چہرے والی آج اتنا کچھ کہہ رہی تھی کسی نے شاید اس کے دل میں جھانک کے نہیں دیکھا ہوگا کہ وہ کیا سوچتی ہے کیا چاہتی ہے۔

رات کے وقت آذر صحن میں ٹہل رہا تھا اور اس کی سوچوں کا محور صرف اور صرف معظمہ تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ انجانے میں ہی بچپن سے ہر بات پر میشل کا معظمہ سے موازنہ ہوتے ہی دیکھا۔ ان دونوں کو ایک عجیب سی چڑ ہوگئی تھی معظمہ سے۔ لیکن آج جس طرح معظمہ.... اپنے لیے بولی اسے رہ، رہ کر میشل کی باتیں یاد آنے لگیں جو وہ معظمہ کے نام سے منسوب کر جاتی تھی اور یہ دونوں جو معظمہ نامے سے چڑتے تھے۔ آذر تک کو تو نعیمہ نے شادی کا کہہ دیا تھا اس کے دل میں معظمہ کے لیے اچھی سوچ آ بھی کیسے سکتی تھی، پر آج معظمہ نے جتنا بھی کہا جیسا بھی کہا آذر کے دل میں معظمہ کے لیے نرم گوشہ بنا گیا تھا۔ وہ معظمہ کے لیے اب یہ سوچ رہا تھا اسے سب کا پتا ہوگا کون اس کے لیے کیا کہتا ہے کون اس کا مذاق اڑاتا ہے لیکن یہ کسی کو جواب نہیں دیتی تھی لیکن آج معظمہ کا جواب دینا اسے احساس دلا رہا تھا کہ اس کے ساتھ غلط ہوتا آیا ہے۔

''کہاں گم ہیں جناب آج؟'' علینہ کے میسج پہ وہ معظمہ کی سوچوں سے نکلا اور کمرے تک جانے لگا۔

''کچھ نہیں بس تم بتاؤ۔'' چلتے، چلتے جواب دیا۔

''مجھ سے تو آج سارا دن بات نہیں کی کیوں؟''

علینہ کے اس میسج سے آذر بیزار ہونا شروع ہوگیا۔

''اب کیا میں مصروف بھی نہیں ہو سکتا؟ اس طرح کے میسج نہ کیا کرو۔'' غصے سے ٹائپ کرتا ہوا آذر کمرے میں آ گیا تھا اور لمبی سانس لے کر بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا۔

''عجیب ہو تم، میری سمجھ سے بالاتر، تم سے میں جب اچھے سے بات کرتی ہوں تمہارا پوچھتی ہوں تمہیں وہ بھی نہیں پسند، تمہارے گھر والوں کی بات کروں خاص کر تمہاری بہن کی تو تمہیں وہ بھی نہیں پسند! کروں تو کیا کروں؟'' علینہ کے میسج پہ آذر کا جی چاہا.... موبائل اٹھا کے پھینک دے۔

''سو جاؤ اور میسج نہ کرو یہ مہربانی کردو، گڈ نائٹ!''

آذر نے فون بند کر دیا۔

''کیسی ہیں آپ چاچی؟ اور تم معظمہ اسپتال نہیں گئیں آج؟'' آذر چچی سے ملنے آیا تھا۔

''اور اب یہ مجھ سے بھی پوچھا جائے گا کہ میں اسکول کیوں نہیں گئی؟''

''ہاں بالکل بھئی پوچھنا تو ضروری ہوگیا ہے اب۔'' آذر نے منال کی بات کا جواب دیا۔

''تو آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے جناب آج اتوار ہے، بھائی کہیں آپ کی بھی تو طبیعت خراب نہیں؟''

منال نے ہنسنا شروع کر دیا تو معظمہ بھی دبی، دبی سی مسکرانے لگی.....اس کی مسکراہٹ دیکھ کر آذر بھی مسکرانے لگا، جو کل تک معظمہ کو ناپسند کرتا تھا آج اس کی ہر بات ہر ادا اچھی لگنے لگی تھی۔ وہ اسے بغور دیکھنے لگا۔

''کیوں تنگ کر رہی ہو آذر کو۔'' جویریہ نے منال کو گھور کر دیکھا۔

''امی آذر بھائی کو لگتا ہے کام زیادہ ہوتا ہے جو وہ یہ بھی بھول جاتے کہ آج چھٹی ہوتی ہے۔'' معظمہ نے بھی کہہ دیا اور آذر ہنسنے لگا۔

''اڑالو تم دونوں مل کر میرا مذاق، کبھی تو میرا بھی وقت آئے گا پھر تم دونوں کو میں نے نہیں چھوڑنا۔''

آذر نے معصومیت سے کہا تو سب ہنسنے لگے۔

''کیا بات ہے آذر؟ کچھ کہنا چاہتے ہو؟ یا کوئی بات ہے جو تمہیں پریشان کر رہی ہے؟'' منال اور معظمہ کے کمرے سے جاتے ہی جویریہ نے سوال اٹھایا۔

''ارے نہیں تو چاچی ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

آذر نے فون جیب میں ڈالا۔

''تمہیں میں نے زیادہ پالا ہے اور جانتے ہو نام بھی میرا دیا ہوا ہے میرا بیٹا نہیں ہے تو کیا ہوا تم مجھے بیٹے کی طرح ہی عزیز ہو......میں بھی تو ماں ہوں کیا میں سمجھ بھی نہیں سکوں گی؟''

''چاچی......'' آذر کی آواز تھکی ہوئی تھی۔

''بولو بچے کیا بات ہے؟''

''معظمہ کی منگنی میری بہن کی وجہ سے ٹوٹی ہے، مجھے اس بات کا بہت افسوس ہے اور شرمندہ بھی ہوں۔''

''یہ سب قسمت کی بات تھی.....اس میں تم کیوں شرمندہ ہوتے ہو؟'' جویریہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

''چاچی..... کچھ نہیں بس..... اور آپ بھی جلدی سے ٹھیک ہو جائیں کیا حالت کر لی ہے اپنی۔''

''بس، بس اب یہ راز کی باتیں بند کریں اور یہ سب نوش فرمائیں میں نے بنایا ہے۔'' منال اونچی آواز میں کمرے میں ٹرالی سمیت داخل ہوئی تو معظمہ نے سر پہ چپت ماری۔

''اوئی..... سب نہ صحیح یہ معصوم سا پراٹھا تو میں نے بنایا ہے ناں۔'' منال نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''اوہو تو یعنی یہ میرے لیے بنایا گیا ہے؟'' آذر نے فوراً پراٹھے کو ہاتھ لگایا۔

''سب تو آپی نے بنایا ہے آپ کے لیے۔'' آذر نے معظمہ کو دیکھا اس کی نظریں بھی آذر پہ گئیں۔

''میرا مطلب ہم سب کے لیے۔'' منال نے بات پوری کی اور آذر نے کھانا شروع کیا۔

جویریہ بھی آذر کو دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ وہ کچھ چھپا رہا ہے کچھ بتانا چاہتا ہے جو بتا نہیں رہا۔

ان کی کھٹ پھٹ آپس میں چل رہی تھی، معظمہ کو بھی ہنستا مسکراتا دیکھ آذر کو بھی اچھا لگنے لگا۔

دوسری طرف علینہ کالز پہ کالز کر رہی تھی لیکن آذر کا دھیان فون پہ تھا ہی نہیں۔

''میں تمہیں صبح سے فون، میسج کر رہی ہوں تم ہو کہاں؟'' بالآخر آذر نے اس کا فون اٹھا ہی لیا تھا جبھی وہ بولی۔

''چاچی کے ہاں تھا۔'' آذر نے جواب دیا۔

''اچھا تو کیا سارا دن وہیں تھے؟ اور موبائل بھی دیکھنا ضروری نہیں سمجھا؟'' علینہ نے ہنکارتے ہوئے کہا۔

''ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھا تو ملنے چلا گیا۔'' آذر کو سخت کوفت ہونے لگی۔

''تمہیں سب کی فکر ہے پر میری نہیں۔'' علینہ کی بات پر آذر کا موڈ خراب ہو گیا۔

''ایک تو میں نے امی کے کہنے پہ فون کیا ہے اور آگے سے تم مجھے ہی سنا رہی ہو؟'' اس کے منہ سے اصل بات نکل گئی۔

''کیا؟ امی کے کہنے پر؟ یعنی تمہیں خود سے زحمت نہ ہوئی کہ مجھے فون کر لو، امی کی بات مان لی؟'' علینہ نے غصے میں کہا۔

''تو اس میں ایسا کیا ہو گیا؟'' آذر چڑا۔

''تم شادی کے بعد بھی جی امی، جی امی حضوری کرتے رہو گے؟'' علینہ کی بات پہ آذر کو سمجھ نہیں آیا کیا جواب دے۔

''ایسا ہے تو میں شادی کے بعد الگ رہوں گی، مجھے ساس سسر کے ساتھ نہیں رہنا۔''

''واٹ؟ کیا بول رہی ہو تم علینہ؟ دماغ تو ٹھیک ہے ناں؟'' آذر نے زور سے کہا.....نعیمہ کچن سے باہر آ گئیں۔

''کیا ہو گیا ہے بھئی؟ کیوں چلا رہے ہو؟''

''امی یہ اپنی ہونے والی بہو کی بات سنیں.....کہتی ہے شادی کے بعد وہ آپ کے ساتھ نہیں رہے گی، اسے الگ گھر چاہیے۔'' آذر نے جھنجلا کر کہا۔

''ارے مذاق کیا ہو گا' مجھے دو میں بات کرتی ہوں۔'' آذر نے فون دے دیا۔

''ایک تو تم آج کل کے بچے بھی ناں۔ منگنی ہوئی نہیں کہ شادی کے بعد کی ساری پلاننگ پہلے شروع کر دیتے ہو۔''

''علینہ بیٹا، کیسی ہو؟'' پیار سے نرمی سے نعیمہ نے کہا۔

''آپ نے سن تو لیا ہو گا، جو میں نے کہا ہے آذر سے.....اگر اسے اعتراض ہے تو میں رشتہ ختم کر دیتی ہوں۔'' علینہ نے کچھ لحاظ نہ کرتے ہوئے کہا۔

''ارے.....علینہ کیا ہو گیا ہے بچے.....کوئی ناراضی ہو گئی ہے؟'' نعیمہ نے اب ہنس کر کہا۔

''آنٹی پلیز...... اب اس بات کو ختم کرنے میں ہی بہتری ہے۔'' علینہ نے یہ کہہ کر فون کاٹ دیا۔

''اس نے تو فون ہی کاٹ دیا، آذر پھر سے ملا دو۔''

''امی...... بس...... اب مجھے یہ رشتہ برقرار نہیں رکھنا، دماغ خراب کر دیا ہے اس لڑکی نے۔'' آذر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا

''یا اللہ خیر...... اب پتا نہیں کیا ہوگا۔'' نعیمہ صوفے پر بیٹھ گئی تھیں۔

اس دفعہ بہت سمجھایا، نعیمہ، علینہ سے ملنے بھی گئیں، پر دونوں اس رشتے کے لیے ذہنی طور پہ راضی ہو چکے تھے کہ ختم کرنا ہے۔

میشل واپس آ چکی تھی...... خوش بھی تھی، راحم اسے بہت چاہنے لگا تھا اور میشل جیسے پھولے نہیں سما رہی تھی۔

''امی...... اب کیا سوچا ہے آپ نے بھائی کے لیے؟'' میشل سیب کھاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''پہلے ہی اتنی مشکلوں سے اس کی منگنی کروائی تھی یہ تو کسی کا نام تک نہیں لیتا تھا۔'' نعیمہ اتنے دنوں بعد ملی بیٹی سے باتیں شیئر کرنے لگیں۔

''پھر اب امی؟''

''اب کیا؟ دیکھو کیا ہوتا ہے؟ اچھا چھوڑو، چل کر چچی سے مل آؤ، خوش ہو جائے گی وہ، پچھلے دنوں کافی بیمار رہی ہے وہ۔'' نعیمہ نے جویریہ کا بتاتے ہوئے کہا۔

''مجھے وہاں نہیں جانا، معظمہ ہوگی، اسے دیکھ کر مجھے عجیب لگے گا۔'' میشل نے بہانہ گھڑا۔

''عجیب کیوں بچے؟'' نعیمہ نے پوچھا۔

''پتا نہیں وہ کہیں بد دعا نہ دے دے۔'' میشل کی بات بن کر نعیمہ نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

''کیسی پاگلوں والی باتیں کر رہی ہو، بھلا معظمہ ایسا کیوں کرے گی؟ جو ہوا بس قسمت کا کرنا سمجھ کر بھول بھی گئی ہوگی وہ تو۔''

''اچھا میں نے کچھ سوچا ہے۔'' نعیمہ نے ہلکی آواز میں کہا۔

''کیا سوچا ہے؟'' میشل نے پر جوش ہوتے پوچھا۔

''اگر معظمہ اور آذر کی شادی ہو جائے تو؟''

''کیا؟ اب وہ کالی کلوٹی رہ گئی ہے میری بھابی بننے کے لیے؟ اور اوپر سے منگنی بھی ٹوٹی ہوئی اس کی، اس پر ترس کھا کر آپ نے یہ سوچا ہے کہ وہ میشل کی بھابی بنے گی؟ ناممکن۔'' میشل نے درشتی سے کہا۔

''میشل تم بہت بد تمیز اور بد لحاظ ہو گئی ہو، معظمہ کے لیے کیسے یہ سب بول رہی ہو تم؟'' نعیمہ کو برا لگا لیکن میشل کا اس طرح کہنا اور برا لگا۔

''میں کبھی اس لڑکی کو اپنے بھائی کی بیوی بنتا دیکھنا برداشت نہیں کر سکوں گی۔''

''کس لڑکی کی بات ہو رہی ہے؟'' آذر اچانک آیا۔

''نہیں...... نہیں کچھ نہیں بس ایسے ہی۔'' نعیمہ گھبرا گئی تھیں، وہ نہیں چاہتی تھیں کہ آذر نے پہلے جیسے منع کیا تھا اب نام لینے پر میشل کے سامنے منع کر دے۔

''آپ کے لیے امی نے ایسی لڑکی سوچی ہے جس پر ترس کھا کر شادی کا سوچا جا رہا ہے۔''

''میشل چپ کرو تم۔'' نعیمہ کو اس کا لہجہ بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

''کس کی بات کر رہی ہو بتاؤ تو سہی اس کا نام؟'' آذر نے پوچھا۔

''وہی...... امی کی بیچاری جاں نشیں...... معظمہ انس اور کون؟'' ہنکارتے ہوئے میشل نے کہا۔

''تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟ دیکھی بھالی لڑکی ہے اور اپنے گھر کی ہے...... مجھے اعتراض نہیں، معظمہ سے پوچھا جا سکتا ہے اور ہاں میشل اس پہ ترس کوئی کھا ہی نہیں سکتا البتہ وہ ترس کھا لے تو شاید بات بن جائے۔'' آذر نے جتنے آرام اور سکون سے کہا، میشل کے چہرے کے زاویے بدلتے رہے، خود نعیمہ بھی ملی جلی کیفیت میں تھیں۔

آذر مسکراتا ہوا چلا گیا تھا نعیمہ خوش ہو گئی تھیں جب کہ میشل کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کچھ

کر جائے۔

''جواب سن لیا میرے بیٹے کا؟'' نعیمہ نے میشل کو کہا۔

''مجھ سے اس بارے میں کوئی بات نہ کریں اب۔'' میشل اپنے کمرے میں چلی گئی تھی، وہ یہاں رہنے کے لیے آئی تھی۔

☆☆☆

''نہیں امی...... یہ سوچا بھی کیسے آپ نے؟'' معظمہ کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ آذر کے لیے اس کا رشتہ آجائے گا۔

''میرے دل میں تو ہمیشہ سے یہ بات تھی...... اب خود بھائی نے بات کی ہے۔'' جویریہ اس رشتے کے بات سے کھل گئی تھیں۔

''امی...... یہ نہیں، ناممکن ہے...... آذر بھائی؟ کیسے؟'' معظمہ شش وپنج میں مبتلا تھی۔

''آذر نے تو خود کہا ہے نعیمہ کو تمہارے لیے...... اور اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ تم کہیں اور نہیں اپنے چاچا کے ہاں ہی جاؤ گی؟'' جویریہ نے ساتھ بیٹھی معظمہ کو پیار کیا۔

''امی...... دنیا کیا کہے گی؟ کہ پہلے دونوں کی منگنی الگ، الگ جگہ ہوئی پھر دونوں کی ٹوٹی اور اب دونوں کی ایک دوسرے سے کرا دی؟'' معظمہ کے لحاظ سے غلط بات تو نہیں تھی۔

''ایسا کیوں سوچ رہی ہو بیٹا؟ یہ تو قسمت کی بات ہوتی ہے، ہمارا کیا ہاتھ اس میں۔'' جویریہ نے سمجھانا چاہا۔

''میں نہیں مان سکتی کہ آذر بھائی مجھے پسند کرتے ہوں گے شاید مجھ پر ترس کھا رہے ہیں کہ اب تو کہیں اور ہو گی نہیں؟ اور میں تو کرنا بھی نہیں چاہتی شادی تو کہیں یہ آپ لوگوں کا کوئی پلان تو نہیں؟'' وہ اپنی سمجھ سے بس بولے جا رہی تھی۔

''میری بیٹی پیاری جو ہے، اتنی اچھی ہے تو کیوں کسی کا دل نہیں آئے گا اس پر؟'' جویریہ نے گلے

لگاتے ہوئے کہا۔

''پر وہ خوب صورت نہیں، اسے کوئی پسند نہیں کرسکتا امی کوئی بھی نہیں۔'' معظمہ کی آنکھ میں آنسو اُمڈ آئے۔

''نہ میری جان، ایسا نہیں کہتے ، یہ تو تم خوش نصیب ہو جو تمہیں خود کہا ہے رشتے کے لیے۔''

''راحم نے بھی خود کہا تھا.....'' معظمہ ماں سے الگ ہوگئی۔

''بھول جاؤ اسے، قسمت میں یہی لکھا تھا، آذر گھر کا بچہ ہے اور اس نے تمہارے لیے کہا ہے ناں تو پھر؟'' جویریہ کو سمجھ نہیں آرہا تھا کیسے اسے سمجھائیں۔

وہ اپنے کمرے میں موجود تھی کھڑکی کے سامنے...... سوچ میں ڈوبی، ٹھنڈی ہوائیں اس کے چہرے کو چھو رہی تھیں، ہاتھ باندھے ہر تھوڑی دیر بعد وہ گہری سانسیں لیتی، کھڑکی کے ساتھ دیوار پہ اپنا وجود ٹکایا۔

اسے فیصلہ کرنا تھا گو کہ اس نے کہا بھی تھا کہ وہ جواب نہیں دے گی لیکن جانتی تھی کہ اس سے پھر ضرور پوچھا جائے گا...... گزرے وقت کی یادوں میں تھی وہ...... جو اس نے سوچا تھا وہ ریت کی طرح مٹھی سے پھسل گیا، اس ریت کو کسی اور نے قید کرلیا تھا۔

اس نے ہاں کردی تھی، آذر کو اچھا لگا پر وہ اس سے اکیلے میں کچھ بات کرنا چاہتا تھا اس کے دل میں جو بھی معظمہ کے متعلق بھرا تھا وہ اسے بتانا چاہتا تھا۔

''اللہ کا شکر ہے میری معظمہ اب میرے پاس ہی رہے گی۔'' نعیمہ رشتہ پکا کرنے آئی تھیں۔

''بھابی...... یہ تو آپ کا پیار ہے بچی ورنہ مجھے فکر کھائے جا رہی تھی۔'' جویریہ کے آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

''ارے ...... رو کیوں رہی ہو؟ کیا میں نے معظمہ کو کبھی اپنی بیٹی نہیں سمجھا؟ اور آذر تمہارا بیٹا نہیں کیا؟ بس اللہ کا جتنا شکر مناؤں کم ہے، ویسے شادی کا کب رکھیں؟'' نعیمہ تو شادی کی تاریخ بھی رکھنے کا سوچ کر آئی تھیں۔

''بھابی، آپ کی اپنی بچی ہے جب دل چاہے لے جائیں...... اور یہ تو خوشی کے آنسو ہیں شاید بے اختیار آگئے آنکھوں میں۔'' جویریہ کی بات سن کر نعیمہ نے انہیں گلے لگالیا۔

☆☆☆

''رمشا...... ہاں کیسی ہو؟ مجھے تمہاری مدد چاہیے۔'' میشل نے رمشا کو فون کیا تھا۔

''اتنے دنوں بعد میری یاد آئی ہے اور وہ بھی کام کے لیے؟ جاؤ میں ناراض ہوں۔'' رمشا نے خفگی نے کہا۔

''اوہو یار، یہاں میں پھنسی ہوئی ہوں معظمہ میں اور تم شکایت لے کر بیٹھ گئی ہو۔'' میشل نے عجلت میں کہا۔

''اچھا، اچھا بتاؤ کیا ہوا ہے؟'' رمشا نے پوچھا۔

''یار امی بھائی کا رشتہ اس سے کروا بیٹھی ہیں۔''

''کیا کہہ رہی ہو؟ معظمہ اور آذر بھائی؟ پھر اب؟'' رمشا نے میشل کی بات پوری ہوئے بغیر کہا۔

''ہاں ناں یار، بس کچھ کرکے یہ ختم کرواؤ۔'' میشل نے اپنا مسئلہ بیان کردیا تھا۔

میشل اپنے اسی مشغلے میں واپس آگئی تھی، دوسری طرف شادی کی تیاری ہو رہی تھی، راحم کو بھی معلوم ہوا تو حیرت بھی ہوئی مبارکباد دینے بھی گیا۔

معظمہ کا ڈر اب بھی موجود تھا...... اسے لگا پھر سے راحم کی طرح شادی سے پہلے سب ختم ہو جائے گا۔

دوپہر کا وقت تھا جب آذر اپنے کولیگ کے ساتھ گھر آیا۔

''یا اللہ آذر...... یہ کیا ہوا ہے؟'' نعیمہ نے بھی آذر کو سہارا دیا۔

''کچھ نہیں آنٹی لنچ کرکے آرہے تھے کہ گاڑی نے ٹکر ماردی۔'' آذر کے کولیگ نے جواب دیا۔

''اُف کتنی بری حالت کردی ہے میرے بچے کی...... آؤ میں کمرے تک ساتھ لے چلوں۔'' اور نعیمہ نے بھی سہارا دیا۔

شام تک سب اس کے کمرے میں جمع ہو چکے تھے......

''آذر بھائی یہ دیکھیں میں ناں آپ کے لیے چاکلیٹس لائی ہوں۔'' منال نے شاپر آذر کے حوالے کیا۔

''اتنی ساری چاکلیٹس؟ صرف میرے لیے؟'' آذر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہاں جی سب آپ کے لیے ہے اب مرضی ہے جسے کھلانا چاہیں۔'' منال نے اتراتے ہوئے اپنی طرف اشارہ کیا۔

''اچھا، اچھا اگر میری مرضی ہے تو میں پھر سب کی سب معظمہ کو دے دوں گا۔'' آذر نے چھیڑتے ہوئے کہا۔

''حد ہے لائی میں ہوں اور دیں گے آپی کو؟'' مصنوعی خفگی سے کہا۔

''ارے میری چھٹکی، تینوں مل کر کھائیں گے بس اب خوش۔'' تھوڑا سا اٹھنے کی کوشش کرکے اس نے ہاتھ بڑھا کر منال کے سر پہ پھیرا۔

''جانتی ہو، امی کی خواہش تھی کہ تم سے شادی ہو۔'' پلیٹ سائڈ میں رکھ کر وہ بولا۔ معظمہ اس کے لیے کچھ خاص بنا کر لائی تھی جبھی اس نے موقع غنیمت جانا۔

''لیکن میں ہر دفعہ منع کر دیتا تھا جانتی ہو کیوں؟'' معظمہ نے آذر کو دیکھا اور گھبرا کر آنکھیں جھکالیں۔

''مجھے میشل نے اتنا کچھ کہہ رکھا تھا اور پھر اس نے ہی تمہارے منگیتر سے شادی کرلی اس کے بعد تم سے اس دن باتیں ہوئیں...... مجھے لگا میں واقعی معظمہ کو جانتا ہی نہیں ہوں، ہاں اتنا جانتا تھا جتنا مجھے کسی اور نے بتایا، خود سے کبھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی۔'' وہ آنکھیں بند کیے گمبھیر انداز میں کہہ رہا تھا۔

''پلیز ابھی آپ آرام کریں...... میں چلتی ہوں۔'' معظمہ نے جانا چاہا۔

''میری بات ابھی پوری نہیں ہوئی ہے، بیٹھ جاؤ۔'' آذر نے کہا تو وہ بیٹھ گئی۔

''اس دن تم ڈری ہوئی تھیں ناں کہ میں بھی تمہیں چھوڑ نا دوں گا۔'' آذر اٹھا اور اس کے نزدیک ہوگیا۔

''دیکھو...... جو بھی ہوا بھول جاؤ، میں نے سنی سنائی بات پہ تم سے برابر تاؤ رکھا اور اب مجھے احساس ہوا ہے کہ میں برا تھا جو اتنی اچھی تھوڑی بے وقوف سی ڈری، ڈری سہمی سی لڑکی کو سمجھ نہ سکا۔''

''یہ آپ میری تعریف کر رہے ہیں یا الٹا میرا مذاق اڑا رہے ہیں؟'' آذر ہنسا اور معظمہ کو دیکھنے لگا۔

''مذاق اب کوئی اڑا کے دکھائے! تمہارے چہرے پر میرے پیار کا رنگ ہوگا ناں تو کوئی مذاق اڑانے کا سوچے گا بھی نہیں۔'' آذر کی باتیں معظمہ کو حیران کر رہی تھیں۔

خوف کے بادل چھٹ چکے تھے...... معظمہ کو اب سب اچھا لگنے لگا تھا......

☆☆☆

''میشل۔'' راحم نے میشل کو رمشا سے بات کرتے ہوئے سن لیا تھا۔ وہ تعویذ وغیرہ کی بات کر رہی تھی۔ اس لیے پکارا۔

''آپ...... آپ کب آئے؟'' میشل نے فون بیڈ پہ پھینکا اور گھبرا اٹھی۔

''چٹاخ۔'' راحم نے زوردار تھپڑ دے مارا جو میشل بیڈ پہ اوندھی گر پڑی۔

''تم اتنی ذلیل اور گھٹیا لڑکی ہو مجھے اندازہ ہی نہیں تھا...... اپنے بھائی تک کو نہ چھوڑا؟ تم تعویذات کرواتی ہو؟ کس کے لیے یہ سب کر رہی ہو ہاں؟ میں تو مل گیا ناں تمہیں پھر اب کیوں؟'' راحم بہت غصے میں تھا۔

''راحم میری بات تو سنیں۔'' اس کی پھٹی، پھٹی آواز نکل رہی تھی۔

''کیا تمہیں مجھ سے پیار نہیں تھا؟ بس معظمہ کو نیچا دکھانا چاہتی تھیں؟''

''راحم میری بات تو سنیں، ایسا کچھ نہیں ہے۔ مجھے واقعی آپ سے......''

''تم ابھی اسی وقت چلو میرے ساتھ۔'' راحم

نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کھینچتا ہوا اسے باہر لے آیا۔
''راحم کہاں لے کر جارہے ہیں مجھے؟'' میشل روتی رہی۔ ''راحم میری بات تو سنیں۔''
''چپ ایک دم چپ...... ایک لفظ نہ بولنا اب۔''
راحم نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اندر بٹھایا اسے۔
یہ دونوں میشل کے میکے پہنچ چکے تھے۔
''امی، ابو......''
''ارے راحم بیٹا؟'' نعیمہ بھی اس وقت انہیں دیکھ کر حیران ہوئیں اور باقی سب بھی نشستوں سے اٹھ چکے تھے۔
''میشل...... اسے کیا ہوا راحم اور یہ رو کیوں رہی ہے؟'' نعیمہ نے میشل کو دیکھا اور گلے لگالیا۔
''مجھے یقین نہیں آرہا میشل کس قدر زہر بھرے بیٹھی ہے اپنے دل میں سب کے لیے۔'' راحم بولا سب اسے دیکھنے لگے۔
''ہوا کیا ہے راحم؟'' شیراز صاحب نے پوچھا۔
''اس لڑکی نے تعویذ کروائے جس کی وجہ سے آذر بھائی کی یہ حالت ہوئی ہے بلکہ یہ ہی نہیں یہ تو پہلے بھی بہت کچھ کرواچکی ہے۔'' راحم نے فون والی بات گوش گزار کردی۔
''میشل؟ تم نے پھر ایسی حرکت دُہرائی؟ کیا ملتا ہے یہ سب کر کے تمہیں؟'' نعیمہ نے پوچھا۔
''امی میں نے کچھ نہیں کیا، میں نے کچھ نہیں کیا، میں نے...... میں نے نہیں چاہا تھا بھائی کے ساتھ ایسا ہو۔'' وہ بلک، بلک کے رو رہی تھی۔
''تم جیسی بیٹی پر تو اب بھروسا ہی نہیں رہا۔'' شیراز صاحب نے چیخ کر کہا۔ اسے حیرانی ہوئی جان کر کہ یہ سب پہلے سے ہی جانتے تھے۔
''مجھے معاف کردیں کہ میں اس لڑکی کی باتوں میں آگیا اور معظمہ سے دور ہوگیا...... میں اسے ابھی اسی وقت طلاق دینا چاہتا ہوں۔''
''ایک منٹ۔'' معظمہ نے راحم کی بات سن کر کہا۔
''رشتوں کو پامال کرنا بھی کوئی تم سے سیکھے راحم، میشل نے تو پیار کیا تھا یا مجھ سے نفرت میں آکر تمہیں اپنا کیا پر تم نے کیا، کیا؟ میں تو تمہارا پیار تھی ناں؟ تم نے مجھے ٹھوکر ماری تو آج تمہیں یہ جان کر غصہ آرہا ہے کہ میشل تمہیں پانے کے لیے یہ سب کرتی تھی؟ اب یہ تمہیں بری لگنے لگی ہے تو اسے بھی چھوڑ دو گے؟ یہ تمہاری سزا ہے راحم اور شاید اب میشل کی بھی کہ تمہارے دل میں اس کے لیے وہ جذبات ختم ہونے لگے ہیں۔'' معظمہ میں اب اتنی ہمت آگئی تھی کہ وہ بول سکے۔
''رشتے توڑنا آسان ہے مسٹر راحم لیکن ایک دفعہ جوڑ کر نبھانا مشکل...... بہت نازک ہوتے ہیں یہ رشتے اور تم رفاقت کے رشتے کو توڑنا چاہتے ہو؟'' سب آج معظمہ کو چپ کر کے سن رہے تھے۔
''تم نے مجھے برا سمجھ کر چھوڑ دیا اب میشل کے ساتھ تو ایسا نہ کرو، بیوی ہے وہ تمہاری۔'' معظمہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہونے لگے۔
''معظمہ...... میں کیا کہوں اب۔'' میشل اس کے پاس آکر بولی۔
''کچھ نہیں میشل...... اب کچھ بچا نہیں کہنے کو۔'' آنسو صاف کرتے ہوئے معظمہ بولی۔
''مجھے معاف کردو معظمہ، میں واقعی اپنے کیے پہ شرمندہ ہوں، میں نے نفرت میں آکر یہ سب کیا، راحم کو تم سے دور کیا، حتیٰ کہ آذر بھائی کے دل میں بھی تمہارے خلاف زہر بھرا اسی لیے میں نہیں چاہتی تھی کہ یہ رشتہ ہو اور آج میری بے وقوفی کی وجہ سے میرے بھائی کی یہ حالت ہوگئی اور میرا گھر برباد ہو رہا ہے۔'' میشل نے بھی رونا شروع کردیا۔
''جاؤ میں نے معاف کیا جانتی ہو کیوں؟ کیونکہ تمہارے بھائی نے اس ٹھکرائی ہوئی لڑکی کو اپنانے کا سوچا، اسے حوصلہ دیا، ساتھ نہ چھوڑنے کی بات کی، ایسے بندے کی تم بہن ہو اس لیے تمہیں معاف کیا۔'' معظمہ اپنے پورشن کی طرف بھاگ گئی تھی۔

❋❋

درد، تکلیف اور دُکھ

عقیلہ حق



کبھی، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہمارے پاس ڈگریوں کے ڈھیر ہوتے ہیں، ہماری الماریوں کے شیلف ہمارے اعزازات سے بھرے ہوتے ہیں، دیواروں پر خوب صورت فریموں میں سجے ہمارے سرٹیفکیٹ ہم کو ایک سرور بھرے فخر میں مبتلا رکھتے ہیں، ساری زندگی ہم A+ پر رہتے ہیں، ہمارا آئی کیو لوگوں کو حیران کر دیتا ہے، ساری زندگی ہم دوسرے لوگوں سے دو قدم آگے رہتے ہیں، ہم عام نہیں رہتے ہم خاص ہو جاتے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود بعض اوقات ایک لفظ کو سمجھنے میں ساری زندگی لگ جاتی ہے۔اور جب بظاہر اس چھوٹے سے لفظ کے معنی سمجھ میں آتے ہیں تو......

☆☆☆

مجھے ہمیشہ محبتیں بانٹنا اچھا لگتا ہے......انسان محبت کی فطرت پر پیدا ہوا ہے تو اسے محبت ہی کرنی چاہیے۔ اللہ پاک اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے، ایک محبت کرنے والی ماں سے بھی ستر گنا زیادہ تو پھر بندہ بندے سے محبت کیوں نہ کرے۔

آج زندگی کے اس موڑ پر کھڑی میں سوچ رہی ہوں کہ محبتیں بانٹتے بانٹتے کبھی ہمیں سامنے والے کی آنکھوں میں بھی دیکھ لینا چاہیے کہ وہ ہماری محبت کو محبت سمجھ بھی رہا ہے یا پھر......

آج جب عمر کی نقدی ختم ہونے جا رہی ہے......اور روزمرہ بولے جانے والا وہ ''لفظ'' میرے سینے میں چبھ رہا ہے۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں اس ''لفظ'' کو آپ کے ساتھ شیئر کروں۔

پتا نہیں مجھے شیئر کرنا بھی چاہیے۔مگر میرے ذہن میں ایک سوال ابھر آتا ہے۔کیا آپ جانتے ہیں درد، تکلیف اور دُکھن میں کیا فرق ہے؟

آپ سوچ رہے ہوں گے میں پاگل ہوں؟ ایک ہی لفظ کو مختلف انداز سے پوچھ رہی ہوں۔

اگر آپ یہ سوچ رہے ہیں تو آپ بالکل غلط سوچ رہے ہیں اور آپ ان لفظوں کے فرق کو نہیں جانتے، میں بھی آج سے پہلے نہیں جانتی تھی۔

درد اور دُکھن کے فرق کو سمجھنے میں مجھے پچیس سال لگے......ہاں پچیس سال یعنی چوتھائی صدی......آپ لوگ بھی سوچ رہے ہوں گے یہ آج میں کیا لکھے جا رہی ہوں؟ فلسفہ یا زندگی کی کہانی......

میں خود بھی الجھ ہی رہی ہوں......

☆☆☆

''یار میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کسی بات کو سیریس کیوں نہیں لیتیں......'' شازیہ نے تلملا کر مجھ سے کہا۔

''لو......اس میں سیریس لینے والی کون سی بات ہے۔'' میں نے چپس کے پیکٹ کو الٹ کر جھاڑا۔ ''شاید کوئی ٹوٹا پھوٹا، اٹکا ہوا چپس دریافت ہو جائے ویسے چپس کی تھیلی خالی ہونے کے بعد خالی پیکٹ سے جو چورا ملتا ہے اس کی خوشی ہی الگ ہوتی ہے۔'' میں نے شازیہ کی طرف دیکھتے حد درجہ سنجیدگی سے کہا۔

''دفع ہو تم، تم کبھی سیریس ہو ہی نہیں سکتیں۔'' شازیہ میرے انداز اور پھر میرے جملے پر جل ہی تو گئی۔

شازیہ چار بہنیں تھیں، ان کا کوئی بھائی نہیں تھا، وہ اپنے خالہ زاد خالد سے بچپن سے بہت انسیت رکھتی تھی، وہ اس کے لیے اس کا بھائی تھا، دوست تھا، غمگسار اور راز دار بھی تھا......لیکن آج صبح جب خالد نے فون پر... اسے پروپوز کیا تو وہ شدید شاک کی کیفیت میں تھی۔

''دیکھو میری جان ان رشتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، تم لاکھ...اسے اپنا بھائی سمجھو، وہ تمہارا بھائی ہے تو نہیں ناں......یہ نامحرم رشتے، ہمیشہ نامحرم ہی رہتے ہیں، تم دونوں ایک دوسرے کو پسند ضرور کرتے تھے لیکن دونوں کی سوچ کا انداز بے حد مختلف تھا۔اب ظاہر ہے...تمہیں تکلیف تو ہوگی ناں......'' اپنے مزاج کے برخلاف میں نے بے حد سنجیدگی سے شازیہ کو تکلیف کے اس فیز سے باہر لانے کی کوشش کی۔

''تم کیا تکلیف، تکلیف کی رٹ لگائے جا رہی ہو، ارے میرا کیا چلتے، چلتے پیر مڑ گیا ہے، ارے بی بی میرا دل ٹوٹا ہے، مجھے دکھ ہوا ہے، دکھ......'' شازیہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے دل پر رکھتے ہوئے تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔

''تو میری بہن، میں بھی تو یہی کہہ رہی ہوں، دُکھن ہو یا درد کیا فرق پڑتا ہے۔'' میں اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔شازیہ نے ایک لمحے کو میری طرف دیکھا۔

''ہوتا ہے بہت فرق ہوتا ہے......لیکن تم نہیں سمجھو گی، سب بیکار ہے۔'' اس نے گھاس پر پھیلی کتابیں سمیٹیں اور پھر کپڑے جھاڑتے ہوئے افسردگی سے کہتے ہوئے، ایک ہاتھ بڑھا کر میرا دایاں ہاتھ تھاما

اور اٹھنے میں میری مدد کی، میں کھڑی ہوئی تو وہ مجھے وہیں چھوڑ کر تیز، تیز آگے چلتی چلی گئی......اور میں اس کے قدموں کے نشانوں پر نظریں جمائے اپنے آپ سے الجھ رہی تھی کہ درد اور دُکھن میں کیا فرق ہے۔

لیکن آج شازیہ میں تم سے کہنا چاہتی ہوں، زندگی دوڑتی بھاگتی ہاتھوں سے پھسل گئی۔ لیکن ہاں......آج میں سمجھ سکتی ہوں۔ درد اور دُکھن میں فرق ہوتا ہے......بہت فرق ہوتا ہے۔

☆☆☆

آج عمرِ رفتہ کی گتھیاں سلجھانے بیٹھی تو سمجھ آیا کہ ہاں فرق ہوتا ہے لیکن بعض اوقات اس فرق کو سمجھنے میں ہم کتنا وقت لگا دیتے ہیں......کبھی، کبھی ساری زندگی اس فرق کو سمجھنے میں لگ جاتی ہے۔

ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے، ہر ابتدا کی انتہا ہوتی ہے۔ ہر شروع کا آخر بھی ہوتا ہے، بالکل اسی طرح جذبوں، محبتوں، رشتوں کو سنبھالنے کا بھی ایک وقت ہوتا ہے اور پھر جذبوں محبتوں اور رشتوں کو سنبھالتے، سنبھالتے ہم ایک دن اس جگہ پر آ کھڑے ہوتے ہیں، جہاں آج میں کھڑی ہوں پیچھے کھائی اور آگے کنواں......

☆☆☆

اپنے سر پر ساتوں آسمانوں کا بوجھ اٹھائے، پیروں سے سرکتی زمین پر اندر سے چٹختا، ٹوٹتا ہوا بدن لے کر، آج جب اس لفظ کی سمجھ آئی تو میرا دل اس بات پر رو رہا ہے کہ جب ساری زندگی نا سمجھی میں گزر گئی تو کاش یہ لمحۂ آگاہی آج بھی نہ آتا......بعض اوقات آگہی عذاب بن جاتی ہے۔ اور عذاب ہر صورت میں ناقابلِ برداشت ہی ہوتا ہے۔

☆☆☆

''اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟'' میری برسوں کی بچھڑی دوست شازیہ محبت سے میرے ہاتھ کی پشت سہلاتے ہوئے مجھ سے پوچھ رہی تھی۔

''کیا میری طبیعت خراب ہے؟'' ہاتھ میں چبھتے کینولا کی تکلیف کو نظر انداز کرتے ہوئے، آس پاس لگی

غزل

رنگ اترنے میں بہت دیر لگی
دل ٹھہرنے میں بہت دیر لگی
تیری آنکھوں کی طرح گہرا تھا
زخم بھرنے میں بہت دیر لگی
بات کرنا تھی ذرا سی تجھ سے
بات کرنے میں بہت دیر لگی
کٹ گئی رات تیرے خوابوں میں
دن گزرنے میں بہت دیر لگی
کب سمیٹا تھا کسی نے مجھ کو
کب بکھرنے میں بہت دیر لگی
زندگی گزری ہے ہر دن میری
سعد مرنے میں بہت دیر لگی

انتخاب: رضیہ بیگم، گجرات

شہرِ خموشاں

مکلی
دیکھا ہے
اک
تیرے
جانے سے
میرا دل
ایسا ہے

از: صبا نور، لیہ

تعلق

تعلق بھی رزق کی طرح ہوتا ہے۔
اگر بد نیتی، بدگمانی آجائے تو برکت اٹھ جاتی ہے

از: سحرش نواز، گجرات

مشینوں کو دیکھتے ہوئے میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔

مجھے اپنی آپا اور ان کے بچوں سے بہت محبت ہے، محبت ہے یا تھی؟ نہیں محبت میں کبھی تھی کا صیغہ استعمال نہیں ہوتا، محبت بس ہوتی ہے تو میں بتا رہی تھی کہ مجھے اپنی آپا اور ان کے بچوں سے بہت محبت ہے اور کیوں نہ ہو۔ ہم لوگ برسوں ایک ہی چھت تلے رہے ہیں، آپا کے بچوں اور مجھ میں زیادہ فرق نہیں ہے، ہم دو ہی تو بہنیں ہیں آپا اور میں...... اماں بتاتی تھیں کہ آپا کے بعد میرے یکے بعد دیگرے پانچ بھائی پیدا ہوئے لیکن جی کوئی نہیں سکا...... تو یوں آپا مجھ سے پندرہ سال بڑی تھیں، جب آپا کی شادی ہوئی تو میں پرائمری میں پڑھتی تھی...... مجھے دولھا بھائی پر بہت غصہ آتا تھا کہ وہ میری آپا کو لے گئے لیکن..... میری خوب صورت سی آپا، جب بہت سارا زیور پہن کر آتیں تو وہ مجھے اپنی اس گڑیا سے بھی زیادہ حسین لگتیں جو ابا نے مجھے لا کر دی تھی۔ اور جسے میں سارا دن اپنے سینے سے لگائے گھومتی رہتی۔

آپا کے اوپر تلے چار بچے ہو گئے تھے، دو بیٹے اور دو بیٹیاں، آپا کے بچے میرے جیتے جاگتے کھلونے تھے۔ عمر کی منزلیں میں اور آپا کے بچے آگے پیچھے طے کر رہے تھے۔ دولھا بھائی ملک سے باہر چلے گئے اور آپا اکثر میکے رہنے آ جاتیں، آپا آتیں تو مجھے کھیلنے کو جیتے جاگتے کھلونے مل جاتے اور آپا آرام کرتیں...... خوب آرام...... میں ان کے بچوں کو سارے محلے میں لیے پھرتی، ایک کو گود میں اٹھاتی تو دوسرے کو اسٹرالر میں لٹاتی۔ ایک کی انگلی پکڑتی اور چل پڑتی، کبھی کھیلتی، کبھی کھلاتی، کبھی ہنستی کبھی ہنساتی، بس یوں سمجھیے میں نے اپنے بچپن میں آپا کے بچوں سے وہ محبت کی جو آج خود چار بچوں کی ماں ہونے کے باوجود میں اپنے بچوں سے نہیں کر سکتی۔ اپنے بچوں کا میں خیال رکھتی ہوں ”ممتا“ تو میں ساری اس وقت لٹا چکی جب مجھے خود ممتا کا مفہوم نہیں معلوم تھا۔

صرف آپا یا آپا کے بچے ہی کیا، میں نے زندگی بھر ہر جذبہ، دکھ اور درد کے احساس سے عاری، محبتوں سے چور ہر ایک پر لٹایا، میں صرف سوچ کر رہ گئی......

☆☆☆

شازیہ اور یسریٰ دونوں بچپن کی سہیلیاں تھیں شاید اس زمانے کی جب بچے دوستی کے مفہوم سے بھی... نا آشنا ہوتے ہیں، اول کلاس سے لے کر بی ایس سی تک دونوں نے ساتھ پڑھا، ایک دوسرے کی ہم مزاج اور غمگسار...... پھر شازیہ، شادی ہو کر کینیڈا چلی گئی۔ اور یسریٰ...... زندگی کی الجھنوں میں ایسی الجھی کہ ڈوری کا سرا جس کے دوسرے کنارے پر شازیہ کھڑی تھی، اس کے ہاتھ سے پھسل گیا۔ لیکن برسوں بعد جب فیس بک پر اسے ڈھونڈتی شازیہ اس سرے تک پہنچی جس کے دوسرے کنارے پر یسریٰ کھڑی تھی تو اس نے یسریٰ کو اسپتال کے بستر پر پایا۔

آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے‘ خشک ہونٹوں پر جمی پپڑیاں اور چہرے پر چھائی زردی......

سرخ و سفید رنگت، پانچ فٹ سات انچ آئیڈیل قد، سنگ مرمر کی طرح تراشا بدن، صراحی دار گردن پر دمکتا سیاہ تل، کمر پر لہراتی بل کھاتی چوٹی، چہرے کا ایک‘ ایک نقش، حسن کا غماز......

”یہ وہ یسریٰ تو نہیں...... یہ کون ہے؟“ شازیہ نے بہت دکھ سے اپنے آپ سے سوال کیا...... لیکن...... لیکن سے آگے وہ معلوم کرنا چاہتی تھی، کھوجنا چاہتی تھی...... لیکن کیسے؟

☆☆☆

مجھے معلوم ہے شازیہ میری دوست، میری بہن...... نہیں، نہیں میری دوست میرے پاس بیٹھی بہت محبت سے میرے ہاتھوں کی پشت سہلا رہی ہے، وہ میری حالت پر الجھ رہی ہے اور آنکھیں موندے، موندے کئی بار چپکے سے میں نے اس کی طرف دیکھا لیکن آنکھیں کھولنے۔ جبکہ اب میری آنکھیں کھل چکی ہیں بظاہر آنکھیں کھولنے کی ہمت نہیں ہو رہی لیکن آنکھیں تو کھولنی ہوں گی...... لیکن کیسے......!

میرا دل چاہ رہا ہے، میں کسی سے بہت ساری باتیں کروں مگر......

ہائے اماں زندگی کے کس موڑ پر یاد آئیں...... میری دائیں آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ پھسل کر میرے تکیے میں جذب ہونے سے پہلے سامنے بیٹھی شازیہ نے محبت سے اپنی انگلی کی پور پر سمیٹ لیا...... جیسے میں نے اماں کی دائیں آنکھ سے آنسو اپنی پور پر سمیٹ لیا تھا۔ اماں کی کئی دنوں سے طبیعت خراب تھی، بخار کی شدت تھی۔

''جی اماں جی، بتائیں آپ کو کہاں تکلیف ہو رہی ہے؟'' ڈاکٹر ملک نے اسٹیتھ اسکوپ میری اماں کے سینے پر رکھتے ہوئے نرم لہجے میں پوچھا۔

''ڈاکٹر صاحب تکلیف نہیں ہو رہی، دُکھن ہو رہی ہے۔'' اماں کا لہجہ نم تھا۔

''اچھا تو یہاں آپ کے دُکھن ہو رہی ہے۔'' ڈاکٹر ملک نے اسٹیتھ اسکوپ گلے سے اتار کر ہاتھ میں پکڑا اور پھر اماں کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرم لہجے میں پوچھا۔

''اور یہاں بھی درد ہے کیا؟'' انہوں نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دوبارہ سوال کیا۔

''ہاں ڈاکٹر صاحب، یہاں بھی دُکھن ہو رہی ہے۔''

''اچھا یہاں بھی دُکھن ہو رہی ہے؟'' ڈاکٹر ملک کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی، انہوں نے اماں کی کمر کے نچلے حصے کو اپنے دائیں ہاتھ کی تین انگلیوں سے ہلکا سا دباتے ہوئے پھر پوچھا۔ ''یہاں بھی تکلیف ہے؟''

''تکلیف نہیں ڈاکٹر صاحب دُکھن ہو رہی ہے۔'' اماں نے ڈاکٹر ملک کی بات کی پھر اصلاح کی۔

''ارے نیک بخت یہ کیا لگا رکھا ہے، تکلیف یا درد ایک ہی بات تو ہے۔'' ابا جی کا لہجہ جھنجلایا ہوا تھا۔

''لیکن ہاشمی صاحب آپ کی بیگم کو تو تکلیف یا درد ہو ہی نہیں رہا۔ ان کے تو دُکھن ہو رہی ہے۔'' ڈاکٹر ملک نے اپنا مخصوص قہقہہ لگاتے ہوئے ابا کو ٹوکا۔ ''اور آپ بالکل غصہ نہ کریں، اماں جی ٹھیک کہہ رہی ہیں درد ہوتا ہے اور دُکھن ہوتی ہے، فرق ہوتا ہے ہاشمی صاحب......''

ڈاکٹر ملک نے ہنستے ہوئے ابا کو ٹوکا......اور سب بے ساختہ مسکرا دیے۔ ان مسکراتے لمحوں نے اماں کی آنکھیں گیلی کر دیں۔

ڈاکٹر ملک ہمارے فیملی ڈاکٹر تھے، اماں کی طبیعت کئی دنوں سے خراب چل رہی تھی، ابھی چند دن پہلے بڑے ماموں کے گھر گئی تھیں تو بالکل ٹھیک تھیں پھر اچانک ہی بیمار ہو گئیں۔ آج ڈاکٹر صاحب کلینک بند کر کے ہمارے گھر چلے آئے تھے اور اس وقت ابا کے ساتھ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

اور میں ایک طرف خاموش بیٹھی بستر پر نڈھال لیٹی اماں کو دیکھ کر یہ سوچ رہی تھی کہ درد اور دُکھن کے فرق کو سمجھاتے، سمجھاتے اماں کی آنکھیں گیلی کیوں ہو گئیں۔

درد......تکلیف یا دُکھن...... ایک ہی بات تو ہے۔ لیکن آج پچیس سال گزرنے کے بعد میں یہ سوال اپنے آپ سے کرنے پر مجبور ہو گئی۔

''درد، تکلیف اور دُکھن ایک ہی احساس کے نام ہیں؟''

نہیں......نہیں......کوئی میرے اندر بلبلایا۔ اور آج برسوں کے بعد بالکل اماں کی طرح میری آنکھیں بھی گیلی ہو گئیں......

☆☆☆

ہماری زندگی، ہمارے احساسات، ہمارے رشتے سب کروٹیں بدلتے ہیں، ایک وقت ہوتا ہے کہ ہم اس قدر گہری نیند میں ہوتے ہیں کہ کروٹ تو بڑی بات، کوئی کان کے پاس آ کر ڈھول بھی بجائے تو بھی ہم سوتے رہتے ہیں اور پھر زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ ہلکی سی آہٹ بھی ہماری آنکھ کھول دیتی ہے......اور شاید میرا ابھی وہی وقت ہے کہ......ایک ہلکی سی آہٹ نے مجھے ہلا کر رکھ دیا......لیکن ٹھہریں شاید میں غلط کہہ رہی ہوں یہ ہلکی سی آہٹ تو نہیں تھی یہ تو شاید......خودکش دھماکا تھا جس نے میرے وجود کے پرخچے اڑا دیے تھے۔

اور میرا وجود......

☆☆☆

''کیا مطلب؟ احمد بھائی کے رشتے سے انکار ہوگیا؟ اور تم نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔'' شازیہ میرے سر پر سوال بنی کھڑی چیخ رہی تھی۔

''احمد جمال!'' میرے دل میں ٹیس اٹھی۔

''تم گلابی رنگ میں بہت اچھی لگتی ہو۔'' احمد جمال نے چائے کا کپ تھامتے ہوئے چاروں طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی اور میرا گلابی وجود بیر بہوٹی کی طرح سرخ ہوگیا۔

احمد جمال...... میری محبت تھا، میرا کزن تھا، میری زندگی تھا، میرا دوست تھا، اس سے دوستی کب محبت میں بدلی اور محبت کیسے عشق کی وادیوں میں ڈوبی میں نہیں جانتی لیکن ہاں میں یہ ضرور جانتی ہوں کہ احمد جمال کا وجود میرے لیے آکسیجن سے کم نہیں تھا، وہ میرا دور کا کزن تھا، پہلے کبھی کبھار ہمارے گھر آتا تھا۔ اماں کو اس سے ایک خاص انسیت تھی، وہ اماں کی خالہ کا نواسہ تھا، وہ بہت محبت کرنے والا تھا، بڑوں کا تابعدار اور بچوں کا دلدار...... پھر ابا کی اور اس کی بہت دوستی ہوگئی یا تو وہ بہت ساری سیڑھیاں پھلانگ کر ابا کی عمر تک پہنچ گیا یا ابا کو آہستگی سے وہ جوانی کی دہلیز پر لے آیا پھر ابا سے ملنے یا آپا کے بہانے یا شاید مجھ سے ملنے وہ اکثر آنے لگا۔

محبت کے لیے عہد و پیماں کی ضرورت نہیں ہوتی، اور ہمارے درمیان بھی کوئی عہد و پیماں نہیں ہوئے لیکن محبت تناور درخت بنتی گئی۔

ہر وہ صبح جو یہ نوید دیتی کہ آج شام احمد جمال آئیں گے، میرے لیے سارا دن حسین بنا دیتی......

''میں نے امی سے بات کرلی ہے وہ جلد ہی آئیں گی۔''

میں جو جاتی مئی کی گرم سہ پہر کو مٹی کے پیالے میں سفید موتیے کے پھول توڑ کر رکھ رہی تھی...... احمد جمال کی سرگوشی پر جیسے میں پتھر کی ہوگئی، میرے ہاتھ کپکپائے اور سارے پھول اس کے قدموں میں جا گرے، سفید معصوم، میری محبت کی طرح پاکیزہ موتیا کے پھول۔

پھر ایک، ایک لمحہ انتظار کا ناقابلِ برداشت ہوگیا۔ میں ہر وقت خیالوں میں احمد جمال کے سنگ ہواؤں کے دوش پر اڑتی پھرتی......

دل ہر وقت ایک سرور بھرے انداز میں دھڑکتا رہتا...... احمد جمال نے مجھے محبت کے پاکیزہ رخ سے روشناس کروایا۔

''میں تم سے پوچھ رہی ہوں...... تمہیں دکھ نہیں ہوا، احمد بھائی کے رشتے سے انکار کردیا گیا......'' شازیہ میرے سر پر کھڑی تھی، اس کی آواز مجھے حال میں واپس لے آئی۔

''ہاں بہت تکلیف ہوئی ہے۔'' میرے اندر کوئی رو دیا۔

''وجہ......! وجہ کیا تھی بھلا انکار کی...... ہینڈسم، مالدار اتنے کامیاب ڈاکٹر، اوپر سے رشتے دار...... یااللہ ایسا رشتہ تو نصیب والوں کو ملتا ہے۔'' شازیہ نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

''مجھے تم وجہ بتاؤ...... وجہ......'' شازیہ کا لہجہ بپھرا۔

''بس ابا آپ منع کردیں۔'' آپا ہمیشہ کی طرح اپنی بات پر ڈٹی ہوئی تھیں۔

''آپ کو تو پتا ہی ہے احمد جمال کی بہن کی شادی میرے دیور سے ہوئی ہے، ہر وقت کوئی نہ کوئی مسئلہ میرے لیے کھڑا کیے رکھتی ہے۔ چاپلوس، بی جمالو ہے وہ...... آپ نہیں جانتے کتنی تیز ہے احمد کی بہن...... بس ہر وقت کوئی نہ کوئی مسئلہ میرے لیے کھڑا رکھتی ہے۔''

''مسئلہ وہ نہیں تم کھڑا رکھتی ہوگی، اولاد ہو تم میری، مجھ سے زیادہ کون جانتا ہے تمہیں...... تمہارے ہی اندر برداشت کی کمی ہے۔''

جب تک اماں زندہ رہیں۔ پھر بھی آپا کنٹرول میں رہیں لیکن جب سے اماں کا انتقال ہوا، آپا نے تو گھر پر اجارہ داری ہی قائم کرلی تھی۔

آفاق احمد (ابا) ہمیشہ کی طرح بس سوچ کر رہ گئے لیکن لاڈلی بیٹی کو ٹوکا نہیں۔

''محبتوں کو بلیک میل کس طرح کرتے ہیں یہ بات آپا اچھی طرح جانتی تھیں۔

''بس میں کہہ رہی ہوں ناں ابا آپ منع کر دیں، میری بہن کے لیے کوئی رشتوں کی کمی ہے بس منع کر دیں۔'' آپا کا ہٹ دھرم لہجہ......اس وقت بھی اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔

''اور تمہارے ابا نے منع کر دیا، انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ تم کو کتنا دکھ ہوگا؟''

''ہاں......ناقابلِ برداشت ہے لیکن میں کیا کر سکتی ہوں۔ مجھے آپا سے محبت ہے بہت محبت...... اب آپا کی مرضی نہیں ہے تو میں کیسے انہیں تکلیف دے سکتی تھی، میں برداشت کرنے کی کوشش کروں گی۔'' میں سوچ کر رہ گئی......کہ بولنے کے لیے ایک لفظ بھی نہیں تھا میرے پاس......

''اچھا تم گھنی بنی رہو، تم کو دکھ نہیں ہوا تو کم از کم یہ آنسو تو پونچھ لو جو مسلسل تمہاری آنکھوں سے بہہ کر تمہارے جھوٹ کا پول کھول رہے ہیں۔'' شازیہ نے تلملا کر کہا۔

اور میں نے بے ساختہ آنسو پونچھ ڈالے...... چہرے پر بہتے آنسو تو پونچھنا ہی تھے......دل پر ناسور بننے والے آنسو کون دیکھتا ہے۔

مجھے اپنی آپا سے بے حد محبت تھی......آپا کے بچوں اور ان سے وابستہ ہر شے سے محبت تھی۔

احمد میری زندگی تھے، شاید میں زندگی بھر ایک افسوس کے ساتھ تو جی سکتی تھی لیکن آپا کی بات کو رد نہیں کر سکتی تھی اور آپا......

لیکن آج برسوں پرانا افسوس خود بخود دکھ میں بدل گیا اور اس کی دُکھن سارے وجود میں زہر کی طرح گردش کر رہی ہے......آج عمرِ رفتہ کی آخری سیڑھی پر کھڑی افسوس، ندامت اور تکلیف کو پسِ پشت ڈال کر میں دکھ کے آنسو بہا رہی ہوں......

میرے دل کے ساتھ، ساتھ میرا پورا وجود بھی دکھ رہا ہے۔

☆☆☆

ہر مومن مسلمان کی طرح مجھے بھی اس بات پر یقین تھا اور ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ ہماری تقدیر میں لکھا ہوتا ہے......دعائیں، تقدیریں بدل بھی سکتی ہیں لیکن کبھی، کبھی لوگوں کی بری نیت ہماری تقدیر کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے اور سنورتے کام بگڑ جاتے ہیں...... کچھ لوگ اس قدر بدنصیب ہوتے ہیں کہ وہ برے کام کرنے کے لیے لوگوں کی خوشیاں چھین لینے کے لیے ہی ہوتے ہیں......اگر راہ میں پتھر کوئی غیر نہیں کوئی بہت اپنا رکھے تو پتا ہے کیا ہوتا ہے؟ نہیں پتا ناں......؟ ہاں، مجھے بھی نہیں پتا تھا......لیکن اب؟

☆☆☆

موت برحق ہے اماں چلی گئیں اور ایک رات ابا بھی، آپا کے ہاتھ میں میرا کپکپاتا ہوا ہاتھ تھما کر مجھے ہق دق چھوڑ کر چلے گئے......آپا نے ابا کا گھر بیچ دیا اور میں آپا کے گھر چلی آئی۔

آپا نے بہت جلد میری شادی کر دی......میں آگے پڑھنا چاہتی تھی لیکن آپا میرے حق میں اچھا ہی فیصلہ کریں گی......سو میں سجاد کے گھر بیاہ کر چلی آئی......

سجاد ایک اچھی پوسٹ پر تھے......بھرا پُرا گھرانا تھا، چار نندیں، تین دیور، ساس، سسر میں تو ہمیشہ اکیلی ہی رہی تھی لیکن اتنا بڑا کنبہ اور ہر شخص چاہے وہ مرد ہو یا عورت، ہر معاملے میں ٹانگ اڑانے کی عادت...... میں گھبرا سی گئی......لیکن مجھے گھر تو کرنا ہی تھا۔ عورت، مرد کی محبت کے سہارے ہر چیز، ہر غم، ہر تکلیف سہہ لیتی ہے۔ لیکن مجھے تو شوہر کی محبت بھی نہ مل سکی۔

اور جن عورتوں کو اپنے شوہروں کی جائز حمایت بھی حاصل نہ ہو تو ان کی سسرال میں کیا درگت بنتی ہے، یہ غم بہت سی عورتیں جھیلتی ہیں اگر میں نے بھی جھیل لیا تو کمال تو نہیں کیا ناں......

میری ساس، اکثر مجھے جتاتیں کہ میرے باپ

کے گھر سے ورثہ نہیں ملا، میری نندیں اکساتیں کہ مجھے آپا سے ورثہ مانگنا چاہیے۔

میں اور آپا سے ورثہ مانگوں؟ نہ میں تو مانگ ہی نہیں سکتی۔ ابا کا گھر اور دوسری کئی جائدادیں کئی کروڑ کی فروخت ہوئی تھیں پھر وہ سارا پیسہ دولھا بھائی نے کاروبار میں لگا دیا... ان بیچاروں کو بہت نقصان ہوا، اس زمانے میں میری شادی طے ہوگئی...... آپا بہت پریشان تھیں، میں نے آپا سے صاف کہہ دیا کہ وہ میرے لیے پریشان نہ ہوں، جو بنے وہ دے دیں کوئی قرض، ادھار نہ لیں اور یوں آپا نے بہت معمولی سے جہیز کے ساتھ مجھے رخصت کر دیا......

سجاد کی فیملی لاکھوں کے جہیز کی امید رکھ رہی تھی...... اور ان کی امیدوں پر پانی پھرا تو انہوں نے جیسے میرے لیے ایک، ایک خوشی حرام کر دی۔

سجاد میرے آگے بہت معمولی شکل صورت کے مالک تھے شادی کے ابتدائی دنوں میں بہت لگاوٹ دکھاتے اور پھر وہ ایسے بدلے کہ کتنے مہینوں میں ان کی قربت اور مسکراہٹ کو ترستی۔

انہوں نے بہت جلد محبت اور ضرورت کا فرق سمجھا دیا...... اور پھر ایک مرد کی ضرورتوں نے مجھے چار بچوں کی ماں بنا دیا...... چار بچوں کی ماں بننے کے باوجود میں محبت کے چند لفظوں کو ترستی رہتی۔ کبھی، کبھی میرا دل چاہتا کہ سجاد سے پوچھوں۔

مجھ میں کیا کمی ہے؟

میری طرف دیکھتے کیوں نہیں؟

مجھ سے محبت کرو......؟

اگر محبت کرتے ہو تو اظہار بھی کرو، گناہ کی طرح چھپاتے کیوں ہو...... اور جو محبت نہیں کرتے تو چار بچوں کی یہ زنجیریں میرے پیروں میں کیوں ڈال دیں...... تمہاری سردمہری اور خاموشی میری جان لے لے گی...... لیکن میں صرف سوچ کر رہ جاتی۔

میری شادی کے بعد دولھا بھائی کا کاروبار بہت چمکا، شاید میرا ہی نصیب کھوٹا تھا، آپا ناظم آباد سے ڈیفنس شفٹ ہوگئیں۔ آپا کی بڑی بیٹی کی شادی ایک بہت بڑے خاندان میں ہوئی، مجھے تب خوشی ہوئی لیکن نہ جانے کیسے، میں ایک ہی تو بہن تھی، آپا مجھے ویسے میں بھلانا بھول گئیں......

سجاد نے طعنے دے، دے کر میرا کلیجا چھلنی کر دیا، میں نے آپا سے کہا تو وہ بیچاری شرمندہ ہوگئیں۔

''اب ہو جاتی ہے انسان سے غلطی، ورنہ آپا تو مجھ سے اتنا پیار کرتی ہیں، اپنے بچوں سے بھی زیادہ......'' میں نے اپنے آپ کو تسلی دی۔ مجھے آپا کی بیٹی کی دعوت بھی تو کرتی تھی۔

میرے پاس سب کچھ تھا لیکن خوشی......! ہاں خوشی نام کی چڑیا میرے پاس نہیں تھی، مجھے سجاد سے محبت تھی لیکن سجاد کی اپنی ایک دنیا تھی اور اس دنیا میں، میں نہیں تھی۔

لیکن میں کیوں نہیں تھی؟ یہ سوال میں اکثر اپنے آپ سے پوچھتی...... لیکن جواب کا کوئی سرا میرے ہاتھ نہیں لگتا اور آج جب......

☆☆☆

زندگی کی اس آخری سیڑھی پر کھڑی، آج میں اس نتیجے پر پہنچی یہ چمک دمک، زیور، کپڑے، شاندار گھر اور چمچماتی گاڑیاں خوشی کا سبب نہیں ہوتیں۔

اگر بہت سارے رنگ برنگے کپڑے خوش نصیبی کی علامت ہوتے تو شاید دھوبی دنیا کا خوش قسمت ترین انسان ہوتا، جھونپڑی میں بیٹھی مسکراتی عورت، محل میں خاموش، سسکتی عورت سے ہزار درجے بہتر ہے...... لیکن آج...... آج یہ سب میں کیوں سوچ رہی ہوں؟ کیا میں ساری زندگی سوتی رہی...... اور اب اور اب...... اب کیوں اٹھی ہوں؟ آپ یہی سوچ رہے ہیں ناں...... ٹھہریں میں بتاتی ہوں، ذرا ہاتھ کی پشت پر لگا کینولا بہت چبھ رہا ہے......

اللہ کرے کوئی آ کر دکھ کا یہ کانٹا نکال دے۔

☆☆☆

''آج میں آپا کے گھر چلی جاؤں؟'' سجاد کو چائے

کا کپ پکڑاتے ہوئے میں نے لجلجاتے لہجے میں پوچھا۔

مسئلہ یہ تھا سجاد کے پاس تو میرے لیے ٹائم تھا ہی نہیں، ان کی زندگی اور مصروفیات میں تو میں کہیں نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ مجھے کہیں آنے جانے ذرا مشکل سے ہی دیتے۔ اکثر مجھے، میری سہیلیاں، میرے خاندان والے، میری آپا سب یاد آتے تو مجھے لگتا میرا دل کسی نے مٹھی میں لے کر بھینچ دیا ہو کہ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے اپنے سارے خاندان کی غم و خوشی سے دور میں کتنی اکیلی ہوں۔

تنہائی انسان کو قطرہ، قطرہ پگھلا دیتی ہے اور میں، میرا وجود نہ جانے کیسے مٹی کے آدمی کے ہاتھوں میں مٹی میں، جیتی زندگی ہی میں رُل گیا۔

''کیوں......؟'' سجاد کا لہجہ ہمیشہ کی طرح کھردرا تھا۔

مجھے آج ہی پتا چلا کہ آپا اپنی منجھلی بیٹی کی منگنی احمد جمال کی اس بہن کے بیٹے سے کر رہی ہیں جو اُن کی دیورانی ہے اور جس کی بدمزاجی کے قصے وہ کل تک کڑواہٹ بھرے لہجے میں سنا رہی تھیں۔

''بس ایسے ہی بہت دن ہوگئے، آپا یاد آرہی ہیں ..چلی جاؤں؟'' میں نے بات کو مروڑتے ہوئے امید بھرے لہجے میں پوچھا۔

''کیوں......؟ اتنی یاد آرہی ہے آپا کی...... وہاں کوئی آرہا ہے کیا؟'' سجاد کا لہجہ طنزیہ اور آنکھیں سوالیہ تھیں۔

''کیا مطلب......؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

سجاد نے ہمیشہ کی طرح میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے دوبارہ کتاب کھول لی اور میں ان کا چہرہ تکتی رہی۔

''جلدی آجایئے گا، پتا نہیں آپ لوگوں کی جان اپنے میکے میں کیوں اٹکی رہتی ہے، میاں کے گھر کو ہمیشہ پرایا ہی سمجھتی ہیں آپ لوگ؟''

سجاد نے جاہل ساس، نندوں کی طرح باتیں سنائیں۔

نعت رسولؐ

سبق دے کر اخوت کا نبیؐ نے
لُٹائے ہیں محبت کے خزینے
سلام انؐ پر کہ جن کے نقش پا سے
فروغِ جوش پایا روشنی نے
غلامانِ محمدؐ کا ہے ایماں
بچائیں گے وہ طوفاں میں سفینے
فری اپنی بھی قسمت آسماں سے
بلائیں گے میرے آقاؐ مدینے

کلام: فریدہ جاوید فری، لاہور

عورت کا کوئی گھر کب ہوتا ہے سجاد صاحب...... پہلے باپ کا گھر پھر بھائی کا گھر پھر میاں کا گھر اور پھر بیٹے کا گھر، وہ بیچاری تو ساری زندگی در بدر رہتی ہے، اس کے تو حقدار بدلتے رہتے ہیں، مردوں کے اس معاشرے میں ساری زندگی تیاگ کر بھی عورت ایک چھت کی مالک نہیں ہوتی...... میں ہمیشہ کی طرح سوچ کر رہ گئی۔

☆☆☆

''آپا کہاں ہیں؟'' میں نے آپا کے وسیع و عریض گھر کے لاؤنج میں کھڑے ہو کر چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے اپنے آپ سے پوچھا۔

میں ابھی، ابھی آپا کے گھر میں داخل ہوئی تھی۔

سارے گھر میں عجیب سا سناٹا تھا جبکہ دروازے پر کھڑی گاڑی بتا رہی تھی کہ آپا گھر میں ہی ہیں۔ میں لاؤنج سے ہوتی ہوئی آپا کے بیڈروم میں چلی آئی، پہلے دروازہ کھٹکھٹایا، پھر کوئی جواب نہ پا کر میں اندر داخل ہوگئی۔ باتھ روم سے گرتے پانی کی آواز آپا کی موجودگی کا پتا دے رہی تھی۔ میں نے بوریت سے بچنے کے لیے کاؤچ پر پڑی ڈائری اٹھالی اور پھر......

☆☆☆

''میں ہمیشہ ہی سے امی، ابا کی لاڈلی تھی، اوپر تلے بھائیوں کی وفات نے ابا اور اماں کو میرے بارے میں بہت حساس کر دیا، ایک عام سے گھر میں، میں شہزادیوں کی طرح رہتی تھی۔ مائیں تو عموماً بچوں سے چاہت کا اظہار کرتی ہی ہیں لیکن میرے بارے میں تو ابا بھی بہت حساس تھے۔ میں جہاں پیر رکھتی، وہاں ابا اپنی ہتھیلی رکھ دیتے۔

میں اکلوتے پن کے مزے لوٹتی پندرہ سال کی ہوگئی، ہر سال میری سالگرہ ایسے منائی جاتی، جیسے پہلی سالگرہ ہو۔ اماں اور ابا میری ہر خواہش کو پوری کرنا جیسے فرض سمجھتے...... پھر یہ منحوس پیدا ہوگئی، یسریٰ ویسے تو میری چھوٹی بہن ہے لیکن مجھے ہمیشہ سے ایک ڈائن لگی، جس نے پیدا ہوتے ہی سب سے پہلے میری اہمیت کو کھالیا، اماں اور ابا اب بھی مجھے چاہتے تھے لیکن ان کی محبتوں کا ایک حصہ اس کے نام بھی تھا، میرا دل چاہتا کہ وہ مرجائے، میں نے کئی دفعہ جب وہ چھوٹی تھی اس کے منہ پر تکیہ رکھ کر اس کو مارنے کی کوشش کی لیکن ڈھیٹ، بے غیرت ہمیشہ بچ جاتی۔

اماں اس کا خیال رکھتیں تو میں برداشت کر لیتی لیکن ابا کی محبت میں شرکت میرے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ جب کبھی اماں اس کو میری گود میں تھماتیں، میں اس کو اپنے کمرے میں لے جاتی اور پھر دروازہ بند کر کے اس کے خوب چٹکیاں لیتی، وہ روتی، وہ بلکتی وہ سسکتی، مجھے بہت سکون ملتا......

''آپا آپ کے سر میں درد ہو رہا ہے، میں آپ کے سر میں تیل ڈال دوں۔'' جیسے ہی آپا نے اپنی کنپٹیوں پر ہاتھ رکھا میں بوتل کے جن کی طرح ہاتھ میں تیل کی بوتل لیے چلی آئی اور آپا......

''ارے یسریٰ تم کیا ہر وقت میری جاسوسی میں لگی رہتی ہو؟'' آپا بے ساختہ ہنس دیں۔

اور میں اپنی پیاری آپا کو ہنستا دیکھ کر خوشی سے نہال ہوگئی۔

''چلو سر میں تیل بھی لگا دو اور سر دبا بھی دینا بہت درد ہو رہا ہے۔'' آپا نے تکیے پر سر رکھ کر آنکھیں موندتے ہوئے مجھ سے کہا۔

آپا کی ڈائری پڑھتے ہوئے سر میں شدید درد کی ٹیس نے برسوں پرانی ایک یاد دلا دی تو بے ساختہ میرا دل بھر آیا۔ میں نے نظر اٹھا کر باتھ روم کے بند دروازے کو دیکھا اور پھر بھرائی ہوئی آنکھوں سے اپنی آپا کے ہاتھوں سے لکھی ڈائری پڑھنے لگی۔ کاش جہاں ساری زندگی بے خبر رہی کاش، کاش آج بھی بے خبر رہتی......

جب اس کا رشتہ احمد جمال نے مانگا تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ صورت شکل میں حسب نسب ہر چیز میں ہر بات میں یکتا تھا۔ یسریٰ ہر جگہ مجھ سے برتر رہی، اس کی صورت، شکل، عادات و اطوار اسے ہر جگہ نمایاں کرتے، وہ تو اپنی خوبیوں سے بے خبر تھی لیکن اس کی ہر خوبی میرے سینے میں چبھتی، اس نے مجھ سے ابا کو چھین لیا تھا، اماں کے بعد ابا اس سے اس قدر محبت کرنے لگے تھے، اس قدر کہ میرا دل چاہتا اسے حبیب بینک پلازہ کی چھت پر لے جا کر نیچے دھکا دے دوں اور پھر اتنی بلندی پر سے اس کے پرخچے اڑتے ہوئے دیکھوں۔

احمد جمال! ہاں میں جانتی تھی وہ اور احمد جمال ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں، احمد جمال کے گھر والے بہت خوشی اور ارمانوں سے اس کو اپنی بہو بنانا چاہتے ہیں...... چاہتی تو میں بھی تھی احمد جمال کے گھر کی بہو بننا، رضا جمال، احمد جمال کا بڑا بھائی شہر کا مشہور آئی اسپیشلسٹ...... میری بچپن کی محبت اور جب ساری انا پسِ پشت ڈال کر میں نے خود اس سے اظہارِ محبت کیا تو......

''معاف کیجیے گا، آپ کی خوب صورتی مجھے متاثر نہیں کر سکتی، مجھے اپنے لیے ایک نرم دل اور نرم خو پارٹنر کی ضرورت ہے۔'' جملوں کا تھپڑ اس نے میرے منہ پر دے مارا اور پھر...... میں ایک ایسے شخص سے بیاہ دی گئی، جو شکل صورت میں میرے پاؤں کی جوتی کے برابر بھی نہیں تھا۔

میں یسریٰ کی شادی احمد جمال سے کیسے ہونے

دیتی...... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور میں کامیاب رہی...... پھر ابا کی وفات کے بعد جب یسریٰ کی ڈوریاں میرے ہاتھوں میں آئیں تو میرا دل چاہا اس کے منہ پر زور...... زور سے تھپڑ ماروں...... اس سے کہوں مجھے تم سے نفرت ہے؟ شدید نفرت...... تم کیوں پیدا ہوئیں، میرے ابا کی محبت میں حصہ دار بننے کے لیے......

میں نے یسریٰ کی شادی سجاد سے کردی...... بے وقوف، میرے ہر فیصلے پر بہ خوشی راضی ہو جاتی تھی، سجاد معمولی صورت شکل کا عام سا لڑکا تھا، میں جانتی تھی اس کے دل کو تکلیف ہوگی لیکن یہ احمق ہر حال میں خوش...... سجاد کی وارفتگی...... اور اس کی مسکراہٹ میرے کلیجے میں تیر کی طرح چبھتی پھر میں نے......

مجھ کو ایسا لگا، آپا کی ڈائری نہیں خود کش جیکٹ ہے، جو میں نے پہن لی ہے اور کسی بھی لمحے میرے وجود کے ٹکڑے فضا میں بکھرے ہوں گے۔ میری آنکھوں میں لگی مرچیں تو اتر سے بہتے آنسو بھی نہ بجھا سکے۔ مجھے دل میں ایک ٹیس سی اٹھتی محسوس ہوئی، میرا بایاں بازو درد سے کانپنے لگا، میں نے باتھ روم کے بند دروازے کو دیکھا اور پھر اپنے درد سے کپکپاتے وجود کو ڈھیر کرنے کے لیے نظریں دوڑائیں پھر میری نظر سیاہ لفظوں میں الجھنے لگیں، میں پڑھنا نہیں چاہتی تھی خدا کی قسم میں مزید پڑھنا نہیں چاہتی تھی لیکن میں پڑھ رہی تھی۔

اور پھر میں نے سجاد کو یسریٰ اور احمد جمال کی محبت کی کہانی خوب مرچ مسالا لگا کر سنا دی اور نتیجہ میری سوچ کے مطابق نکلا۔ سجاد کا دل یسریٰ کی طرف سے بہت خراب ہو گیا، وہ جو یسریٰ کو بیگم جان کہا کرتا تھا اس کے لیے یسریٰ کا وجود گھر میں موجود کاٹھ کباڑ سے زیادہ نہیں تھا۔

میں نے یسریٰ سے بدلہ لے لیا جس طرح پانچوں بھائی مرے تھے، یہ بھی مر جاتی، یہ کیوں بچ گئی، میری راجدھانی کو اس نے آگ لگائی تھی، میں نے بھی شادی شدہ ہونے کے باوجود اسے کسی بیوہ کی طرح تنہا کر دیا۔

میں نے پڑھتے، پڑھتے ایک ٹھنڈی سانس بھری...... آپا...... آپ کہتیں...... میں زہر کھا لیتی لیکن آپا، آپ کا یہ روپ ناقابلِ برداشت ہے۔ بازو کا درد سینے کی طرف بڑھنے لگا۔

اور سجاد ہی کیا، میں نے تو احمد جمال کی سرد مہری بھی سہی ہے۔

اب مجھے یقین ہے جس طرح آپ نے سجاد کو میری اور احمد کی محبت کی جھوٹی کہانی سنائی تھی اسی طرح آپ نے احمد جمال کو بھی مجھ سے متنفر کیا تھا۔

''احمد میں اپنے گھر کے بڑوں کے آگے کیسے بولوں......؟'' میں نے روٹھے، روٹھے احمد جمال سے کہا۔

''رہنے دو یسریٰ، کیوں گھر والوں کا نام لیتی ہو، مجھے آپا نے بتا دیا ہے کہ ابا کی بے حد مرضی ہے لیکن تم نے انکار کیا ہے کیونکہ تم کو میری بہنیں پسند نہیں ہیں، تم مجھ سے کہتیں تو میں تمہارے لیے الگ گھر لے لیتا بلکہ ہم ملک سے باہر ہی چلے جاتے...... یسریٰ میں نے تم سے بے حد محبت کی لیکن تم نے میرے ساتھ صرف وقت گزارہ میری، فیلنگز سے کھیلیں، میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔''

اچھا ہے احمد جمال مجھ سے متنفر ہو گئے آپا کتنی سمجھ دار ہیں لیکن پھر بھی آپا آپ احمد جمال سے یہ سب نہیں کہتیں...... میں سیڑھیوں پر بیٹھی سارے آنسو بہا رہی تھی، احمد جمال کب کے جا چکے تھے اور میں سیڑھیوں پر بیٹھی ان کے قدموں کے نشانوں کو دیکھ رہی تھی رو رہی تھی لیکن خاموش تھی......

میں نے ایک بار پھر باتھ روم کے بند دروازے کی طرف دیکھا، اندر سے آپا کے گنگنانے کی آواز آ رہی تھی۔

آپا...... آج آپ کی بیٹی کا رشتہ اس گھر میں...... اس خاندان میں طے ہو رہا ہے، جن سے وابستگی میری اول خواہشوں میں سے ایک خواہش تھی لیکن آپا آج لگ رہا ہے زندگی سے ساری خواہشیں ختم ہو گئیں، مجھے تو آپ سے آج بھی کوئی شکایت نہیں ہے، پہلے اس لیے کوئی شکایت نہیں ہوتی تھی کہ آپ میری آپا تھیں اور

آج...... آج اس لیے کوئی شکایت نہیں ہے کہ آپ میری کچھ نہیں ہیں......

بھاگتی دوڑتی...... گاڑی میں سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے، بائیں ہاتھ کی تکلیف کو سینے کی طرف بڑھتے محسوس کرتے ہوئے میں اپنے آپ سے محوِ کلام تھی اور پھر جیسے درد کی شدت ناقابلِ برداشت ہونے لگی تو میرے منہ سے بے ساختہ کپکپاتے ہوئے الفاظ نکلے۔

''ڈرائیور پلیز کسی قریبی اسپتال میں لے چلو......''

☆☆☆

''شازیہ تم کو پتا ہے درد، تکلیف اور دُکھ میں کیا فرق ہے؟'' میں نے آنکھیں کھول کر دھیرے دھیرے اپنے ہاتھ کی پشت سہلاتی...شازیہ سے پوچھا۔

کمرے سے باہر، میرے سارے رشتے تھے، سجاد، میرے بچے اور آپا لیکن آج میں شازیہ کے برسوں پرانے پوچھے سوال کا جواب دینا چاہتی تھی۔

''پلیز تم خاموش رہو، ڈاکٹر نے تمہیں باتیں کرنے سے منع کیا ہے۔'' شازیہ کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ اس نے محبت سے میرے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

''درد، ایک آفاقی جذبہ ہے، جو ہمیں...... اگر ہم انسان ہیں تو کسی کے لیے بھی محسوس ہوسکتا ہے، اپنے معاشرے کے ایک انسان یا ایک بلی کے بچے کے لیے بھی، درد تو سب کے لیے ہے...... چلتے، چلتے انسان پتھر سے ٹکرا جائے، کوئی چوٹ اور زخم لگ جائے تو کوئی نقصان ہوجائے، کوئی روٹھ جائے کوئی نہ منائے، کوئی بچھڑ جائے کوئی امید ٹوٹ جائے کوئی آس باقی نہ رہے تو تکلیف ہوتی ہے میری جان تکلیف ہوتی ہے......''

''امی آپ کیسے اتنی بیمار ہوگئیں؟'' میں نے امی کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں پوچھا تھا۔ ''آپ تو بڑے ماموں کے گھر گئی تھیں، جب تو ٹھیک تھیں۔'' اماں کے وہ آنسو جو اُن کا تکیہ راتوں کو بھگوتے تھے، میری نظروں سے چھپے نہ رہتے۔

''بس بیٹا، بڑے بھیا نے ایک چھوٹی سی بات پر میری بے حد بے عزتی کی، مجھے بہت دکھ ہوا۔'' اماں کی آنکھ کے دائیں گوشے سے پھر ایک گرم آنسو تکیے میں جذب ہونے کے لیے بے قرار ہوا۔ جو میں نے اپنی پور پر سمیٹ لیا۔

''اور پتا ہے دکھ کیا ہوتا ہے؟'' میں نے اپنا آنسو شازیہ کی شہادت کی انگلی پر سسکتا دیکھا اور پھر کمرے میں داخل ہوتی آپا پر ایک نظر ڈالی۔

''دکھ لفظوں کا وہ نشتر ہوتا ہے جو ہمارے اپنے' ہمارے بہت پیارے ہمارے سینے میں اتار دیتے ہیں۔ دکھ وہ دھوکا ہوتا ہے جو ہمیں وہ لوگ دیتے ہیں جنہیں ہم رہنما اور رہبر سمجھتے ہیں۔ دکھ، بڑا ناقابلِ برداشت لفظ ہے دکھ دینے والے...... وہ لوگ ہوتے ہیں جو ہمارے جنازوں پر دھاڑیں مار، مار کر رو رہے ہوتے ہیں، جن کو گلے سے لگا کر لوگ ہماری موت پر دلاسا دے رہے ہوتے ہیں اور جب دکھ ملتا ہے تو......'' مجھے اپنی سانس اکھڑتی محسوس ہوئی، مانیٹر پر چلتی وائبریشن نے سب کو ہلا دیا...... شازیہ ڈاکٹر کو بلانے باہر کی طرف بھاگی۔ آپا لپک کر میری طرف بڑھیں، میں نے بہت آہستگی سے ان کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

اب کوئی آس اور امید باقی نہیں رہی، محبتوں کے ملال کے ساتھ جیتے، جیتے میں تھک گئی تھی لیکن دکھوں کے بعد ساری زندگی رائگاں جانے کے ساتھ جینا بہت مشکل ہوتا ہے اور شاید میرا ناتواں دل اتنی مشکل اٹھانے کے لیے تیار نہیں...... میری دائیں آنکھ سے آنسو کا ایک بے حد گرم قطرہ تکیے میں آخری بار ہمیشہ کے لیے جذب ہوا، اس بات کی پروا کیے بغیر کہ میرے آس پاس کتنے لوگ بے تحاشا آنسو بہا رہے ہیں۔

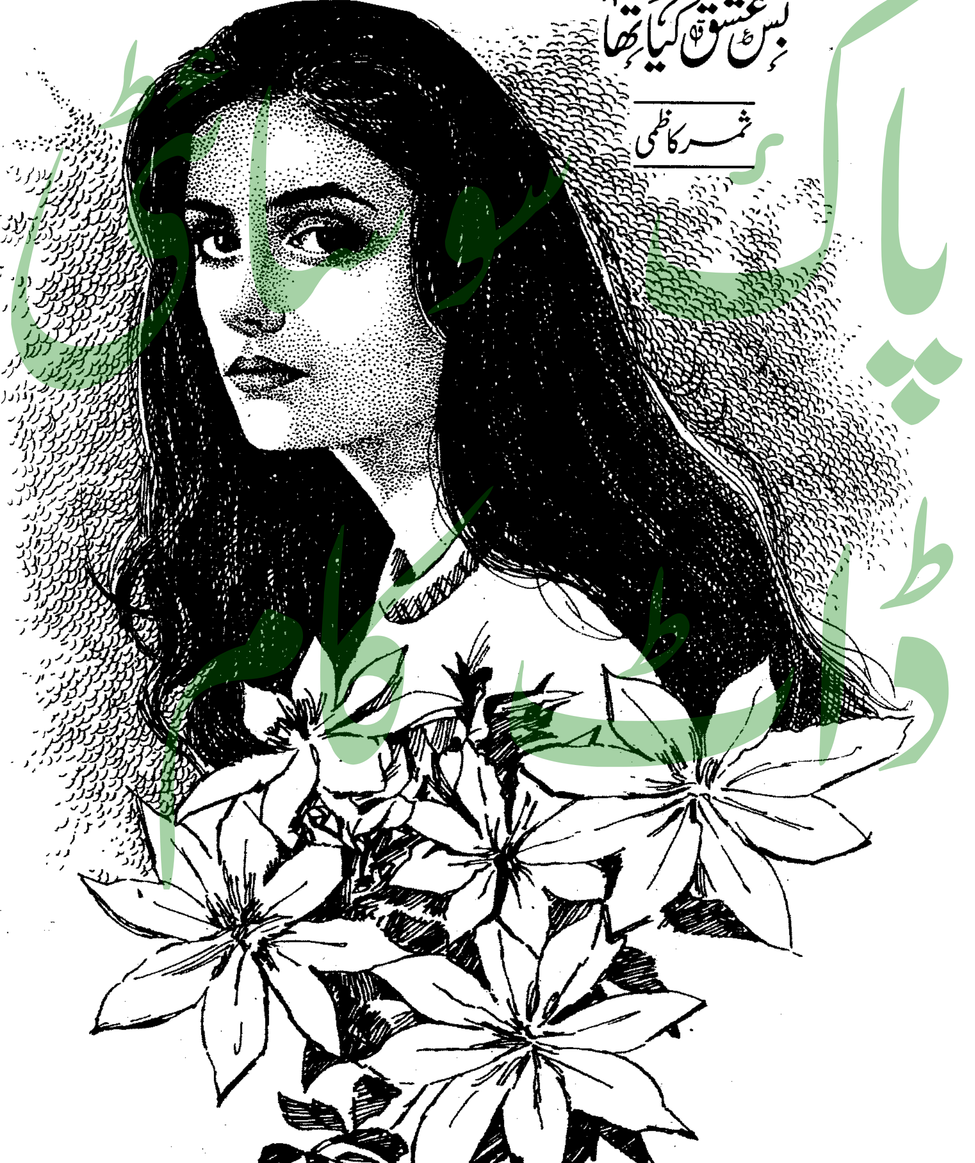
میرے پورے وجود کو سفید چادر نے ڈھانپ لیا ہے اور ویسے بھی......

کون کس کے لیے روتا ہے فراز
سب کو اپنی ہی کسی بات پہ رونا آیا

سورج آگ کے گولے برسا رہا تھا۔ اس مرتبہ گرمی بڑے زوروں کی پڑی تھی، گرمی سے خوفزدہ لوگ دوپہر میں باہر نکلنے کو تیار نہیں ہوتے تھے۔ تپتی دوپہر میں قدم کیا زمین پر رکھا گویا جلتے تندور میں پاؤں رکھ دیا ہو۔ کلثوم نے ایک نظر چھپر تلے سوئے باپ پر ڈالی جو گرمی سے بے نیاز گہری نیند میں تھا۔ اس نے بالٹی اٹھائی اور نلکے سے پانی بھر کے صحن میں چھڑکاؤ کرنے لگی۔ پانی پڑتے ہی زمین نے حبس باہر نکالنا شروع کر دیا۔ احاطے میں بندھی گائے' بکریاں گرمی سے زبانیں باہر نکالے کھڑی تھیں۔ اس نے ان کے سامنے پانی رکھنا شروع کیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر ہاتھ منہ اچھی طرح دھویا اور ایک طرف بنے باورچی خانے

بس عشق کیا تھا

ثمر کاظمی



میں آگئی۔ اس نے ڈرم سے پرات میں آٹا نکالا اور گوندھنے لگی۔ کام تو وہ سب انجام دے رہی تھی مگر کچھ بے کلی سی تھی۔

''میرا دل صبح سے کیوں بے چین ہے؟'' اس نے اپنی حالت کا جائزہ لیتے ہوئے سوچا۔

''نہیں کچھ نہیں...... بس میں خواہ مخواہ ہی وہمی ہوں۔'' اس نے سر جھٹکا، یک دم دیوار پر کوّا آ کر بیٹھا اور کائیں، کائیں کرنے لگا۔ اس نے گوندھے آٹے کے چھوٹے، چھوٹے ٹکڑے کر کے اسے پھینکے مگر وہ بدستور کائیں، کائیں کر رہا تھا۔

''چپ کر منحوس۔'' کلثوم جھلا کر پتھر اٹھانے لگی۔

''نہ بیٹی، پرندوں کو مارا نہیں کرتے' اماں بی کہا کرتی تھیں۔ کوّے منڈیر پر آئیں تو مہمان آتے ہیں۔''

''ہیں، اللہ کرے اماں بی کا کہا سچ ہو اور کوئی تو آ جائے۔'' سچ کہتے ہیں یہ تنہائی بڑی جان لیوا ہوتی ہے بعض اوقات انسان جو سوچتا ہے وہ ہو جاتا ہے اور کلثوم بنت حیات نے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ اس کی دعا قبول ہو گئی ہے۔ دروازے پر فوراً ٹک، ٹک ہوئی۔

''اس کا مطلب اماں بی کا کہا درست ثابت ہوا۔'' اس نے دروازے کی طرف دوڑ لگائی اور ایک جھٹکے سے پٹ کھولے۔ آنے والے مہمانوں کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں زمین آسمان گھوم گئے۔ کھلے دروازے سے مومن شاہ اور ایمان زارا داخل ہو رہے تھے' اس نے آنکھوں کو مسلا، یہ کوئی واہمہ تو نہیں لیکن یہ کوئی واہمہ کوئی خواب نہیں تھا' یہ حقیقت تھی کہ وہ دونوں سراپا مجسم اس کے سامنے تھے۔ اس نے ذہن پر زور دیا تو یاد آیا کل تو چار جولائی ہے۔ چار جولائی کو کیا ہوا تھا؟ چار جولائی کو احمد شاہ کے سپوت مومن شاہ اور ایمان زارا شاہ کی شادی ہوئی تھی لیکن وہ آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا اور وہ زمین پر بیٹھتی جا رہی تھی۔ زمین پر گرنے سے پہلے اس نے ایمان زارا کی چیخ سنی تھی۔

''کلثوم۔'' مومن شاہ کے ہاتھ اس کی طرف بڑھے، وہ اسے روکنا چاہتی تھی' وہ کہنا چاہتی تھی مت لگاؤ مجھے تم ہاتھ مگر اس کی حسیات کام کرنا چھوڑ چکی تھیں۔ اس کے آگے گھپ اندھیرا چھا رہا تھا بس تاریکی ہی تاریکی تھی۔

☆☆☆

''کلثوم تمہیں پتا ہے جو دینو چاچا کے گھر کے پاس نیا بنگلا بنا ہے اس میں کون رہتا ہے؟'' ایمان نے تجسس سے کہا۔

''پتا ہے، اس کا نام مومن عباس شاہ ہے۔ جب ہم دونوں باغ کی طرف جا رہے تھے تو وہ کتنی پُرشوق نظروں سے تمہیں دیکھ رہا تھا، مجھے تو لگتا ہے تم پر لٹو ہو گیا ہے۔''

''ایمان کا رشتہ آیا ہے، مومن شاہ کی طرف سے۔'' اس کی سماعتوں پر دھماکا ہوا تھا۔

''مومن شاہ اور ایمان۔'' اس کی نظریں ایمان کی جانب اٹھی تھیں جو مجرموں کی طرح سر جھکائے بیٹھی تھی۔

چاچی بشیراں اب تفصیل بتا رہی تھی۔ کلثوم کی سماعت کام کرنا چھوڑ چکی تھی وہ ایک جھٹکے سے پلٹی اور گھر کی طرف بھاگتی چلی گئی۔ ایمان اور اس کی پسند ایک جیسی تھی کپڑوں سے لے کر جیولری، پراندے وغیرہ تک دونوں ایک جیسی چیزیں پہنتی تھیں۔ وقت دبے پاؤں گزرتا چلا گیا۔ تتلیوں، پھولوں سے نکلنے اور کھیلنے کے موسم گزرے اور جوانی انگڑائی لے کر اُن کی دہلیز پر آن کھڑی ہوئی۔ کلثوم کا رنگ تھوڑا سانولا تھا جبکہ ایمان گورے رنگ کی تھی اور نین نقش کی اچھی تھی۔ حاصل پور کے اکلوتے گرلز اسکول سے میٹرک کرنے کے بعد شہر کے گورنمنٹ کالج میں انہوں نے داخلہ لے لیا تھا۔ ایمان نے سائنس اور کلثوم نے فائن آرٹس لے رکھی تھی۔ دونوں کے ڈیپارٹمنٹ الگ ہونے کے باوجود دونوں کالج میں اکٹھی پائی جاتی تھیں۔ گاؤں کے اکلوتے بس اسٹینڈ تک وہ دونوں پیدل آتی جاتی خوش باش گپوں میں مصروف اور کچھ دنوں میں ایسا ہوا کہ بس اسٹینڈ کے قریب خالی زمین

پر بنگلے کی تعمیر کا کام شروع ہوا اور نئے مکین حاصل پور کو رونق بخشنے آ گئے۔

''مجھے تو لگتا ہے اس گھر میں کوئی کروڑ پتی فیملی آ کر رہنے والی ہے گھر تو دیکھ محل سے کم نہیں لگتا، اس گھر میں واقعی کوئی عالیشان خاندان .... رہنے والا ہے۔'' ایمان نے رشک سے کہا تھا وہ کالج سے واپس آ رہی تھیں۔

''ایمان دیکھ برگد کے پیڑ کے پاس خشک پتوں کا ڈھیر کتنا خوب صورت لگ رہا ہے ناں۔'' کلثوم کی نظر اس پر تھی۔

''افوہ بور لڑکی، میں تمہیں محل دکھا رہی ہوں اور تم سوکھے پتوں میں اٹکی ہو۔'' اس نے غصے سے کہا۔ وہ اپنی دُھن میں واپس مڑی تو کسی سے ٹکراتے بچی۔

مقابل پُر شوق نگاہوں سے انہیں تک رہا تھا۔

''چلو ایمان....'' کلثوم نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے دوڑ لگا دی اور مومن شاہ کی نگاہیں دور تک ان پر جمی رہیں۔

☆☆☆

''ہائے اللہ کتنا پیارا تھا بالکل اپالو کے مجسمے جیسا...... کتنے پیار سے دیکھ رہا تھا، ویسے اس کی نگاہیں تم پر تھیں۔'' ایمان نے اسے چھیڑا پھر ایسا ہونے لگا کہ آتے جاتے ٹکراؤ ہونے لگا۔ کلثوم کے دل میں محبت کی کونپل پھوٹنے لگی اور اسے ہر جگہ مومن شاہ ہی دکھائی دینے لگا۔ اس کا اکیلے میں بھی مومن شاہ سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ لیکن ایمان اس سے بات تک کر آئی تھی۔

''یہاں پر وہ مرغیوں کا فارم اور باغ بنا رہے ہیں' ہائے اللہ کلثوم تیرے تو وارے نیارے پر مجھے تو مت بھول جانا۔'' سیکنڈ ائیر کے پیپرز ختم ہونے کے بعد دونوں گھر کی ہو کر رہ گئی تھیں...... اب شوقِ دیدار سے محرومی ہو گئی۔ کلثوم ابا کے ساتھ پیر بابا کے مزار پر گئی۔ اونٹ پر بابا نے اسے خود سوار کیا اور واپس آتے ان کو پورا دن گزر گیا اور اگر کلثوم کو پتا ہوتا کہ اس کے پیچھے یہ سب کچھ ہو جائے گا تو شاید وہ کبھی نہ جاتی۔

''ایمان کا رشتہ مومن شاہ کے ساتھ پکا ہو گیا ہے۔'' اس کے کان میں ناقابلِ یقین بات پڑی لیکن یقین کرنا پڑا کیونکہ پہلے تو وہ سمجھ رہی تھی کہ رشتہ غلطی سے اس کے بجائے ایمان سے کیا گیا ہے پر اب تو شادی کی تاریخ بھی رکھ دی گئی تھی۔ مہندی سے ایک دن پہلے وہ ایمان سے صرف یہ پوچھنے آئی تھی کہ اسے محبت جیسے سنہرے خواب دکھا کر وہ اس کی محبت پر قابض ہو گئی تو کیوں ہو گئی تھی۔ مگر بیٹھک سے آتی آوازیں سن کر وہ رک گئی۔

''مگر میں نے ایسا کوئی عندیہ نہیں دیا تھا تو آپ کو یہ غلط فہمی کیسے ہوئی کہ میں آپ کی دوست سے محبت کرتا ہوں' میں نے آپ سے محبت کی ہے ایمان، آپ دونوں ساتھ، ساتھ ہوتی تھیں تو شاید آپ کو لگا کہ میں ان سے...... میں تو آپ کو دیکھنے کے لیے آتا تھا۔'' وہ ایمان کو وضاحت دے رہا تھا اور کلثوم کو لگ رہا تھا اس کے وجود میں انگارے اتر رہے تھے۔

''جیجا جی یہ تو پاگل ہے، اس کا بس چلے تو ہر چیز مجھ سے منسوب کر دے لیکن یہ پگلی نہیں جانتی کہ محبت زبردستی تو نہیں ہوتی ناں اور ویسے میرے اتنے بھی برے دن نہیں آئے کہ آپ سے شادی کر لوں۔'' کلثوم اندر آتے ہوئے شرارت سے بولی۔ ایمان نے اس کا چہرہ کھوجنے کی کوشش کی لیکن وہاں گہرا اطمینان تھا۔ ایمان نے سکھ کی سانس لی۔

شادی سر پر تھی۔ کلثوم نے ہر فنکشن میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا پر اس نے اپنے کسی اندرونی جذبے کو عیاں نہیں ہونے دیا اور چار جولائی کو مومن شاہ اور ایمان کی شادی انجام پائی۔ رخصتی کے بعد ایمان اس سے ملنا چاہتی تھی لیکن وہ جان بوجھ کر مہمانوں کے ساتھ مصروف رہی لیکن گھر آ کر وہ خوب روئی' سب یہ سمجھ رہے تھے کہ اسے اپنی عزیز از جان دوست کی رخصتی کا دکھ ہے مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کون سے دکھ میں آنسو بہا رہی ہے وہ ان خوابوں کو رو رہی ہے جنہوں نے ابھی پروان چڑھنا شروع کیا تھا اور انہیں جڑ سے کاٹ دیا گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ خودغرض ہوئی

تھی پھر وہ جانتی تھی کہ اگر مومن شاہ سے اس کی شادی ہو بھی جاتی تو وہ پیار تو اسے نہ ملتا جو اس کا حق ہوتا۔ مومن شاہ کے دل میں ایمان زارا کی تصویر بس چکی تھی اور عشق وہی ہے جو محبوب کی خوشی میں خوش ہو شادی کے بعد ایمان بہت نکھر گئی تھی جب بھی وہ ملنے آتی، کلثوم کڑے امتحان سے گزرتی۔

''یا اللہ مجھے میری دوست کے آگے شرمندہ ہونے سے بچالینا، اے خدا مجھے صبر دے کہ میں اس آزمائش پر پوری اتروں۔'' وہ مصلے پر بیٹھ کر دعا مانگتی۔

☆☆☆

شادی کو چار سال ہونے کو ہیں اور ایمان زارا کی گود خالی تھی'' مومن شاہ کی ماں، بیٹے کی دوسری شادی کروانا چاہتی ہے۔'' ایسی خبریں اڑ، اڑ کر کلثوم تک بھی آتیں۔ ایمان کا ویران چہرہ دیکھ کر اس کا بس نہیں چلتا کہ وہ ہر خوشی اس کے قدموں میں ڈال دے۔ پھر یوں ہوا کہ اس کا آنا جانا کچھ کم ہو گیا اور ایک دن وہ اچانک آ گئی اور اسے سامنے دیکھ کر شاید گرمی کے سبب کلثوم بے ہوش ہو گئی یا پھر......اور ان کی جان پر بن آئی۔

''سارا دن کام کرتی ہے، ایک لمحے کو آرام نہیں۔'' چاچا دین محمد نے لسی کا جگ ایمان کو پکڑایا تھا وہ گلاس میں ڈال کر مومن شاہ اور کلثوم کو دینے لگی۔

''میں ذرا گودام تک جا رہا ہوں بیٹا اور تم دونوں کھانا کھا کر جانا۔''

''میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں چاچا۔'' مومن شاہ نے ان کی پیروی کی۔

''کلثوم میں آج تم سے کچھ مانگنے آئی ہوں، مجھے امید ہے تم مجھے خالی ہاتھ نہیں لوٹاؤ گی۔'' ایمان نے اصل بات پر آنے کے لیے تمہید باندھ رہی تھی۔

''تمہیں میں انکار نہیں کر سکتی اور میرا سب کچھ تمہارا ہے، تم بولو کیا کہنا چاہتی ہو۔'' کلثوم نے محبت سے اس کے ہاتھ تھامے۔ ان ہاتھوں کو مومن شاہ چھوتا ہو گا، کلثوم نے کچھ سوچ کر بوسہ دیا۔

''تم جانتی ہو ناں کہ آج شادی کے چار سال بعد بھی میری گود خالی ہے۔ ڈاکٹرز نے مجھے بانجھ قرار دیا ہے اور صالحہ آنٹی مومن کی دوسری شادی کروانا چاہتی ہے۔'' ایمان نے جھکے ہوئے سر کے ساتھ وضاحت کی۔ ''میں مومن شاہ کو کسی اور کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتی کلثوم۔ بس میں چاہتی ہوں تم مومن شاہ سے شادی کر لو۔'' ایمان نے اس کی سماعت پر دھما کا کیا تھا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو تم، ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' اس نے بے اختیار اس کے ہاتھ پیچھے کیے۔

''کلثوم مجھے خالی ہاتھ مت لوٹانا، میں بڑی امید کے ساتھ آئی ہوں۔ بچپن سے ہم ہر چیز کا اشتراک کرتی آئی ہیں۔''

''مگر مومن شاہ کوئی چیز نہیں ہے، جسے ہم بانٹ لیں گے۔'' اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''کلثوم میں تمہارے پاؤں پکڑتی ہوں پلیز مان جاؤ۔'' ایمان جھکی تھی اور کلثوم قدرت کے اس فیصلے پر حیران تھی۔ اس نے بالآخر ہاں کہہ دی تھی۔ اور پھر دلہن بن کر وہ مومن شاہ کے گھر آ گئی تھی۔

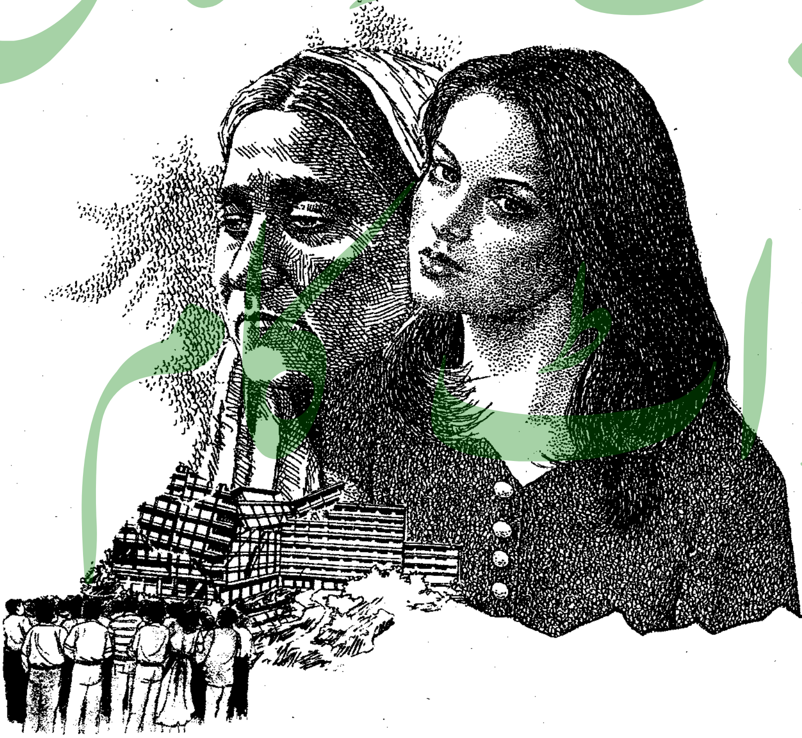
شادی کے بعد مومن شاہ اس کی محبت دیکھ کر حیران رہ جاتا۔ اس نے دونوں کے ساتھ یکساں سلوک روا رکھا تھا۔ شادی کے ایک سال بعد ننھی مومنہ کی پیدائش پر خوشی کے شادیانے بجے۔ اس نے بچی ایمان کی گود میں ڈال دی تھی۔ اور مومن شاہ نے اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔

''کلثوم تم بہت عظیم ہو، ہر گزرتے دن کے ساتھ میری تم سے محبت اور عزت بڑھتی جا رہی ہے۔ میری زندگی میں آنے کا شکریہ۔'' اس نے کلثوم کو محبت سے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا تھا۔ اور کلثوم کو لگا کہ اس نے سب کچھ پا لیا تھا۔ اس کی خاموش محبت جیت گئی تھی، اس نے عشق کیا تھا لیکن عشق کا خراج نہیں مانگا تھا۔ اسے اس کے صبر کا پھل مل گیا تھا، وہ اللہ کی بارگاہ میں سجدۂ شکر ادا کرتی اور کہتی بے شک خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔

زنجیرِ جنوں

ہما بیگ

مجھے آج بھی وہ دن، تاریخ اور سال یاد ہے، یکم دسمبر 2005ء کی صبح جب میں نے مری میں واقع دماغی امراض کے اسپتال کا بحیثیت سینئر ڈاکٹر چارج لیا۔ کراچی جیسے پُر رونق، پُرشور اور تیز رفتار شہر کی نسبت مری کی زندگی کسی نعمت سے کم نہیں۔ مری کی پُرسکون برف سے ڈھکی وادیاں، ہر سمت سکون، خوشبو، کبھی بارش کبھی دھوپ اٹکھیلیاں کرتے بادل...... ہاتھ بڑھا کر پکڑ لو...... قدرت کے نظارے کہ انسان کھو کر رہ



جائے۔

وہاں کا ماحول میرا ہم مزاج تھا۔ اسپتال میں مجھ سے سینئر دو اور ڈاکٹرز تھے۔ باقی اسٹاف مجھے رپورٹ کرتا تھا اور دماغی امراض کے اداروں کی بہ نسبت یہاں صفائی کے خاص انتظامات تھے۔ ڈاکٹرز اور دیگر اسٹاف کا بھی مریضوں کے ساتھ مشفقانہ اور ہمدردانہ سلوک تھا۔ زیادہ تر خواتین مریض تھیں۔ جن میں کافی حد تک خطرناک بھی تھیں یعنی جو اپنے پر اور دوسروں پر بھی تشدد پر اتر آتیں۔ اس لیے ان کو الگ رکھا جاتا تھا اور زیادہ خطرناک مریضوں کو مستقل کمروں میں بند رکھا جاتا تھا۔ آزادی کی صورت میں اگر اچانک ان کو دورہ پڑ جائے تو وہ دوسروں کے ساتھ، ساتھ اپنے لیے بھی مسئلہ کھڑا کرسکتی تھیں۔ کچھ کم خطرناک مریض تھے جو گم صم رہتے یا صرف باتیں کرتے رہتے۔

ایک ہفتہ تو مجھے وہاں کی سردی برداشت کرنے اور ماحول سمجھنے میں لگا۔ حسبِ معمول ایک صبح میں راؤنڈ پر تھی، کیا دیکھتی ہوں کہ ہال میں سفید چاندنی بچھی تھی۔ کافی خواتین مریض اور اسٹاف ممبر سر ڈھک کر انہماک سے کچھ سن رہے تھے۔ درمیان میں ایک مہذب، شائستہ سی خاتون ان کو درس دے رہی تھیں۔ جہاں اللہ نے انہیں علم سے مالا مال کیا تھا، ان کی آواز اور انداز میں بھی بے پناہ کشش عطا فرمائی تھی۔

کچھ دیر وہاں رک کر میں وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ میں نے سوچا شاید خاتون کا تعلق کسی قریبی علاقے سے ہوا اور وہ تبلیغ کے لیے اسپتال آئی ہوں۔

اگلے دن پھر یہی منظر دیکھا۔ اس دفعہ وہ تلاوت کررہی تھیں ان کی پُرسوز آواز نے گویا میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال دیں۔ تلاوت کے بعد انہوں نے اس کا ترجمہ اور تفسیر بیان کرنی شروع کی۔ سب نہایت عقیدت اور احترام سے سن رہے تھے۔

ان کی آواز کے سحر میں لوگ اس طرح ڈوب جاتے کہ گرد و پیش کی خبر نہیں رہتی۔ ایسا لگتا جیسے ہوائیں اور فضائیں بھی ساکت ہوگئی ہوں۔ ان کی عمر کوئی پچاس سال کے قریب ہوگی۔ ان کے چہرے کی پاکیزگی اور تقدس دیکھ کر لگتا... جیسے آسمان سے کوئی حور ہمارے درمیان آگئی ہو۔ روز صبح جب میں ان کے پاس سے گزر کر اپنے آفس آتی تو سوچتی آج ضرور ان کے بارے میں معلومات کروں گی لیکن کچھ اس طرح مصروفیات شروع ہوجاتیں کہ دماغ سے ہی نکل جاتا۔ دراصل ایک تو نئی جگہ، اپنی فیملی سے دوری، مریضوں کے نت نئے مسائل......

فطرتاً شروع سے ہی میں حد سے زیادہ حساس تھی۔ ہر مریض جیسے میرا قریبی رشتے دار اور دوست بن جاتا۔ میں ذہنی طور پر اس کا ہر مسئلہ اپنے اعصاب پر سوار کرلیتی اور باقی ساری باتیں پس منظر میں چلی جاتیں۔ میرے گھر والے اور ساتھی ڈاکٹر سمجھاتے تھے۔

''مریضوں کو مریض ہی سمجھا کرو، ان کا صرف ایک حد تک تم علاج کرسکتی ہو۔ ان کی بیماری کو اپنی بیماری نہ بنالیا کرو۔'' لیکن انسان کی فطرت کب بدلی ہے۔ بچپن سے یہی شوق تھا نفسیات پڑھنے، سمجھنے اور لوگوں کا علاج کرنے کا...... سو اب یہی نفسیاتی مریض میرے لیے سب سے اہم تھے۔

مجھے دو ہفتے ہوچکے تھے۔ وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا...... اسپتال کے کمپاؤنڈ میں ہی اسٹاف کے گھر بنے ہوئے تھے۔ ابھی تک میں اپنا سامان سیٹ نہیں کر پائی تھی۔ سوٹ کیس بند رکھے تھے صرف شالیں اور سوئٹرز نکال لیے تھے۔ جاب کرنے والوں سے کوئی ویک اینڈ کے مزے پوچھے...... رات دیر تک کراچی میں گھر والوں سے بات کی، کمرے کی لائٹ بند کی تو باہر ستارے سے بھرتے نظر آئے۔

''ارے یہ کیا ہیں۔'' میں کھڑکی میں آکھڑی ہوئی۔ ''اوہ جگنو اتنے سارے۔'' صرف کہانیوں میں پڑھا تھا آج دیکھا تو میری آنکھوں میں بھی ان گنت جگنو آگئے۔

کب آنکھ لگی پتا ہی نہیں چلا پھر صبح دس بجے کے قریب آنکھ کھلی۔ اتنی بڑی عیاشی...... یعنی اتنی دیر تک

سوئی تھی۔ پہلے تو بہت خوشی ہوئی پھر کمرے کی حالت دیکھ کر یاد آیا کہ آج تو بہت سا کام کرنا ہے۔ سامان سیٹ کرنا ہے، پورے ہفتے کے لیے کھانا بھی پکانا ہے۔ پھر بھی کم از کم لان میں خوب صورت نظاروں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ناشتا تو کیا جا ہی سکتا تھا۔

ناشتے کے بعد جو کام شروع ہوئے تو دن گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ ”اُف خدایا کل سے پھر روٹین لائف شروع ہو جائے گی۔“ بس لگ رہا تھا ویک اینڈ ختم رات جلد ہی سر پر آ گئی تھی۔ یہ سوچتے ہی بستر پر لیٹی اور فوراً ہی نیند کی دیوی نے اپنی مہربان بانہوں میں سمیٹ لیا۔

کسی نے زور، زور سے دروازہ دھڑ دھڑایا تھا۔ گہری نیند میں کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ نہ جانے رات کا کون سا پہر تھا۔ کوئی مستقل دروازہ پیٹ رہا تھا۔ دماغ نیند کے خمار میں تھا۔ آنکھ کھلنے کے ساتھ سردی اور ہلکی، ہلکی روشنی کا احساس ہوا۔ بھاگ کر میں نے دروازہ کھولا تو ایک نرس بدحواسی کے عالم میں کھڑی تھی۔

”میڈیم جلدی چلیں، آپا جان کو پھر دورہ پڑ گیا ہے۔ کل شام سے ہی وہ بے قرار سی تھیں۔ ہم نے دوائیں دے دی تھیں کہ فجر کی نماز سے پہلے ہی دورہ پڑ گیا۔ کسی کے قابو میں نہیں آ رہیں، آپ فوراً چلیں۔“ نرس نے ایک ہی سانس میں بات پوری کر دی۔

میں نے اسے تسلی دی اور اپنے آپ کو گرم کپڑوں میں لپیٹ کر تیزی سے اسپتال کی طرف چل دی۔ چونکہ مجھے یہاں آئے زیادہ وقت نہیں ہوا تھا اس لیے سارے مریضوں کو نہیں جانتی تھی۔

”پتا نہیں یہ آپا جان کون ہیں؟“ نرس مجھے لے کر خطرناک مریضوں کے وارڈ کی طرف چل دی۔ سلاخوں والے کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ وہی درس دینے والی مہذب خاتون زنجیروں سے بندھی بری طرح چیخ رہی تھیں۔ ان کے منہ سے تھوک نکل رہا تھا۔ بے ربط جملے، چیخیں، آنکھیں سرخ جیسے ابھی خون ٹپکا کہ تبھی......

”ارے دیکھو وہ بھاگی، وہ جا رہی ہے وہ منحوس

ہے۔ مت جانے دو، پکڑ لو۔ اسے مار دو۔ وہ ہماری خوشیوں کو نگل رہی ہے۔ اوپر روشندان میں بیٹھ کر ہنستی ہے، بدشگونی پھیلا رہی ہے۔ اس ناسور کو کاٹ دینا چاہیے جو جسم میں زہر پھیلا دے۔ ہر طرف نحوست پھیلا دے۔ عجیب لوگ ہو تم بھی...... مرنے بھی نہیں دیتے، جینے بھی نہیں دیتے؟ آخر کب تک مجھے موت کے شکنجے سے بچاؤ گے؟ کیا سمجھتے ہو بچا لو گے مجھے، مرجانے دو مجھے، میں منحوس ہوں، جب ہجر ہی مقدر ٹھہرا تو نارسائی کی کسک کیوں؟‘‘

وہ بولتی جارہی تھیں اور آنسوؤں کا سیلِ رواں ان کی آنکھوں سے نکل کر میرے دل میں اُتر رہا تھا۔ انہوں نے اپنے بال نوچ لیے تھے۔ حالانکہ اسٹاف اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتا تھا کہ مریضوں کے ناخن بڑھے نہ ہوں، ان کے بال لمبے نہ ہوں اور کوئی نقصان دہ چیز ان کی پہنچ میں نہ ہو۔ جسم ان کے اپنے ناخنوں سے زخمی تھا۔ لگتا تھا وہ اپنا سر بھی دیواروں سے ٹکراتی رہی تھیں۔ جگہ، جگہ سے خون بہہ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اپنے جذبات پر قابو پا کر میں نے نرس سے مختلف قسم کے انجکشن منگوائے۔ زنجیروں میں بندھے ہونے کے باوجود وہ قابو سے باہر ہورہی تھیں۔ تین نرسوں نے انہیں قابو میں کیا تو میں نے ان کو سکون آور دوا کے انجکشن لگائے۔ آہستہ، آہستہ ان کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑتے گئے اور وہ بے سدھ ہوگئیں۔ میں نے اور نرسوں نے جلدی، جلدی ان کے زخم صاف کیے اور مرہم پٹی کی۔

بیڈ پر لٹا کر ایک بار پھر ان کے ہاتھ پیر باندھ دیے کہ وہ ہوش میں آکر پھر اپنے آپ کو زخمی نہ کرلیں۔ ویسے تو ان انجکشن کے زیرِ اثر وہ کم از کم آٹھ گھنٹے تو ضرور سوتی رہتی مگر احتیاط لازم تھی۔

اس دوران باقی ڈاکٹرز بھی ڈیوٹی پر آچکے تھے۔ میرا دماغ ابھی تک موجودہ صورتِ حال کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ ڈیوٹی روم میں آکر پہلے تو گرما گرم کافی پی۔ میرا سر درد سے پھٹا جارہا تھا۔ جو کچھ دیکھا اسے ذہن و دل ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ کہاں ایک فصیح و بلیغ مہذب خاتون اور کہاں وہ زنجیروں میں بندھی پاگل عورت...... میں نے رات کی ڈیوٹی والی نرس کو بلا کر پوچھا۔

’’یہ تو درس دیتی ہیں ضرور اسٹاف میں شامل ہوں گی، یہ ان کو کیا ہوگیا؟‘‘

’’میڈم آپ کو ابھی ان کی ہسٹری نہیں معلوم، یہ اسٹاف میں سے نہیں ہیں، یہ تو خطرناک ترین پاگل خاتون ہیں، ویسے تو زیادہ تر نارمل رہتی ہیں، کبھی کبھار ایسے دورے پڑتے ہیں۔ دواؤں کے زیرِ اثر وہ بے ضرر رہتی ہیں ویسے انہوں نے آج تک اپنے علاوہ کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ جس ڈاکٹر کے وہ زیرِ علاج ہیں وہ چھٹی پر ہیں، اس لیے میں آپ کو بلا لائی۔‘‘ نرس بولی۔

’’لیکن پہلے تو میں نے جب بھی انہیں دیکھا بالکل نارمل پایا۔‘‘

میرے سوال پر نرس نے ٹھنڈی سانس لی اور بولی۔

’’ویسے تو ہر اک کے ساتھ کوئی نہ کوئی کہانی، کوئی نہ کوئی غم ہوتا ہے اور ہر ایک کا رویّہ بھی مختلف ہوتا ہے کہ وہ کیسے اپنے دکھوں کو برداشت کرتا ہے۔ ان کی بھی بڑی دکھ بھری کہانی ہے آپ آفس سے فائل منگوا کر ان کا کیس اسٹڈی کرلیں۔ میری ڈیوٹی ختم ہوچکی ہے۔ تھوڑا آرام کرلوں، رات کو پھر انہی پاگلوں کے ساتھ رہنا ہے۔‘‘ یہ کہہ کر نرس بیرونی دروازے کی طرف روانہ ہوگئی۔

پہلے سوچا کہ فائل آفس میں منگوا لو پھر خیال آیا کیوں نہ پہلے آپا جان کو ایک نظر دیکھ لوں، وارڈ کا چکر لگا کر فائل بھی لے لوں گی۔ کمرے سے نکلتے ہی نظر اس ہال پر پڑی جہاں آپا جان درس دیتی تھیں۔ آج وہاں صرف ویرانی تھی۔ میرے دل کی طرح نہ تلاوت کی سحر انگیز آواز تھی نہ ان کا روحانی پیکر......

جلدی سے میں نے کاریڈور طے کیا اور ان کے کمرے کی طرف چل دی۔ وہ دنیا جہان سے بے خبر سو رہی تھیں۔ ہر آنکھ ان کے لیے پُرنم تھی۔ جیسے تیسے میں نے مریضوں کا معائنہ کیا۔ اور آپا جان کی فائل لے کر گھر آگئی۔ یکسوئی سے میں ان کی ہسٹری پڑھنا

چاہتی تھی۔

''آپا جان کا اصل نام صابرہ خاتون تھا۔ عمر پچاس سال، ان کی پیدائش کے چھ ماہ بعد ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا تھا۔ دادی نے ہی پوتی کو سنبھالا تھا۔ بیٹے کو انہوں نے دوسری شادی کا کہا مگر وہ نہ مانے کچھ عرصے میں صابرہ کے والد ذاکر علی کو کاروبار میں.... پے در پے نقصانات کا سامنا کرنا پڑا۔ پریشانیاں انسان کو توہمات کا شکار کر دیتی ہیں۔ ایسے میں رشتے دار اور دوستوں نے بھی باتیں بنانی شروع کر دیں۔

''بچی بدنصیب ہے، پہلے ماں مرگئی۔ پھر کاروبار پر اثر پڑا۔ پریشانیوں نے تمہارا گھر دیکھ لیا ہے۔'' ڈاکٹر صاحب اگرچہ ضعیف الاعتقاد نہیں تھے لیکن آئے دن نئے مسائل اور لوگوں کی باتیں سن کر ان کے دل میں بھی بیٹی کے لیے نفرت پیدا ہونے لگی۔ پہلے وہ کام سے واپس آکر بیٹی سے لاڈ پیار کرتے تھے، گھمانے پھرانے لے جاتے۔ لیکن وقت کے ساتھ ان کے رویّے میں سرد مہری آتی گئی۔

دادی روشن خیال اور سمجھدار خاتون تھیں۔ انہوں نے بیٹے کے بدلے ہوئے مزاج کو سمجھ لیا۔ انہوں نے بیٹے کو سمجھانے کی بہت کوشش کی۔

''یہ سب وقت، وقت کی باتیں ہیں، اس میں بھلا اس معصوم بچی کا کیا قصور......؟ تم لوگوں کی باتوں میں آکر بلاوجہ اس پر ظلم کر رہے ہو۔''

ذاکر صاحب نے اپنے والدہ کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی یا تو دوسری شادی کے نام سے بھاگتے تھے اب فوراً اپنے دوست کی بہن سے شادی کر لی۔

اور یکے بعد دیگر ایک بیٹے اور بیٹی کے باپ بن گئے۔ ان کی توجہ کا مرکز دوسری بیگم اور اس کے بچے تھے۔ انہیں صابرہ کی کوئی پروا نہیں رہی۔ خوش قسمتی سے سوتیلی ماں اچھی ثابت ہوئی تھیں وہ ان کا خیال رکھتی تھیں مگر شوہر کے ڈر سے چھپ، چھپ کر وہ اپنے بچوں کی کتابیں بھی صابرہ کو دیتیں اور کپڑے بھی۔ دادی نے بیٹے سے کئی دفعہ کہا کہ صابرہ کو بھی اسکول بھیجیں مگر وہ نہیں مانے۔ بس اس کے لیے ٹیوشن ٹیچر رکھ دیا اور ایک قاری صاحب جو سب بچوں کو ایک ساتھ پڑھاتے تھے۔ جب تک دادی زندہ رہیں انہوں نے صابرہ کا بہت خیال رکھا۔ اسے پڑھایا، سلائی، کڑھائی سکھائی، کھانا پکانا سکھایا ان کے انتقال کے بعد صابرہ کی زندگی اور تنہا ہوگئی۔ سگے باپ کی موجودگی میں صابرہ اپنے کمرے سے باہر بھی نہیں نکل سکتی تھی۔ بچپن ہی سے باپ کا خوف اس کے دل میں بیٹھ گیا تھا۔

جب والد صاحب گھر پر نہ ہوتے تو وہ گھر کے سارے کام کرتی، سوتیلی ماں کبھی کبھار اس کو پیار بھی کر لیتیں اس کے کام سے خوش ہوکر پھر وہ وقت بھی آیا کہ صابرہ کے رشتے آنے لگے۔ ذاکر صاحب تو چاہتے ہی تھے کہ جلد از جلد ان سے جان چھڑا لیں پہلے ہی رشتے پر انہوں نے ہاں کر دی اور صابرہ بیاہ کر اپنے سے پندرہ سال بڑے مرد کی بیوی بن گئیں۔ نصیب، نصیب کی بات وہ بہت محبت کرنے والے ثابت ہوئے۔ اچھی نوکری تھی، خیال رکھنے والے شوہر تھے۔ تفریح کے لیے ہی اکثر باہر لے جاتے۔ مگر غصے کے تیز تھے۔ کب کسی بات پر دماغ گھوم جائے کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ اسی لیے ابھی تک ان کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ کبھی، کبھی غصے کی حالت میں ان کا ہاتھ اٹھ جاتا۔ صابرہ اندر ہی اندر سہم جاتیں۔ پہلے باپ پھر شوہر...... اگر وہ ان سے التفات سے بھی پیش آتے تو صابرہ دل ہی دل میں ڈرتی رہتیں۔ پھر بھی ساری تلخیاں بھلا کر ان کے ساتھ ہنستی بولتی رہتیں۔ ان کے آرام کا ہر طرح خیال رکھتیں۔ انہیں یقین تھا کہ اپنی خدمت اور محبت سے وہ ان کو بدل دیں گی۔ وہ صحیح معنوں میں صابرہ ہی تھیں ہر بات پر صابر و شاکر...... انہوں نے شوہر کی اچھائیوں کے ساتھ ہر برائی کو بھی مسکرا کر قبول کیا۔

☆☆☆

وقت گزرتا رہا۔ دس سال گزر گئے۔ صابرہ دو بیٹیوں اور ایک بیٹے کی ماں بن گئیں۔ چھوٹی بیٹی چار

سال کی تھی کہ صابرہ کی زندگی میں ایک اور قیامت آ گئی۔ ایک ٹریفک کے حادثے میں ان کے شوہر بری طرح زخمی ہو گئے اور محض ... ایک ہفتے موت و زندگی کی کشمکش میں رہ کر خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ صابرہ کے اوپر تو گویا مسائل کے نہ ختم ہونے والے دروازے کھل گئے۔ چھوٹے، چھوٹے بچے، والد نے تعلیم بھی نہیں دلوائی تھی کہ کہیں نوکری کر لیتیں۔ صابرہ نے ہمت کی اور کمر کس لی۔ اب بچوں کے لیے انہیں زندہ رہنا تھا، ان کو اعلیٰ تعلیم دلوانی تھی۔ بڑی بیٹی آسیہ، بیٹا نومان اور سب سے لاڈلی چھوٹی بیٹی روبی......! یوں تو تینوں ہی بچے صابرہ کی جان تھے مگر روبی کو تو دیکھ، دیکھ کر وہ جیتی تھیں۔ دونوں بہن، بھائی اسے بے حد چاہتے تھے۔ صابرہ نے گھر میں سلائی کا کام شروع کر دیا تھا۔ اور ساتھ، ساتھ پڑوس کے بچوں کو قرآن کی تعلیم بھی دینی شروع کر دی۔ سلائی اس کی دادی نے سکھادی تھی اور قرآن بھی قاری صاحب کے ساتھ، ساتھ انہوں نے صابرہ کو ترجمے سے پڑھایا تھا۔ شکر تھا کہ گھر اپنا تھا ایک پورشن کرایے پر اٹھا دیا۔

بچوں کو پرائیویٹ اسکول سے سرکاری اسکول میں داخل کروا دیا تھا، اس طرح زندگی میں کافی سہولت پیدا ہو گئی۔ بچوں میں مثالی محبت تھی۔ ماں کے بغیر ان کا وقت نہیں گزرتا تھا۔ بڑی بیٹی حتی الامکان ماں کی مدد کرتی۔ بھائی اور بہن کو پڑھاتی۔ آسیہ، روبی سے چار سال بڑی تھی مگر اس نے روبی کا ماں کی طرح خیال رکھا۔ وہ ماں کی طرح سگھڑ، کم گو، حوصلہ مند اور صبر و برداشت کی حامل تھی۔ جبکہ روبی نٹ کھٹ اور لاابالی فطرت کی حامل تھی۔ نچلا بیٹھنا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ اس کی معصوم شرارتوں سے گھر میں رونقیں تھیں۔ میٹرک کرتے ہی آسیہ کے رشتے آنے لگے۔ جہیز میں تو دینے کے لیے صابرہ کے پاس کچھ نہیں تھا۔ صرف آسیہ کی خوب صورتی، نیک سیرت اور شرافت تھی جو صابرہ کی اعلیٰ تربیت کا نتیجہ تھی۔

صابرہ چونکہ خود تعلیم نہیں حاصل کر سکی تھیں اس لیے ان کا ارمان تھا بچوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں۔ وقت کی رفتار تو وہ آندھی ہے جو اپنے سامنے آنے والی ہر شے کو تہ و بالا کر دیتی ہے۔

بہت عرصے کے بعد آج صابرہ کے چہرے پر خوشیوں کے چراغ روشن ہوئے تھے۔ آسیہ دلہن بنی اپنی سہیلیوں کے درمیان شرمائی لجائی بیٹھی تھی۔ روبی تتلی کی طرح رنگ بکھیرتی پھر رہی تھی۔ اتنے سالوں بعد تو گھر میں خوشی کی گھڑی آئی تھی۔ صابرہ کو آج قدم، قدم پر شوہر کی یاد بے چین کیے دے رہی تھی۔ بہر حال آسیہ ماں کی دعاؤں کے حصار میں رخصت ہو گئی تھی۔

روبی کو چپ سی لگ گئی۔ اِک دم جیسے وہ بڑی ہو گئی تھی۔ ماں کی مدد کرنا اور اپنی پڑھائی پر توجہ...... نومان، ماں اور بہن کی دلجوئی کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ بچپن سے ہی اسے اپنی ذمّے داریوں کا احساس تھا۔ ہوش سنبھالتے ہی اس نے ماں کو محنت، مشقت کرتے دیکھا تھا۔ اس کی آرزو تھی باہر جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ کچھ بن کر دکھائے اپنی ماں اور بہنوں کا دامن خوشیوں سے بھر دے۔ میٹرک سے ہی وہ پڑھائی کے ساتھ، ساتھ ٹیوشن بھی پڑھاتا رہا تاکہ ماں کی ذمّے داریاں کچھ کم ہو جائیں۔

انٹر کے امتحان میں نومان نے پورے صوبے میں پہلی پوزیشن لی۔ صابرہ اور بہنوں کی خوشی دیدنی تھی۔ آسیہ کا شوہر فہیم بہت پُرخلوص اور محبت کرنے والا لڑکا تھا۔ اس نے آسیہ اور اس کے گھر والوں کا ہمیشہ ساتھ دیا۔

نومان کی قابلیت کی بنا پر اسے بیرون ملک کئی یونیورسٹیوں میں داخلے کی امید تھی۔ مگر وہاں کے اخراجات اٹھانا صابرہ کے بس سے باہر تھا۔ کل جمع پونجی خرچ کر کے بھی صرف ٹکٹ اور ایک سمسٹر کی فیس ادا ہوتی۔ وہاں رہنا کھانا پینا، کیسے گزارہ ہوگا؟

یہ سوچ، سوچ کر سب پریشان تھے۔

مگر وہ ہی ہستی لم یزل، راستے بنانے والا جو شہ رگ سے بھی قریب ہے، جو سب کی بگڑی بنانے والا

ہے وہی مسبب الاسباب ہے۔ صابرہ نے ایک بار پھر اپنا مسئلہ اللہ کے حوالے کر دیا۔

اس بار بھی نوازنے والے نے اسے مایوس نہیں کیا۔ فہیم کے قریبی دوست اسی ملک میں رہتے تھے جہاں سے نومان کو اسکالرشپ آفر ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنے گھر میں ایک کمرے میں اس کو رہنے کی بھی پیشکش کر دی اور مزید معلومات بھی فراہم کیں کہ اگر وہ پارٹ ٹائم جاب کر لے تو اپنے بقیہ اخراجات بھی پورے کر سکتا ہے۔

بس پھر کیا تھا نومان نے باہر جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

☆☆☆

وقت اپنی ڈگر پر بے لگام گھوڑے کی طرح سرپٹ دوڑے چلا جاتا ہے۔ کسی کے راستے میں کتنی کھائیاں آتی ہیں کہاں، کہاں کون، کون سی باڑھ کے اوپر سے پھلانگنا پڑتا ہے وقت کو اس سے اسے کوئی غرض نہیں۔ وقت کا کام ہی آگے بڑھنا ہے سو وہ بڑھتا چلا گیا۔

اپنی راہ میں آئی ہر چیز کو روندتے ہوئے...... ہر ماں کی طرح صابرہ کے دل میں بھی بڑے ارمان تھے۔ نومان کو دولھا کے روپ میں دیکھنے کے۔ چاند سی بہو بیاہ کر لانے کی۔ خوابوں پر کب کوئی پابندی لگا سکا ہے بھلا۔ مگر سارے ارمان دھرے کے دھرے رہ گئے۔ جب اس نے تعلیم کے دوران ہی اپنی عمر سے بڑی امریکن لڑکی سے شادی کر لی۔ شادی کے بعد اس نے ایک معافی نامے پر مشتمل خط لکھ کر ماں کو اپنی شادی کی اطلاع دی اور ساتھ ہی شادی کی تصویر بھی بھیجی...... تب وہ کتنا روئی تھیں۔ اپنے بانکے سجیلے بیٹے کے ساتھ شادی کے لباس میں ایک گوری جو کم از کم نومان سے دس سال بڑی لگ رہی تھی۔ صابرہ کو یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ اس کی خاطر لاڈلے بیٹے نے ہر رشتہ، ماں کی قربانیاں بھلا دی تھیں۔

وہ جتنا اس کے کیے کو بھلانے کی کوشش کرتیں، وہ غم اتنی ہی شدت سے ان کے اعصاب پر سوار ہوتا۔ اندر ہی اندر وہ بیٹے سے باتیں کرتیں، اپنی ناراضی کا اظہار کرتیں مگر ماں کا دل اسے ہر گھڑی معاف کر دیتا، کیا شے ہے یہ ماتا بھی۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ نومان ان کو بھول گیا تھا، ہر ہفتے فون پر بہنوں اور ماں سے بات کرنا اس کا معمول تھا۔ اسی طرح ڈالرز بھی باقاعدگی سے بھیجتا تھا مگر کاغذ کے ان ٹکڑوں سے ماں کا دل بہلنے والا نہیں تھا۔ اسی دوران روبی بھی اپنی تعلیم مکمل کر چکی تھی۔ سانولی سلونی خوش مزاج، سگھڑ سی لڑکی......اس کے کئی رشتے آچکے تھے مگر صابرہ بیگم روبی کو اتنی جلدی اپنے سے جدا کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ پھر ایک روز ان کے مرحوم شوہر کے دوست عاقل رضا اپنے بیٹے کے لیے روبی کا ہاتھ مانگنے آئے۔ عاقل صاحب نہایت سلجھے ہوئے اور پرانی روایات کے پروردہ انسان تھے۔ انہوں نے اپنے دوست کی وفات کے بعد بھی اس گھر سے اپنا تعلق نہیں توڑا تھا۔ ہمیشہ یتیم بچوں کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا چونکہ بیوی کا بھی انتقال ہو چکا تھا اس لیے وہ بہت محتاط انداز میں ایک فاصلے سے ملنا جلنا رکھتے تھے۔ روبی ان کی بھی لاڈلی تھی۔ وہ عاقل انکل سے اپنی تعلیم کے بارے میں ڈسکشن کرتی، وہ اسے اکثر باہر گھمانے لے جاتے۔ فہدان کا اکلوتا، لائق اور ہونہار بیٹا تھا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ، وجیہہ، شستہ مزاج کا حامل، صرف ایک قباحت تھی اس کی رہائش اسلام آباد میں تھی اور صابرہ بیٹی کو اتنی دور بھیجنا نہیں چاہتی تھیں۔ عاقل صاحب اپنی سفارش کے لیے آسیہ اور اس کے شوہر کو اپنے ساتھ لائے۔ آسیہ نے ماں کو سمجھایا۔

''امی پیاری اتنا اچھا رشتہ ہے، بچپن سے دیکھا بھالا، وہ ہمارے بارے میں سب جانتے ہیں، آخر اسلام آباد اور کراچی میں ایسا کون سا فاصلہ ہے؟ ڈیڑھ دو گھنٹے کی فلائٹ اور میں ہوں ناں آپ کے پاس۔''

شادی سے ایک رات پہلے مہندی لگے ہاتھوں سے ماں کا ہاتھ پکڑ کر روبی بولی۔ ''امی یہ رواج بھی عجیب ہوتے ہیں ماں، بیٹیوں کو پال پوس کر سکھا پڑھا کر

دوسروں کے حوالے کردیتی ہیں، جب ماں کو خدمت کی ضرورت ہوتی ہے تو بیٹی کسی اور کی خدمت میں لگی ہوتی ہے۔'' صابرہ نے اسے سینے سے لگالیا۔

''بیٹیاں تو ہوتی ہی پرایا دھن ہیں اور سسرال جا کر جب وہاں کے لوگوں کی خدمت کرتی ہیں تو ماؤں کا دل خوش ہوتا ہے ان کا سر فخر سے بلند ہوجاتا ہے۔ تم بھی اپنے شوہر اور سسر کی خدمت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھنا۔ ماں کی لاج رکھنا۔''

اور ڈھیر ساری دعاؤں کے سائے میں روبی وداع ہوکر پیا دیس سدھاری۔ اس کی شادی پر سب کا ارمان تھا کہ نومان اپنی بیوی کے ساتھ ضرور پاکستان آئے اور بہن کو اپنی دعاؤں کے حصار میں رخصت کرے۔ سب کی نظریں اس کے انتظار میں دروازے کو تکتی رہیں مگر وہ نہیں آیا۔ کیونکہ بیگم کو چھٹی نہیں ملی تھی۔ البتہ اپنے دوست کے ہاتھ نقدی اور بے شمار قیمتی تحائف بھجوادیے۔ فون پر بات بھی کی مگر یہ احساس نہ کرسکا کہ ماں، بہنوں کو ان چیزوں کی نہیں بلکہ اس کی ضرورت زیادہ ہے۔

☆☆☆

چند برس مزید آگے بڑھ گئے روبی کے گلشن میں دو پھول کھل گئے۔ کراچی تو اس کے لیے آنا مشکل تھا، سسر اور بچوں کی ذمے داریاں...... ضد کر کے روبی، ماں کو ہی اپنے پاس بلوالیتی بیٹی کے گھر جاتے ہوئے صابرہ کو شرم آتی تھی مگر عاقل صاحب اور داماد کی محبت کے سامنے ان کی ایک نہ چلتی اور سچ کہا ہے کسی نے اصل سے سود پیارا ہوا ہے، اولاد کی اولاد زیادہ پیاری ہوتی ہے، صابرہ بیگم کو آسیہ کے بچوں سے زیادہ روبی کے بچے خاص طور پر بیٹا بہت عزیز تھے۔ وہ بالکل ماموں پر گیا تھا۔ وہ ملنے والوں سے کہتیں۔ ''لگتا ہے زندگی کا مقصد پورا ہوگیا۔ مالک کا احسان ہے ہمیشہ اوقات و توقعات سے بڑھ کر نوازا ہے۔'' ہمیشہ کی طرح ایک آسودہ مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر رقصاں رہتی۔

روبی نے اپنے بیٹے کی سالگرہ دھوم دھام سے منائی۔ آسیہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ اسلام آباد آئی۔ اس کے بعد وہ مختلف مقامات پر تفریح کرتے رہے۔ لگتا تھا کہ زندگی صرف خوشیوں کا نام ہے۔

صابرہ نے محلے کے بچوں کو اور عورتوں کو کلام پاک کی تعلیم دینی شروع کردی۔ خواتین کے لیے باقاعدگی سے درس کا اہتمام کرتیں۔ ان کے لہجے میں جادو اور انداز میں ایسی مٹھاس تھی کہ لوگ دور سے ان کا درس سننے آتے۔

اس سال یعنی 2005ء اکتوبر میں رمضان شروع ہوا تو انہوں نے درس کے ساتھ تراویح کا بھی انتظام کیا۔ مگر نہ جانے روبی کو کیوں ضد سی ہوگئی کہ امی اس سال رمضان ہمارے ساتھ گزاریں۔ جیسے، جیسے صابرہ اسے سمجھاتیں اس کا اصرار بڑھتا گیا......

7 اکتوبر کو وہ صبح سے ماں کو کئی بار فون کرچکی تھی۔

''امی بس آجائیں ناں بہت دل کررہا ہے آپ سے ملنے کا۔ فہد بھی دفتر کے کام سے کوئٹہ گئے ہوئے ہیں، انکل بھی کہہ رہے ہیں اپنی امی کو بلوالو...... پلیز آجائیں میرا دل گھبرارہا ہے۔''

''بیٹی کے سسرال روز، روز آنا اچھا نہیں لگتا، یہاں میں نے درس و تدریس کا بندوبست کیا ہوا ہے۔'' صابرہ نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''امی کوئی کچھ نہیں کہے گا، انکل کوئی غیر تو نہیں، آپ ہی تکلف کرتی ہیں، بس ٹھیک ہے آپ کو مجھ سے محبت نہیں ہے۔'' روبی نے ناراض ہوکر فون بند کردیا۔ آسیہ کا بھی فون آیا۔

''امی آپ روبی کے پاس کچھ دن کے لیے چلی جائیں، اس کا میرے پاس بھی فون آیا تھا۔ رو رہی تھی بیچاری......''

''بچی ہے ابھی تک چلو کل اس کو منالوں گی اور آخری روزے اور عید اس کے ساتھ کرلوں گی۔ آسیہ تم بھی وہیں آجانا۔''

کل کیا ہوگا کس کو معلوم ہے صرف آج اپنا ہے کل پرایا۔ ایک لمحے، اگلی سانس کا بھی بھروسا نہیں...... کاش

یہ بات ہم وقت پر سمجھ سکتے۔ اپنے پیاروں کی خواہشات کا احترام کرسکتے۔ کل جو کبھی نہیں آتا۔ ہم سوچتے ہیں ابھی بہت وقت ہے کل محبت کا اظہار کریں گے۔ اپنے احساسات سے آگاہ کریں گے، کل معافی مانگ لیں گے۔ مگر وقت وہ کل کبھی نہیں لاتا۔

سحری کے بعد صابرہ تلاوت کرتیں اور بچوں کی خوشیوں اور زندگی کے لیے دامن پھیلا، پھیلا کر دعا مانگتیں۔ مگر 8 اکتوبر کو تو عجیب بے قراری تھی۔ ان کا آنچل آنسوؤں سے بھیگ گیا۔

''مولا مجھے بخش دے، میرے گناہ معاف فرمادے۔ مجھے مزید آزمائشوں سے بچالے، میرے دل کو سکون عطا فرما۔''

دس بجے آسیہ اور فہیم آگئے۔ ان کی بے وقت آمد پر صابرہ حیران ہوئیں ''خیر تو ہے فہیم بیٹا! آپ آفس نہیں گئے آج؟'' ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

فہیم نے ان کے کندھے پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''امی شمالی علاقہ جات میں بہت بڑا زلزلہ آیا ہے۔ بڑے پیمانے پر تباہی ہوئی ہے۔'' ہچکچاتے ہوئے اس نے اپنی بات مکمل کی۔

''امی وہ دراصل اسلام آباد میں بھی کافی نقصان ہوا ہے کئی عمارتیں زمین بوس ہوگئی ہیں۔'' صابرہ سکتے کی حالت میں انہیں تک رہی تھیں۔

''امی ابھی ٹی وی پر بتایا ہے کہ مارگلہ ٹاور زجہاں روبی رہتی ہے نقصان ہوا ہے، آپ حوصلہ رکھیں، کئی بلاکس ہیں، پتا نہیں کس میں ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہے۔ بس اب چلنے کی تیاری کریں۔ میں آپ کا سامان سوٹ کیس میں رکھتی ہوں۔'' آسیہ نے ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھا جو اپنا دل تھام کر وہیں بیٹھ گئی تھیں۔

روبی انہی فلیٹس میں رہتی تھی۔ آسیہ نے بھاگ کر ماں کے ہاتھ میں پانی کا گلاس دیا۔

''امی آپ تو بہت بہادر ہیں، آپ کو دیکھ کر تو ہمارے اندر توانائی بھر جاتی ہے۔ حوصلے سے کام لیں ہمیں فوراً اسلام آباد کے لیے روانہ ہونا ہے۔''

صابرہ نے پانی کا گلاس میز پر رکھا اور آسیہ کا سہارا لے کر اپنی جگہ سے اٹھیں۔ ''میں روزے سے ہوں، ضرور کوئی بڑی بات ہے جو تم بھول گئیں رمضان کو۔ روبی کو فون کیا؟ اس کے سسر سے بات کی؟''

''امی جب سے خبر ملی ہے کئی دفعہ فون کیا مگر فون بند ہے، ہوسکتا ہے وہ لوگ اپنے گھروں سے نکل گئے ہوں اور فون گھر میں رہ گیا ہو۔ فہد بھی اسلام آباد کے لیے روانہ ہوگیا ہے۔'' فہیم نے ساس کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

اور اس طرح ایک اور کہانی شروع ہوگئی۔ تیرہ دن تیرہ راتیں، جس کا ہر لمحہ انتظار، امید اور ناامیدی سے جڑا تھا۔ بہت مشکل سے وہ لوگ اسلام آباد پہنچے۔ وہ جگہ جہاں ہزاروں لوگ آباد تھے۔ جن کے دم سے رونقیں تھیں۔ قہقہے تھے، وہاں موت کی ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ ہر سو وحشتوں کے بادل چھائے ہوئے تھے، اس عمارت کے ملبے تلے جانے کتنے زندہ کتنے مردہ جسم دبے ہوں گے۔ کتنے خاندان آباد تھے یہاں...... کس، کس کے لختِ جگر بے یارو مددگار پڑے ہوں گے۔ ان کے چاہنے والوں کا ایک ہجوم جمع تھا۔ ہر سمت آہ و بکا تھی۔ تلاش کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا جو ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔

دو دن اور راتیں صابرہ اور اس کے خاندان نے کھلے آسمان کے تلے گزاریں۔ نومان بھی حادثے کا سن کر اسلام آباد پہنچ گیا۔ ماں نے صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے بیٹے کو دیکھا صرف اتنا کہا۔

''بیٹا بہت دیر کردی، روبی نے تمہارا بہت انتظار کیا۔ اپنے بچوں کو وہ تمہاری باتیں، بچپن کی یادیں سناتی تھی۔ ماموں آئیں گے تو ایسا کریں گے، ان کے ساتھ کھیلیں گے، وہ تم سے بہت پیار کرتے ہیں، دیکھو نومی وہ اب بھی اپنے بچوں کے ساتھ ہمارا انتظار کررہی ہے، اس کے بچے ماموں، ماموں پکار رہے ہیں کچھ کرو ناں۔''

ماں کے سوال پر اس کی آنکھوں سے آنسوؤں

کی برسات شروع ہوگئی۔ اس نے ماں کا سر اپنے سینے سے لگایا۔‘‘

’’امی اللہ پر بھروسا رکھیں، ہم جلد ہی انہیں تلاش کرلیں گے۔‘‘

فہد کے دل پر جو گزر رہی تھی۔اس کا اندازہ اس کے چہرے سے لگایا جاسکتا تھا۔ مشفق باپ، محبت کرنے والی بیوی اور دو معصوم بچے......کل کائنات اس کا نشیمن ہی آندھیوں کی زد پر تھا۔صرف ہونٹوں پر دعا تھی یا اللہ مدد......تیسرے دن بیرونی امداد پہنچی اور کھدائی شروع ہوئی۔ سب کے چہروں پر امید کے چراغ روشن ہوئے۔ ایک نئے جوش و ولولے سے سب نے کھدائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کیا۔ آسیہ نے ضد کر کے اپنی ایک رشتے کی نند کے گھر صابرہ اور اپنے بچوں کو چھوڑ دیا تھا۔اس عمر میں وہ کب تک کھلے آسمان تلے رہتے۔ ملبے تلے کبھی کوئی زندہ انسان مل جاتا تو سب خوشی سے سجدے میں گر جاتے۔ اور لاش ملتی تو امید کی کرن ناامیدی کے گھپ اندھیروں میں کھو جاتی۔ پھر نئے حوصلے سے لوگ اپنے پیاروں کی تلاش میں لگ جاتے۔ سات دن کے بعد عاقل صاحب مل گئے اس طرح کہ ان کے اوپر چھت کا کافی حصہ گرا ہوا تھا۔شاید جب زلزلہ آیا تو وہ صوفے پر لیٹے ہوئے ہوں گے۔

باہر نکلنے کی کوشش کی ہو مگر کامیاب نہ ہوسکے۔ ان کو فوری طور پر نکالنا مشکل تھا اس لیے دوسرے حصے کی کھدائی شروع کردی گئی۔ اس امید پر کہ شاید روبی بچوں کو لے کر باہر نکل گئی ہو۔فہد نے بڑی مشکل سے اپنے غم کو چھپا کر اور تیزی سے لوگوں کے ساتھ ملبہ ہٹانا شروع کردیا۔ موجودہ صورتِ حال انتہائی درجے کا ضبط و تحمل کی متقاضی تھی۔

امید و ناامیدی کے درمیان مغلوب ہونے سے یہی بہتر ہے کوئی یقینی بات ہوجائے۔ چاہے وہ کتنی ہی بدترین ہو، اس تکلیف کا اندازہ صرف وہ ہی لوگ کرسکتے ہیں جن پر بیت رہی ہو، ہر لمحہ زندگی کا احساس پھر موت کا خوف! ان کے بیچ رہنا انسان کو زندہ درگور کردیتا ہے۔ یہی کیفیت روبی کے خاندان والے اور نہ جانے کتنے خاندانوں پر بیت رہی تھی۔ خاموش لبوں پر یہی سوال تھا کیا ہوا؟ کسی خوف کے سائے میں زندگی گزارنا کتنا اذیت ناک ہوتا ہے، مرنے والے کو تو صبر کرلیا جاتا ہے لیکن لاپتا ہونے والے کو کیسے صبر کیا جائے۔ بالآخر تیرھویں دن جو تلاش کا آخری دن بھی تھا۔ اس کے بعد حکومت نے اعلان کردیا تھا کہ مزید تلاش نہیں جاری رکھی جاسکتی۔ روبی مل گئی اس طرح کے اس نے دونوں بچوں کو اپنے سینے سے لپٹایا ہوا تھا۔ گھر سے نکل کر وہ لفٹ تک پہنچی تھی اور پوری چھت اس پر آگری۔ شاید فرشتۂ اجل کو ان معصوموں پر ترس آگیا اور ان کو تڑپنے سسکنے سے بچالیا۔

اسپتال سے فون آیا، روتی تڑپتی عورتوں کو گھر پر چھوڑ کر وہ دھڑکتے دلوں کے ساتھ روانہ ہوئے۔ کل تک یہی انتظار ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھا لیکن اب جب وہ شناخت کیے جارہے تو ان کے قدم منوں من بھر کے ہورہے تھے۔ ہاں وہ وہی تھی۔ پہچان کے لیے کوئی شکل نہیں تھی صرف اس کے اور بچوں کے کپڑے ہی شناخت کی صورت تھے۔ تینوں کو ایک ہی تابوت میں بند کرکے ان کے حوالے کردیا گیا۔ اس تاکید کے ساتھ کے تابوت نہ کھولا جائے اور دفنا دیا جائے۔

انتظار ختم ہوگیا۔ کون کس کو تسلی دے، کس کے آنسو کون اپنے دامن میں جذب کرے۔ ایک بار پھر صابرہ نے صبر کے پہلے درجے کا مظاہرہ کیا۔ خاندان کی سربراہ ہونے کی حیثیت سے سب کے سر پر دستِ شفقت رکھا۔ نازوں کی پالی بیٹی، نواسا، نواسی کو رخصت کیا۔ اس وقت ان کا... خاندان آزمائش کی جس گھڑی سے دوچار تھا وہاں ایسے ہی رویے کی ضرورت تھی۔

اپنا پیاروں کو ان کی منزل تک پہنچا کر... بدنصیب خاندان کراچی واپس آگیا۔ ہمیشہ کی صابر عورت نے اپنے زندگی کے سب سے بڑے نقصان

کو اپنے دل میں چھپالیا تھا۔ ہاں اگر کوئی چھپ کر رات کی تنہائیوں میں اُن کو دیکھتا تو وہ اپنے رب کے حضور ایک معصوم بچے کی طرح آہ وزاری و استغفار کرتی نظر آتیں۔

''میرے آقا، میرے گناہ بخش دے، بہت ناتواں ہوں اب مزید کسی امتحان میں مت ڈالنا میرے مالک۔''

روبی کے چہلم والے دن نومان نے ماں کو اپنے واپس جانے کی خبر دی تو وہ حیرت اور غم سے گنگ ہو کر رہ گئی تھیں۔ اب وہ کس کے آسرے پر زندہ رہیں گی۔ ان کا خیال تھا اب نومان اپنے بیوی بچوں کے ساتھ پاکستان شفٹ ہو جائے گا مگر وہ پھر سے ان کو تنہائیوں کی سوغات دے کر شاید ہمیشہ کے لیے جا رہا تھا۔

سوچا بیٹے کو روک لیں مگر غیرت اور خود داری آڑے آگئی۔ ''اگر اس کو ماں کا خیال نہیں تو میں کیوں کہوں......'' وہ مایوسیوں کے اندھیروں میں گھری ماضی، حال اور مستقبل کا تجزیہ کر رہی تھیں، کہاں تربیت میں ان سے کمی رہ گئی۔ تنہائی کے خوف سے اور بیٹے کی بے حسی سے ان کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ پھر بھی انہوں نے بیٹے کو مسکراتے ہوئے رخصت کیا مگر دروازہ بند کر کے وہ وہیں زمین پر بیٹھ گئیں ضبط کے تمام بند ٹوٹ گئے، ان کی سسکیاں، چیخوں میں بدل گئیں۔ پڑوسیوں نے پہلے دروازہ کھلوانے کی کوشش کی پھر آسیہ کو فون کیا۔ دونوں میاں، بیوی فوراً پہنچے، دروازہ توڑ کر جب اندر داخل ہوئے تو بہت دیر ہو چکی تھی۔

صابرہ بیگم اپنا ذہنی توازن کھو چکی تھیں، شاید ضبط کی انتہا یہی تھی۔ بیٹی، داماد نے علاج کی ہر ممکن کوشش کیں۔ وقتی طور پر تو وہ نارمل ہو جاتیں مگر جب دورہ پڑتا تو اپنے آپ کو کوستی، زخمی کر لیتیں، کوئی روکنے کی کوشش کرتا اس کو بھی نہ چھوڑتیں، جنہوں نے اپنی ذات سے کسی کو کبھی کوئی دانستہ نادانستہ کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ اب سب کے لیے خطرناک ہو چکی تھیں۔ مجبوراً آسیہ نے انہیں شہر سے دور اس پاگل خانے میں داخل کروادیا کیونکہ یہاں کا ماحول اور علاج دوسرے اسپتالوں سے بہتر تھا۔ اس لیے صابرہ کئی سال، سے یہاں زیرِ علاج تھیں، جب وہ ٹھیک ہوتیں تو نماز، روزے کی پابندی کرتیں، درس دیتیں سب کو نیکی کی تلقین کرتیں۔ پھر کسی وقت بیتی یادیں، باتیں، حادثات ان کے حواس پر قابو پا لیتے اور وہ دنیا اور دین سے بیگانہ ہو جاتیں۔

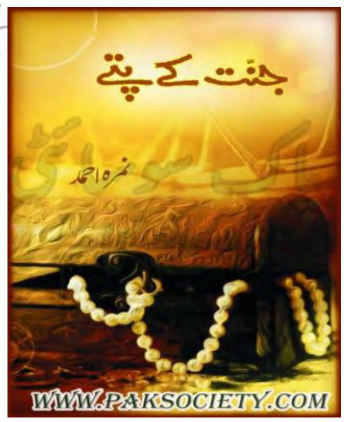
کیس فائل پر جس پر مریضہ کا نام صابرہ خاتون عمر 70 سال مریض نمبر 313 اور بیماری کا نام conversion fits لکھا تھا۔ ایک سرد آہ بھر کر میں نے بند کی۔

کافی کا گرم، گرم کپ پی کر نماز پڑھی، دعا کے لیے ہاتھ اٹھے تو لگا آج میرے پاس دنیا کی ہر نعمت ہے، میرے پاس اپنے لیے مانگنے کو کچھ نہیں، صرف صابرہ کے لیے میرے ہاتھوں کے پیالوں میں آنسو گرتے رہے۔ ان کا ہی تصور تھا۔ لبوں پر ان کے لیے دعا تھی۔

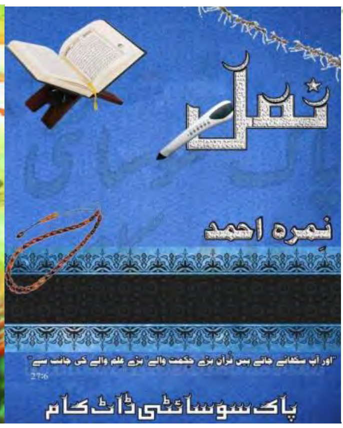
''اے مشکل کشا، اے دلوں میں رہنے والے رب......رحم فرما! اب اس نیک عورت کو سکون عطا فرما۔ جس کے لیے اب زندگی میں کچھ نہیں بچا۔ اپنے حصے کے بہت دکھ جھیل لیے اس نے...... اسے مزید آزمائش سے بچالے، رحم مالک رحم۔''

شاید یہ قبولیت کی گھڑی تھی۔ جب میں اسپتال پہنچی تو وہاں کی فضا پر سکوت چھایا ہوا تھا۔ ہر آنکھ اشکبار تھی، ہر چہرے پر ملال تھا۔ باہر کی برف نے اندر کے بھی ہر ذی روح کو منجمد کر دیا تھا۔ میں نے صابرہ کے کمرے کی طرف قدم بڑھائے، راستے میں جس جگہ وہ درس دیتی تھیں، آج سفید چادر اوڑھے وہ لیٹی تھیں۔ چہرے پر بلا کا سکون، جیسے صدیوں کی پیاسی روح کو قرار آگیا ہو۔ رشتے ناتے، صبر اور برداشت کی ہر پابندی سے بے نیاز وہ ابدی نیند سو گئی تھیں۔

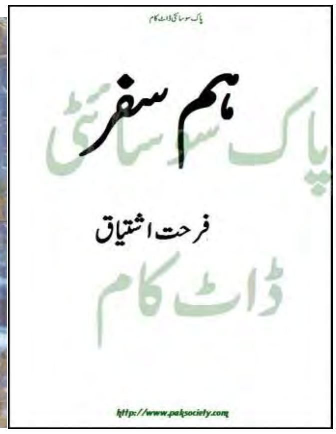
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

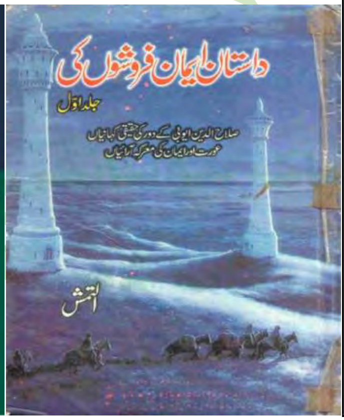




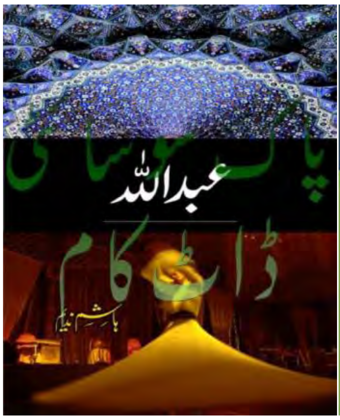


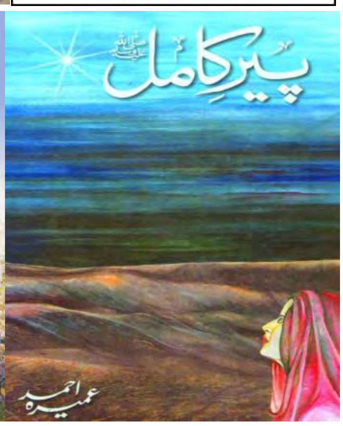


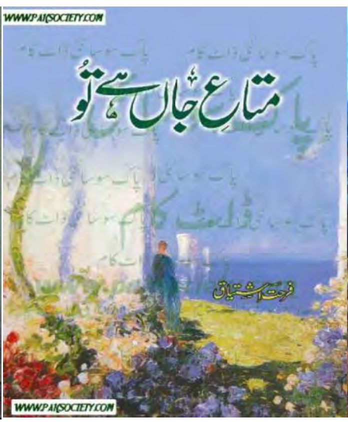


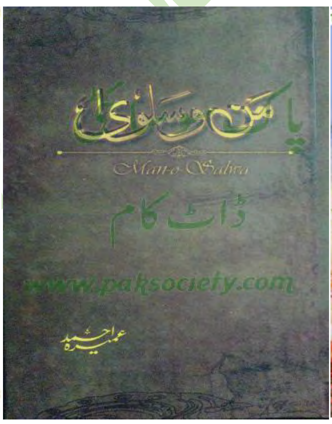




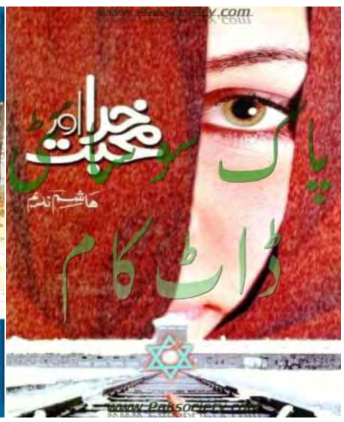


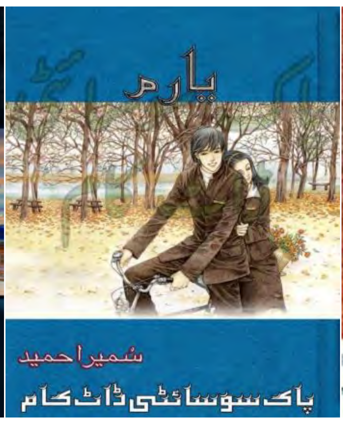




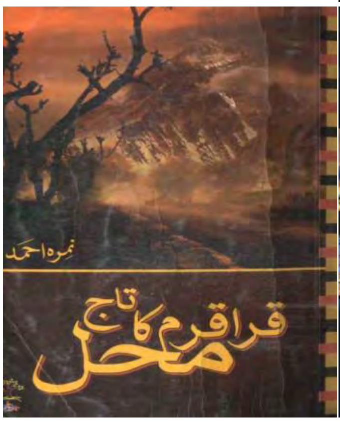














صیدِ ضیافت

نگہت سیما

میں بڑی تائی کی نظروں میں گُھنّا تھا کیونکہ میں چپ رہتا تھا۔ لاکھ بڑی تائی کچھ پوچھتیں میں منہ سے کچھ نہ پھوٹتا...... ان کے سوال عموماً چھوٹی تائی کے متعلق ہوتے تھے یا ان کے بچوں کے متعلق...... گو وہ خود بھی ان پر کڑی نظر رکھتی تھیں۔ ان کا کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، آنا جانا، اوڑھنا پہننا سب پر ان کی گہری نظر تھی پھر بھی انہیں گمان گزرتا تھا کہ شاید کہیں کچھ ان کی نظر سے رہ نہ گیا ہو۔ سو وہ مجھے بلا بھیجتیں گو میں خود ہر روز



ان کے حضور چھ سات بار حاضری دیتا تھا اوران کے ضروری اور غیر ضروری کام نبٹا تا تھا پھر بھی چھوٹی تائی کے متعلق اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے وہ مجھے بطورِ خاص بلوا بھیجتیں۔ چاہے میں اسی وقت تیس سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں پہنچا ہوتا......تیس سیڑھیاں اس طرح کہ گراؤنڈ فلور سے فرسٹ فلور تک سولہ سیڑھیاں اور فرسٹ فلور سے سیکنڈ فلور تک سولہ سیڑھیاں......سیکنڈ فلور پر ایک کمرا اور ایک باتھ تھا۔ یہ کمرا دراصل میری ماما نے گھر کے اندر کام کرنے والی ملازم لڑکی شنو کے لیے بنوایا تھا جبکہ ڈرائیور اور دوسرے مرد ملازموں کے لیے پچھلے لان کے ساتھ سرونٹ کوارٹر تھے اور اب سیکنڈ فلور کا یہ کمرا میرا نصیب تھا، میں جو اس گھر کا بلاشرکتِ غیرے مالک تھا۔ ملازم کے لیے بنوائے جانے والے کمرے میں رہتا تھا۔ خیر اس وقت تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ بڑی تائی مجھے گھنا کہتی تھیں اور میں گھنا تھا کیونکہ میں دن میں لامحالہ بیس، پچیس دفعہ تو ضرور اوپر سے نیچے آتا جاتا تھا اور چھوٹی تائی فرسٹ فلور پر اپنی آل اولاد کے ساتھ رہتی تھیں اور بڑی تائی نے گراؤنڈ فلور پر قبضہ جما رکھا تھا اور بقول بڑی تائی کے میں نہ تو اندھا تھا اور نہ آنکھوں پر کھوپے چڑھا کے اترتا تھا کہ مجھے فرسٹ فلور پر ہونے والی کسی سرگرمی کا علم نہیں ہو کہ سیڑھیاں فرسٹ فلور کے لاؤنج سے نیچے گراؤنڈ فلور کے لاؤنج میں جاتی تھیں البتہ سیکنڈ فلور کی سیڑھیاں لاؤنج کے باہر سے اوپر جاتی تھیں۔

چھوٹی تائی مجھے منافق کہتی تھیں کیونکہ میں منافق تھا۔ جب کبھی چھوٹی تائی مجھ سے پوچھتیں وہ کیسی لگ رہی ہیں تو میں خوب تعریف کرتا تھا۔ جبکہ وہ طوطے کلر کی ساڑی میں زہر لگ رہی ہوتی تھیں۔

''چل جھوٹا منافق۔'' وہ میرے بازو پر ہاتھ مارتیں لیکن اُن کا چہرہ چمک اٹھتا تھا۔ مجھے نہیں پتا کہ بڑی تائی کے سامنے چپ کا روزہ رکھنے والا میں چھوٹی تائی کے سامنے کب بولنا شروع ہو گیا تھا۔ بھلے اٹک، اٹک کر ہی سہی شاید اس روز سے جب نو، دس سال کی عمر میں چھوٹی تائی کو بلانے کے لیے میں اوپر آیا تھا اور چھوٹی تائی آئینے کے سامنے کھڑی اپنے ہونٹوں پر لپ اسٹک لگا رہی تھیں۔

''میں کیسی لگ رہی ہوں؟'' انہوں نے اچانک ہی مجھ سے پوچھ لیا۔

''اچھی......'' میرے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا حالانکہ وہ تیز سرخ لپ اسٹک اور گہرے میک اپ میں بہت بری لگ رہی تھیں لیکن اگر میں کہتا کہ وہ اچھی نہیں لگ رہی تو وہ ضرور مجھے تھپڑ مارتیں اور ان کا ہاتھ اتنا بھاری تھا کہ گھنٹوں میرا رخسار جلتا رہتا اور درد ہوتا رہتا۔ وہ ہمیشہ میرے رخسار کو ہی نشانہ بناتی تھیں۔ اس روز پہلی بار میں نے مار کے خوف سے ان کی تعریف کی تھی لیکن بعد میں اور عوامل بھی اس میں شامل ہو گئے تھے۔ اس روز چھوٹی تائی نے خوش ہو کر سینٹر ٹیبل پر پڑی چھوٹی سی باسکٹ سے ایک چاکلیٹ نکال کر مجھے دی تھی حالانکہ مدت ہوئی میں چاکلیٹ کا ذائقہ تک بھول چکا تھا تو شاید اس لیے وہ جب بھی اس طرح کی کوئی بات پوچھتیں میں ان کی تعریف ضرور کرتا تھا۔ اور چھوٹی تائی مجھے منافق کہنے کے باوجود مجھ سے پوچھتی رہتی تھیں۔

''یہ کپڑے کیسے ہیں؟''

''یہ زیور اچھا ہے ناں......؟''

اور میں کہتا ''ہاں بہت اچھا......اے ون، بیوٹی فل'' اور چھوٹی تائی مجھے کچھ نہ کچھ کھانے کو ضرور دیتیں۔ اور اگر کسی دن کچھ نہ بھی دیتیں تو زبانی، زبانی مہربان ضرور ہوتیں۔ نرمی سے بات کر کے، مسکرا کر دیکھ کر اور میں صرف گھنا اور منافق ہی نہیں تھا جھوٹا بھی تھا اور بڑے تایا دن میں دو یا تین بار ضرور مجھے انہیں القاب سے نوازتے تھے۔

''جھوٹا......مکار......شودا......'' جھوٹے کے ساتھ یہ دو اضافی بلکہ بعض اوقات تین چار اضافی خوبیاں بھی شامل ہو جاتی تھیں۔ میں ان سے جھوٹ بولتا تھا۔ پہلی بار میں نے اس وقت ان سے جھوٹ بولا تھا جب میں جھوٹ کے معنی تک نہیں جانتا تھا۔ میری عمر

تب سات سال تھی یا شاید سات سے بھی کچھ کم یا زیادہ...... معلوم نہیں۔ اس روز تائی نے مجھے ناشتا نہیں دیا تھا اور دوپہر کا کھانا بھی گول کر گئی تھیں اور بھوک سے میرے پیٹ میں بل پڑ رہے تھے اور آنکھوں کے آگے ترمرے سے ناچ رہے تھے۔ جب سب سونے کے لیے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے تو میں دبے پاؤں کچن میں گیا تھا اور دن کی بچی ہوئی روٹی کے کچھ ٹکڑے چنگیر سے اٹھا کر میں نے اپنی مٹھی میں بند کر لیے تھے۔ جب بڑے تایا اچانک ہی کچن میں آ گئے تھے اور مجھ سے پوچھا تھا کہ ''اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو......'' تو میں نے جواب میں کہا تھا۔

''پانی پینے آیا تھا۔''

''یہ پیچھے کیا چھپایا ہوا ہے؟''

''کچھ نہیں......''

میں نے ہاتھ پیچھے کیے، کیے ہی بائیں ہاتھ میں بند روٹی کا ٹکڑا دائیں ہاتھ میں بند کر کے بایاں ہاتھ آگے کر دیا تھا۔ لیکن تایا بھی بڑے کایاں تھے انہوں نے میرا دوسرا ہاتھ پکڑ کر آگے کیا اور بند مٹھی کھول کر دیکھی۔

''جھوٹے...... جھوٹ بولتا ہے۔''

ایک جھانپڑ لگا کر وہ چلے گئے تھے اور میں مٹھی میں دبا روٹی کا ٹکڑا کھانے لگا تھا...... لیکن اب تو میں ضرورتاً جھوٹ بول لیتا تھا سوچ سمجھ کر مثلاً جب میرا ضروری ٹیسٹ ہوتا اور مجھے لائبریری جانا ہوتا یا کسی دوست کے پاس جا کر پڑھنا ہوتا اور تایا مجھے باہر جاتے دیکھ کر کسی کام کا کہتے تو میں دھڑلے سے جھوٹ بول دیتا۔

''ابھی تو چھوٹی تائی کے کام سے جا رہا ہوں پھر آ کر آپ کا کام کر دوں گا۔''

کبھی جھوٹ کھل جاتا اور کبھی نہ کھل پاتا پھر بھی بڑے تایا نے مستقل طور پر میرا نام جھوٹا رکھ دیا تھا کہ بڑے تایا کو مجھے دیکھتے ہی کوئی نہ کوئی کام یاد آ جاتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی میرے بہت سے نام تھے جیسے ٹنڈا، ہکلا، کھمبا، تنکو وغیرہ...... جس کا جب جی چاہتا مجھے کسی بھی لقب سے بلا لیتا تھا۔ میں ٹنڈا تھا کیونکہ میرا ایک بازو تھوڑا سا ٹیڑھا تھا اور صرف ٹیڑھا ہی نہیں وہ دوسرے بازو کے مقابلے میں کمزور اور سوکھا ہوا سا تھا۔ یہ بازو پیدائشی طور پر ایسا نہیں تھا بلکہ پیدائشی طور پر میں بہت صحت مند تھا۔ یہ کارنامہ میری بڑی تائی کا تھا۔ جب کوئی مجھے ٹنڈا کہتا تو ان کی گردن فخر سے تن جاتی تھی۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ فخر سے سینے پر ہاتھ مار کر کہیں کہ یہ میرا کارنامہ ہے۔ یہ کارنامہ جب انہوں نے انجام دیا تھا تو میں آٹھ سال اور دو ماہ کا تھا میری ماما جو تقریباً ڈیڑھ سال پہلے میرے لیے گڑیا سی بہن لینے اسپتال گئی تھیں گڑیا سمیت اللہ میں کے پاس چلی گئی تھیں اور میرے بابا بقول تائی کے بیوی کا غم غلط کرنے یورپ چلے گئے تھے اور مجھے تایا کے پاس چھوڑ گئے تھے۔

یہ گھر جس میں بڑے تایا اور چھوٹے تایا رہتے تھے ہمارا آبائی گھر تھا لیکن میرے بابا گاؤں والے اس آبائی گھر میں نہیں رہتے تھے بلکہ ہم لاہور میں رہتے تھے۔ دادا، دادی کا انتقال ہو چکا تھا۔ بڑی تائی مجھ سے نفرت کرتی تھیں، کہانیوں اور افسانوں کی طرح والی...... کوئی بات تو نہیں تھی کہ میرے بابا نے تائی یا ان کی بہن کو رد کر کے ماما سے شادی کر لی ہو اور اب تائی انتقاماً مجھ سے نفرت کرتی تھیں۔ تائی کی کوئی بہن تھی ہی نہیں اور جب بڑی تائی کا نکاح بڑے تایا سے ہوا تھا تو تب بابا آٹھویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ تایا اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے اور بابا سب سے چھوٹے، بڑے تایا اور چھوٹے تایا کے بعد دو بہنیں تھیں اور پھر بابا تھے تو ایسا کچھ نہیں تھا۔ بابا کو میری ماما اچھی لگی تھیں، وہ ان کے کسی دوست کی کزن تھیں۔ دادی جب ان کے لیے لڑکی دیکھ رہی تھیں تو بابا نے ماما کا نام لے دیا اور دادی خوشی، خوشی رشتہ لے کر پہنچ گئیں لیکن اُدھر سے پہلے تو صاف انکار ہو گیا کہ وہ برادری سے باہر رشتہ نہیں کرتے لیکن پھر کچھ بابا کے دوست کے زور دینے پر اور کچھ ماما کی مرضی جان کر دادی کے کئی بار جانے کے بعد بابا کا رشتہ قبول تو کر لیا گیا لیکن خوش دلی سے نہیں...... سو اُن لوگوں نے ماما سے شادی

کے بعد بہت کم رابطہ رکھا، اس لیے میں نے اپنے ننھیالی رشتے داروں کو اپنے گھر آتے نہیں دیکھا تھا۔ ہاں ماما کی وفات پر سنا تھا کہ وہ لوگ آئے تھے۔ میرے ماموں اور نانا...... نانی کا شاید انتقال ہو گیا تھا لیکن مجھے یاد نہیں کہ وہ مجھے ملے تھے یا نہیں...... تو بڑی تائی کی نفرت کی وجہ کچھ خاص نہیں تھی کچھ لوگ ہوتے ہیں ناں جو بلاوجہ ہی دل میں کسی کے لیے دشمنی پال لیتے ہیں جیسے بھابیاں، نندوں سے، نندیں، بھابیوں سے بہویں، ساسوں سے تو بڑی تائی بھی ایسے ہی لوگوں میں سے تھیں اور انہیں بھی ماما سے بلاوجہ کی دشمنی تھی۔ وہ شاید ماما کی خوب صورتی اور ان کی تعلیم سے جلتی تھیں۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میرے بازو کو بیکار کرنے کا کارنامہ بڑی تائی نے سرانجام دیا تھا۔

مجھے یاد نہیں کہ کیا ہوا تھا...... میں نے کیا، کیا تھا یا میری کیا غلطی تھی لیکن اس روز بڑی تائی نے مجھے کپڑے دھونے والی کونڈی سے مارا تھا۔ وہ مجھے اندھا دھند مار رہی تھیں، میں چہرہ بچانے کے لیے بازو سے چہرہ چھپاتا تو کونڈی میرے بازو پر لگتی...... پتا نہیں میرے بازو کی ہڈی کہاں، کہاں سے ٹوٹی تھی لیکن شام تک میرا پورا بازو سوج گیا تھا اور میں درد کی شدت سے بار، بار بے ہوش ہو جاتا تھا اور جب ہوش میں آتا تو چیخنے چلانے لگتا۔ تب تایا مجھے کسی سیانے کے پاس لے کر جانا چاہتے تھے کہ کہیں کوئی ہڈی وڈی نہ ٹوٹ گئی ہو لیکن تائی نے واویلا مچا دیا کہ ایک ذرا سا مارا تھا خواہ مخواہ ڈراما کر رہا ہے۔ اور تایا دبک کر بیٹھ گئے۔ پتا نہیں یہ مرد اپنی بیویوں سے کیوں ڈرتے ہیں، میں نے تو ہر مرد کو اپنی بیوی کے سامنے چوہا بنتے ہی دیکھا ہے۔ چاہے گھر کے باہر اور دوسروں کے سامنے وہ کتنا ہی دبنگ اور شیر کیوں نہ ہو۔ سو تایا بھی بیٹھ گئے تھے اور تائی نے مجھے ڈھیر ساری افیون چٹا دی تھی تاکہ میرا چیخنا اور تڑپنا ان کے آرام میں خلل نہ ڈالے۔ میں مدہوشی میں بھی چارپائی پر پڑا درد کی شدت سے جھٹکے کھاتا تھا۔ کیا کوئی اتنا بھی ظالم ہو سکتا ہے کہ ایک آٹھ سال دو ماہ

کے بچے پر اتنا ظلم ڈھائے تو میرا جواب ہے کہ ہاں کیونکہ لیے کہ یہ ظلم مجھ پر ڈھایا گیا تھا۔ میرے بابا فون کرتے تایا سے میری ان سے خیریت پوچھ کر مطمئن ہو جایا کرتے تھے۔ تایا نے کبھی میری بات نہیں کروائی تھی کہ کہیں میں ان کی شکایت نہ کر دوں۔ ان سے مطلب تائی کی ورنہ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ڈیڑھ سال میں بابا نے ایک بار بھی مجھ سے بات کرنے کی خواہش نہ کی ہو۔ میں نے تو نہیں البتہ بخشو چاچا نے انہیں بتا دیا تھا کہ بڑی تائی کا سلوک میرے ساتھ اچھا نہیں ہے۔ دراصل فون گھر کے مردانے حصے میں تھا اور اس روز جب بابا کا فون آیا تو مردانے میں موجود بخشو چاچا نے فون اٹینڈ کیا تھا کہ بڑے اور چھوٹے تایا دونوں ہی گھر پر نہیں تھے اور یوں انہوں نے بابا کو ساری صورتِ حال جلدی، جلدی بتا دی تھی۔ بخشو چاچا یوں تو جانوروں کی دیکھ ریکھ کرتے تھے لیکن وہ گھر کے کئی دوسرے کام بھی کر دیا کرتے تھے۔ بخشو چاچا نے بابا کو اپنی گود میں کھلایا تھا اس لیے انہیں مجھ سے ہمدردی تھی۔ تائی نے میرا بازو توڑنے کے بعد میری چارپائی باہر صحن میں ڈلوا دی تھی کہ تکلیف کی شدت سے میں روتا، چلاتا تھا اور مجھے غشی کے دورے پڑنے لگے تھے۔ یہ شاید تیسرا دن تھا۔ میں بان کی کھردری چارپائی پر نیم بے ہوش سا پڑا تھا...... روتے، روتے میرے آنسو خشک ہو گئے تھے۔ آواز بیٹھ گئی تھی۔ نقاہت اتنی زیادہ تھی کہ میں بہ مشکل آنکھیں کھولتا تھا۔ جب صحن کا دروازہ ایک چرچراہٹ کے ساتھ کھلا اور کوئی بیگ اٹھائے اندر داخل ہوا تھا یہ میرے بابا تھے۔ میں انہیں ڈیڑھ سال بعد دیکھ رہا تھا لیکن مجھ میں اتنی سکت نہیں تھی کہ انہیں آواز دے سکوں حالانکہ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں دوڑتا ہوا جاؤں اور ان سے لپٹ جاؤں...... وہ میری چارپائی سے چند قدم دور کھڑے حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ شاید انہیں مجھے پہچاننے میں وقت ہو رہی تھی۔ یہ میرا خیال تھا۔ میں انہیں بتانا چاہتا تھا یہ میں ہوں...... ان کا لاڈلا ان کا شہزادہ......

''با......با......'' بہ مشکل میں نے پوری طاقت صرف کرتے ہوئے انہیں پکارا تھا۔ اتنے میں وہ چند قدم کا فاصلہ پاٹ کر میرے قریب آچکے تھے اور انہوں نے بیگ زمین پر رکھتے ہوئے مجھ آٹھ سال دو ماہ کے لڑکے کو گود میں اٹھالیا تھا۔ وہ حیران تھے، شاک میں تھے۔ شاید وہ مجھے اس حال میں دیکھنے کی توقع نہیں کررہے تھے۔ دو ہفتے پہلے بخشو چاچا نے انہیں یہ تو بتایا تھا کہ میرے ساتھ یہاں اچھا سلوک نہیں ہورہا۔ لیکن میری یہ حالت ہوگی انہیں اندازہ نہیں تھا۔

''میرا بیٹا......میری تابی کی نشانی......'' وہ مجھے گلے لگائے رورہے تھے۔

اور میں ہکلایا تھا۔ یہ کارنامہ بھی اصل میں بڑی تائی کا ہی تھا لیکن وہ اپنے اس کارنامے سے بے خبر تھیں۔ جب بھی ان کے بچوں میں سے مجھے کوئی ہکلا کہتا تو وہ تمسخر سے ہنستیں اور پھر فخر سے اپنے بچوں کی طرف دیکھتیں جو میری طرح ہکلے نہیں تھے بلکہ ان کی زبانیں تھیں کہ قینچیاں کتر، کتر چلتی تھیں۔ یہ چھوٹی تائی کے خیالات تھے جن کا اظہار وہ اکثر کرتی تھیں اور پھر زبان سے چچ، چچ بھی کرتی تھیں۔ تو میں جو یہ ہکلا کر بولتا تھا تو دراصل میں اسے بڑی تائی کا کارنامہ اس لیے کہتا ہوں کہ اس روز جب میرے بابا مجھے گلے لگائے روتے ہوئے بار، بار مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ مجھے کیا ہوا ہے۔ میرا بازو اس طرح کیوں سوجا ہوا ہے اور میں یوں لاوارثوں کی طرح صحن میں کھردری چارپائی پر کیوں پڑا ہوا ہوں اور ابھی میں نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ عین اس وقت بڑی تائی نے صحن میں قدم رکھا تھا۔

اور آنکھوں ہی آنکھوں میں دھمکیاں دی تھیں کہ اگر کچھ کہا تو اس سے بھی برا حشر کروں گی اور میں جو بابا کو بتانے ہی لگا تھا کہ بڑی تائی نے مارا ہے' ہکلا گیا۔

''وہ، وہ......میں......''

اور تائی یک دم آگے بڑھی تھیں۔

''یہ چھت سے گر گیا ہے شاید بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ یہ آج کل کے بچے بڑوں کی کہاں سنتے ہیں۔ پتنگ لوٹنے کے لیے چھت پر چڑھ گیا تھا۔ مجھے خبر ہی نہیں ہوئی۔''

بڑی تائی بڑی صفائی سے جھوٹ بول رہی تھیں۔

''بس تمہارے بھائی صاحب گھر پر نہیں تھے ان کا انتظار کررہی تھی کہ آجائیں تو اسے اسپتال لے جائیں ویسے تم اچانک آگئے نہ کوئی خیر خبر نہ اطلاع......''

وہ بات تو بابا سے کررہ تھیں اور گھور مسلسل مجھے رہی تھیں۔ اور میرا ننھا سا دل سینے میں ایسے پھڑکتا تھا جیسے چڑیا کا ننھا سا بچہ کسی بچے کی مٹھی میں پھڑکتا ہے تو اس روز جو میں پہلی بار ہکلایا تو پھر کبھی ہکلائے بغیر بات نہیں کرسکا۔ بابا، تائی کی بات کا جواب دیے بغیر انہی قدموں مجھے گود میں اٹھائے اور ایک ہاتھ میں اپنا بیگ پکڑے باہر نکل آئے تھے۔ میں نے تو انہیں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن انہوں نے بخشو چاچا سے سب کچھ پوچھ لیا تھا۔ وہ مجھے سیدھے شہر کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں لے کر آئے تھے۔ میرے بازو کی حالت بہت خراب تھی۔ خود میری حالت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ میلے ملگجے کپڑے آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں' بخار میں تپتا جسم......بابا نے ڈاکٹر کو ساری صورتِ حال بتادی تھی۔ مختصراً یہ کہ میرے بازو کے دو آپریشن ہوئے تھے۔ پلیٹیں بھی ڈلی تھیں۔ ڈاکٹر نے بابا سے کہا تھا ''پلاسٹر اترنے کے بعد دیکھیں گے۔ شاید ایک چھوٹا سا آپریشن اور بھی کرنا پڑے۔''

ہم اپنے اسی گھر میں آگئے تھے جہاں ماما کی ڈیتھ سے پہلے رہتے تھے۔ بابا ہر دم مجھے اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ خود نہلاتے، کپڑے پہناتے، میری پسند کے کھانے بنواتے۔ مجھے کھانا کھلانے باہر لے جاتے۔ وہ سب کھانے جن کے ذائقے میں بھول چکا تھا۔ چند ہی دنوں میں میرے چہرے پر سرخی آگئی تھی لیکن میں بابا کی باتوں کا جواب دیتے ہوئے ہکلا جاتا۔ تائی کی وہ خونخوار آنکھیں میرے تصور میں آجاتی تھیں۔ بابا اداس ہوجاتے۔

"تمہیں کیا ہوگیا ہے سنی، تم تو اپنی ماما کے طوطے تھے۔ ہر وقت چہکتے رہتے تھے۔ اب کیوں بولنے سے ڈرتے ہو، مجھ سے بات کرو میری جان۔"

وہ جلاد آنکھیں ڈراتی، دھمکاتی میرے تصور میں آجاتیں اور میں ہکلا کر رہ جاتا۔ حالانکہ میں نے اپنی عمر کے بچوں کے مقابلے میں جلدی بولنا شروع کیا تھا۔ ماما نے مجھے کتنی ہی چھوٹی، چھوٹی نظمیں یاد کروا رکھی تھیں اور جب میں اشاروں سے انہیں سناتا تو وہ بہت خوش ہوتی تھیں، بابا مجھے ایک اور ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے تھے تو ڈاکٹر نے میرا چیک اپ کر کے بابا سے کہا تھا۔

"بچہ صرف خوفزدہ ہے، اسے پہلے خوف سے نجات دلائیں۔ کوئی فزیکلی پرابلم نہیں ہے اسے۔"

اور پھر بابا مجھے ایک سائیکاٹرسٹ کے پاس بھی لے کر گئے تھے اور اس نے ساری تفصیل سننے کے بعد بابا کو تسلی دی تھی۔

"یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے، دو تین سٹنگ میں بچے کا خوف دور ہوجائے گا۔" بابا مطمئن ہوگئے تھے۔

اور میں "کھبا" تھا، اس میں کسی کا قصور نہیں تھا۔ بلکہ میں پیدائشی طور پر ہی ایسا تھا۔ ہوتے ہیں ناں کچھ بچے جو لیفٹ ہینڈڈ ہوتے ہیں تو میں بھی ایسا تھا لیفٹ ہینڈڈ...... ماما نے میرے بچپن میں کتنی ہی کوششیں کی تھیں کہ میں ہر کام دائیں ہاتھ سے کروں لیکن میں نہیں کر پاتا تھا۔ ماما کی کوششوں کا صرف اتنا نتیجہ نکلا تھا کہ میں کھانا تو دائیں ہاتھ سے کھانے لگا تھا لیکن میں لکھتا بائیں ہاتھ سے ہی تھا اور کلاس ون میں بھی میری رائٹنگ بہت خوب صورت تھی۔

میں اللہ کا شکر ادا کرتا تھا کہ میں لیفٹ ہینڈڈ تھا کیونکہ میرا دایاں بازو تائی کے کارنامے کی وجہ سے تقریباً ناکارہ ہوچکا تھا۔ ہاں اگر بابا ہوتے اور بڑی تائی اس پر دوبارہ طبع آزمائی نہ کرتیں تو شاید میرا بازو ٹھیک ہوجاتا۔ جس صبح میرا پلاسٹر کھلا تھا اس صبح ڈاکٹر نے بابا سے کہا تھا۔

"بازو معمولی سا ٹیڑھا ہے لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ ایک چھوٹی سی سرجری کے بعد یہ بالکل ٹھیک ہوجائے گا۔ لیکن یہ سرجری ہم چند ماہ بعد کریں گے۔" لیکن یہ سرجری پھر کبھی نہ ہوسکی۔

اور یہ اسی رات کی بات تھی۔ وہ رات میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس رات میں بابا کے بیڈ پر ان کے بازو پر سر رکھے سو رہا تھا اور بابا بائیں ہاتھ سے میرے بالوں میں انگلیاں پھیر رہے تھے۔ اور ساتھ، ساتھ تاسف سے کہتے جاتے تھے۔

"کاش میں جانتا ہوتا۔ کاش مجھے علم ہوتا کہ بھائی صاحب اور بھابی تمہارے ساتھ یوں کریں گے تو میں کبھی تمہیں چھوڑ کر نہ جاتا...... جب بخشو چاچا نے مجھے بتایا تو مجھے یقین ہی نہیں آیا تھا۔ پھر بھی میں چلا آیا...... بہت گھبرا گیا تھا میں۔" ان کی آنکھوں میں دکھ اور تاسف تھا۔ اس رات متعدد بار انہوں نے میری پیشانی اور رخساروں پر بوسے دیے تھے۔ تب میں نہیں جانتا تھا کہ ان ہونٹوں کا یہ شفقت بھرا لمس میں کبھی محسوس نہیں کر پاؤں گا۔ یہ انگلیاں آخری بار میرے بالوں کو چھو رہی ہیں۔ میں یہ پیارا، شفیق چہرہ پھر کبھی نہ دیکھ سکوں گا۔

"مجھے بہت ضروری جانا ہے سالک، میں نے کنٹریکٹ کیا ہوا ہے اور میں اس کا پابند ہوں، صرف دس ماہ بعد میرا کنٹریکٹ ختم ہوجائے گا۔ پھر میں ہمیشہ کے لیے تمہارے پاس آجاؤں گا۔"

میں خوفزدہ ہو کر انہیں دیکھنے لگا تھا۔

"میں تمہیں ان ظالم لوگوں کے پاس چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ میں صبح تمہیں ایبٹ آباد لے کر جارہا ہوں...... بدر منیر میرا اچھا دوست ہے اور رشتے میں تمہارا ماموں بھی لگتا ہے۔ تمہاری ماما کا فرسٹ کزن ہے۔ میری اس سے بات ہوچکی ہے دو تین ماہ وہ تمہیں گھر میں ہی پڑھائے گا تاکہ اس ڈیڑھ سال کی کمی پوری ہوجائے۔ پھر تین ماہ بعد جب ایڈمیشن اوپن ہوں گے تو وہ تمہیں وہاں ہی کسی اچھے بورڈنگ اسکول میں داخل

کروادے گا۔ وہ تو کہہ رہا تھا کہ میرے واپس آنے تک اس کے گھر میں ہی رہو...... لیکن اب میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا۔ نہ جانے اس کے گھر کی خواتین تمہارے ساتھ کیا سلوک کریں۔''

اس رات میں ان سے لپٹ کر سویا تھا۔ صبح انہوں نے میرا بیگ خود تیار کیا تھا اور بہت ساری چھوٹی، چھوٹی باتیں مجھے سمجھائی تھیں۔ ہماری گاڑی تایا نے بابا کے جانے کے بعد فروخت کردی تھی۔ اس لیے ایبٹ آباد جانے کے لیے بابا نے گاڑی ہائیر کی تھی۔ وہ میرے ساتھ ہی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا ہوا تھا اور ہولے ہولے کہہ رہے تھے۔

''تمہیں بہت بہادر بننا ہے اور کسی سے خوفزدہ نہیں ہونا۔ میں اپنی بے پروائی پر شرمندہ ہوں کہ بھائی صاحب کی بات پر اعتبار کرتا رہا اور تم سے کبھی بات کرنے کی ضد نہیں کی۔ وہ کہتے تم ٹیوشن پڑھنے گئے ہو' نہا رہے ہو، مسجد میں سیپارے پڑھنے گئے ہو تو میں سمجھتا کہ وہ صحیح کہہ رہے ہیں۔''

''اور میں سمجھتا تھا کہ آپ مجھ سے بات ہی نہیں کرنا۔'' ابھی میں نے بات مکمل بھی نہیں کی تھی کہ یکا یک دھما کا ہوا۔ میرا ہاتھ ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ میرے چہرے اور ماتھے پر کچھ کرچیاں آکر لگی تھیں۔ پھر مجھے نہیں پتا تھا کہ کیا ہوا ہے۔ میری آنکھ کھلی تو میں اسپتال میں تھا۔ اور میرے بابا نہیں رہے تھے۔ اس وقت جب میں بابا سے بات کررہا تھا نہ جانے کہاں سے ایک اینٹوں سے لدا ہوا ٹرک آیا اور بابا کی اور ڈرائیور کی موت کا سبب بن گیا۔ ابھی ہم لاہور میں ہی تھے جب موت کا پیامبر وہ ٹرک ہماری گاڑی سے ٹکرایا تھا، مجھے نہیں پتا بڑے تایا اور چھوٹے تایا کو کیسے خبر ہوئی تھی۔ شاید بابا کے سامان یا پاکٹ میں کچھ تھا۔ شاید شناختی کارڈ یا تایا ابا کے فون نمبر وغیرہ کہ وہ دونوں ہی اسپتال آگئے تھے۔ بابا کی ڈیڈ باڈی کے ساتھ مجھے بھی اسی ایمبولینس میں بٹھا دیا گیا تھا۔ اور میں ایک بار پھر اسی گھر میں تھا۔ جس میں پھر کبھی نہ جانے کے لیے بابا نے کہا تھا۔ بابا نے بڑے تایا اور تائی سے کچھ نہیں کہا تھا نہ کوئی باز پرس کی تھی نہ کوئی سوال بس اتنا کہا تھا کہ اب وہ کبھی اس گھر میں نہیں جائیں گے نہ ان سے کوئی تعلق رکھیں گے لیکن اب میں وہاں تھا اور بڑی تائی میرا بازو دبوچے کہہ رہی تھیں۔

''ڈھیٹ ہڈی کا بچ گیا ہے، ارے ساتھ ہی مرجاتا تو اچھا تھا۔ اب عمر بھر کا عذاب......''

اور میں نے بھی سوچا تھا کاش میں بھی بابا کے ساتھ ہی مرجاتا۔ اور مجھے دوبارہ تائی کے ساتھ نہ رہنا پڑتا لیکن نہ مرنا میرے اختیار میں تھا اور نہ اس گھر کے افراد سے بچنا۔ بابا کو اس دنیا سے رخصت ہوئے ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ ہم سب شہر منتقل ہوگئے۔ بڑے تایا اور تائی نے گراؤنڈ فلور سنبھال لیا اور چھوٹے تایا کی فیملی نے فرسٹ فلور...... دو چار دن تو میرا بستر لاؤنج میں لگایا گیا اور پھر مجھے شنو کا کمرا دے دیا گیا۔ شنو بارہ تیرہ سال کی وہ لڑکی تھی جو ماما کی زندگی میں ہمارے پاس رہتی تھی۔ گھر کے اندر کی صفائی، تیل لگانا اور ایسے ہی چھوٹے موٹے کام کرتی تھی۔ یہ بیڈ بھی وہی تھا جس پر پہلے شنو سویا کرتی تھی۔ پہلی رات تو میرا جی ہی نہیں چاہا اس بیڈ پر سونے کا...... میں ساری رات بیٹھا رہا لیکن پھر ظاہر ہے میں ہر رات جاگ کر نہیں گزار سکتا تھا۔ شروع میں تو مجھے ڈر بھی بہت لگتا تھا لیکن بابا نے مجھ سے آخری بات جو کہی تھی وہ یہی تھی کہ مجھے بہادر بننا ہے اور مجھے بہادر بننا تھا۔ اس لیے مجھے ڈرنا نہیں تھا لیکن میں پندرہ' سولہ سال کی عمر تک جب تک جاگتا رہتا ڈرتا رہتا اور آیت الکرسی پڑھتا رہتا۔

بڑے تایا کے دو بیٹے تھے اور .... دو بیٹیاں......اور چھوٹے تایا کا ایک بیٹا اور تین بیٹیاں...... وہ بیڈروم جس میں اس آخری رات میں بابا کے بازو پر سر رکھ سویا تھا اب بڑے تایا اور تائی کے پاس تھا۔ دور، دور سے میں حسرت سے اسے دیکھتا تھا اور مجھے اس کے اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میں سالک عبد الرحمٰن...... عبد الرحمٰن اعوان اور تابندہ

اعوان کا اکلوتا، لاڈلا بیٹا دن بھر بڑی تائی کی جھڑکیاں سنتا، مار کھاتا اور چپکے، چپکے روتا...... پھر ایک روز وہ آئے، سوچتا ہوں وہ بابا کے وہی دوست ہوں گے بدر منیر جن کے پاس ہم جا رہے تھے۔ ورنہ اور کسی کو مجھ سے کیا ہمدردی ہو سکتی تھی۔ ان کے اور بڑے تایا کے درمیان بہت تلخ کلامی ہوئی۔ چھوٹے تایا بھی اونچا' اونچا بول رہے تھے۔

''تم کس کھیت کی مولی ہو بھائی، جاؤ اپنی راہ لگو...... کس رشتے کے بل پر اتنا اچھل رہے ہو۔''

لیکن وہ جو کوئی بھی تھے تایا کی اونچی آواز سے ذرا بھی نہیں ڈرے تھے۔

''میں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا۔ کیس کر دوں گا۔ تمہارے خلاف کہ یتیم بھتیجے کی جائداد پر قبضہ جمائے بیٹھے ہیں اور بچے کی جان کو خطرہ ہے۔''

''ہم اس کے شرعی اور قانونی وارث ہیں تم نہیں۔'' بڑے تایا دہاڑے تھے۔

''وارث...... اس کی جان کے دشمن...... میرے پاس عبدالرحمٰن کا خط موجود ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اسے آپ لوگوں پر ٹرسٹ نہیں تھا۔''

''آپ کچھ ثابت نہیں کر سکیں گے۔ بہتر ہے کہ آپ ہمارے معاملات میں دخل نہ دیں۔''

چھوٹے تایا کا لہجہ اب قدرے دھیما تھا۔

میں کچن کے فرش پر بیٹھا تھا اور لاؤنج سے آنے والی آوازوں کو سنتے ہوئے دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ یہ جو کوئی بھی ہیں، مجھے اپنے ساتھ لے جائیں لیکن میری تو کوئی بھی دعا قبول نہیں ہوتی تھی۔ پھر یہ دعا کیسے قبول ہوتی۔

تائی نے مجھے سختی سے کہا تھا کہ اگر میں یہاں سے باہر نکلا تو وہ میرا دوسرا بازو بھی توڑ دیں گی اور میں وہاں ہی ڈر کر بیٹھا رہا جہاں تائی نے مجھے بٹھایا تھا۔

کافی دیر باتیں ہوتی رہیں۔ کبھی آوازیں بلند ہو جاتیں اور کبھی دھیمی...... لیکن اب مجھے ان کی باتیں سمجھ نہیں آ رہی تھیں کیونکہ بڑی تائی نے زور، زور سے کونڈی میں کچھ کوٹنا شروع کر دیا تھا۔ شاید وہ نہیں چاہتی تھیں کہ میں ان کی بات سنوں...... کچھ دیر کے لیے تائی نے کوٹنا بند کیا تو مجھے ان کی آواز آئی۔

''لیکن میں سالک سے ملے بغیر نہیں جاؤں گا۔ میں اس کا انتظار کروں گا بلکہ آپ مجھے بتا دیں کہ وہ کہاں کس مسجد میں سیپارہ پڑھنے جاتا ہے۔ میں وہاں ہی جا کر اس سے مل لوں گا۔''

شاید تایا نے ان سے کہا ہوگا کہ میں مسجد میں سیپارہ پڑھنے گیا ہوا ہوں جب انہوں نے مجھ سے ملنے کی خواہش کی ہوگی۔

''میں اسے بلواتا ہوں آپ تشریف رکھیں۔''

یہ چھوٹے تایا کی آواز تھی اور پھر کچھ دیر بعد چھوٹے تایا نے کچن کا دروازہ کھول کر چھوٹی تائی سے کہا تھا جو چند لمحے پہلے ہی کچن میں آئی تھیں۔

''اسے دس پندرہ منٹ بعد لاؤنج میں بھیج دینا اور ہاں وہ میری نماز والی ٹوپی اس کے سر پر رکھ دو۔ اور اچھی طرح سمجھا دینا کہ یہ مسجد سے سیپارہ پڑھ کر آ رہا ہے۔'' اور پھر ایسا ہی ہوا تھا میں نماز کی ٹوپی سر پر اچھی طرح جمائے لاؤنج میں داخل ہوا تھا۔

''سالک......'' وہ بے اختیار اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ''کیسے ہو بیٹا؟'' انہوں نے ایک بازو میرے گرد حمائل کرتے ہوئے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔

''میں تو آپ لوگوں کا اِنتظار کر رہا تھا لیکن پھر کتنے ہی فون کیے گھر پر یہاں سے کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ کل یہاں سے ہی کسی بچی نے فون اٹینڈ کیا اور بتایا کہ عبدالرحمٰن، میرا یار، میرا دوست اب نہیں رہا۔'' ان کی آواز بھرا گئی تھی اور انہوں نے مجھے اپنے ساتھ بھینچ لیا تھا۔ بابا کے بعد پہلی بار اس شفیق لمس کو پا کر میرا جی چاہا کہ میں چیخ، چیخ کر رو دوں، ان سے لپٹ جاؤں اور کہوں کہ مجھے ساتھ لے جائیں۔ یہاں چھوڑ کر مت جائیں لیکن میرا حلق خشک ہو گیا تھا اور زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا۔ تایا مجھے خشمگیں نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں تنبیہ کر رہے

ہوں کہ خبردار زبان سے ایک لفظ نہ نکالنا......

''آپ خوش ہو بیٹا؟ ٹھیک ہو؟'' وہ میرا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لیے پوچھ رہے تھے۔اور غیر ارادی طور پر میرا سر اثبات میں ہل گیا حالانکہ میں کہنا چاہتا تھا کہ میں خوش نہیں ہوں اور میں ٹھیک بھی نہیں ہوں۔ مجھے رات کو بہت ڈر لگتا ہے لیکن میں کچھ بھی نہیں کہہ سکا تھا۔

''میری خواہش تھی کہ تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں لیکن تمہارے تایا اس کے لیے رضامند نہیں ہیں۔ بہرحال ان کا تم پر حق ہے، میں مجبور ہوں۔'' وہ ہولے، ہولے کہہ رہے تھے۔

''تاہم میں تم سے غافل نہیں رہوں گا۔ تمہاری خبر لیتا رہوں گا۔ تم دل لگا کر پڑھنا اور ہمیشہ سب سے آگے رہنا۔ یہ تمہارے بابا اور ماما کی خواہش تھی کہ تم بہت سا پڑھو۔'' جاتے، جاتے انہوں نے جیب سے چھوٹی سی ڈائری نکالی تھی اور اس کے ایک ورق پر اپنا نمبر لکھ کر مجھے دیا تھا۔

''یہ میرا فون نمبر ہے، جب کبھی ضرورت پڑی تو مجھے فون کر لینا۔'' میں نے اس فون نمبر کو کسی قیمتی متاع کی طرح مٹھی میں بند کر لیا۔ اور سوچا کہ جب بھی مجھے موقع ملا تو میں انہیں فون کر کے کہوں گا کہ مجھے یہاں سے لے جائیں لیکن ایسا موقع ہی نہیں آیا۔ ان کے جاتے ہی بڑی تائی نے میری مٹھی سے وہ کاغذ چھین کر ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیا۔ اس رات میں بہت رویا تھا شاید مجھے لگا تھا کہ وہ ایک در جو میرے لیے کھلا تھا ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ لیکن ان کے آنے کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ اگلے روز مجھے ایک سرکاری اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔ یوں میرا ٹوٹا ہوا تعلیمی سلسلہ بحال ہو گیا۔ شاید انہوں نے میری تعلیم کے سلسلے میں بھی ان سے بات کی تھی تب ہی بڑی تائی کے بولنے کے باوجود تایا نے مجھے اسکول داخل کروا دیا تھا۔ میری دوبارہ پھر اُن سے ملاقات نہیں ہوئی۔ حالانکہ میں ہمیشہ ان کا منتظر رہا کہ شاید وہ کسی روز آ جائیں۔ مجھ سے بات کریں......لیکن وہ نہیں

''ببول''

یہ کس قدر فضول ہے
یہ زندگی ببول ہے
انا کے ہیں حصار میں
جلے ہیں اعتبار میں
اجڑ گئے بہار میں
بھلا یہ کیا حصول ہے!
یہ زندگی ببول ہے

☆☆☆

فریب تھا کہ تھا گماں
سمجھ رہے تھے سائباں
وہ پھر رہے ہیں بے مکاں
نہ حاصل و وصول ہے
یہ زندگی ببول ہے

☆☆☆

بُجھے ہوئے ہیں زہر میں
بھرے ہوئے ہیں قہر میں
ستمگروں کے شہر میں
نہ اصل نہ اصول ہے
یہ زندگی ببول ہے

☆☆☆

اجڑ گیا مرا وطن
اِدھر اُدھر جلے بدن
خزاؤں میں ڈھلا چمن
دھواں ہے اور دھول ہے
یہ زندگی ببول ہے

کلام: یمنیٰ احمد، کراچی

آئے۔ ممکن ہے وہ آئے بھی ہوں اور تایا سے مل کر چلے گئے ہوں اور انہوں نے مجھ سے ملنے نہ دیا ہو۔ تاہم مجھے خیال تھا کہ وہ ضرور بڑے تایا کو فون کر کے میرے متعلق پوچھتے ہوں گے یا کسی اور ذریعے سے باخبر رہتے ہوں گے کہ کبھی کبھار جب بڑی تائی مجھے اسکول جانے سے روکتیں تو بڑے تایا مبہم الفاظ میں ان کا ذکر کرتے تھے اور انہیں سمجھاتے تھے کہ وہ مجھے پڑھنے سے مت روکیں۔ یوں میرا پڑھائی کا سلسلہ جاری رہا اور سرکاری اسکول میں پڑھنے کے باوجود میں نے بہت اچھے نمبروں کے ساتھ میٹرک کیا۔ گو بڑی تائی اور چھوٹی تائی نے ہر ممکن طریقے سے میری پڑھائی میں روڑے اٹکانے کی کوشش کی تھی لیکن میٹرک کے بعد میں نے اتنا ضرور جان لیا تھا کہ اگر مجھے ان کے چنگل سے نکلنا ہے تو مجھے پڑھنا ہے سو میں پڑھ رہا تھا گو میں کوئی پروفیشنل ایجوکیشن حاصل نہیں کر سکا تھا یعنی ڈاکٹر یا انجینئر نہیں بن رہا تھا حالانکہ میری خواہش تھی کہ میں بابا کی طرح انجینئر بنوں لیکن تایا ابا نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اب میری تعلیم کے اخراجات برداشت نہیں کریں گے۔ اگر مجھے پڑھنا ہے تو اپنے زور پر پڑھوں...... سو میں نے اپنے ایک ٹیچر کے مشورے پر ایف ایس سی میں کمپیوٹر سائنس رکھ لی تھی اور مجھے امید تھی کہ تعلیم ختم کرنے کے بعد مجھے کہیں نہ کہیں جاب ضرور مل جائے گی۔ میرے ٹیچر نے کالج میں میرے ایڈمیشن کے سلسلے میں نہ صرف میری مالی مدد کی تھی بلکہ ہر طرح سے میری حوصلہ افزائی بھی کی تھی۔ اور میرے لیے مڈل کلاس تک کے چند بچوں کی ٹیوشن کا بھی انتظام کر دیا تھا۔ یوں میری پڑھائی کا سلسلہ چل پڑا تھا......

اور شاید میرے ان ٹیچر کی رہنمائی میری زندگی میں کچھ مثبت تبدیلیاں لے آتی کہ ان کا ٹرانسفر کسی دوسرے شہر میں ہو گیا۔ جانے سے پہلے انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں اپنی پڑھائی کبھی نہ چھوڑوں...... وہ میرے کچھ نہ تھے، میرا ان سے کوئی رشتہ نہیں تھا لیکن وہ مجھ سے ہمدردی رکھتے تھے۔ اور میں اب... بابا کے دوست کے بعد اپنے اس واحد، ہمدرد سے بھی محروم ہو گیا تھا اور اس دکھ نے کتنی ہی بار میری آنکھوں میں آنسو بھر دیے اور میں جو اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش کر رہا تھا پھر ویسا ہی ہو گیا گھنا، مکار، جھوٹا، کبھی کبھی جب میں اپنا تجزیہ کرتا تو مجھے لگتا کہ میری شخصیت میں بہت سی کجیاں اور خامیاں ہیں کبھی جو میں ان خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتا بھی تو ناکام ہو جاتا۔ مجھے لگتا تھا کہ یہاں ان سب کے ساتھ رہ کر میں ان خامیوں پر قابو نہیں پا سکتا ہر روز مجھے اتنا ستایا جاتا، میرا اتنا استحصال کیا جاتا کہ میں تڑپ کر رہ جاتا تھا جواباً میں تایا سے جھوٹ بول کر چھوٹی تائی کی خوشامد کر کے بڑی تائی کو کچھ نہ بتا کر انہیں چڑا کر خود کو تھوڑا مطمئن کر لیتا تھا۔

شاید میری ساری زندگی ایسے ہی گزر جاتی سب کی خدمتیں بجا لاتے اور باتیں سنتے اگر جو مجھے دانیال احمد نہ مل جاتا تو یہ دانیال احمد ہی تھا جس نے مجھے بتایا تھا کہ میری اپنی بھی کوئی شخصیت ہے اور یہ کہ جو کمزور ہوتا ہے سب اسے ہی دباتے ہیں...... اور اپنے حق کو چھوڑ دینا بزدلی ہے۔ یہ دانیال احمد کون تھا میں خود نہیں جانتا وہ بالکل اچانک ہی میری زندگی میں آیا تھا۔

اس روز میں گھر کے قریب پارک میں بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ یہ پارک ہمارے بلاک میں بالکل ہمارے گھر کے سامنے روڈ کراس کر کے تھا۔ اکثر شام میں بچے یہاں کھیلتے تھے...... پارک میں بچوں کے لیے جھولے وغیرہ بھی تھے۔ میں نے ایف ایس سی بہت اچھے نمبروں میں پاس کیا تھا اور یونیورسٹی میں آئی ٹی میں ایڈمیشن لے لیا تھا اور ایک ٹرسٹ کی طرف سے مجھے اچھا اسکالر شپ بھی مل گیا تھا۔ میرا فرسٹ سیمسٹر نزدیک تھا، میں اگر گھر میں ہوتا تو کسی نہ کسی کو کوئی نہ کوئی کام یاد آتا رہا تھا۔ کوئی کام نہ بھی ہوتا تو چھوٹی تائی مجھے فضول کاموں میں لگا دیتی تھیں ...... سو مجھے جب بھی پڑھائی کرنا ہوتی، میں پارک میں آ جاتا تھا اور اس روز بھی میں پارک میں ایک تنہا گوشے میں بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ جب بڑے تایا مجھے ڈھونڈتے ہوئے پارک میں آئے تھے

یقیناً انہیں تائی نے ہی میری تلاش میں بھیجا تھا حالانکہ میں اپنی طرف سے تائی کے سارے کام نبٹا کر آیا تھا۔

''اچھا تو تم یہاں بیٹھے انجوائے کررہے ہو۔''

تایا نے یک دم ہی میرے سامنے آکر کہا تھا۔ میں بوکھلا کر کھڑا ہوگیا۔ میں انہیں بتانا چاہتا تھا کہ میں یہاں انجوائے نہیں کررہا بلکہ پڑھ رہا ہوں لیکن میں گھگیا کر رہ گیا تھا۔

''کیا تمہیں پتا نہیں کہ آج ثنا کے سلسلے میں مہمان آرہے ہیں اور تم یہاں چھپ کر بیٹھ گئے ہو۔ کام کرنے سے تو تمہاری جان نکلتی ہے ناں......'' میں انہیں بتانا چاہتا تھا کہ میں نے وہ سب سامان تائی کو لا کردے دیا تھا جس کی لسٹ تائی نے مجھے دی تھی۔ کام سے تو ثنا، حنا کی جان نکلتی تھی۔ کچن میں جاتے ہوئے ان کا دل گھبراتا تھا۔ اس لیے تو بیکری کے سامان کے علاوہ دہی بھلے، کباب، نگٹس، بروسٹ سب ہی کچھ تو میں بازار سے خرید کر لایا تھا پھر......

''تایا جی......وہ......'' اور میں ہکلا کر رہ گیا کچھ بھی نہیں کہہ سکا۔

''بکواس نہ کر۔'' ان کی آنکھیں خوں رنگ ہورہی تھیں۔ پتا نہیں وہ کیوں اتنے غصے میں تھے۔ ابھی میں اپنی پوری بات نہیں کرپایا تھا کہ ان کا تھپڑ میرے رخسار پر پڑا۔ ایک لمحے کے لیے میرا سر گھوم گیا۔ میرے ہاتھ میں موجود کتاب نیچے گر پڑی۔ میں جھک کر اسے اٹھانا چاہتا تھا کہ انہوں نے اپنے پاؤں سے مجھے ٹھوکر ماری میری پنڈلی جھنجھنا اٹھی۔ تایا کی مار میرے لیے نئی نہیں تھی' وہ کبھی کبھار مجھ پر ہاتھ اٹھالیتے تھے۔ یوں ہی بلاوجہ تائی کے اکسانے پر، میں ان کے تھپڑ، جوتے کھانے کا عادی تھا لیکن یہاں پارک میں اس طرح گھر کے باہر پہلی بار تایا مجھے مار رہے تھے۔ پارک میں کھیلتے بچے بھی یقیناً مجھے دیکھ رہے ہوں گے اور دیکھنے والوں نے جانے کیا سوچا ہوگا اور کیا اندازے لگائے ہوں گے کہ یہ شخص مجھے کیوں مار رہا ہے...... میں کوئی چھوٹا بچہ نہیں تھا... انیس، بیس سال کا جوان لڑکا تھا......کاش زمین دھنس جاتی اور میں اس میں سما جاتا۔ اس سمے میں نے بڑی شدت سے خواہش کی تھی۔ تایا نے جاتے، جاتے ایک اور ٹھوکر میری ٹانگوں پر ماری تھی۔ میرا رخسار جل رہا تھا۔ میری ٹانگوں میں درد ہورہا تھا۔ لیکن اس تکلیف سے زیادہ یہ احساس مجھے اذیت دے رہا تھا کہ پارک میں موجود بچے اور اِکا دُکا خواتین مجھے مار پڑتے دیکھ کر کیا سوچتے ہوں گے۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اردگرد موجود لوگوں کی پروا کیے بغیر زور، زور سے روؤں اونچا، اونچا۔ مجھے پہلی بار ماما اور بابا پر غصہ آرہا تھا کہ وہ مجھے کیوں چھوڑ کر چلے گئے ان ظالم لوگوں کے پاس لیکن میں ضبط کیے ہونٹ بھینچے کھڑا تھا۔ جب اس نے بہت آہستگی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا، وہ مجھے ہی دیکھ رہا تھا اس کی آنکھوں میں نرماہٹ تھی اور لبوں پر مہربان سی مسکراہٹ۔

''بیٹھ جاؤ......دوست......'' اس نے زمین پر پڑی کتاب اٹھا کر مٹی جھاڑی اور مجھے دے دی۔ میں کسی روبوٹ کی طرح کتاب لے کر بینچ پر بیٹھ گیا۔ سر جھکائے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے زمین کی طرف دیکھتا ہوا۔

''اپنے آپ پر جبر مت کرو......رونا چاہتے ہو تو رولو۔'' وہ میرے قریب ہی بیٹھ گیا تھا۔

میں نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا آس پاس کوئی نہیں تھا۔ وہ بچے جو تایا کی بلند آواز سن کر اکھٹے ہوگئے تھے۔ اب سامنے نہیں تھے۔ اور پارک کے دوسرے حصے میں جاکر اپنے کھیل میں مصروف ہوگئے تھے۔ آنسو بے اختیار ہی میری آنکھوں سے بہہ نکلے تھے۔ اور میں کوشش کے باوجود انہیں روکنے پر اختیار نہیں رکھتا تھا۔ مجھے نہیں یاد کہ میں آخری بار کب رویا تھا۔ شاید بابا کی موت پر یا شاید ان کے بعد بھی کچھ عرصے تک بات بے بات میرے آنسو نکل آتے تھے۔ اکثر راتیں روتے، روتے سو جاتا تھا لیکن پھر خود بخود ہی میرے آنسو خشک ہوگئے تھے شاید میں نے جان لیا تھا کہ میرے آنسو اور میرا رونا میرے حالات نہیں بدل سکتے۔

لیکن آج پتا نہیں کیا ہوا تھا کہ میں سالوں بعد رو رہا تھا۔ حالانکہ میں اب بھی جانتا تھا کہ میرا رونا بے فائدہ ہے۔ شاید بے عزتی کا احساس مجھے رُلا رہا تھا یا پھر اس شخص کا وہ نرم لہجہ، وہ مہربان آواز...... نرمی سے کہتی آواز

''رُولو...... رونا چاہتے ہو تو......'' وہ خاموشی سے مجھے روتا دیکھ رہا تھا۔ پتا نہیں میں کتنی دیر تک آنسو بہاتا اس کی موجودگی کے احساس سے بے خبر پھر اس نے میرے بازو پر ہاتھ رکھا، میں نے چونک کر سر اٹھایا مجھے احساس ہوا کہ میں اکیلا نہیں ہوں۔ میرے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔ مجھے اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ مدھم سا مسکرایا۔

''میں دانیال ہوں...... دانیال احمد......''

یک دم بہت ساری شرمندگی نے مجھے گھیر لیا۔ اس نے مجھے مار کھاتے اور اب روتے دیکھا تھا۔ اور پتا نہیں دل ہی دل میں مجھ پر کتنا ہنس رہا ہوگا۔

''ہوتا ہے، ہو جاتا ہے ایسا کبھی، کبھی۔'' اس کی آنکھوں میں ایک نرم سا تاثر تھا۔

''ایک بار میرے دادا نے بھی مجھے یوں ہی پارک میں مارا تھا۔ اور میرے دادا......'' اس نے.... جھرجھری سی لی تھی۔

''اُف...... اور کیا بتاؤں انہوں نے تو میرا ذرا بھی لحاظ نہیں کیا تھا۔ اپنے پشاوری جوتے سے میری ایسی مرمت کی تھی کہ میری اماں دو دن تک میری ٹکور کرتی رہی تھیں۔ میں نے بھی پورے تین دن تک دادا سے بات نہیں کی تھی لیکن پھر اماں نے مجھے سمجھایا تھا کہ وہ بزرگ ہیں، بڑے ہیں انہوں نے تمہارے بھلے کے لیے ہی تمہیں مارا ہوگا۔ تمہاری کوئی غلطی ہوگی ناں۔''

''لیکن انہوں نے مجھے میرے بھلے کے لیے نہیں مارا اور نہ ہی میں نے کوئی غلطی کی ہے۔'' بے اختیار ہی میرے لبوں سے نکلا تھا۔

''غلطی تو میرے بابا اور ماما کی ہے جنہیں اس دنیا سے جانے کی جلدی تھی۔ جنہوں نے.... ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا کہ میں ان کے بغیر اکیلا کیسے اس ظالم دنیا میں سروائیو کروں گا۔''

''اوہ......'' اس نے ایک دم ہونٹ سکیڑے تھے اور اس کی آنکھوں سے تاسف جھلکنے لگا تھا۔

''یہ......؟''

''میرے تایا تھے۔'' میں نے اس کے پوچھنے سے پہلے ہی بتا دیا۔

''اور انہوں نے یقیناً مجھے تائی کے اکسانے پر مارا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ تائی نے ان سے میری کیا شکایت کی ہے۔ لیکن تایا اکثر مارتے رہتے ہیں مجھے۔'' اس روز میں نے دانیال احمد سے...... اس اجنبی لڑکے سے جس سے میں پہلی بار ملا تھا جسے میں آج سے پہلے جانتا تک نہیں تھا سب کچھ کہہ دیا تھا۔ ماما کی ڈیتھ سے لے کر اب تک کی ہر بات...... اس سے بات کرتے، کرتے کئی بار میں ہکلایا۔ کئی بار اٹکا لیکن وہ بہت سنجیدگی اور خاموشی سے مجھے سنتا رہا۔ میرے ہکلانے پر...... ایک بار بھی مجھے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے تمسخر نظر نہیں آیا البتہ جب میں ہکلاتا تو وہ میرے بازو پر ہلکا سا دباؤ ڈال کر جیسے میرا حوصلہ بڑھاتا تھا اور یہ دانیال احمد سے میری پہلی ملاقات تھی جو آخری ملاقات نہیں تھی۔ وہ بھی اسی یونیورسٹی میں پڑھتا تھا اور مجھ سے ایک سال سینئر تھا۔

''مجھے یقین ہے یہ ہماری آخری ملاقات نہیں ہوگی۔''

پارک میں اندھیرا پھیل گیا تھا جب میں اور دانیال اٹھے تھے اور دانیال نے پارک کے گیٹ پر مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا تھا۔ لیکن میں خاموش رہا تھا میں از حد دلگرفتہ اور مایوس ہو رہا تھا۔ ایسی زندگی سے تو موت اچھی ہے۔ میں نے سوچا تھا۔ میرا دل اتنا مردہ کبھی نہیں ہوا تھا جتنا اس وقت تھا۔

''تمہیں لگتا ہے کہ موت کسی بھی مسئلے کا آسان حل ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔'' پارک سے باہر روڈ پر وہ ایک لمحے کے لیے چلتے، چلتے رک گیا تھا۔ کیا وہ میرے دل میں جھانک رہا تھا، میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''صبح یونیورسٹی میں ملاقات ہوگی۔'' وہ مسکرایا تھا۔

''میرا گھر بھی اسی بلاک میں ہے اور میں بھی اسی یونیورسٹی میں پڑھتا ہوں۔'' میں نے اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ اس سے الوداعی مصافحہ کر کے اپنے گھر کی طرف بڑھ گیا تھا۔ میرا گھر جس پر دوسروں نے قبضہ کر رکھا تھا۔

''سنو...... کیا ہم دوست بن سکتے ہیں؟'' وہ تیزی سے چلتا ہوا میرے ہم قدم ہوا تھا۔

میرے لیے لفظ دوست نیا تھا' میں نے کبھی کسی طرف دوستی کا ہاتھ نہیں بڑھایا تھا۔ اور نہ ہی کبھی کسی نے مجھے دوست بنانے کی خواہش کی تھی اور یہ لڑکا دانیال احمد جو مجھ سے پہلی بار ملا تھا اور پہلی بار ہی مجھ سے دوستی کی خواہش کر رہا تھا۔ مجھے اس سے کچھ عجیب سا لگا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

''میں اچھا دوست نہیں بن سکتا۔ مجھ میں بہت سی خامیاں ہیں۔'' اس وقت مجھے اپنی ساری خامیاں اور کمزوریاں یاد آ گئی تھیں۔ گھنا، ہکلا، منافق، جھوٹا میں بھلا کسی کی دوستی کے قابل کب تھا۔

''خامیاں تو مجھ میں بھی یقیناً بہت سی ہوں گی۔'' دانیال احمد مسکرایا تھا۔ اسٹریٹ لیمپ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

''کیا، آپ مجھے میری خامیوں سمیت اپنی دوستی کا شرف بخشیں گے مسٹر......'' اس کے لہجے سے شرارت جھلکتی تھی اور آنکھوں میں پُرخلوص سی آنچ دہکتی تھی۔

''سالک...... سالک عبدالرحمٰن۔''

''خوب صورت...... بہت خوب صورت نام ہے۔'' اس نے پھر گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔

''انشاء اللہ کل ملاقات ہوگی۔'' وہ مسکرایا اور رخصت ہوگیا۔ لیکن میں بہت دیر تک گھر کے گیٹ کے باہر کھڑا رہا...... یہ گھر جسے میرے ماما اور بابا نے بہت شوق سے بنوایا تھا۔ میں اس گھر میں جانا نہیں چاہتا تھا لیکن میں کہاں جاتا۔ میں بیس سالہ سالک عبدالرحمٰن گھر کے گیٹ کے باہر کھڑا خوف سے کانپ رہا تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے بابا کی ڈیتھ کے بعد پہلی رات مجھ پر خوف طاری ہوگیا تھا۔ میں خوفزدہ سا گیٹ کے اندر داخل ہوا تھا۔ خلافِ معمول لاؤنج خالی تھا، میں اِدھر اُدھر دیکھے بغیر دبے قدموں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر اپنے کمرے میں پہنچ گیا تھا اور دل ہی دل میں شکر ادا کیا تھا کہ کسی سے مڈبھیڑ نہیں ہوئی تھی۔ پوری رات میں نے جاگ کر گزاری تھی۔ بہت عرصے سے تو میں نے اپنا وجود پتھر کا کر لیا تھا لیکن پھر آج کیا ہوا تھا کہ یہ پتھر موم میں ڈھل گیا تھا۔ میں نے گزری ہر بات کو یاد کیا تھا اور صبح تک نہ جانے کتنی بار رویا تھا۔ اور وہ لڑکا دانیال احمد کہتا تھا مجھے زندگی کی ان آزمائشوں سے ہار نہیں ماننی چاہیے۔ اور اگر جو وہ سب کچھ جو میرے ساتھ گزرا تھا اس کے ساتھ گزرا ہوتا تو شاید وہ ایسی بات کبھی نہیں کہتا...... اسے پتا ہوتا کہ یہ سب کتابی باتیں ہیں اور زندگی کے ایسے چیلنجز کا مقابلہ کرنا آسان نہیں ہوتا۔ صبح جب میں اٹھا تو میرا سر بھاری ہو رہا تھا اور آنکھیں بوجھل اور سرخ تھیں۔ میرا یونیورسٹی جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن گھر پر رہنا اور بھی عذاب تھا سو میں اٹھ کھڑا ہوا، میں نے دعا کی کہ میرا کسی سے سامنا نہ ہو اور میں خاموشی سے نکل جاؤں لیکن پہلے میری کون سی دعائیں قبول ہوئی تھیں جو اب ہو جاتی...... چھوٹے تایا کا زبیر ٹریک سوٹ میں ملبوس ٹی وی لاؤنج میں کھڑا تھا۔ شاید وہ ابھی، ابھی واک کر کے آیا تھا۔ پچھلے ایک ماہ سے اسے اسمارٹ بننے کا شوق چرایا تھا۔ وہ نہ صرف واک کے لیے جاتا تھا بلکہ اس نے جم بھی جوائن کر لیا تھا۔ وہ اپنی تینوں بہنوں سے چھوٹا اور مجھ سے بھی تقریباً ایک سال چھوٹا تھا اور میٹرک میں فیل ہونے کے بعد اب فارغ تھا۔ چھوٹے تایا اور بڑے تایا نے گاؤں سے آنے کے بعد یہاں اکبری منڈی میں ہول سیل کی دکان کھول لی تھی۔ گاؤں میں زمین ٹھیکے پر دے دی تھی۔ دالیں، چاول، چنے وغیرہ تو اپنے ہی بہت ہوتے تھے جو پہلے منڈی میں بکتے تھے اب خود بیچنے لگے تھے۔ مزید اجناس بھی وہ اِدھر اُدھر سے خرید لیتے تھے۔ کام اچھا چل رہا تھا،

تایا کا بڑا بیٹا ان کے ساتھ ہی دکان پر جاتا تھا۔ چھوٹے تایا بھی زبیر کو دکان پر ساتھ لے جانا چاہتے تھے سو انہوں نے اس کی پڑھائی پر زیادہ زور نہیں دیا تھا۔

میں اس پر ایک نظر ڈال کر خاموشی سے نیچے جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا تھا۔

''موڈ بہت آف لگتا ہے شہزادے کا۔'' وہ تمسخر سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''سنا ہے کل تایا نے خوب سینکائی کی ہے۔'' میں اس کی بات کی طرف دھیان دیے بغیر نیچے اتر گیا تھا۔

نیچے لاؤنج میں تائی ہاتھ میں چائے کا کپ لیے بیٹھی تھیں۔ اور سامنے چھوٹی ٹیبل پر گھی میں تر پراٹھا پڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔

''اِدھر آ کمبخت ہکلے۔'' میں نے آخری سیڑھی کے پاس رک کر سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

''اِدھر مر، مردار......'' لیکن مجھے اپنے قریب بلانے سے پہلے انہوں نے پراٹھے اور آملیٹ کو ڈھک دیا تھا۔ میں چند قدم اٹھا کر ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

''تو مسز بھٹی کو جانتا ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''یہ سارے شہر میں کیا ڈھنڈورا پیٹتا رہتا ہے کہ ہم نے تیرے گھر پر قبضہ کر رکھا ہے۔''

میرا سر پھر نفی میں ہل گیا تھا۔

''چل دفع ہو میری نظروں سے دور ہو جا۔'' شاید تائی کو اپنے پراٹھے کے ٹھنڈے ہونے کا خوف تھا کہ خلافِ توقع میری جان جلدی چھوٹ گئی تھی۔

یہ مسز بھٹی کون تھیں۔ ان کے متعلق مجھے دوسرے دن چھوٹی تائی اور ان کی بیٹیوں کی گفتگو سے پتا چلا تھا، وہ لاؤنج میں بیٹھی زور شور سے تبصرہ کر رہی تھیں جبکہ میں کچن کا پنکھا صاف کر رہا تھا۔

مسز بھٹی لڑکے کی ماں کی بھابی تھیں اور ان کے ساتھ آئی تھیں۔ وہ بہت پہلے یہاں قریب ہی رہتی تھیں اور ماما کو جانتی تھیں۔ انہوں نے میرے بارے میں پوچھا کہ کہاں ہوں، کیا کر رہا ہوں، پڑھتا ہوں وغیرہ تو تائی نے میرے متعلق کچھ الٹا سیدھا بول دیا تھا اور پھر بات بنانے پر بھی نہیں بن سکی تھی۔ مسز بھٹی نے انہیں خوب سنائی تھیں کہ یتیم بھتیجے کی جائداد پر قبضہ کر کے بیٹھے ہوئے ہیں، ایسے فراڈ لوگوں میں ہمیں رشتہ نہیں کرنا۔ یوں مجھے تایا کے اس رات والے غصے کی وجہ بھی سمجھ آ گئی تھی۔ لیکن اس روز میں تائی کی بات پر غور کرتا ہوا بغیر کچھ کھائے پیے گھر سے نکل آیا تھا۔ میرے لیے کون سا پراٹھا اور آملیٹ ہونا تھا۔ رات کی بچی کھچی روٹی ہی میرا نصیب تھی۔

''دانیال احمد غلط کہتا تھا میرے جیسے لوگوں کے پاس ہار ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ رات کو پھر میری کلاس لگنی ہے اور مجھے میرے کسی ناکردہ گناہ کی سزا ملنی ہے۔ میں انہی سوچوں میں گھرا ہوا یونیورسٹی پہنچ گیا تھا کہ میرے پاس وقت گزارنے کے لیے کوئی اور ٹھکانا بھی نہیں تھا لیکن میں نے پہلے پیریڈ کے سوا اور کوئی پیریڈ اٹینڈ نہیں کیا تھا اور خاموشی سے آ کر لان میں بیٹھ گیا تھا۔ میں کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا بس یونہی خالی الذہن سا بیٹھا تھا جب وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''ہیلو......'' اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی۔ میں نے خالی، خالی نظروں سے اسے دیکھا۔

''میں دانیال ہوں یار، کیا پہچانا نہیں......؟ لگتا ہے آج پڑھنے کا موڈ نہیں ہے۔ کبھی، کبھی ایسی عیاشی کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ سو میں بھی کلاس چھوڑ کر آ گیا ہوں۔''

میری بات کا جواب دیے بغیر وہ بولتا جا رہا تھا۔ میں تو خود اپنی جان سے بیزار سا بیٹھا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میرا اس وقت کسی سے بھی بات کرنے کا ذرا سا بھی موڈ نہیں تھا۔ لیکن اس کی باتیں اتنی بے ساختہ اور دلچسپ تھیں کہ میں دھیان سے اس کی باتیں سننے لگا اور ان میں دلچسپی لینے لگا اور یوں دانیال احمد سے میری دوستی کا آغاز ہوا۔

میرا کوئی دوست نہیں تھا لیکن اب دانیال احمد میرا

دوست تھا۔ صرف دانیال احمد نہیں سویرا بصیر بھی......سویرا بصیر، دانیال احمد کی کزن تھی اور اسی یونیورسٹی میں ہی پڑھتی تھی۔ سویرا میری تایا زاد بہنوں کے بالکل برعکس بہت سادہ اور ہنس مکھ سی تھی میک اپ سے بے نیاز اس کے چہرے میں بلا کی کشش تھی۔ شروع میں جب دانیال نے میرا اس سے تعارف کروایا تھا تو میں اس سے بات کرتے ہوئے جھجکتا تھا۔ لیکن پھر ہولے، ہولے میری جھجک ختم ہوگئی اور میں اس سے بھی اسی طرح اپنے مسائل ڈسکس کرنے لگا جیسے دانیال احمد سے کرتا تھا۔ دانیال احمد کی دوستی نے نہ صرف یہ کہ میرے اندر اعتماد پیدا کیا تھا بلکہ میرے اندر دھیرے، دھیرے بہت سی مثبت تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔ میں نے چھوٹی تائی کی جھوٹی تعریف کرنا چھوڑ دیا تھا۔ جھوٹ کم بولتا تھا اور کوشش کرتا تھا کہ ان لوگوں سے کم ہی سامنا ہو۔ اگر بڑی تائی کچھ کرنے کو کہتیں تو خاموشی سے کردیتا۔ دانیال نے مجھے میٹرک تک کے گئی بچوں کی ٹیوشن دلوادی تھیں......سو میں یونیورسٹی سے سیدھا ٹیوشن پڑھانے چلا جاتا تھا۔ دانیال کے کہنے پر ہی میں نے اسکالرشپ اپلائی کردیا تھا۔ اکثر نوٹس بورڈ پر مختلف اداروں کی طرف سے اسکالر شپ کی آفرز آتی رہتی تھیں لیکن پہلے میں نے کبھی دھیان نہیں دیا تھا۔ لیکن اب مجھے ایک ادارے کی طرف سے اچھا خاصا اسکالرشپ مل گیا تھا۔ سو میں نے دانیال اور سویرا کے مشورے پر کچھ اچھے کپڑے خرید لیے تھے۔ میری ڈریسنگ میں نمایاں فرق پڑا تھا۔ دانیال مجھے مسلسل اسپیچ تھراپی کے لیے لے کر جاتا رہا تھا سو کئی نشستوں کے بعد میری گفتگو میں روانی آ گئی تھی۔ میرا بازو کے سوا کوئی جسمانی پرابلم تو نہیں تھا۔ صرف نفسیاتی مسئلہ تھا۔ اس لیے اسپیچ تھراپی سے مجھے کافی فائدہ ہوا تھا۔ گو کبھی، کبھی گفتگو کرتے ہوئے اچانک لمحہ بھر کے لیے ہکلا جاتا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ میں جلد ہی اس پر بھی قابو پالوں گا۔ دانیال اور سویرا کے اصرار پر میں ان کے ساتھ ایک آرتھوپیڈک سرجن کے پاس گیا اور اپنا بازو دکھایا۔ اس نے امید دلائی تھی کہ دو آپریشن کرنے پڑیں گے اور بازو کا ٹیڑھا پن بہت حد تک دور ہوجائے گا۔ یوں گرمیوں کی چھٹیوں میں یکے بعد دیگرے میرے بازو کے دو آپریشن ہوئے اور بہت حد تک اس کا ٹیڑھا پن دور ہوگیا......اس عرصے میں دانیال اور سویرا ہر لمحہ میرے ساتھ رہے۔ میرے گھر سے غائب ہونے پر دونوں بار ہی بڑی تائی نے شور مچایا۔ تایا نے بھی برا بھلا کہا......آوارگی کے طعنے دیے۔ میں نے سر جھکائے ان کی پھٹکارسنی اور جب وہ بول، بول کر تھک گئے تو میں دوستوں کے ساتھ مل کر پڑھائی کرنے کا بتا کر اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔

میری شخصیت میں ہونے والی تبدیلیوں کو سب سے پہلے بڑے تایا کی حنا نے نوٹ کیا تھا۔ حنا اپنے بہن، بھائیوں میں سب سے چھوٹی اور تقریباً میری ہم عمر تھی۔ میٹرک میں تین بار فیل ہونے کے بعد اب گھر میں سارا دن ٹی وی دیکھتی یا سستے رومانی ناول پڑھتی رہتی تھی۔ میرا پانچواں سمسٹر شروع ہوا تھا، میں نے نوٹ کیا کہ صبح جب میں یونیورسٹی جانے کے لیے نکلتا تو حنا لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی ہوتی۔ حالانکہ وہ صبح بارہ بجے سے پہلے کبھی نہیں اٹھتی تھی۔ اور جب میں واپس آتا تب بھی وہ لاؤنج میں ہی موجود ہوتی۔ کبھی، کبھار جب سب لاؤنج میں ہوتے تو وہ لان میں ٹہل رہی ہوتی......اس روز بھی جب میں اپنی فائل اور کتابیں لیے اس کی طرف دیکھے بغیر لاؤنج سے جارہا تھا کہ اس نے مجھے آواز دی۔

''سالک تم ہر روز ہی بغیر ناشتا کیے یونیورسٹی چلے جاتے ہو۔''

میں چونک کر رک گیا تھا۔ اس گھر کے کسی بھی فرد نے مجھ سے کبھی اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ میں نے مڑ کر اسے دیکھا۔ وہ بہت اشتیاق سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا تھا کہ میں نے نظریں چرالیں۔

مجھے دو بچوں کو پڑھانا ہوتا تھا، دونوں بھائیوں

کے میٹرک کے پیپرز ہونے والے تھے۔ ان کا گھر میری یونیورسٹی کے نزدیک ہی تھا۔ میں انہیں میتھس پڑھا کر وہاں سے ہی یونیورسٹی چلا جاتا تھا۔

''مجھے جلدی جانا ہوتا ہے۔'' مختصر جواب دے کر میں نے قدم بڑھایا ہی تھا کہ وہ یک دم اٹھتے ہوئے بولی۔

''میں آج کل سویرے جاگ جاتی ہوں' کہو تو میں تمہارے لیے ناشتا بنا دیا کروں؟''

میں بے ہوش ہوتے، ہوتے بچا۔ یک دم ہی مجھے کچھ ادراک ہوا تھا۔ میرے لبوں پر بے اختیار مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہوگئی اور دور تک تلخی گھلتی گئی۔

میں نے اپنی اب تک کی زندگی میں اس گھر میں پہلے کب ناشتا کیا تھا۔ بچپن سے ہی سب کے ناشتا کرنے کے بعد کچن میں بیٹھ کر رات کی بچی ہوئی روٹی رات کے ہی بچے ہوئے سالن کے ساتھ کھا لیتا تھا اور اگر تائی کا موڈ خراب ہوتا تو وہ یہ بچی ہوئی روٹی اور سالن بھی چھپا دیتیں۔ تب میں خالی پیٹ ہی اسکول یا کالج چلا جاتا تھا۔

''شکریہ۔''

میں نے ایک طنزیہ نظر اس پر ڈالی۔

''میں ناشتا کرنے کا عادی نہیں ہوں۔'' اور تیزی سے لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ اس نے شاید کچھ کہا تھا لیکن میں نے سنا نہیں۔ دانیال اور سویرا اکثر مجھے احساس دلاتے رہتے تھے کہ میری شخصیت بہت جاذب نظر ہے اور کئی نظریں میری ستائش کرتی ہیں۔ لیکن میرے اندر چھپا احساسِ کمتری کبھی اس پر مکمل یقین نہیں کرپاتا تھا لیکن اس روز مجھے احساس ہوا تھا کہ واقعی میری شخصیت میں ایسی تبدیلی ضرور آئی ہے جس نے نک چڑھی حنا کو میری طرف متوجہ کیا ہے۔ اس روز جب میں نے یونیورسٹی میں دانیال اور سویرا کو ساری بات بتائی تو دانیال نے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

''یہ ہوئی ناں بات...... اب جا کر آئینے میں خود کو دیکھنا۔'' اور اس روز میں نے نہ صرف خود کو آئینے میں اچھی طرح دیکھا تھا بلکہ جب میں اپنے بیڈ پر لیٹا تو میری آنکھوں کے سامنے سویرا کا سراپا تھا۔ دلکش، نرم خو سویرا کے نام پر نہ جانے کب دل نے دھڑکنا شروع کیا تھا لیکن میں تو تصور میں بھی ایسا سوچنے سے ڈرتا تھا۔ میں بھلا اس قابل کہاں تھا کہ سویرا بصیر جیسی لڑکی کے متعلق کوئی ایسی بات سوچتا سو میں سختی سے ایسے کسی خیال کو ذہن و دل سے جھٹک دیتا تھا۔ لیکن آج سویرا کا خیال میرے دل میں ہلچل مچائے ہوئے تھا اور میں اپنے اس جذبے کی نفی بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ کیا تھا اگر میں اور سویرا......

سویرا اور میں......

ہاں مجھے سویرا بصیر سے محبت ہوگئی تھی۔ اپنی کم مائیگی کے باوجود میں اسے چاہنے لگا تھا۔ میں نے پہلی بار خود سے اعتراف کیا لیکن میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے اپنے اس جذبے کو خود سے بھی چھپا کر رکھنا ہے۔ اس وقت تک جب تک میں کچھ بن نہیں جاتا۔ میری تعلیم ختم ہوگی تو یقیناً ایک بہترین مستقبل میرا منتظر ہوگا...... تب...... ہاں تب میں سویرا کے لیے ہاتھ پھیلا سکوں گا اور مجھے یقین تھا کہ میرا دوست دانیال زندگی کے اس مرحلے پر بھی ضرور میری مدد کرے گا۔ اور میرا یقین کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ میں پہلے سے زیادہ محنت کرنے لگا تھا۔ یوں تو میں ہر سمسٹر میں ٹاپ پر ہی رہتا تھا لیکن اب پرسنٹیج...... پہلے سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ دانیال اور سویرا میری ہر کامیابی کو سیلیبریٹ کرتے تھے۔ کسی ہوٹل میں لنچ یا ڈنر اور پھر گفٹ بھی ضرور ہی دیتے۔ ان کی ان محبتوں پر ہمیشہ ہی میری آنکھیں نم ہوجاتی تھیں۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں دانیال اور سویرا جیسے...... لیکن تھے۔ دانیال اور سویرا کے روپ میں۔ گھر میں دونوں پورشنوں میں اکثر میں زیر بحث رہتا تھا۔ کبھی کبھار کچھ جملے میرے کانوں میں بھی پڑ جاتے تھے جو اس طرح

کے ہوتے۔

''ارے بھرجائی اس ٹنڈے کو دیکھا تم نے کیسا اکڑا، اکڑا لگتا ہے۔'' چھوٹی تائی کی آواز اتنی بلندی ہوتی کہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے صاف سنائی دیتی۔

''بھائی صاحب سے کہیں نکیل ڈالیں اسے۔ پڑھ لکھ رہا ہے اپنے آپ کو لاٹ صاحب سمجھنے لگا ہے۔''

لڑکے اور لڑکیاں اب بھی تمسخر سے مجھے دیکھتیں۔ اور پھر دبی، دبی سرگوشیاں......

''ڈریسنگ دیکھی ہے اس کی، لگتا ہے کچھ مال ہاتھ لگ گیا ہے۔''

''ارے نہیں، ٹیوشن پڑھاتا ہے۔'' یہ حنا کی آواز ہوتی۔

''ہاں بھئی، آج کل تو ان پڑھانے والوں کے بھی مزے ہیں، دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں، میں نے تو ابا سے کہا ہے کئی بار... ایک اسکول یا اکیڈمی کھول لیتے ہیں۔''

سوایسی ہی بے شمار باتیں...... میرے کانوں میں پڑتی رہتی تھیں۔ میرے اندر اتنا اعتماد پیدا ہوگیا تھا کہ اگر میں پڑھ رہا ہوتا اور کوئی مجھے کسی کام کے لیے کہتا تو میں صاف انکار کر دیتا۔ اس روز سنڈے تھا، میں اپنے کمرے کی صفائی کر رہا تھا کہ چھوٹی تائی نے آدھی سیڑھیاں چڑھ کر مجھے آواز دی۔ شاید آزمانے کے لیے یا نکیل ڈالنے کے لیے ورنہ کچھ عرصے سے انہوں نے مجھے اس طرح کے کام کہنے چھوڑ دیے تھے۔

''سنو لڑکے، آج شام بچیوں کی سہیلیاں آرہی ہیں، اچھی طرح سے ڈسٹنگ وغیرہ کردو۔''

''سوری چھوٹی تائی، یہ میرا کام نہیں ہے ڈسٹنگ کرنا۔ آپ زرینہ سے کہیں یہ اس کا کام ہے۔'' میں نے کام کرنے والی ماسی کا نام لیا...... چھوٹی تائی کا منہ ذرا سا کھلا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتیں۔ میں نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کرلیا...... چھوٹی تائی نے نیچے جا کر کیا ہنگامہ کیا مجھے اس کا علم نہیں...... میں اپنے کام سے فارغ ہو کر نیچے اترا تھا تو اوپر والا لاؤنج خالی تھا...... غالباً سب اپنے، اپنے کمروں میں تھے۔ نیچے بھی خاموشی تھی اور کچن میں تالا لگا تھا جو غالباً بڑی تائی کی کارروائی تھی۔ وہ جب بھی مجھے سزا دینا چاہتی تھیں ایسے ہی کرتی تھیں۔ میں خاموشی سے گھر سے باہر نکل گیا۔ ایک نزدیکی ہوٹل سے کھانا کھا کر میں دانیال کی طرف چلا گیا۔ میں اکثر اتوار کا کچھ وقت اس کے ساتھ گزارتا تھا۔ گھر میں صرف دانیال کی امی ہوتی تھیں، اس کے ابو ملک سے باہر تھے، وہ بہت محبت سے ملتی تھیں۔ دانیال مجھے دیکھ کر ہمیشہ کی طرح بہت خوش ہوا۔

''اچھا ہوا تم آگئے، میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ تم آجاؤ تو ذرا شاپنگ کے لیے چلتے ہیں۔''

''نہیں یار، میرا آج موڈ نہیں ہے۔ میں تو بس کھانا کھانے کے لیے باہر نکلا تھا تو ذرا سی دیر کو تمہاری طرف چلا آیا......''

''خیریت کچھ پریشان ہو؟''

''نہیں تو کچھ خاص نہیں۔'' اس نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا۔

میں نے ساری بات اسے بتائی۔ شاید میں اندر سے کچھ پریشان تھا کہ رات کو جب چھوٹے اور بڑے تایا گھر آئیں گے تو یقیناً میری شکایت نمک، مرچ لگا کر لگائی جائے گی۔ اور ان کا ردِعمل کیا ہوگا اس کا قبل از وقت اندازہ لگانا مشکل تھا۔

''یہ ہوئی ناں بات...... شیر بنو شیر......'' اس نے میری بازو پر تھپکی دی...... اور ہاتھ میں پکڑا اخبار کھول کر میرے سامنے رکھا۔

''اسے پڑھو......''

یہ ایک طویل نظم تھی، صیدِ ضیافت......

میں نے ایک سرسری نظر نظم پر ڈال کر سوالیہ نظروں سے دانیال کی طرف دیکھا تو دانیال نے اس کے آخری چند مصرعوں کو بلند آواز میں دُہرایا۔

''ہر ایک اپنی جنگ آپ لڑتا ہے
کوئی کسی کا سہارا نہیں ہے

مگر ایسا کیوں ہے کہ
آزاد ہو کر بھی میں روز بنتا ہوں ”صیدِ ضیافت“
یہی سوچ کر
میں نے سب بے بسوں کو اکھٹا کیا
اور کہا آؤ ہمت کرو
چلو سب اٹھو
روز مرنے سے بہتر ہے
یک مشت یلغار کر کے اسے کیوں نہ ”صیدِ ضیافت“ بنالیں
جو اعصاب پر کب سے چھایا ہوا ہے“
”تو......“

دانیال نے میری طرف دیکھا۔

”اس کا مطلب سمجھتے ہو تم.... سالک عبدالرحمٰن......اب تمہیں صیدِ ضیافت نہیں بننا بلکہ انہیں صیدِ ضیافت بنانا ہے جنہوں نے تم پر ظلم کیا۔“

”لیکن کیسے، کیسے دانیال احمد؟“

پتا نہیں کیوں میں بہت دلگرفتہ ہو رہا تھا۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ چھوٹی تائی تو ہمیشہ ہی مجھے ڈسٹنگ کے لیے کہتی تھیں اور میں کر بھی دیا کرتا تھا پھر آج......

”کیا میں سمجھوں کہ تم پر کی گئی میری ساری محنت اکارت گئی؟ نہیں، میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ اب وقت آگیا ہے کہ تم اپنا حق ان سے لو اور ”صیدِ ضیافت“ بننے سے انکار کر دو۔ یہ گھر جس میں تم رہتے ہو...... یہ تمہارا ہے......تمہارے والدین کا، اس کے کاغذات رجسٹری وغیرہ......؟“

”معلوم نہیں......میں چھوٹا تھا جب بابا کا انتقال ہوا......ان کے بیڈ روم کے لاکر میں ہی سب قیمتی کاغذات اور ماما کی جیولری وغیرہ ہوتی تھی جو ظاہر ہے تایا وغیرہ کے قبضے میں ہوں گے۔“

”خیر کوئی بات نہیں، تم نے اب ڈرنا نہیں ہے۔ میں ہوں ناں تمہارے ساتھ......“

”دانیال کیا تم کوئی فرشتہ ہو، کیا ہو تم؟“ میری آواز بھرّا گئی تھی۔

”یار میں ایک عام سا انسان ہوں، میں اس روز پارک میں یہ برداشت نہیں کر سکا تھا کہ کسی انسان کی عزتِ نفس کو اس طرح کچلا جائے سو......“

تب ہی سویرا دروازے پر دستک دے کر اندر آگئی۔ اسی گھر کے دوسرے پورشن میں سویرا کی فیملی رہتی تھی۔ اس لیے سویرا کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ میرے آنے پر اکثر دانیال خود ہی اسے بلا لیتا۔ سادہ سے گھریلو کپڑوں میں بھی وہ دل میں اتری جا رہی تھی، میں نے نگاہیں چرالیں۔ دانیال نے اسے بھی صیدِ ضیافت والی نظم پڑھائی تو اس نے حوصلہ دیتی نظروں سے مجھے دیکھا اور مسکرائی۔

”دانی صحیح کہتا ہے سالک، تمہیں اب صیدِ ضیافت نہیں بننا......“ اور میں نے بھی دل ہی دل میں عہد کیا کہ ہاں مجھے اب صیدِ ضیافت نہیں بننا......اور اس روز میری زندگی نے ایک اور کروٹ بدلی تھی۔ اس روز جب میں گھر آیا تو کچن میں بدستور تالا لگا ہوا تھا اور گھر کی خواتین اپنے، اپنے کمروں میں تھیں۔ عموماً وہ مغرب کے بعد ہی اپنے کمرے سے نکل کر لاؤنج میں اکھٹی ہوتی تھیں۔ میں دبے پاؤں اپنے کمرے میں آگیا تھا اور پھر اپنے بیڈ پر لیٹ کر بہت دیر تک سوچتا رہا کہ مجھے کیا کرنا ہے اور کیسے خود کو ان کا صیدِ ضیافت بننے سے بچانا ہے۔ اس رات میں نیچے نہیں اترا تھا۔ اترتا بھی تو مجھے علم تھا کہ میرے لیے کچن میں کھانا نہیں ہوگا۔ گویا بچا کھچا کھانا جو تائی کاؤنٹر پر رکھ دیتی تھیں میں خود ہی گرم کر کے کھاتا تھا۔ لیکن تائی جب غصے میں ہوتی تھیں تو یہ کھانا بھی بند کر دیا جاتا تھا۔ لیکن اب مجھے اس سے پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ میرے پاس پیسے ہوتے تھے اور میں خرید کر کھا سکتا تھا۔ لیکن آج میرا موڈ باہر جا کر کھانا کھانے کا نہیں تھا۔ جب سے میرے ہاتھ میں پیسہ آیا تھا میں اپنے کمرے میں کھانے پینے کی کچھ خشک چیزیں اور جوسز وغیرہ رکھنے لگا تھا۔ پڑھتے، پڑھتے کبھی بھوک محسوس ہوتی تو کچھ کھا لیا کرتا تھا۔ سو میں بیڈ پر لیٹا سوچتا رہا اور یونہی سوچتے، سوچتے سو گیا۔ صبح جب

میں اٹھ کر نیچے آیا تو سب سو رہے تھے۔ میں خاموشی سے باہر جا کر ناشتا لے کر آیا، کچن میں جا کر چائے بنائی اور ڈائننگ ٹیبل پر آ کر بیٹھ گیا۔ میں کتنے سالوں بعد یہاں اپنے گھر میں ڈائننگ ٹیبل پر ناشتا کر رہا تھا۔ آخری بار میں نے بابا کے ساتھ یہاں ناشتا کیا تھا۔ بابا نے خود میری پلیٹ میں سلائس رکھے تھے۔ مجھے گلاس میں دودھ ڈال کر دیا تھا۔ میری آنکھوں میں نمی پھیلتی چلی گئی۔ تب ہی حنا اپنے کمرے سے نکلی۔

''اوہ تو اکیلے، اکیلے ناشتا ہو رہا ہے۔''

اس کے اس طرح بے تکلفی سے بات کرنے پر میں نے ذرا سا حیران ہو کر اسے دیکھا اور پھر اپنے ناشتے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ تب ہی تائی بھی غالباً حنا کی آواز سن کر آنکھیں ملتی ہوئی اپنے کمرے سے نکلی تھیں۔ اور کچھ دیر پھٹی، پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے کے بعد تیر کی طرح میری طرف لپکیں۔

''یہ، یہ تم یہاں بیٹھ کر کیا کر رہے ہو؟''

''ناشتا......'' میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

''کس نے، کس نے تمہیں بنا کر دیا یہ ناشتا؟''

انہوں نے مڑ کر حنا کی طرف دیکھا جو سامنے صوفے پر بیٹھی مجھے دیکھ رہی تھی۔

''میری کون سی ماں زندہ ہے جو میرے لیے ناشتا بنائے گی، بازار سے لایا ہوں۔''

''بہت زبان لگ گئی ہے تجھے، اٹھ کر جا، جا کر کچن میں بیٹھ کر ناشتا کر۔'' انہوں نے میرا بازو پکڑا، غصے سے ان کی ناک کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔

میں نے آہستگی سے سے ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے بازو سے ہٹایا۔

''یہ میرا گھر ہے اور یہ ڈائننگ ٹیبل اور چیئرز میرے بابا کی خریدی ہوئی ہیں اور مجھے یہاں بیٹھ کر ناشتا کرنے سے آپ نہیں روک سکتیں۔''

''تم......تم......'' تائی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ مجھے کچا ہی کھا جائیں۔

''اماں پلیز......'' حنا نے قریب آ کر انہیں بازو سے پکڑا اور کمرے میں لے گئی۔ جاتے، جاتے اس نے ایک معذرت بھری نظر مجھ پر ڈالی تھی لیکن مجھے اس کی معذرت بھری نظروں کی پروا نہیں تھی۔ میری ذات میں اس کی دلچسپی اور التفات میرے دل میں اس کے لیے نرمی پیدا نہیں کر سکتا تھا۔ ناشتا کرنے کے بعد میں اپنی فائل اٹھا کر گھر سے نکل آیا تھا۔ میں جانتا تھا میرا اس طرح ناشتا کرنا آج کا ہاٹ ٹاپک ہوگا اور خوب نمک مرچ لگا کر یہ واقعہ ایک دوسرے کو سنایا جائے گا۔

''یہ ہوئی ناں بات۔'' ساری بات سن کر دانیال نے میری پیٹھ ٹھونکی تھی لیکن سویرا کچھ پریشان سی ہوگئی تھی۔

''تمہارے تایا اور دوسرے لوگوں کا کیا ردِّعمل ہوگا؟''

''کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ دو چار تھپڑ، جوتے، ٹھڈے......'' میں نے بے پروائی سے کہا۔

''اور تمہیں صید ضیافت نہیں بننا......سالک عبدالرحمٰن بالکل بھی نہیں، کبھی نہیں۔'' دانیال نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

''اپنے بازو کا دھیان رکھنا سالک، کہیں وہ اسے پھر کوئی نقصان نہیں پہنچا دیں۔'' سویرا ہنوز پریشان تھی اور مجھے اس کا اپنے لیے پریشان ہونا اچھا لگا۔ دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوئی تھیں۔ اس روز جب میں شام ڈھلے گھر پہنچا تو لاؤنج میں محفل جمی تھی۔ چھوٹی تائی بھی مع تایا جان اور اپنی تینوں صاحبزادیوں کے ساتھ نیچے موجود تھیں۔ میں نے مشترکہ طور پر سب کو سلام کیا اور اوپر جانے کے لیے ابھی پہلی ہی سیڑھی پر قدم رکھا تھا کہ تایا دہاڑے تھے۔

''کہاں سے آوارہ گردی کر کے آ رہے ہو؟''

''ٹیوشن پڑھا کر آتا ہوں اس وقت......'' میں نے تحمل سے کہا۔

''اور یہ صبح یہ کیا حرکت کی تھی تم نے؟''

''کیا حرکت......؟'' میں نے پوچھا۔

''کیا یہ بھی میں ہی تمہیں بتاؤں؟'' تایا اٹھ کر میری طرف بڑھے۔

''تم نے صبح اپنی تائی کے ساتھ بدتمیزی کی ہے، چار جماعتیں کیا پڑھ لی ہیں چھوٹے، بڑے کا لحاظ ہی نہیں رہا۔''

''میرا نہیں خیال میں نے کوئی بدتمیزی کی ہے۔''

''زبان چلاتا ہے۔'' تایا کا ہاتھ مجھے تھپڑ مارنے کے لیے اٹھا لیکن میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''بس، اب نہیں...... بہت ہوگیا۔ بہت مار لیا آپ نے مجھے۔'' میں نے آہستگی سے ان کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ نہ صرف ان کی بلکہ حاضرین کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ سب مجھے یوں دیکھ رہے تھے جیسے میں کوئی عجوبہ ہوں۔

''ارے آپ کیوں اس کے منہ لگتے ہیں۔'' بڑی تائی ان کی کمک کو آئی تھیں میں ریلنگ پر ہاتھ رکھے سیڑھی کے پاس کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔ تایا نے ہاتھ سے انہیں پیچھے کیا اور چیخے۔

''نکل جاؤ ابھی اسی وقت' اس گھر سے نکل جاؤ۔ اپنا بوریا بستر اٹھاؤ او دفعان ہوجاؤ۔'' اب وہ گالیاں دے رہے تھے۔

''نکلو، نکلو......'' انہوں نے مجھے دھکا دینے کی کوشش کی۔

''کمال ہے، آپ مجھے میرے ہی گھر سے نکلنے کو کہہ رہے ہیں۔'' میں اعتماد سے کھڑا تھا۔

''تمہارا گھر......؟'' انہوں نے قہقہہ لگایا۔

''میاں کس خیال میں ہو...... یہ گھر ہمارا ہے، ہمارا' ہم دونوں بھائیوں کا۔ تمہارے باپ نے شہر میں رہنا تھا سو اسے رہنے کے لیے دیا تھا۔ سو چلتے پھرتے نظر آؤ، یتیم بھتیجا سمجھ کر بہت برداشت کرلیا تمہیں۔ احسان مند ہونے کے بجائے سر پر چڑھ رہے ہو۔''

''اچھا......'' میں مدھم سا مسکرایا۔

''یہ گھر میری ماما کے نام ہے، کیا آپ نے ماما کے نام سے خریدا تھا۔''

تایا کا رنگ بدلا تھا اور انہوں نے بے اختیار پیچھے مڑ کر سب کی طرف دیکھا جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھ رہے ہوں اسے یہ بات کس نے بتائی ہے۔ اب یہ محض اتفاق تھا کہ چند دن پہلے میں نے چھوٹی تائی کو بڑی تائی سے کہتے سنا تھا کہ یہ گھر ماما کے نام ہے، وہ بڑی تائی سے کہہ رہی تھیں کہ جتنی جلدی ہوسکے گھر اپنے نام کروالیں۔ سالک کے تیور مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے تھے اسے اگر پتا چل گیا کہ گھر تابندہ کے نام ہے تو کہیں وہ کوئی جھگڑا ہی نہیں کھڑا کردے۔ اور میں نے اسی دن دانیال کو بتادیا تھا کہ گھر ماما کے نام ہے اور دانیال نے کہا تھا کہ وہ بہت جلد اصل کاغذات کی نقل نکلوالے گا اور پھر دیکھیں گے مزید کیا کرنا ہے۔

''کیا بک رہے ہو۔'' تایا لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد پوری طاقت سے چلاّئے تھے۔

''بک نہیں رہا، حقیقت بیان کررہا ہوں بہتر یہ ہے کہ مجھے اس گھر سے نکالنے کے بجائے آپ میرا گھر خالی کردیں۔'' میں اپنی بات کرکے رکا نہیں تھا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگا تھا۔

''کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟'' مجھے تایا کی آواز سنائی دی۔

''وقت آنے پر ثبوت بھی آپ کو مل جائے گا۔'' میں نے سیڑھیاں چڑھتے، چڑھتے جواب دیا۔

''میں کہتی ہوں دھکے دے کر نکالیں اسے گھر سے۔'' تائی کے مشورے جاری تھے۔ میں فرسٹ فلور کے لاؤنج میں لمحہ بھر رک کر اوپر اپنے کمرے میں آگیا تھا۔ یہ رات بڑی انوکھی تھی۔ میں بہت کم سویا۔ کبھی میں خود کو تھپکی دیتا۔

''خوب...... بہت خوب سالک عبدالرحمٰن، تم نے آج انہیں بتادیا کہ تم ہو اصل مالک...... تم نے خود کو صیدِ ضیافت نہیں بننے دیا۔'' تایا کا بدلتا رنگ اور باقی حاضرین کی آنکھوں میں پھیلی حیرت کے تصور سے میرے اندر ایک خبیث سی خوشی پھیل جاتی لیکن دوسرے ہی لمحے میں خوفزدہ ہوجاتا۔

''کل کیا ہوگا کہیں سچ مچ تایا مجھے گھر سے دھکے

دے کر نہ نکال دیں۔ میں کہاں جاؤں گا۔ یہاں کم از کم رہنے کا ٹھکانا تو ہے ناں...... اصلی کاغذات تو ظاہر ہے تایا کے پاس ہی ہوں گے۔ نقل پتا نہیں ملے گی یا نہیں ملے گی۔'' اور پھر سویرا کی حوصلہ دیتی نظریں......

''اب تمہیں ڈرنا نہیں ہے سالک، خوفزدہ نہیں ہونا۔'' دانیال کی آواز......

''آؤ ہمت کرو......''

''چلو سب اٹھو......''

میرے خوف کو کم کر دیتی۔ میں نے کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ یہ گھر میرا تھا اور وہ مجھے اس گھر سے نکالنے کا حق نہیں رکھتے تھے۔ غاصب تو وہ تھے، میں نہیں...... سو صبح جب میں تیار ہو کر یونیورسٹی جانے کے لیے نکلا تو میں پہلے سے زیادہ پُر اعتماد تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں اب اکیلا نہیں ہوں۔ دانیال اور سویرا بھی میرے ساتھ ہیں۔ یہ لوگ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ دونوں لاؤنج خالی تھے۔ خلافِ توقع کچن کا دروازہ کھلا تھا، حیرت تھی کہ تائی نے کچن کو لاک نہیں کیا تھا۔ اندر سے حنا کے گنگنانے کی آواز آ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا خاموشی سے چلا جاؤں لیکن دوسرے ہی لمحے اس خیال کو جھٹک کر میں کچن کی طرف بڑھا۔ حنا نے چونک کر مجھے دیکھا۔

''ارے آپ سالک......'' اس کی حیرت مصنوعی تھی، میں جانتا تھا وہ میری آمد سے باخبر تھی۔

''آپ غالباً چائے بنانے آئے ہوں گے۔''

مجھے لفظ آپ پر ہنسی آئی اس گھر میں کسی نے مجھے آپ تو کیا تم کہہ کر بھی نہیں پکارا تھا۔

کچھ عرصے سے میں اپنی چائے خود بنانے لگا تھا۔ ورنہ تو بچی کھچی چائے ہی میرا نصیب تھی اس لیے میں ٹی بیگ اور خشک دودھ استعمال کرتا تھا۔ لیکن اس خیال سے کہ کچن لاک ہوگا میں ٹی بیگ اور دودھ نہیں لایا تھا۔

''میں اپنے لیے چائے بنا رہی تھی آپ کے لیے بھی بنا دیتی ہوں۔ آپ بیٹھیں باہر۔''

اور میں اس التفات پر مرتے، مرتے بچا......

میرا جی چاہا میں حنا کے اس التفات سے فائدہ اٹھا کر بڑے تایا اور تائی کو زچ کروں لیکن دوسرے ہی لمحے میرے ضمیر نے مجھے ملامت کی۔

''تف ہے تم پر سالک عبدالرحمٰن ایک لڑکی کے جذبات سے کھیلنا چاہتے ہو۔''

''نو تھینکس......'' میں نے چہرے پر سختی پیدا کر لی تھی۔ مڑتے، مڑتے میں نے دیکھا۔ کاؤنٹر پر دو کپ رکھے تھے۔

''سالک پلیز، اس میں کیا حرج ہے میں نے چائے تو بنا ہی لی تھی۔'' اس کی نظروں میں التجا تھی لیکن میں اس کی ملتجی نظروں کو نظر انداز کرتا ہوا کچن سے نکل کر تیزی سے لاؤنج کے دروازے کی طرف بڑھا، لاک میں چابی گھماتے ہوئے میں نے غیر ارادی طور پر مڑ کر اس کی طرف دیکھا وہ کچن کے دروازے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی اس کی آنکھوں میں نمی تھی اور وہ اداس نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

''بے وقوف لڑکی......'' میں نے زیرِ لب کہا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ یہ بڑے تایا کی بیٹی نہ بھی ہوتی تو بھی یہ دل تو پہلے ہی سویرا بصیر کا اسیر ہو چکا تھا۔ اور اب کسی اور کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ عام سی لڑکی سویرا بصیر میرے دل میں بسیرا کرتی تھی۔ اس روز میں راستے بھر سویرا کے متعلق ہی سوچتا رہا تھا۔ کبھی سوچتا دانیال سے دل کی بات کہہ دوں کبھی سوچتا نہیں ابھی نہیں کچھ بن جاؤں پھر...... ہاں پھر...... اس روز سویرا یونیورسٹی نہیں آئی تھی۔ ہاں دانیال نے میرے گھر کی رجسٹری وغیرہ کی نقل نکلوالی تھی۔ اس نے سارے پیپرز مجھے دیے۔

''یہ رکھ لو سالک، میں نے ایک وکیل سے بھی بات کر لی ہے۔ پاپا کے دوست ہیں۔ وہ گھر خالی کرنے کا نوٹس بھجوا دیں گے۔ یونیورسٹی سے واپسی پر تم میرے ساتھ ہی چلنا ان کی طرف۔''

میں کاغذات ہاتھ میں لیے کتنی ہی دیر تک ساکت کھڑا رہا۔ یہ اس گھر کی ملکیت کے کاغذات تھے میں جس

میں ملازمہ کے لیے بنائے گئے کمرے میں رہتا تھا اور جہاں ملازموں سے بھی بدتر سلوک کیا گیا تھا مجھ سے...... میں نے دانیال کو رات کا واقعہ بتایا تو دانیال مسکرایا۔

''پھر تو یہ کاغذات بڑے مناسب وقت پر مل گئے ہیں۔تم آج انہیں ثبوت دکھا کر گھر خالی کرنے کا کہہ دو......''میں نے وہ براؤن لفافہ لے کر اپنی فائل میں رکھ لیا تھا لیکن پتا نہیں کیوں سارا دن ڈسٹرب رہا......اور ٹیوشن پڑھانے بھی نہیں گیا اور یونیورسٹی سے سیدھا گھر آ گیا۔خلافِ معمول بڑے تایا گھر پر تھے اور لاؤنج میں باقی گھر والوں کے ساتھ موجود تھے۔چھوٹی تائی بھی تھیں۔اور کسی اہم موضوع پر بات ہو رہی تھی جیسے ہی میں نے لاؤنج میں قدم رکھا یک دم سب خاموش ہو گئے تھے تایا یک دم اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

''تم......تمہیں یہاں آنے کی جرأت کیسے ہوئی۔کل کیا کہا تھا میں نے تمہیں......نکل جاؤ ہمارے گھر سے،آئندہ تمہاری شکل نظر نہیں آئے۔''

''میں نے بھی کل آپ سے کچھ کہا تھا۔آپ شاید بھول گئے ہیں تو یاد دلا دوں کہ آپ مجھے میرے ہی گھر سے نہیں نکال سکتے۔بلکہ میں آپ کو ایک ماہ کا وقت دے رہا ہوں اس ایک ماہ میں اپنے لیے گھر تلاش کر لیں یا پھر گاؤں چلے جائیں۔''

''تم......''غصے سے جیسے تایا کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔

''ابھی اسی وقت دفعان ہو جاؤ۔''

وہ شاید مجھے مارنے کے لیے تیزی سے میری طرف بڑھے تھے لیکن حنا نے یک دم اٹھ کر ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''ابا پلیز آپ کا بی پی پہلے ہی ہائی ہے۔''

''اور ہاں......''میں مدھم سا مسکرایا۔

''یہ رہا میرے گھر کی ملکیت کا ثبوت......''میں نے براؤن لفافہ ان کے سامنے لہرایا۔

''ان کاغذات کی رو سے یہ گھر میری ماما کے نام ہے اور ان کا اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے اب یہ گھر قانوناً اور شرعاً میرا ہے۔''

''یہ، یہ کاغذات کہاں سے لیے تم نے؟''بڑی تائی بوکھلا کر مجھے دیکھ رہی تھیں۔

''جھوٹے بنوا لیے ہوں گے۔''چھوٹی تائی نے مجھے گھورا۔

''جھوٹے یا سچے اس کا فیصلہ تو عدالت کرے گی۔تاہم اطلاعاً عرض ہے کہ اصل کاغذات پر تو یقیناً آپ کا قبضہ ہے، میں نے نقل نکلوائی ہے اور ہاں یہ بیڈ روم میرے ماما اور ماما کا ہے۔''میں نے ماما اور بابا کے بیڈ روم کی طرف اشارہ کیا۔

''میں چاہتا ہوں کہ جب تک آپ کو گھر نہیں مل جاتا، آپ گیسٹ روم میں رہیں۔میں نیچے شفٹ ہو رہا ہوں کہ اوپر بہت گرمی ہوتی ہے۔''میں اپنی بات مکمل کر کے سب کو حیران پریشان چھوڑ کر اوپر آ گیا تھا۔

''ضرور اس کے پیچھے کوئی ہے، کہیں وہ ایبٹ آباد والا نہ ہو۔ارے میں تو کب سے کہہ رہی تھی کہ اس کے تیور بدلے، بدلے ہیں لیکن کسی نے میری بات کا نوٹس ہی نہیں لیا۔''چھوٹی تائی کی بڑبڑاہٹ اوپر تک آ رہی تھی۔

سویرا اس ساری صورتِ حال سے پریشان ہو گئی تھی۔

''وہ تمہیں نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں سالک، تمہاری زندگی کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔ان حالات میں وہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔بہتر ہے کہ تم دانیال کی طرف آ جاؤ جب تک وہ گھر خالی نہیں کرتے۔''مجھے سویرا کا اپنے لیے پریشان ہونا اچھا لگا تھا میرے اندر ایک انجانی سی خوشی پھیل گئی تھی۔اندر رنگ ہی رنگ بکھر گئے تھے محبت کے رنگ، خوشی کے رنگ، اس روز میرا بہت جی چاہا کہ میں سویرا سے کچھ تو کہوں۔کوئی ایسا جملہ کوئی ایسی بات جو میرے دل کی بے تابیوں کا حال اس سے کہہ دے لیکن پھر میں نے خود کو روک لیا۔

''آج تمہارے تایا صاحبان کو وکیل کی طرف سے گھر خالی کرنے کا نوٹس مل جائے گا۔''دانیال نے۔

مجھے بتایا اور سویرا کی تائید کی۔

''ہاں سویرا ٹھیک کہہ رہی ہے تم کچھ دنوں کے لیے میری طرف آجاؤ۔'' لیکن میں نے انکار کر دیا میں ان کی کیفیات کو انجوائے کرنا چاہتا تھا۔

''دیکھو سالک محتاط رہنا.....کھانا وغیرہ گھر میں مت کھانا۔''

''لگتا ہے آج کل جاسوسی کہانیاں زیادہ پڑھ رہی ہو۔ کسی کو زہر دینا یا قتل کرنا آسان نہیں ہوتا اور پھر یہ لوگ کوئی عادی مجرم اور قاتل نہیں ہیں بس لالچ اور ہوس......''

دانیال ہنسا تھا لیکن میں تو سویرا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پریشانی جس کے لہجے سے ہی نہیں آنکھوں سے بھی جھلک رہی تھی۔

''لالچ اور ہوس ہی تو بندے کو قاتل بناتا ہے۔''

''تم دعا کرنا سویرا تو انشاء اللہ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔'' میں مسکرایا تھا اور میری نگاہوں نے دیر تلک سویرا کو اپنے حصار میں لیے رکھا تھا۔ اس روز دانیال اور سویرا کے بے حد اصرار پر میں دانیال کے ساتھ چلا گیا تھا لیکن دوسرے دن میں ٹیوشن سے فارغ ہو کر سیدھا گھر آیا تھا۔ وکیل کا نوٹس مل چکا تھا۔ اور سب لاؤنج میں اکٹھے بیٹھے صورتِ حال پر تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔ میں انہیں نظر انداز کرتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

''یہ اتنے سے کو پال پوس کر بڑا کیا اور احسان کا یہ بدلہ دیا ہے کہ وکیل کی طرف سے نوٹس بھجوا دیا۔'' بڑی تائی میری طرف دیکھ رہی تھیں لہجے میں مظلومیت طاری کر لی تھی۔

''احسان۔'' میں ریلنگ پر ہاتھ رکھ کر مڑا' میرے اندر دور تک تلخی گھل گئی تھی۔

''ہاں میں یہ احسان مانتا ہوں کہ آپ نے مجھے یتیم خانے میں بھجوانے کے بجائے اپنے پاس رکھا۔ کس طرح رکھا یہ آپ جانتے ہیں پھر بھی اس احسان کی بہت قیمت چکا دی ہے میں نے اور مزید گاؤں کی زمین اور حویلی میں جو میرا حصہ بنتا ہے میں اس حق سے دستبردار

جلدی کرو

اچھا دوست جتنی دفعہ بھی ناراض ہوا سے منالینا چاہیے کہ وہ بے غیرت سارے راز جانتا ہے......ہاہاہا......

از: نرگس نسیم صابہ موہڑاہ چکوال

یاد رکھو

نیکیاں اور احسان کرتے جاؤ اور دریا میں ڈالتے جاؤ۔ کبھی زندگی میں کوئی طوفان آیا تو یہی نیکیاں کشتی بن جائیں گی۔

از: صبا نور، لیہ

ہوتا ہوں......اسے اپنے احسان کی قیمت سمجھ لیں۔''

بڑے تایا اور چھوٹے تایا کا چہرہ یک دم چمک اٹھا تھا۔ ہماری زمینیں سونا اگلتی تھیں اور یہاں منڈی میں جو تایا اتنے بڑے آڑھتی تھے تو سارا اناج اپنی زمینوں سے ہی آتا تھا۔ اور یہ اسی رات کی بات تھی، میں کمرے سے باہر ٹہل رہا تھا۔ اندر بہت حبس اور گرمی تھی کہ میری نظر سیڑھیوں سے اوپر آتی حنا پر پڑی۔

''تم یہاں کیوں آئی ہو۔ وہ بھی اس وقت؟'' میں حیران ہوا۔

''میں تمہیں یہ بتانے آئی تھی کہ چاچا اور ابا گھر دیکھنے گئے ہیں......جلد ہی ہم چلے جائیں گے۔ اماں کہہ رہی تھیں کہ کچھ دنوں کے لیے اب ہم گیسٹ روم میں کہاں سامان لے کر جائیں تم گیسٹ روم میں چلے جاؤ۔''

''ٹھیک ہے اب جاؤ اور آئندہ اوپر مت آنا جو کچھ کہنا ہو نیچے بھی کہہ سکتی ہو۔''

''شکریہ......'' وہ ذرا سا جھجکی تھی۔ ''زمینوں اور حویلی میں اپنا حق چھوڑ کر تم نے اچھا کیا۔ ابا اور چاچا بھی تمہیں وہاں حصہ نہ دیتے اور مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ تمہیں وہ کوئی نقصان نہ پہنچا دیں......لیکن وہاں حویلی سے ملحق جو جدید طرز کا بنگلا ہے، وہ تمہارے بابا نے خود زمین خرید کر اپنے لیے بنوایا تھا۔ وہ زمین ان کے نام ہے تم......''

"اس ہمدردی کا شکریہ۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "مجھے اس گھر کے سوا کسی اور جائداد سے دلچسپی نہیں ہے۔ وہ دن جو میں نے حویلی میں گزارے تھے بہت تکلیف دہ تھے۔ اور میں کبھی زندگی میں وہ حویلی دیکھنا نہیں چاہتا...... اور پلیز اب تم جاؤ......"

وہ خاموشی سے نیچے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی تھی۔ اور ٹھیک بیس دن بعد انہوں نے گھر خالی کردیا...... حنا سے ہی مجھے پتا چلا تھا کہ انہوں نے اقبال ٹاؤن میں اپنا گھر خرید لیا ہے۔ ان بیس دنوں میں دو واقعات ہوئے تھے۔ تایا کے بڑے بیٹے کا شدید ایکسیڈنٹ جس میں ٹرالر نے اس کے بازو کو اس بری طرح کچل دیا تھا کہ کہنی کے نیچے سے کاٹنا پڑا تھا...... تایا کا یہ بیٹا ہمیشہ مجھے ٹنڈا کہہ کر بلاتا تھا اور دوسرا واقعہ منڈی میں موجود تایا کے ایک گودام میں نہ جانے کیسے آگ لگ گئی تھی۔ گو بچت ہوگئی تھی تاہم کافی مالی نقصان ہوا تھا۔

کسی یتیم کا حق مارنا، اس کے ساتھ ناروا سلوک کرنا اس کی کچھ نہ کچھ سزا تو اس دنیا میں بھی ملنی ہی تھی ناں حالانکہ میں نے انہیں بددعا نہیں دی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ تو جانتا تھا ناں سب...... مجھے عرفان بھائی کے بازو کٹنے کا دکھ تھا۔ اور جب وہ گھر سے جا رہے تھے تو میں نے اس دکھ کا اظہار بھی کیا تھا لیکن عرفان بھائی خاموش رہے تھے۔ ہاں ان کی آنکھیں نم ہوگئی تھیں۔

گھر خالی ہوگیا تھا، وہ گھر جو آوازوں سے ہمہ وقت بھرا رہتا تھا اب وہاں خاموشی تھی۔ ماما، بابا کے بیڈ روم میں قدم رکھتے ہی میرے اندر سے جیسے طوفان ابل پڑے تھے۔ ان کے بیڈ پر گر کر میں تڑپ، تڑپ کر رویا۔ مجھے وہ رات شدت سے یاد آئی جب میں بابا کے بازو پر سر رکھ کر لیٹا تھا اور بابا ہولے، ہولے مجھ سے باتیں کر رہے تھے اور اس رات کی صبح میرے بابا مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوگئے تھے۔ میں تڑپ، تڑپ کر رویا تھا۔

"سالک میرے بھائی، میرے یار......" پتا نہیں دانیال کب کھلے دروازے سے اندر آیا تھا اور مجھے بازوؤں میں بھر لیا تھا۔ ان کے جانے کے بعد میں گیٹ بند کرنے کے لیے نہیں گیا تھا۔

"بس اب نہیں رونا...... اب نہیں رونا میرے دوست......" ہولے، ہولے میرے آنسو تھم گئے لیکن کئی دن مجھ پر اداسی کا غلبہ رہا۔ سویرا اور دانیال ہر طرح مجھے بہلاتے رہے۔ کئی شامیں انہوں نے میرے ساتھ میرے گھر میں گزاریں۔ سویرا نے میرا کچن نئے سرے سے سیٹ کیا۔ بیڈ روم میں بھی میری کتابیں وغیرہ سیٹ کیں۔ میں بہل گیا، مجھے بہلنا ہی تھا۔ پھر بھی گھر آتا تو گھر کی خاموشی سے وحشت ہوتی لیکن ہولے، ہولے میں تنہائی کا عادی ہوگیا۔ کام والی زرینہ جو تایا تائی وغیرہ کی موجودگی میں صفائی کرتی تھی اب بھی ہفتہ، اتوار کو آکر صفائی کردیتی تھی۔ برتن صبح کے بجائے شام کو دھو جاتی تھی۔ ان دنوں میں سویرا کو زیادہ سوچنے لگا تھا۔ بیٹھے، بیٹھے خواب دیکھنے لگتا۔ تصور میں اسے اس گھر میں چلتے پھرتے دیکھتا اور اس سے ہم کلام ہوتا تو تنہائی اچھی لگنے لگی تھی...... وقت دھیرے، دھیرے گزر رہا تھا۔ حتیٰ کہ دانیال اور سویرا کا آخری سمسٹر آگیا۔ میرا ابھی ایک سمسٹر رہتا تھا...... سویرا اور دانیال یونیورسٹی سے چلے جائیں گے میں اب ہر روز سویرا کو نہ دیکھ سکوں گا۔ یہ سوچ کر مجھے گھبراہٹ سی ہوتی۔ میری نظریں سویرا کا طواف کرتیں اور جھک جاتیں۔ ابھی میری تعلیم ادھوری تھی میرے پاس کوئی جاب نہیں تھی ابھی میں کیسے سویرا کے لیے ہاتھ پھیلا سکتا تھا۔ میں تو سویرا کو کبھی نہیں بتا سکا تھا کہ میں اسے کتنا سوچتا ہوں۔ میری صبحوں، میری شاموں اور میری راتوں کو اس کا تصور مہکائے رکھتا تھا۔ میں اپنے سارے جذبے ایک امانت کی طرح اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھا۔ اس وقت کے انتظار میں جب سویرا میری زندگی میں شامل ہوجاتی۔ دانیال اور سویرا اپنی پڑھائی میں بے طرح مصروف تھے۔ زیادہ دیر تک ہماری بات نہیں ہوتی تھی۔ کسی فری پیریڈ میں کچھ دیر

کے لیے کیفے ٹیریا میں مل بیٹھتے تھے تو زیادہ تر گفتگو پڑھائی کے متعلق ہوتی۔

اس روز بھی کئی دنوں بعد ہم اکٹھے چائے پی رہے تھے جب دانیال نے بتایا کہ وہ امتحان کے فوراً بعد اپنے پاپا کے پاس یوکے چلا جائے گا۔ جہاں وہ جاب کرنے کے ساتھ، ساتھ اپنا ماسٹر بھی کرے گا۔

''تم چلے جاؤ گے تو میں کیا کروں گا؟'' بے اختیار میرے لبوں سے نکلا تھا۔

''میرا اس دنیا میں تمہارے سوا اور کون ہے؟'' میری آواز بھرا گئی تھی۔

''یہ دنیا ہے یار، یہاں لوگ ملتے ہیں بچھڑتے ہیں، زندگی کا سفر جاری رہتا ہے رک نہیں جاتا۔ تم اب ایک بااعتماد اور کامیاب انسان ہو۔ تم اب وہ پہلے والے سالک نہیں رہے، مجھے یقین ہے تمہیں اب کوئی صیدِ ضیافت نہیں بنا سکتا۔'' اس نے حوصلہ دیتی نظروں سے مجھے دیکھا۔

وہ صحیح کہہ رہا تھا کہ میں اب وہ پہلے والا.... سالک عبدالرحمٰن نہیں تھا جس سے دانیال پہلی بار ملا تھا۔ لیکن میں اس دل کا کیا کرتا جو اگر سویرا کی جدائی سے تڑپ رہا تھا تو دانیال کے دور چلے جانے کے خیال سے بھی ڈوبتا تھا۔

''تمہارے بعد میں تو بہت اکیلا ہو جاؤں گا بہت تنہا.....'' میں نے اپنی آنکھوں میں امڈ آنے والی نمی کو چھپانے کی کوشش کی۔

''ہم رابطے میں رہیں گے یار پھر یہ سویرا بھی تو ہے ناں یہاں۔'' میری نظروں نے سویرا کو اپنے حصار میں لیا تھا۔

ہاں سویرا بھی تھی لیکن سویرا کا مزید پڑھنے کا ارادہ تھا نہ جاب کا تو کیا دانیال کے جانے کے بعد میں ہر روز بے دھڑک سویرا سے ملنے جا سکتا تھا؟ کبھی، کبھی بھی ملنا مناسب نہیں تھا۔ میں تو کبھی بھی سویرا کے گھر نہیں گیا تھا۔ ہاں دانیال کی طرف جاتا تھا تو وہ بھی اپنے پورشن سے اُدھر کا چکر لگا لیتی تھی۔

''کوئی مسئلہ ہو کوئی پریشانی ہو تو تم فون پر سویرا سے ڈسکس کر سکتے ہو۔'' دانیال نے میری الجھن سمجھ لی تھی۔ اور وہ ایسا ہی تھا بن کہے سمجھ جاتا تھا۔

''اس ادارے میں گزرے یہ چار سال کبھی نہیں بھول پائیں گے ہم۔'' سویرا نے موضوع بدل دیا تھا اور پھر فیئرویل پارٹی کے بارے میں باتیں ہونے لگی تھیں۔ دانیال نے بتایا تھا کہ اب وہ صرف دو تین دن ہی یونیورسٹی آئیں گے۔ پھر فیئرویل پر ہی ملاقات ہو گی...... میں بہت افسردہ تھا۔ دانیال کے لطیفے بھی اس افسردگی کو دور نہیں کر سکتے تھے اور پوری رات سوچنے کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مجھے دانیال سے بات کر لینی چاہیے۔ وہ سویرا کے والدین سے بات کر سکتا ہے، منگنی تو ہو سکتی ہے۔ شادی بھلے میری جاب کے بعد ہو۔ اس رشتے کے حوالے سے میں دانیال کے جانے کے بعد بھی اس کے گھر جا سکتا تھا۔ دانیال میرے روشن مستقبل کی ضمانت دے سکتا تھا۔ فیصلہ کرنے کے بعد میں مطمئن ہو گیا تھا۔ اور صبح بہت مطمئن سا یونیورسٹی آیا تھا۔ ان دنوں کلاسز کم ہی ہو رہی تھیں۔ میں انہیں ڈھونڈتا ہوا لائبریری کے پیچھے والے لان کی طرف آیا تھا وہ اکثر یہاں ہی بیٹھتے تھے۔ وہ اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھے تھے۔ میری طرف ان کی پیٹھ تھی میں یونہی انہیں حیران کرنے کے لیے دبے قدموں ان کی طرف بڑھا تھا، جب مجھے دانیال کی آواز سنائی دی تھی۔

''تم سالک کے متعلق ایسی بات کیسے کر سکتی ہو سویرا' ہو سکتا ہے تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو۔ تمہارا اندازہ غلط ہو۔''

میں اپنا نام سن کر غیرارادی طور پر رک گیا تھا۔

''مجھے تو کبھی ایسا محسوس نہیں ہوا کہ سالک تمہارے لیے اس طرح کی پسندیدگی رکھتا ہے۔''

''میں غلط نہیں کہہ رہی دانی، عورت مرد کی نظر پہچانتی ہے، تمہیں اسے بتانا چاہیے تھا کہ میرا اور تمہارا رشتہ کیا ہے۔ پہلے روز ہی جب تم نے اس سے میرا تعارف کروایا تھا تو تمہیں یہ بھی بتانا تھا کہ میں تمہاری منگیتر بھی ہوں۔''

''کیا اس نے تمہیں کچھ کہا؟'' دانیال الجھ سا گیا تھا۔

''نہیں، اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا لیکن کچھ عرصے سے مجھے اس کی آنکھیں کچھ کہتی محسوس ہوتی ہیں۔'' وہ جھنجلائی تھی۔

''پاگل ہو تم۔'' دانیال نے آہستگی سے کہا تھا۔

''اللہ کرے میرا اندازہ غلط ہو دانی لیکن بہت دنوں سے مجھے لگ رہا ہے کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن کہہ نہیں سکا فرض کرو اگر وہ کسی روز مجھے پروپوز کردے اور اسے پتا چلے تو کیا اس کی شخصیت میں ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوگی، کیا وہ کرچی، کرچی نہیں ہوجائے گا۔ تم مان لو دانی تم نے غلطی کی ہمارے بارے میں نہ بتا کر۔''

''میں نے تو بس یونہی ذکر نہیں کیا تھا۔ مناسب نہیں لگا تھا کہ......'' بات ادھوری چھوڑ کر دانیال خاموش ہوگیا تھا اور میں سانس روکے کھڑا تھا۔

لمحہ بھر بعد وہ آہستگی سے بولا تھا۔ یوں جیسے خود سے بات کررہا ہو۔

''وہ ایک بے حد بکھرا ہوا شخص تھا جب میں نے پہلی بار اسے پارک میں اپنے تایا سے مار کھاتے اور روتے ہوئے دیکھا تو میں سوچا تھا کہ میں اس کی اس کچلی ہوئی شخصیت کو بناؤں گا تو میں نے بنایا، اس کی شخصیت کو سنوارا، اس میں اعتماد پیدا کیا، اسے جینے کا قرینہ سکھایا۔ اپنے حق کے لیے لڑنا سکھایا اسے بتایا کہ اسے صیدِ ضیافت نہیں بننا تو اب میں اسے کرچی، کرچی ہوتے، ٹوٹتے ہوئے کیسے دیکھ سکتا ہوں ویرا......''

''تو......تو کیا کرو گے تم اگر اس نے مجھے پروپوز کردیا، اپنی محبت سے انکار کردو گے، مجھ سے دستبردار ہوجاؤ گے؟''

''ہاں......؟'' چند لمحے بعد اس نے گہری سانس لی تھی۔ ''میں اس کے راستے سے ہٹ جاؤں گا۔''

''دانی......!'' سویرا کی آواز بلند تھی۔ ''تم ایسا نہیں کرسکتے...... کیسے کرسکتے ہو تم ایسا...... یہ صرف میری اور تمہاری بات نہیں ہے۔ محبت تو ہمیں بعد میں ہوئی تھی اس سے بہت پہلے ہی ہمارے والدین نے ہمیں ایک دوسرے سے منسوب کیا تھا۔ تم مجھے اور خود کو جواز دے سکتے ہو لیکن اپنے والدین سے کیا کہو گے۔'' وہ اب رونے لگی تھی۔

''تو تم ہی بتاؤ کیا کروں' اسے ٹوٹنے دوں، بکھرنے دوں مجھے اس سے ایسی ہی محبت ہے جیسے کسی مصور کو اپنے شاہکار سے ہوتی ہے۔ وہ رنگ جو میں نے خود اپنے ہاتھوں سے بھرے ہیں انہیں کیسے بکھرتے ہوئے دیکھ سکتا ہوں۔ جب وہ پہلی بار دل سے ہنسا تھا جب پہلی بار اس نے اعتماد سے سر اٹھا کر بات کی تھی۔ جب اس کے بازو کا آپریشن ہوا تھا۔ میں اس کی شخصیت میں ہونے والی ہر، ہر تبدیلی پر ایسے ہی خوش ہوتا تھا ایسا ہی فخر محسوس کرتا تھا جیسے یہ تبدیلی اس کی ذات میں نہیں میری اپنی ذات میں ہورہی ہو۔''

لمحہ بھر خاموش رہنے کے بعد اس نے سویرا کے ہاتھ تھام لیے اور التجا کی۔

''وعدہ کرو ویرا اگر ایسا ہوا تو تم اسے مایوس نہیں کروگی......وہ محبتوں کا ترسا ہوا ہے سویرا تم......'' اور میں یک دم ہی وہاں سے پلٹ آیا تھا۔ میری محبت اظہار سے پہلے ہی دم توڑ گئی تھی۔ میرا دل ڈوب رہا تھا، آنکھیں جل رہی تھیں۔ دل چاہتا تھا کہ دہاڑیں مار، مار کر روؤں۔ یہ کیا ہوگیا تھا میرے ساتھ میرے دل نے سویرا کی چاہت کیوں کی......میں کیوں نہ جان سکا کہ سویرا اور دانیال، دانیال اور سویرا...... یہ بالکل سامنے کی بات میں کیوں نہیں جان سکا تھا۔ میں اپنے دل کی اس بے ایمانی پر شرمندہ تھا۔ ہاں مجھے شرمندہ ہی ہونا چاہیے تھا۔ کیا دانیال جیسے لوگ اسی دنیا میں ہوتے ہیں، اتنے مخلص، اتنے بے ریا......اگر اس دنیا میں تایا جیسے لوگ ہیں تو دانیال جیسے بھی ہیں اور شاید یہ دنیا ایسے ہی لوگوں سے قائم ہے۔

اس رات میں جی بھر کر رویا......اور سویرا کی محبت کو اپنے دل کی گہرائیوں میں دفن کردیا......اور مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا......رات کچھ دیر سے دانیال کا فون آیا۔

''یار آج تم یونیورسٹی نہیں آئے، خیریت تھی

تاں۔۔۔۔۔ گھر میں کچھ مہمان آگئے تھے۔ اس لیے میں فون نہیں کرسکا۔'' وہ ہی صاف نکھرا ہوا لہجہ۔۔۔۔۔۔
''فلو ہوگیا تھا۔''
''اوہ ہاں، تمہاری آواز سے لگ رہا ہے۔ تم بتادیتے میں اور سویرا آجاتے تمہاری طرف۔''
''ہاں تاکہ تم دونوں کو بھی فلو ہوجاتا۔'' میں زبردستی ہنسا۔ ''بھول گئے کیا، سویرا کو تو بقول اس کے ٹیلی فون پر بھی بات کرنے والے کو فلو ہو تو اسے فلو ہوجاتا ہے۔''
وہ بھی ہنس دیا۔
''تم نے کچھ دوا لی؟''
''ہاں لے لی تھی۔''
''ٹھیک ہے، کل یونیورسٹی سے تمہاری طرف آئیں گے۔''
''نہیں یار مت آنا۔۔۔۔۔ اگر سویرا کو وائرس چمٹ گیا تو پہ نہ ہو فیئر ویل پارٹی پر اس کی آنکھوں اور ناک سے پانی بہہ رہا ہو۔'' میں نے خوشگوار انداز میں کہا تو اس نے بھی تائید کی۔
''ٹھیک ہے تو پھر ایک دن ریسٹ کرلو۔۔۔۔۔ پرسوں ضرور آنا لاسٹ ڈے ہوگا۔''
''شیور!''
مجھے خود کو سنبھالنے کے لیے کچھ وقت چاہیے تھا۔ میں یونیورسٹی نہیں گیا تھا۔ سارا دن بیڈ پر لیٹا روتا رہا خود کو سمجھاتا رہا۔
دانیال کا ظرف بہت بڑا تھا، وہ میرے لیے اپنی محبت سے دستبردار ہونے کو تیار تھا تو کیا میں کم ظرف تھا، احسان فراموش تھا کہ جس نے مجھے جینا سکھایا میں اس سے اس کی زندگی چھین لیتا۔ تین بجے کے قریب میں اپنے بیڈ سے اٹھا تھا۔ اور فریش ہوکر چائے بنا رہا تھا کہ وہ آگئے۔ میرے منع کرنے کے باوجود مجھے ان پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ سویرا کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ دانیال مضطرب تھا اور اس کی آنکھیں میرے اندر کچھ کھوجتی تھیں۔
''دیکھو سویرا اب اگر تمہیں فلو ہوگیا تو ہرگز، ہرگز مجھے الزام نہیں دینا کہ میں نے دانیال کو منع کیا تھا آنے سے۔'' میں نے لہجے کو خوشگوار بنانے کی پوری کوشش کی تھی۔
''اچھا چلو تم ہٹو کچن سے، سویرا تمہارے لیے بلکہ ہم تینوں کے لیے چائے بناتی ہے۔'' دانیال نے میرا ہاتھ پکڑا اور ہم دونوں لاؤنج میں آکر بیٹھ گئے۔ اور وہ مجھے بتانے لگا کہ ہماری یونیورسٹی ہر سال ٹاپر لڑکوں کو باہر کسی بھی یونیورسٹی میں ماسٹر کرنے کے لیے اسکالر شپ آفر کرتی ہے لیکن وہ انہیں ماسٹر کے بعد پھر پانچ سال یونیورسٹی میں پڑھانے کے لیے باؤنڈ کرتی ہے۔۔۔۔۔
''ظاہر ہے ٹاپ تو تم نے ہی کرنا ہے تم چاہو تو اس آفر سے فائدہ اٹھاسکتے ہو۔'' میں بظاہر اسے سن رہا تھا لیکن میری نظریں کئی بار کچن میں چائے بناتی سویرا کی طرف اٹھی تھیں اور جیسے کوئی خواب کرچی، کرچی ہوا تھا اور اس کی کرچیاں میری آنکھوں میں چبھنے لگیں۔
تو میں نے زور سے آنکھیں بھینچ کر کھولیں۔
''کیا ہوا؟'' دانیال نے پوچھا۔
''شاید آنکھوں میں کچھ چبھا ہے۔'' میں نے آنکھیں رگڑ ڈالیں۔
تب ہی سویرا چائے بنا کر لے آئی۔
''چائے کے لیے بہت شکریہ لیکن ڈیئر سسٹر تمہارا یہ بھائی صبح سے بلکہ رات سے بھوکا ہے تو ساتھ میں کچھ بسکٹ وغیرہ بھی لے آتیں تو بھلا ہوتا۔'' میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ جملہ بولا تھا حالانکہ اس وقت کسی شے کی طلب نہیں تھی۔ حسب توقع دانیال کی آنکھیں یک دم لو دینے لگی تھیں جبکہ سویرا کی آنکھوں میں حیرت تھی۔
''کیبنٹ میں نمکو اور بسکٹ کے جار ہوں گے۔'' میں نے چائے کا کپ اپنی طرف کھسکایا۔
چائے پیتے ہوئے سویرا نے دو تین بار کھوجتی نظروں سے مجھے دیکھا لیکن میں آج دانستہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ ابھی زخم کچا تھا اور ابھی اس سے خون رستا تھا۔ چائے پیتے ہوئے دانیال یو کے کی باتیں کرتا رہا کہ یو کے سے کسی یونیورسٹی سے ماسٹر کی

ڈگری لینا اس کا خواب تھا۔
''چلو اب تمہارا خواب پورا ہو جائے گا لیکن میں تم دونوں کو بہت مس کروں گا۔ یونیورسٹی میں بھی دل نہیں لگے گا۔ میرا کوئی اپنا نہیں تھا۔ والدین نہ بھائی نہ بہن...... پھر تم مجھے ملے تم صرف میرے دوست ہی نہیں ہو، تمہارے روپ میں مجھے محبت کرنے والا شفیق بھائی بھی ملا......اور سویرا کے روپ میں محبت کرنے والی خیال رکھنے والی بہن ملی۔ وہ میرے غموں پر ایسے ہی پریشان ہوتی ہے جیسے بہنیں عام طور پر بھائیوں کے لیے ہوتی ہیں...... میں تم دونوں کے احسان......''
''بس اس سے آگے ایک لفظ مت کہنا...... نہ آج نہ پھر کبھی......'' دانیال نے ہاتھ اٹھا کر مجھے روکا...... دونوں کی آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔ مرجھائے ہوئے چہرے کھل اٹھے تھے۔ میں جو کچھ انہیں باور کرانا چاہتا تھا وہ کروا چکا تھا۔
''صرف ایک سال کی تو بات ہے یار پھر میں تمہیں وہاں بلوانے کی کوشش کروں گا۔''
اس نے میرے بازو کو تھپکا تھا لیکن میں یونیورسٹی کے اسکالرشپ کی آفر کو قبول کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا کہ یہی مناسب تھا اور مجھے ایسا ہی کرنا تھا۔ دوریاں محبت کی اس ننھی سی کونپل کو خود ہی ختم کر دیتیں جو دل کے کسی نہاں گوشے میں اب بھی لہرائی تھی...... سو میں صرف مسکرا دیا تھا۔
''اور......'' اس نے شریر نظروں سے سویرا کی طرف دیکھا۔
''یہ جو بے وقوف سی لڑکی ہے ناں تمہاری بہن...... ہمارے والدین اسے میرے پلے باندھنے کی سازش کر رہے ہیں تو دو سال بعد یہ محترمہ بھی میرے ساتھ یو کے روانہ ہو جائیں گی۔''
''مبارک ہو یار بہت، بہت مبارک ہو۔'' میں نے دانیال کو گلے لگا لیا۔ ''اور یہ بے وقوف تم نے کس کو کہا ہے.... آئندہ میری بہن کو بے وقوف مت کہنا ورنہ......''
''ورنہ کیا سالے صاحب......'' دانیال کھل کر ہنسا تھا۔
''آپ کو ان کی حماقتوں کا احوال نہیں معلوم۔''
سویرا اسے گھور رہی تھی۔ اور میں جانتا تھا سویرا صحیح کہتی تھی عورت، مرد کی نظر پہچانتی ہے۔ لیکن مجھے ثابت کرنا تھا کہ وہ غلط تھی سو شعوری کوشش سے میں نے آج اپنی نظروں کو بے اختیار نہیں ہونے دیا تھا۔ گو غیر ارادی طور پر میری نظر ایک دو بار اس کی طرف اٹھی ضرور تھی لیکن میں نے فوراً ہی نظریں اس کے چہرے سے ہٹالی تھیں۔ دو تین بار اس نے بھی الجھی، الجھی نظروں سے مجھے دیکھا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ ایک روز اسے یقین آجائے گا کہ میرے متعلق اس کا اندازہ غلط تھا۔ کچھ دیر بعد وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔
''میں ماما سے سوپ یا یخنی بنوا کر تمہیں دے جاؤں گا۔ فلو میں اچھی ہوتی ہے۔''
''دانی......'' میرے آنسو چھلک پڑے۔
''کیسے، کیسے بھلا پاؤں گا تمہاری یہ محبتیں، تمہارا یہ خلوص، کون اس طرح میرا خیال رکھے گا تمہارے جانے کے بعد۔''
''اوں ہوں......'' دانیال نے اپنی انگلی کی پور سے میرا آنسو پونچھا۔
''یاد ہے وہ نظم جو اس روز پڑھی تھی۔
میں نے سر ہلایا۔ میری آواز میں نمی تھی۔
''ہر ایک اپنی جنگ آپ لڑتا ہے
کوئی کسی کا سہارا نہیں ہے
مگر ایسا کیوں ہے''
سویرا اور دانیال کی آوازیں بھی میری آواز میں شامل ہو گئی تھیں۔ لاؤنج میں ہم تینوں کی مشترکہ آواز گونج رہی تھی۔
''آؤ ہمت کرو
چلو سب اٹھو
روز مرنے سے بہتر ہے
یک مشت یلغار کر کے اسے کیوں نہ صید ضیافت بنا لیں''
اور ہمارے اردگرد ایک الوہی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی یقین، اعتماد، خلوص، محبت، حوصلے اور ہمت کی روشنی......



کوہِ گراں

نیلم احمد بشیر

نبیل یونیورسٹی چلا تو آیا تھا مگر بوجھل دل سے۔ نہ جانے کیوں اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اس کا دل خواہ مخواہ اداس کیوں ہو رہا ہے؟ یوں جیسے کچھ ہونے والا ہو مگر کیا...؟ سب کچھ ٹھیک تو تھا۔ صبح نو بجے سے کچھ قبل جب اسے زلزلے کے ایک زوردار جھٹکے نے جگایا تھا تو وہ زیادہ خوف زدہ نہیں تھا۔ لاہور میں ہلکے پھلکے جھٹکے تو کبھی کبھار آہی جاتے ہیں۔ یہ جھٹکا کچھ لمبا ضرور تھا مگر لاہور کے جی داروں کے لیے کوئی بڑی بات نہیں

تھی۔ ریشم بھی اسے یہی کہا کرتی تھی۔
''جب سے تم لاہور پڑھنے گئے ہو کافی ڈھیٹ اور بے پروا ہوگئے ہو۔ پہلے کی طرح میرا خیال نہیں رکھتے...... یہ شہر والے کیا ایسے ہی بے نیاز ہوتے ہیں؟ کیا ان پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا؟''

اس بات کے جواب میں پہلے تو وہ زور، زور سے ہنستا، کھلکھلاتا پھر جھوٹ موٹ پنجابی فلموں کے جیسے ہیرو بننے کی اداکاری کرتے مونچھوں کو تاؤ دینے لگ جاتا تو وہ بھی مذاق اڑانے اور ہنسنے لگ جاتی اور وہ مسحور ہو کر اسے دیکھنے لگتا۔ اس کی ہنسی دیکھ کر ایسے لگتا جیسے وادی کی بہتی ندیوں سے اچانک کوئی نیا چشمہ پھوٹ نکلا ہو۔ ایسا چشمہ جس میں خوابوں کی چاندنی گھلی ہوئی ہو اور پانی کی جگہ موتی بہتے ہوں اور رنگ برنگی مچھلیوں کی جگہ جل پریاں رہتی ہوں۔

کلاس سے واپس آکر نبیل نے خبریں دیکھنے کے لیے ٹی وی لگالیا۔ خبریں ایسی تھیں کہ دیکھ کر اس کے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔ صبح کو معمولی سا محسوس ہونے والا زلزلہ شمالی علاقہ جات میں اتنی بڑی آفت بن کر نازل ہوا تھا اور اسے کچھ خبر ہی نہیں تھی۔

''یا میرے خدا!'' اس نے اپنا سر پکڑ لیا اور جلدی سے گھر فون ملانے کی کوشش کرنے لگا۔ حیرت کی بات تھی کہ کسی کا بھی فون مل نہیں رہا تھا۔ امی، ابو، بہن، بھائی، چچا کا خاندان اور پھر ریشم...... کوئی بھی اپنا فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ آخر سب کہاں چلے گئے تھے؟ نبیل کو پریشانی ہونے لگی۔ خبریں سن، سن کر اسے ڈر لگنے لگا۔ نیوز کاسٹر بتائے چلے جا رہے تھے کہ ... بالاکوٹ، مظفر آباد اور ملحقہ علاقوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے اور شدید جانی نقصان کا اندیشہ ہے۔ نبیل کا خون رگوں میں منجمد ہونے لگا۔ ''زلزلے سے پہلے تو ریشم صبح صبح اسکول پڑھانے کے لیے جا چکی ہوگی۔''

نبیل اسلام آباد جانے والی بس میں بیٹھا اپنے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش میں اپنے ہونٹ مستقلاً کاٹتا چلا جا رہا تھا اور کسی کا خوب صورت چہرہ پورے چاند کی طرح اس کی خیالوں میں دمک رہا تھا۔ ریشم اس کی چچا زاد تھی اور وہ بچپن سے ایک دوسرے کی منگ ہونے کے ساتھ، ساتھ بہترین دوست بھی تھے۔ دونوں نے مستقبل کے حوالے سے حسین خواب دیکھ رکھے تھے جن کے پورے ہونے کا وقت اب زیادہ دور نہیں تھا۔

بچپن میں وہ دونوں ہم جولیوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے، پہاڑوں اور وادیوں میں دور نکل جاتے۔ اس کھیل میں بہت مزہ آتا اپنے کیونکہ چھپنے کے لیے جگہیں بہت تھیں۔ وادی کی گود میں وسعت بہت تھی۔ نبیل اکثر اوقات سب سے پہلے اپنے دوستوں کو ڈھونڈ نکالتا اور جیت جاتا۔ دوست حیران ہو، ہو جاتے کہ وہ انہیں اتنی مشکل جگہوں سے کیسے ڈھونڈ لیتا تھا۔ وہ ہنستا اور سب ہارنے والوں کو خوب چھیڑتا...... وہ ڈھونڈ نکالنے میں اتنا ماہر یوں تھا کہ وہ قدموں کی چاپ، پتوں کی سرسراہٹ اور ہوا کی سرگوشیوں سے ہی کھوج لگا لیتا کہ اس کے ساتھی کہاں چھپے ہوئے ہیں۔ اس کی بہت شو بن جاتی اور وہ سینہ پھلا کر کہتا۔

''دراصل میرے قبضے میں کوہ قاف کی ایک پری ہے۔ ایک بار وہ مجھے ایک پہاڑی پر بیٹھی روتی ہوئی ملی۔ میں نے پوچھا کیا ہوا تو کہنے لگی۔ میں گھر سے نکلی تھی سودا سلف لینے...... پھر واپسی کا راستہ بھول گئی۔ کاش مجھے کوئی پرستان پہنچا دے۔ میں نے اسے تسلی دی اور اس کی مدد بھی کی۔ وہ ہنسی خوشی اپنے گھر جا پہنچی۔ انعام کے طور پر اس نے مجھے یہ دو سپر کان دیے۔''

''سپر کان......؟'' ریشم اور ساتھی حیرانی سے پوچھتے۔

''ہاں بھئی...... جیسے سپر مین کے ہوتے ہیں۔ اسی لیے تو اتنی آسانی سے تم سب کی باتیں، سرگوشیاں سن لیتا ہوں......'' وہ بولتا جاتا اور ریشم اس کے کان مروڑ کر انہیں گھما، گھما کر ٹیسٹ کرنے لگتی۔ وہ بس میں بھی بار، بار فون ملائے جا رہا تھا کہ اچانک اس کے بھائی شکیل نے اپنا فون اٹھا لیا۔

''شکیل! شکر ہے خدا کا تم نے فون تو اٹھایا۔ کہاں ہو تم؟ سب لوگ خیریت سے تو ہیں ناں......؟'' نبیل

نے بے صبری سے سوالات کرنے شروع کر دیے۔
''کوئی بھی خیریت سے نہیں ہے بھائی جان...... سب کچھ ملیا میٹ ہو گیا ہے۔ کچھ نہیں بچا۔''
شکیل نے ہچکیوں کے درمیان تیز، تیز انداز میں جواب دیا۔ ''میں تو اتفاقاً باہر گیا ہوا تھا۔ ساتھ والے گاؤں، اس لیے میری بچت ہو گئی ورنہ......'' شکیل نے بات ادھوری چھوڑی اور خود سسکیاں لینے لگا۔
نبیل کو لگا اس کے کلیجے میں جیسے کسی نے خنجر بھونک دیا ہو۔
''اور ریشم......؟'' اس نے کانپتی آواز میں پوچھا۔
''سب اسکولوں کی چھتیں گر چکی ہیں، مجھے کچھ نہیں پتا ان کا۔'' شکیل نے ہچکیوں کے درمیان جواب دیا اور پھر فون کٹ گیا۔ نبیل کو ایسے لگا جیسے وہ کسی پہاڑ کی چوٹی کو سر کرنے کے لیے تنی ہوئی رسی پکڑے بڑی احتیاط سے قدم جماتا اوپر کو جا رہا ہو اور رسی ایک دم ہاتھ سے چھوٹ گئی ہو۔ وہ جیسے پاتال میں نیچے ہی نیچے گرتا چلا جا رہا تھا۔
''کیا وہ اب کبھی ریشم کو، دوبارہ نہیں دیکھ سکے گا؟'' اس سوال نے اس کے ذہن میں دھماکے کرنے شروع کر دیے اور آنسو اس کی آنکھوں سے بے اختیار بہنے لگے۔ ''اے خدا......! مہربانی کر، اے میرے رب! میرے عزیزوں، میرے پیاروں کی خیر ہو......'' اس کے دل سے دعائیں نکلنے لگیں۔
نبیل جب بسیں بدلتا، جاگتا، سوتا منزلیں طے کرتا بالاکوٹ پہنچا تو شام ڈھل رہی تھی۔ اس کے گھر جانے کا کوئی بھی راستہ سلامت نہیں رہا تھا۔ مددگار ٹیموں نے خیمے گاڑ لیے تھے اور ان میں روشنیاں جلنا شروع ہو چکی تھیں۔ ان کا گھر کہاں تھا؟ دوسروں کے گھر کے گھر کہاں تھے؟ کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ یہ تو ٹوٹی پھوٹی گری ہوئی عمارتوں، دل چیر دینے والے سناٹوں کا شہر تھا اور بس...... ہر طرف ملبے کے تودے، بچ جانے والوں کے پریشان چہرے اور خوف زدہ آنکھیں تھیں جو وقفے، وقفے سے بعد کے جھٹکوں سے سہم کر مزید سمٹ جاتی تھیں۔ شکیل اسے اپنے ماں، باپ کے گھر کے آگے بت بنا کھڑا مل گیا۔ نبیل کو دیکھتے ہی اس نے دھاڑیں مار، مار کر رونا شروع کر دیا اور دونوں بھائی اپنے ہاتھوں سے جلدی، جلدی ملبہ ہٹانے کی کوشش کرنے لگے۔ وہ دونوں اِدھر اُدھر ہاتھ پارتے رہے۔
کیا یہ وہی گل پوش حسین وادی تھی جہاں زندگی ایک شہزادی کے مانند ناچتی مسکراتی تھی......؟ خوش رنگ پھول چنتی، سر پر خوشبوؤں کے تاج سجاتی، باؤلی ندیا کی طرح ہر دم اٹھلاتی تھی...... شریر جھرنے ہنستے گاتے...... اسی میں محبت کرنے والے دور نکل جایا کرتے تھے اور کسی کو خبر تک نہیں ہوتی تھی۔ پھر کیا ہوا شہزادی کا راج پاٹ پل بھر میں الٹ گیا اور موت وادی کی رانی بن بیٹھی۔ کالا چوغہ پہنے، بدہیت موت اپنے کارندوں کو حکم دیتی تھی کہ سب کچھ مٹا دو، روند ڈالو، مار ڈالو، ختم کر دو، زندگی کا ہر نشان مٹا دو، تباہ کر دو سب کچھ، برباد کر دو۔
''اے خدا ہمیں معاف کر دے۔'' نبیل سسکنے لگا۔ شکیل نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دینا چاہی۔ یہ سب ہو کیسے گیا؟ وہ سوچتا چلا گیا۔ اسے خیال آیا شاید ہم انسان بہت جلدی میں رہتے تھے، ہر وقت کی جلدی، ہر جگہ کی جلدی، آگے جانے کی جلدی، کامیاب ہونے کی جلدی...... بس جلدی ہی جلدی، سرعت ہی سرعت...... شاید ہم سب کسی خود فریبی میں رہتے ہوئے اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتے ہیں، بادشاہوں کی طرح طاقت کے زعم کا کلف لگائے اکڑے، اکڑے پھر رہے تھے کہ سب سے برتر طاقت نے ہمیں ایک ہلکے سے ٹھوکے سے ہلا کر کچھ یاد کروانے کی کوشش کی اور پھر ہمیں یاد آیا کہ ہمارا کوئی خالق و مالک بھی ہے۔ وہی ہے جس کے قبضے میں سب کچھ ہے۔ جان و مال، زمین آسمان، پوری کائنات، اس نے ہمیں یاد دلایا کہ ہمارا ایک خدا بھی ہے جسے ہم اکثر کہیں رکھ کر بھول

جاتے ہیں، نظر انداز کر دیتے ہیں، یہ اس کی ڈانٹ تھی۔ اس کا حکم تھا کہ میں ہی ہوں فنا اور بقا، میں ہی ہوں سب سے بڑی حقیقت، باقی سب کچھ مایا ہے۔ پھر اس غصے سے بستیاں اجڑ گئیں، راستے بند ہو گئے، خوشبوؤں کی سانس گھٹ گئی اور ہمیں خدا یاد آیا جو اول و آخر ہے، ہمارا سب سے اہم رشتے دار ہے۔ (اگرچہ وہ تو لاشریک ہی ہے)

نبیل کے دل میں ہوک سی اٹھی اور وہ دیوانہ وار ریشم کے اسکول کی جانب بھاگنے لگا جو وہاں سے اتنی دور نہیں تھا۔ وہاں پہنچ کر اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ عمارت کے در و دیوار منہدم ہو چکے تھے اور ہلکی، ہلکی چاندنی میں چاروں طرف ملبے کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اسکول کہاں؟ وہاں تو بس ویرانی اور وحشت تھی، خوف اور دہشت تھی اور کچھ نہیں تھا۔

''تم کیا لینے آئے ہو یہاں؟ کچھ بھی تو نہیں بچا۔'' اجڑے اکھڑے ایک درخت نے اس سے سرگوشی کی۔ نبیل نے پیار سے اس کی طرف دیکھا اور زمین سے باہر اکھڑی ہوئی جڑوں کو پیار سے چھونے لگا۔

''ریشم اس وقت کہاں ہوگی؟'' اس نے کرب سے سوچا۔ درخت کی جڑوں کو چھو کر اسے لگا جیسے اس نے ریشم کے ریشمی آنچل کو چھو لیا ہو۔ ''ریشم، ریشم!'' وہ منہ ہی منہ میں اس کا نام جپنے لگا۔ کچھ زخمی مائیں اور باپ اپنے، اپنے بچوں کو ملبے سے ڈھونڈ نکالنے کے لیے آوازیں دے رہے تھے۔ زور، زور سے پکار رہے تھے۔ ''کس قدر وزنی ملبے کے نیچے دبے ہوئے تھے ان کے نازک پھول۔'' سوچ کر اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ وہ آنکھیں پھاڑ، پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

اسکول کی عمارت آخری مغل فرمانروا کی طرح سرنگوں تھی۔ ہر طرف حسرت و یاس کا سماں تھا۔ موت اپنے بال کھولے، دانت نکالے، وحشت بھری دھمالیں ڈال رہی تھی۔ اسکول کے طالب علموں کے متعدد بستے، پنسلیں، ربڑ، شاپنر، کاغذ اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ کئی تو ٹوٹ پھوٹ چکے تھے مگر کچھ ایسے بھی تھے جنہیں کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک اور سلامت تھے۔ ان بستوں کو ان بچوں کی ماؤں نے کتنے پیار سے صبح ان کے گلوں میں ڈالا ہوگا۔ کئی ناشتے دان الٹے پڑے تھے جن میں ان کی ماؤں نے انہیں آدھی چھٹی کے وقت کھانے کو کچھ نہ کچھ دیا ہوا تھا۔ لفافوں میں بند پراٹھے، کباب، انڈے، بسکٹ، توس، مکھن اور نہ جانے کیا، کیا کچھ تھا۔

چند خوف زدہ اور بھوکی بلیاں اور کتے کھانے کی خوشبو سونگھ کر ان لفافوں کی طرف بڑھتے اور الٹنے پلٹنے لگ جاتے۔ نبیل کے دل میں اچانک ایک نیا اور خوف ناک خیال آیا۔ ''کیا خبر کل کو زلزلے کے مارے ہوئے مردہ اور نیم مردہ زخمی لوگوں کو بھی یہ کتے، بلیاں سونگھنے لگیں اور...... نہیں......'' یہ بھیانک خیال اسے ڈرانے لگا اور اس نے اٹھ کر پتھر اٹھا کر کتوں، بلیوں کو بھگانے کی کوشش میں الٹے سیدھے ہاتھ پاؤں چلانے شروع کر دیے۔

ایک شاپنگ بیگ سے جھانکتا ہوا ناشتا دیکھ کر وہ خود ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑنے سے باز نہ رہ سکا۔ بستے پر بچے کا نام عبدالقیوم لکھا ہوا جسے پڑھتے ہی اس کے کلیجے میں پھانس سی چبھی اور اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ عبدالقیوم کی ماں نے لنچ ٹائم کے لیے اپنے پیارے، لاڈلے بیٹے کو کھانے کے لیے پراٹھے، انڈے کے ساتھ آم کے مربے سے ایک میٹھی قاش بھی دی تھی جس میں سے الائچی کی میٹھی، میٹھی اشتہا انگیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ نبیل کو اپنی امی کے ہاتھ کے بنے ہوئے پراٹھے یاد آ گئے۔ اسے لگا جیسے وہ اس وقت نبیل نہیں، چوتھی جماعت میں پڑھنے والا چھوٹا سا عبدالقیوم ہو اور یہ ناشتا اس کی اپنی امی نے اس کے لیے دیا ہو۔ اسے ایک دم اپنے معدے میں گڑگڑاہٹ سی محسوس ہوئی تو یاد آیا کہ اس نے صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں تھا۔ مائیں کتنی اچھی اور کتنی بڑی نعمت ہوتی ہیں۔

عبدالقیوم کے حصے کا مزے دار پراٹھا اور انڈا کھاتے ہوئے اسے بس یہی خیال آرہا تھا۔ بڑے زلزلے کے بعد ابھی تک جھٹکے آتے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ گھبرا کر تھوڑی، تھوڑی دیر بعد غور سے اِدھر اُدھر دیکھتا، ساکت ہو کر پوری توجہ سے ملبے کی طرف نظر دوڑاتا کہ کیا پتا زمین کہیں شق ہو جائے اور ریشم باہر نکل آئے۔

کھانے کے بعد وہ دوبارہ گھاس پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر کے سوچنے لگا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اچانک اسے لگا جیسے زمین میں سے ہلکی، ہلکی سرگوشیوں کی آوازیں آرہی ہوں اس نے کچھ دیر تک انہیں سنا اور پھر یقین کر لینے کے بعد اپنے کان دوبارہ ملبے کی طرف لگا دیے۔

''یہ کیا؟'' اس نے حیرانی سے سوچا...... آوازیں واقعی زمین کے نیچے سے آتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے دو بچے آپس میں بات کر رہے ہوں۔ نبیل پوری طاقت سے چیخا۔ لیکن شاید اوپر سے آواز نیچے نہیں جا رہی تھی ۔ کیونکہ اسے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ خاموشی یونہی چھائی رہی۔ کہیں یہ میرا وہم نہ ہو۔

اس نے اپنے کان زمین پر لگا دیے۔ ''کیا کوئی زندہ ہے؟ کیا خبر اب بھی کچھ لوگ نیچے دبے سانس لے رہے ہوں۔ اس کا تو مطلب ہے شاید ریشم بھی۔''

اس امید نے اس کے وجود میں دیے روشن کر دیے اور وہ ریسکیو ورکرز کی تلاش میں سرپٹ بھاگنے لگا۔ گاؤں میں کدالیں کم تھیں اور کھدائی کا کام بہت زیادہ...... ابھی تک بہت سی امدادی ٹیمیں وہاں پہنچ بھی نہیں سکی تھیں۔ اس لیے نبیل کے بے حد اصرار اور منت سماجت کرنے کے باوجود اسے زیادہ مدد حاصل نہیں ہوئی۔ یہ مشکل کھدائی ہاتھوں سے نہیں بلکہ مشینوں اور کرینوں سے ہونے والی تھی اور ایسی کسی چیز کا وہاں دور، دور تک پتا نہیں تھا۔ بعد میں پتا چلا تھا کہ ہیوی ڈیوٹی کرینیں اور امدادی مشینیں تو حکمرانوں کے شہر میں گر جانے والی ایک کروڑ پتیوں کی رہائشی بلڈنگ کا ملبہ اٹھانے کا کام کر رہی تھیں۔ بھلا چھوٹے گاؤں، گراؤں میں کیسے بھجوائی جا سکتی تھیں؟

دو دن کی مستقل محنت، منت سماجت اور اصرار کے بعد نبیل کے کہنے پر امدادی کارکنوں نے واقعی دو بچوں کو نیم مردہ حالت میں ملبے کی قبر سے نکال لیا۔ فرطِ مسرت سے نبیل کے آنسو نہ تھمتے تھے۔ اس روز کے بعد سے اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ حوصلہ نہیں ہارے گا۔ وہ ہر رات خاموشی سے ملبے کی ڈھیریوں پر کان لگا دیتا اور آوازیں سننے کی کوشش کرتا...... جہاں سے بھی اسے کسی سرسراہٹ، کسی سرگوشی کا گمان ہوتا وہ وہاں چاک سے نشان لگا دیتا اور صبح ہوتے ہی ورکرز کو مجبور کرتا وہ وہاں کھدائی کریں ہر بار بڑی مشکلوں سے وہ اس کی بات مانتے، کبھی کبھار تو وہاں سے کچھ بھی نہیں ملتا اور کبھی کبھار کوئی ایک آدھ بچے کھچے سانسوں والا بچہ واقعی نکل آتا تو سب خوش ہو جاتے۔ ٹی وی کے رپورٹروں نے اسے سرگوشیاں سننے والا شخص قرار دے کر اس کے بارے میں ایک دلچسپ سی اسٹوری بھی تیار کر لی تھی جسے وہ بار، بار ٹی وی پر دکھا کر لوگوں کو حیران کر رہے تھے۔ کئی اخبار والے اس کا انٹرویو لینے کے لیے اس سے ملنے کی کوشش کر رہے تھے مگر نبیل کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس پر تو بس ایک ہی دُھن سوار تھی کہ اسے کسی طرح ریشم کا پتا چل جائے۔ کسی طرح وہ ریشم تک پہنچ سکے اور بس...... اسے ڈھنگ سے سوئے ہوئے تقریباً چار راتیں ہو چکی تھیں۔ نیند کے جھونکے آتے تو وہ ان سے لڑتا اور چند ہی لمحوں بعد بیدار ہو کر بیٹھ جاتا۔

وادی میں انسانوں اور جانوروں کی لاشوں کا تعفن پھیل چکا تھا۔ مگر نبیل وہاں سے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔

''اتنے دن ہو گئے بھائی جان، اب ہمیں امید نہیں رکھنی چاہیے۔'' ایک روز اس کے چھوٹے بھائی شکیل نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر نبیل کی خاموشی نے اسے بتا دیا کہ وہ ابھی حوصلہ ہارنے کو تیار نہیں تھا۔ اسے اب بھی کسی معجزے کی امید تھی۔ کسی ان ہونی کا انتظار تھا۔

”اگر ایک فی صد بھی کسی کے زندہ بچ جانے کے چانس ہوں تو ہمیں یہ چانس تو لینا چاہیے ناں...... میں ریشم کو ڈھونڈ کر ہی رہوں گا شکیل!“ اس نے متوحش آنکھوں سے بھائی کو دیکھا تو وہ چپ ہوگیا اور بھائی کی ذہنی صحت اور دل کے سکون کے لیے دل ہی دل میں دعائیں کرنے لگا۔

☆☆☆

وہ زلزلے کا پانچواں دن تھا۔ دوپہر شام میں ڈھل رہی تھی جب اسکول کے ملبے پر بے سبب، بے مقصد گھومتے پھرتے، پل بھر کو رکتے، سانس لیتے چلتے ہوئے نبیل تھک ہار کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ صبح سے اس نے کسی کی کوئی آہ ہچکی یا پکار کچھ بھی نہیں سنا تھا۔ بس ایک اس کے اپنے دل کی دھڑکن تھی جس کی آواز پوری وادی میں گونج رہی تھی۔ اسے ریشم بے طرح یاد آرہی تھی۔ کاش پریوں کی کہانیوں کی طرح زمین کے کسی کونے کھدرے سے ریشم کی اوڑھنی کا کوئی حصہ ہی دکھائی دے جائے۔ کوہ قاف کی وادی کی ایک خوب صورت پری راستہ بھول کر کہیں پاتال میں جا چھپی تھی اور وہ اس کی مدد کرنے کے لیے بے چین تھا۔ اسے راستہ دکھانا چاہتا تھا کہ مگر شاید وہ کہیں بہت دور چلی گئی تھی جو ابھی تک اسے اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔ ریشم تو اس وادی کی بیٹی تھی۔ شاید دھرتی ماں اسے پُرسکون نیند دینے کے لیے اپنی آغوش میں لوریاں دے رہی تھیں۔ شاید، شاید......

”نہیں! نہیں......“ اس نے اس خیال کو فوراً ہی ذہن سے جھٹک دیا اور عمارت کے ملبے کے اردگرد چکر لگانے شروع کر دیے۔ اور پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ ملبے کو کھنگالتے پھرولتے اس کے ہاتھوں میں کلاس روم کے باہر لگی تختی آگئی۔ جس پر عمارت ہشتم بی لکھا ہوا تھا۔

”یا خدا!“ نبیل کا سر گھوم گیا۔ ”یہ تو ریشم کا کلاس روم تھا۔“ اس نے فوراً گھٹنوں کے بل جھک کر ملبے کی تہوں کا بغور مشاہدہ شروع کر دیا۔ کبھی وہ اٹھتا، کبھی بیٹھتا اور کبھی لیٹ جاتا۔

”ریشم، ریشم!“ اس نے اپنی طاقت سے آوازیں دینا شروع کر دیں اسے لگا جیسے جواباً کہیں دور سے کسی نیچی جگہ سے جیسے ہلکی سی بھنبھناہٹ کی آواز آئی ہو۔ ”کہیں یہ میرا وہم تو نہیں ہے؟“ اس نے اپنے اردگرد پڑی چیزوں کو زور، زور سے سیمنٹ کی سلوں پر مارنا شروع کر دیا اور پھر جواب سننے کے لیے کان زمین پر لگا دیے۔ جواب میں واقعی ہلکی سی آواز آرہی تھی جو ہوا کی سرگوشی سے زیادہ محسوس نہیں ہوئی تھی۔ نبیل دیوانوں کی طرح زمین کھودنے لگا۔ اس کے ناخن زخمی ہو رہے تھے۔ کہنیاں چھل رہی تھیں مگر اس پر تو جیسے کوئی جنون سوار تھا۔ ”ریشم زندہ ہے۔“ اس کا دل کہہ رہا تھا رواں، رواں پکار رہا تھا۔ اسے زمین کھودتے دیکھ کر کچھ اور لوگ بھی اپنے پھاوڑے اٹھائے اس کی مدد کو آگئے اور گھنٹے بھر کی جان توڑ کوششوں کے بعد وہ ایک نوجوان لڑکی اور ایک بچے کو باہر نکالنے میں کامیاب ہوگئے۔ نبیل کو خدا پہ بے اختیار پیار آگیا۔ اور وہ زمین پر جھک کر سجدے کرنے لگا۔ ریشم اور بچہ نیم مردہ، مرجھائے ہوئے پھولوں کی ٹوٹی ہوئی ڈالیوں کی طرح اسٹریچروں پر ڈال کر فوراً اسپتال لے جائے گئے اور ٹی وی والوں نے ایک بار پھر نبیل کے بارے میں رپورٹ تیار کرنا شروع کر دی کہ کیسے ایک شخص نے زمین سے آوازیں بلکہ سرگوشیاں سن کر قیمتی جانیں بچالی ہیں۔

”ریشم! میری جان! میری زندگی! میں جانتا تھا تم مجھے اکیلا چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتیں۔ میری دنیا میں واپس لوٹ آنے کا شکریہ......“ اس نے کئی دن ملبے کی نیچے دبی رہنے والی اپنی خوب صورت، بچی محبت کے کانوں میں سرگوشیاں کر کے رس انڈیلا اور اس کا زخمی ہاتھ دھیرے سے چھو کر اسے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ جواب میں ریشم نے ایک لمحے کے لیے اپنی آنکھیں کھولیں اور پھر مسکرا کر دھیرے سے بند کر لیں۔ ایک عجیب سا اطمینان تھا ان آنکھوں میں۔ نبیل کا خون سیروں کے حساب سے بڑھ گیا تھا۔ اسے اپنی خوش بختی

پر یقین نہیں آرہا تھا۔ ماں، باپ، بہن، بھائیوں کے بعد اب شکیل اور ریشم ہی اس کی کل کائنات تھے اس لیے وہ اس کی دل و جان سے حفاظت کر رہا تھا۔

کئی زخمیوں کی طرح ریشم کو بھی اسلام آباد کے ایک بڑے اسپتال میں داخل کرا دیا گیا جہاں اس کی دن رات نگہداشت ہونے لگی۔ اسپتال میں کمرے کم تھے اور مریض زیادہ...... اس لیے بہت سے زخمیوں کو برآمدوں اور گھاس کے قطعوں پر ہی لٹانا پڑ رہا تھا۔ مگر ایسے وقت میں تو زندہ بچ جانا ہی بہت تھا۔ ہر طرف... نفسا نفسی اور افراتفری کا عالم تھا۔ ہر کوئی اپنے کھوئے ہوئے رشتے داروں کی آس میں دروازوں کی طرف دیکھتا تھا اور جلد سے جلد ٹھیک ہو کر وہاں سے رخصت ہونا چاہتا تھا۔ مگر اب تو واپس جانے کے لیے ان کے پاس گھر بھی نہیں تھا۔ نہ جانے کہاں جانا تھا ان کو......؟ انہیں پتا بھی نہیں تھا۔

ریشم کے جسم پر چوٹیں تو بہت آئی تھیں مگر شکر تھا کہ ہڈیاں نہیں ٹوٹی تھیں۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ پندرہ بیس دنوں میں وہ اسپتال سے فارغ ہو کر گھر جا سکتی تھی۔ گھر ابھی اسے بھی پتا نہیں تھا کہ کہاں جانا ہے؟ نبیل نے بھی ابھی اس بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا۔ سوچا تھا تو بس یہی کہ ریشم کیسے جلد سے جلد اچھی ہو جائے۔ اسے مزید کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ اسے سکون ملے، آرام نصیب ہو اور ہمیشہ چین سے رہے۔

رات بھر وہ مریضوں کے کراہنے کی آوازیں سنتا تو اپنے پیارے ماں، باپ، بہن، بھائیوں کا تصور اسے ستانے لگتا اور نیند اس سے بہت دور کہیں دور چلی جاتی۔ وہ جلتی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر سکون پانے کی کوشش کرتا مگر اسے کامیابی نہیں ہوتی۔ ریشم کی ہلکی سی ''سی'' اور ''اُف'' پر لپک کر اس کے کمرے میں جا پہنچتا اور اسے دیکھ کر تسلی کر لینے کے بعد باہر آ کر پھر سے لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگتا۔ دن میں بھی وہ اس کے قریب ہی منڈلاتا رہتا۔ کبھی اسے اس کی پسند کا برگر اور بوتل لا کر دیتا تو کبھی چاکلیٹوں کے پیکٹ اور پھول...... وہ اس کا بالکل بچوں کی طرح خیال رکھتا۔ اس کی اتنی توجہ اور محبت کی وجہ سے ریشم ذہنی طور پر بہتر اور توانا محسوس کرنے لگی تھی اور اس کی جسمانی صحت بھی روز بروز بہتر ہوتی جا رہی تھی۔

''اب میں بہت بہتر ہوں نبیل، تم رات کو ہاسٹل جا کر آرام سے سو لیا کرو۔ خواہ مخواہ یہاں بے آرام ہوتے ہو۔'' ایک رات ریشم نے اسے پیار سے کہا۔

''میں تمہیں اکیلا چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں ریشم......! اب ہم دونوں کا اس دنیا میں ایک دوسرے کے سوا آخر ہے کون؟'' نبیل نے اسے ہولے سے تھپک کر تسلی دی۔

''تمہارا نیند سے برا حال ہو جاتا ہے۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ پہلے بھی تم کتنا کچھ برداشت کر چکے ہو پلیز جا کر سو جاؤ۔ تمہیں بھی آرام کی ضرورت ہے۔''

''تم سے دور جانے کو جی نہیں چاہتا...... کیا کروں؟'' نبیل مسخری کرتے ہوئے الٹے سیدھے منہ بنانے لگا۔

''دیکھو یہاں اسپتال میں اتنے لوگ ہیں میرا خیال رکھنے والے۔ ڈاکٹر، نرسیں، سوشل ورکرز، والنٹیئرز پھر تمہیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں بھی اب سونا چاہتی ہوں۔ اوکے گڈ نائٹ۔'' ریشم نے مسکرا کر اسے ہاتھ ہلا کر الوداع کہا تو وہ بادلِ ناخواستہ اٹھا اور اس کا ماتھا چوم کر باہر چلا گیا۔ جہاں زمینی بستر اس کا حسبِ معمول منتظر تھا۔ آج واقعی اسے بھی بہت زور کی نیند آرہی تھی۔ تکیے پر سر رکھتے ہی وہ بے خبر سو گیا اور اسپتال کے کاریڈور میں جلنے والی بتیاں اسٹاف نے قدرے دھیمی کر دیں۔

گہری نیند میں ڈوبی ریشم کی اچانک آنکھ کھل گئی۔ اس کے زخمی بدن میں درد سا اٹھ رہا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ کوئی اس کے بالکل قریب کھڑا اس کے بدن کو ٹٹول رہا تھا۔ یہ کیا؟ وہ بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ پیچھے ہٹی، اتنی پیچھے کہ اسے لگا وہ بستر سے نیچے ہی گر جائے گی۔ مگر کسی نے اسے اپنی بانہوں میں

سمیٹ کر اس کے لبوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ایک انجانے سے خوف سے ریشم کا دل دھک، دھک کرنے لگا۔

اس نے چیخنا چاہا مگر آواز اس کے گلے میں جیسے گھٹ سی گئی باہر نہ آئی، کمرے میں گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ شاید بجلی چلی گئی تھی۔ گہرے اندھیرے کے باوجود ریشم نے ڈاکٹر احسن کو اس کی بڑی، بڑی مونچھوں کی چبھن اور کلون کی مخصوص مہک کی وجہ سے پہچان لیا تھا۔ زخم لگانے والا یہ مسیحا تو دن میں کئی بار اسے وحشت بھری تعریفی نظروں سے گھور کر اس کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کا حال چال پوچھا کرتا تھا۔ اس کی آنکھیں ہمیشہ ریشم سے یہ سوال کرتی نظر آتیں۔ ''اے خوب صورت پری تو اسپتال کے اس بے رنگ دکھ بھرے وارڈ میں کیسے؟ تجھے تو کسی عالی شان محل کے مخملیں بستر پر ہونا چاہیے تھا۔''

ریشم کی قوتِ مدافعت کمزور پڑتی جا رہی تھی۔ شاید یہ اس کے ٹیکے کا بھی نتیجہ تھا جو خوف ناک جن نے اس کے بازو میں اچانک ٹھونک کر اسے بے بس سا کر دیا تھا۔

''نبیل! ہیلپ، ہیلپ بچاؤ......'' ریشم کے منہ سے گھٹی، گھٹی چیخیں نکلیں۔ ''بچاؤ نبیل......'' اس کے لبوں پر سسکی سی ابھری اور پھر چند ہی لمحوں میں اس کے لبوں پر ہی دم توڑ گئی۔

ریشم کو ہوش آیا تو صبح کا اجالا کمرے میں پھیل چکا تھا۔ نرس سفید براق لباس میں اس کے پاس کھڑی اس کا بلڈ پریشر لینے کی کوشش کر رہی تھی اور نبیل ناشتے کے لیے چائے کا گرم کپ ہاتھ میں تھامے دو سینکے ہوئے سلائس اور مکھن جیم کی چھوٹی سی طشتری لیے اس کے قریب کھڑا پیار سے اسے تکے جا رہا تھا۔

''آج بہت سوئیں تم۔'' نبیل نے خوش دلی سے کہا۔

''رات تم کہاں چلے گئے تھے نبیل؟ میں اتنا چیخی تم اندر کیوں نہیں آئے؟'' ریشم نبیل پر برسنے لگی۔

''اوہ بھئی ٹیک اٹ ایزی...... اتنا غصہ کیوں؟ بارہ بجے تو میں تمہارے پاس ہی تھا۔ یاد نہیں؟ پھر جب پاور فیل ہوئی تو میں باہر آ گیا۔'' نبیل نے چائے کا گرم، گرم مگ اس کے آگے کر دیا۔

''اندھیرے سے ڈر گئی ہو گی...... ویسے بھی اتنے بڑے زلزلے سے گزری ہو، نارمل ہونے میں کچھ وقت تو لگے گا ناں......'' نرس نے نبیل کے پاس منہ لے جا کر آہستہ سے کہا اور خود اپنا سامان اٹھا کر دوسرے مریضوں کی طرف چل دی۔

''آہستہ، آہستہ سب ڈر دور ہو جائے گا...... تم فکر نہیں کرو......'' نبیل نرمی سے اس کے بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔

''مگر تم میری چیخیں سن کر اندر کیوں نہیں آئے نبیل؟ تم نے تو پتھروں سے سیمنٹ کی سلوں سے میری سرگوشیاں تک سن لی تھیں۔ تم نے میری آوازیں نہیں سنیں۔ that is not fair''

ریشم مٹھیاں بھینچ کر زور، زور سے پلنگ کی آہنی اطراف پر مارنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اسے دورہ سا پڑ گیا۔ وہ دیوانگی سے اپنے بال نوچنے لگی اور آگے بڑھ کر نبیل کا گریبان پکڑ لیا۔

''سوری ریشم، مجھے کیا پتا تھا کہ تم اتنا ڈر جاؤ گی...... لیکن تم ہی نے تو مجھے کل رات باقاعدہ دھکے دے کر سونے کے لیے بھیجا تھا تو بس میں سو گیا۔ غلطی ہو گئی جان...... اب کبھی نہیں سوؤں گا۔'' اس نے لاڈ سے اپنے کان پکڑ لیے۔

ریشم کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا جو اس نے فوراً ہی پونچھ ڈالا۔

''تمہیں سب کچھ یاد آ گیا ہو گا ناں...... آئی انڈر اسٹینڈ......'' نبیل سنجیدہ ہو گیا۔

''ہاں...... زلزلہ......'' ریشم آہستہ سے بولی۔

''مگر دوسرا زلزلہ......'' اب اس کی آواز اتنی مدھم تھی کہ نبیل تک نہیں سن سکتا تھا۔ اب وہ کیسے بتاتی کہ دوسرے زلزلے نے اسے جسمانی نہیں ذہنی طور پر زیادہ پامال کر دیا تھا۔

جانم بیٹا

ہاجرہ ریحان



وہ روتے، روتے ہلکان ہوئی جارہی تھی اور مس شاہین کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرح اس کو چپ کرائیں......آخرکار انہوں نے ہمیشہ کا آزمایا ہوا حربہ استعمال کیا۔

''ارے کب تک یوں ٹسوے بہاتی رہوگی جانم بیٹا؟'' ان کو معلوم تھا کہ ''جانم بیٹا'' سن کر تو اس کا موڈ بحال ہو ہی جائے گا اور یہی ہوا......وہ سنبھل کر ننھے بچوں کی طرح ہتھیلی سے آنکھوں کو رگڑنے لگی۔

''آپ کو کیا بتاؤں مس شاہین...... کتنی تنہا ہوں میں، کتنی اکیلی، ماں کے ہوتے ہوئے بھی جیسے بن ماں کی......انہیں پروا ہی کب ہے میری، بس آپا کی سسرال کا دم بھرتی رہتی ہیں۔ بھائی جان نے تو کہہ دیا ہے کہ بس شرمین جلدی سے شادی کرلو تو تم کو تمہارے میاں سمیت امریکا بلالوں گا......'' یہ کہتے، کہتے وہ کن

انکھوں سے امریکا کا سنتے کے ساتھ ہی مس شاہین کی بڑی، بڑی آنکھوں میں پیدا ہونے والی چمک بھی دیکھ چکی تھی۔ کتنی ہی بار وہ یہ سب مس شاہین کو سنا چکی تھی...... بھائی جان کے امریکا جانے، وہاں سے ڈالر بھیجنے، امی کا گھر بنانے، آپا کی شادی اور...... بے دریغ جہیز دینے کے تمام قصے مس شاہین کے لیے نئے نہیں تھے مگر ہر بار ایسے کسی قصے کے شروع ہوتے کے ساتھ ہی وہ ایسے دم سادھ لیتیں جیسے کوئی ان کو داستانِ الف لیلہ سنا رہا ہو......ان کی آنکھوں میں چمکتا دمکتا امریکا اور ڈالرز تیرتے نظر آنے لگتے...... وہ شاید اپنی کرسی پر بیٹھے، بیٹھے ہی امریکا کی سیر کو نکل جاتی تھیں...... اور پھر اچانک پیریڈ ختم ہونے کی گھنٹی بج جاتی...... شرمین گڑبڑا...کر اپنی اسائنمنٹ کی فائل سنبھالتی تو مس شاہین مسکراتی ہوئی اس سے کہتیں۔

''ارے کوئی بات نہیں، تم اپنا اسائنمنٹ مجھے دے دو، میں مکمل کر دوں گی...... ویسے بھی میرے پاس ابھی دو چار پیریڈ خالی ہی ہیں۔'' شرمین کو پھر اپنے غم یاد آجاتے۔

''اللہ مس شاہین، میں کیا بتاؤں اللہ نے آپ کو صرف میرے لیے بھیجا ہے...... سچی، میں سوچتی ہوں آپ نہ ہوتیں تو میں کہاں جا کر اپنا دل ہلکا کرتی...... مجھے ناں اپنے اللہ پر بڑا پیار آتا ہے اس نے مجھے آپ کو دے دیا۔''

وہ پھر روہانسی ہونے لگتی تو مس شاہین اسے یاد دلاتیں کہ وہ انسٹیٹیوٹ سے جاتے ہوئے اپنا اسائنمنٹ یاد سے لے جائے ورنہ اگلی صبح اسے سر کلیم سے نبٹنا مشکل ہو جائے گا...... وہ سر ہلاتی، احسان مندسی ہوتی لیب سے رخصت ہو جاتی۔

مس شاہین لیب اسسٹنٹ تھیں، ٹیچر نہ تھیں اور لیب اسسٹنٹ کی تنخواہ ہی کیا ہوتی ہے...... شادی کی عمر کو پہنچ چکی تھیں مگر ایسے گھرانے کی لڑکیوں کو کون پوچھتا ہے جہاں دو چھوٹے بھائی، پانچ دس ہزار کے معمولی مشاہرے پر ملازمت کرتے ہوں...... اماں اپاہج اور کان سے بہری ہوں، ایک چھوٹی بہن جو بھائیوں' بہن کے برعکس پڑھ لکھ نہ سکی ہو اور گھر سنبھالتی ہو۔ اوپر سے والد کو آج تک کسی محلے والے نے نہ دیکھا ہو......بس اتنا تھا کہ چھوٹی بہن کچھ اچھا پکاتی تو محلے کے دو چار گھروں میں ضرور بانٹ آتی تھی...... مالک مکان کو کبھی کرایہ دیر سے نہیں ملا تھا......

مس شاہین امتحانوں کے دنوں میں محلے کے بچوں کو پڑھا دیا کرتی تھیں اور چھوٹا بھائی آصف جس کی شکل صورت سے محلے بھر کی خواتین متاثر تھیں اکثر محلے والوں کے باہر کے کام نمٹا دیا کرتا۔ تمام گھر والوں کے کام سے کام رکھنے اور محنت کرتے رہنے سے محلے والوں نے ان کو ایسے ہی قبول کر لیا تھا۔

اس چھوٹے سے کمپیوٹر انسٹیٹیوٹ میں شرمین جب سے کمپیوٹر کورس کرنے آئی تھی، انسٹیٹیوٹ کی تمام ہی لڑکیوں نے اسے ناپسند کر دیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ لڑکیوں سے زیادہ لڑکوں میں مصروف رہتی تھی......بس لڑکوں کا شرمین سے بے تکلف ہونے سے پہلے اس کا بھائی بننا ضروری تھا...... جہاں نام کے ساتھ بھائی کا اضافہ ہوتا شرمین صاحبہ کے پہلو میں جگہ مل جاتی......لڑکے اس کے دکھڑے سنتے......تاسف سے سر ہلاتے، اسے خوش کرنے کی سعی کرتے...... باقی کی تمام لڑکیاں غصے سے یہ تماشا دیکھتی جاتیں کسی میں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ شرمین کے نقشِ قدم پر چلے سکے...... اور نہ ہی کسی میں اتنی عقل ہی تھی۔

''تو یہ ہے...... ہر ایرے غیرے لڑکے کو اپنے سے لگائے رکھتی ہے......ارے ایک دو کو تو کسی اور کے لیے بھی چھوڑ دو......کیا ہمارا کوئی حق نہیں......؟ کیا ہم فیس نہیں دیتے......حد ہے یعنی کہ......'' نفیسہ غصے سے بلبلا کر اپنی ہم جماعتوں سے کہتی مگر کوئی بھی شرمین کا توڑ نہیں لا سکا تھا......اکثر میل ٹیچر بھی اسٹاف روم میں شرمین کی دکھ بھری داستان دُہراتے سنائی دیتے......اور آخر میں یہ بات ضرور ایک دوسرے کو سناتے کہ بس جیسے ہی شرمین کی شادی ہوگی وہ اپنے

میاں کو لے کر اپنے بھائی جان کے پاس امریکا چلی جائے گی۔لفظ شادی اور امریکا پر آ کر وہ ذرا دیر کو رک کر اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر اسے تر ضرور کرتے تھے جیسے ان الفاظ میں آبِ حیات کی تاثیر ہو......مزہ ہو۔مس شاہین نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اب کی بار شرمین کا لیب میں پیریڈ ہوگا تو وہ اسے سرفراز سے حد ممکن دور رکھیں گی......وہ دیکھ رہی تھیں کہ سرفراز آج کل کمپیوٹر سیکھنے میں شرمین کی کچھ زیادہ ہی مدد کرنے لگا ہے......اور ایک دو دفعہ ان کو سنائی بھی دے گیا تھا کہ کس طرح سرفراز اپنی امی کا اس کی شادی کے لیے پریشان ہونے کے قصے بھی سنا چکا ہے......یہاں تک کہ ایک دن تو وہ یہ کہتا سنائی دیا تھا کہ وہ صرف باہر کی لڑکی سے ہی شادی کرے گا اور یہ بات اس کی امی کو سمجھ میں نہیں آتی۔ جس میں شرمین نے اپنی ازلی معصومیت سے اسے دلاسا بھی دیا تھا۔

''سرفراز بھائی! آپ بالکل بھی پریشان نہ ہوں...... جب بھی آپ کا شادی کا موڈ ہو آپ مجھے بتایئے گا، میں آپ کو ایک سے ایک باہر کی لڑکی دکھادوں گی......آپ کی امی نہیں مانتیں تو آپ آنٹی کو مجھ سے ملوادیں' میں انہیں منالوں گی...... میں جانتی ہوں سرفراز بھائی، میری امی نے مجھے بھی وہ توجہ نہیں دی جو میرا حق تھا مگر میں آپ کو بتاؤں کہ ہمارے سارے رشتے داروں میں تمام آنٹیوں کی ناک میں پسندیدہ بچی ہوں...... میں جانتی ہوں میری محرومی کا ان سب کو اندازہ ہے......میں جانتی ہوں آپ کی امی مجھ سے ملنے کے ساتھ ہی مان جائیں گی......میری تو دعا ہوتی ہے کہ اللہ میاں پلیز......! آپ بہت اچھے ہیں......آپ نے میری ماں سے مجھے محبت نہیں دلوائی نہ سہی مگر میری ساس کو تو پلیز مجھ سے محبت ہونی چاہیے ناں......''

اور اس پر سرفراز کی زوردار آمین سن کر تو مس شاہین کے تن بدن میں آگ ہی لگ گئی تھی۔ ان کی آنکھوں نے اسی وقت سرفراز اور شرمین کو ایک ساتھ جہاز پر چڑھتے دیکھنا شروع کردیا۔

''دیکھو شرمین ابھی جواب نہ دو......میری بات پر ٹھنڈے دل سے غور فکر کرنا......ویسے بھی تم مجھے اتنی اچھی لگتی ہو کہ میرا دل چاہتا ہے کہ تم کو ساری زندگی اپنے ساتھ رکھوں......میں اپنے بھائیوں کو جانتی ہوں بہت محنتی ہیں کوئی ذرا سا ہاتھ پکڑ لے گا تو بہت آگے جانے کی اہلیت ہے ان میں......تم کہو گی تو تم کو اپنے گھر والوں سے بھی ملوادوں گی اور جیسے تم کہو گی تمہاری امی سے بات بھی کرلوں گی......اور اگر کہو گی تو تمہارے بھائی جان سے بھی امریکا میں بات......''

''اللہ......مس شاہین! یہ میں کیا سن رہی ہوں......میری ہمدرد......میری دوست......آپ نے تو مجھے سرخرو کردیا ہے۔اللہ میں کیسے بتاؤں کہ اب تک جو بھی دکھ تھے مجھے، آپ کی اس بات سے جیسے ہوا ہوگئے ہیں......اللہ جی......! آپ کتنے اچھے ہیں آپ نے تو میرے تمام گلے ہی مٹادیے......میں آج تک خود کو کتنا تنہا پاتی تھی لیکن آج میرے پاس سب کچھ ہے......آج میں دنیا کی خوش نصیب ترین انسان ہوں۔''مس شاہین نے گھڑی پر وقت دیکھا......پیریڈ ختم ہی ہونے والا تھا اور وہ چاہتی تھیں کہ آج ہی تمام بات مکمل کردیں تاکہ کوئی بھی گنجائش نہ رہے۔

''تم کو تو پتا ہی ہے کہ میرے دو بھائی ہیں، رمیز اور آصف......میرے خیال میں تم نے دونوں کو ہی دیکھا ہے۔میں بس اتنا پوچھنا چاہتی ہوں......دیکھو برا نہیں منانا اب وہ زمانہ نہیں رہا......میں چاہ رہی تھی کہ تم یہ بھی بتادو کہ......کون......؟''

''مس شاہین......''شرمین لجاتے شرماتے دہری ہوئی جارہی تھی۔

''اللہ میں اپنے منہ سے کیسے کہوں مگر میں آپ کی مشکل کا بھی احساس کررہی ہوں......مجھے اندازہ ہے......بس وہ یہ ہے کہ وہ جو آپ کے بھائی ہیں ناں وہ جو سانولے سے لمبے سے ہیں وہ نہیں......وہ جو دوسرے والے ہیں جو اپنی بائیک پر ہرا کور چڑھا کر رکھتے ہیں......اور آپ کو پیار سے اپیا کہتے ہیں وہ جن کے ایک

بازو پر بڑا گہرا بڑا نشان بھی ہے، گورے سے۔''

''اچھا، اچھا میں سمجھ گئی وہ۔ وہ آصف ہے...... تم کو آصف پسند ہے؟'' مس شاہین نے جلدی سے بات مکمل کردی۔

''ہائے مس شاہین آپ کتنی سوئٹ ہیں، آپ نے تو دوستی کا حق ادا کر دیا ہے...... میں تو سوچ، سوچ کر ہی آسمانوں پر پہنچی جا رہی ہوں کہ میں آپ کی بھاوج...... اللہ، اللہ میرے مالک، آج آپ پر مجھے بہت پیار آ رہا ہے۔''

''شرمین میری بات دھیان سے سنو...... میں جانتی ہوں کہ شریف گھرانے کی لڑکیاں یہ سب نہیں کرتیں مگر آج کل اور خاص طور پر تمہارے گھر کے حالات کو دیکھتے ہوئے مجھے لگتا ہے کہ یہ ضروری ہے۔ تم ایک بار آصف سے مل ضرور لو...... دیکھو تم بھی پڑھی لکھی ہو اور آصف بھی اپنی دُھن میں رہتا ہے...... میں نہیں چاہتی کہ بعد میں کوئی بھی بات تمہیں اچھی نہ لگے اور ہماری دوستی پر فرق پڑے، تم یقین کرو میں اس وقت آصف کی بہن کم اور تمہاری دوست زیادہ ہوں، سمجھیں۔'' انہوں نے اس کا ہاتھ دبایا۔ ابھی مس شاہین اور بھی کچھ کہنا چاہتی تھیں مگر شرمین ان سے لپٹ چکی تھی۔

☆☆☆

''بھائی جان تو کہتے ہیں کہ شادی میں جہیز کے بجائے مجھے نقدی دے دیں گے...... کیونکہ شادی کے بعد ہم نے یہاں تو رہنا نہیں ہے۔ ان کا تو خیال ہے کہ وہ...... سلامی میں ہی امریکا کا ٹکٹ دے دیں......'' شرمین نے شرماتے ہوئے آصف کو بتایا۔

''شادی...... شادی میں؟'' آصف نے ''شادی'' پر زور دیتے ہوئے ذرا اکھڑے، اکھڑے سے لہجے میں کہا...... وہ آج شرمین کو مس شاہین کی دعاؤں کے زیر سایہ کمپیوٹر انسٹیٹیوٹ سے یہاں آئس کریم کھلانے لے آیا تھا۔

''تمہارے بھائی جان غیر شادی شدہ ہیں......؟ شاید آپا کی عمر کے ہی ہیں یا پھر ان سے دو ڈھائی سال بڑے؟'' آصف نے بیرے کو آئس کریم کا آرڈر دے کر شرمین سے پوچھا۔

''جی...... بھائی جان کہتے ہیں کہ امریکا میں تو بہت سی لڑکیاں ہیں مگر وہ چاہتے ہیں کہ پہلے میری شادی ہو جائے...... بھائی جان کہتے ہیں میری شادی کے بعد ہی وہ اپنی......''

''یہی تو بات ہے، میں ان سے متفق ہوں...... اصل میں بات یہ ہے کہ میں نے بھی آپا سے صاف، صاف کہہ دیا ہے کہ پہلے آپ کی شادی ہوگی پھر میں اپنی شادی کے بارے میں سوچوں گا......'' آصف جلدی سے شرمین کی بات کاٹتے ہوئے چہکا۔

''پھر الٹے پلٹے کی شادیاں بھی تو ہوتی ہیں ناں...... سوچتا ہوں کہ ایک چھوٹا سا ہی سہی مگر گھر اپنا لے لوں...... چھت اپنی ہو تو سکون سے زندگی گزرتی ہے ورنہ کرایے کے مکان میں بڑی خواری ہے یار...... پھر بھائی رمیز اتنے سیدھے ہیں، کیا بتاؤں سوچتا ہوں کہ ان کے لیے اتنا کر دوں کہ وہ کوئی چھوٹا سا کاروبار شروع کر لیں اور چھوٹی...... وہ تو حد سے زیادہ بدھو ہے...... اس کے لیے بھی بینک میں سرمایہ محفوظ کر دوں گا کہ جب تک شادی نہیں ہوتی کسی کی محتاج میں نہ رہے...... اماں کے لیے ایک دو نرسوں کے انٹرویو کیے ہیں زیادہ نہیں یہی کوئی دس سے پندرہ ہزار ماہانہ میں امی کی دن بھر کی اچھی خاصی خدمت گزار مل جائے گی...... یہ سب کر لوں تو ہی اپنی شادی کا سوچوں گا اور اگر کسی کو جلدی ہے تو وہ خود سمجھدار ہے......'' یہ کہتے، کہتے وہ ہنس پڑا...... شرمین نے پھر سے اسٹارٹ لیا۔

''بھائی جان کہتے ہیں کہ امریکا میں بڑی کمائی ہے، ان کا ڈالر یہاں کے روپے پر بھاری ہے...... پھر وہاں ہمارا تو کوئی خرچہ ہی نہیں کہ گھر اور کھانا تو بھائی جان ہی دیں گے ہمیں...... بھائی جان کہتے ہیں کہ جو کماؤ چاہو تو بینک میں رکھو نہیں تو پاکستان بھیج دو......

اور وہاں کی ایک ہفتے کی کمائی یہاں کے دو مہینے کی کمائی کے برابر ہوتی ہے...... بھائی جان نے تو کہہ دیا ہے کہ شادی کے بعد......''

''ارے یار سوری...... میں تو بٹوا ہی لانا بھول گیا...... اصل میں آج جینز پہن لی تھی تو بٹوا جیب میں ڈالو تو جیب پھول کر عجیب سی ہوجاتی ہے تو میں پیسے نکال کر رکھ لیتا ہوں...... وہ تم کو پک کرنے سے پہلے بائیک کی ٹنکی فل کروالی تھی جس میں پورے پیسے چلے گئے، سوچا تھا کہ اپیا سے کچھ پیسے لے لوں گا مگر تمہیں دیکھا تو سب بھول گیا...... سوری یار تم برا نہیں منانا، میں سود سمیت واپس کردوں گا اگلی ملاقات میں، وعدہ رہا...... بس تم اپیا سے نہ کہنا...... بہت کان کھینچیں گی وہ میرے......'' شرمین بل ادا کر چکی تھی...... جب تک وہ دونوں واپس انسٹیٹیوٹ پہنچے تھے کلاسز اختتام کو پہنچ چکی تھیں ایک دو طلبہ اِدھر اُدھر ٹہلتے نظر آرہے تھے اور مس شاہین انسٹیٹیوٹ کے دروازے پر ہی کھڑی تھیں۔

''آگئے آپ دونوں...... ماشاء اللہ...... بہت پیارے لگ رہے ہو ایک ساتھ...... باتیں شاتیں کرلیں آپ دونوں نے...... ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لیا ناں...... دیکھو شیرمین تم فکر نہیں کرو، مجھے تمہاری امی کا اچھی طرح سے اندازہ ہے، وہ کبھی نہیں چاہیں گی کہ تم ہمارے ہاں آؤ...... وہ تم کو ہمیشہ محرومی میں رکھنا چاہیں گی...... تم ایسا کرو کہ براہِ راست میری...... اپنے بھائی جان سے بات کرادو...... میری مانو تمام باتیں آرام سے طے ہوجائیں گی...... مجھے اپنے بھائی جان کا نمبر دے دینا، میں ان سے خود ہی بات کرلوں گی۔'' یہ سب کہتے، کہتے مس شاہین...... آصف کے پیچھے بائیک پر سوار ہوچکی تھیں...... شرمین کھڑی ان کو نظروں سے اوجھل ہوتے دیکھ کر انسٹیٹیوٹ کے اندر آگئی کہ اپنا بیگ لے کر وہ بھی گھر کو نکلے کہ اچانک اس کا ٹکراؤ فیصل سے ہوتے، ہوتے بچا۔

''ارے کیا ہوا میری شیریں سخن بہن...... اتنا منہ کیوں لٹکا ہوا ہے؟'' فیصل اس سے ایک کلاس سینئر تھا اور اپنی ہنس مکھ طبیعت کی وجہ سے انسٹیٹیوٹ میں مشہور تھا۔ شرمین نے پہلی بار غور سے فیصل کو دیکھا...... لمبا قد، گھنے گھنگرالے بال اور چہرے پر بشاشت......

''کیا بتاؤں فیصل بھائی...... میں کتنی تنہا ہوں...... کتنی محرومیوں کی ماری ہوئی ہوں...... میری ماں ہیں مگر...... آہ...... نہیں ہیں...... اتنی تنہا ہوں کہ دل چاہتا ہے کہ مرجاؤں...... بھائی جان کہتے ہیں کہ شرمین ہمت سے کام لو کوئی نہ کوئی تو اللہ کی مرضی سے کبھی آئے گا تمہاری زندگی میں...... پھر تم اسے امریکا لے کر میرے پاس چلی آنا......''

شرمین نے محسوس کرلیا تھا کہ فیصل پر امریکا کا لفظ کسی ڈرون کی طرح ہی گراتھا...... وہ ایک دم لرز کر سنبھل گیا تھا...... وہ پھر گویا ہوئی۔

''بس فیصل بھائی...... بھائی جان تو کہتے ہیں کہ شادی کے بعد......''

فیصل کی مسکراہٹ کچھ الگ سی محسوس کر کے شرمین کہتے، کہتے رک گئی۔

''شرمین...... ایسی باتیں کر کے تم اپنے آپ کو دھوکا دینا چھوڑ دو...... جو اچھے لوگ ہوتے ہیں ناں وہ جس طرح بھی ہو خودداری سے اپنی زندگی خود بناتے ہیں...... تم سب سے پہلے تو اپنے بھائی جان سے کہو کہ تم شادی کر کے پاکستان میں ہی رہوگی...... کیا پاکستان میں انسان نہیں رہتے...... کیا یہاں ہم ترقی نہیں کرسکتے...... سب جیتے ہیں، سب ترقی کرتے ہیں میری بہن...... دوسری بات یہ ہے کہ اپنی امی سے دوستی کرلو...... وہ تمہیں بہت چاہتی ہیں، میں ان کو کئی بار تمہیں لینے کے لیے انسٹیٹیوٹ میں آتا دیکھ چکا ہوں...... اپنی ماں کا کہنا مانو اور کسی اچھے انسان سے شادی کرو جو پیسوں سے زیادہ تمہارا پجاری بنے...... سمجھیں میری شیریں سخن بہن شرمین، اچھا جی کل ملیں گے، اللہ حافظ......''

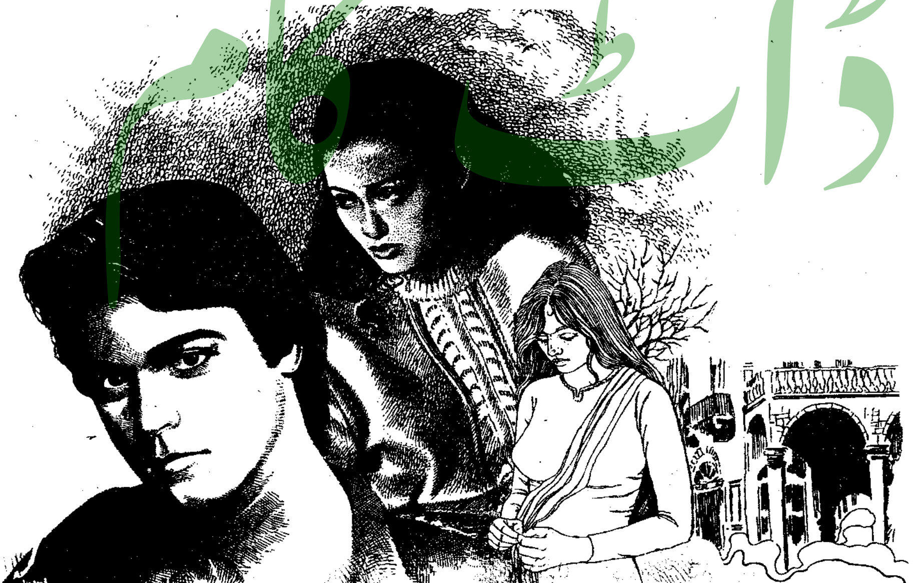
امرت

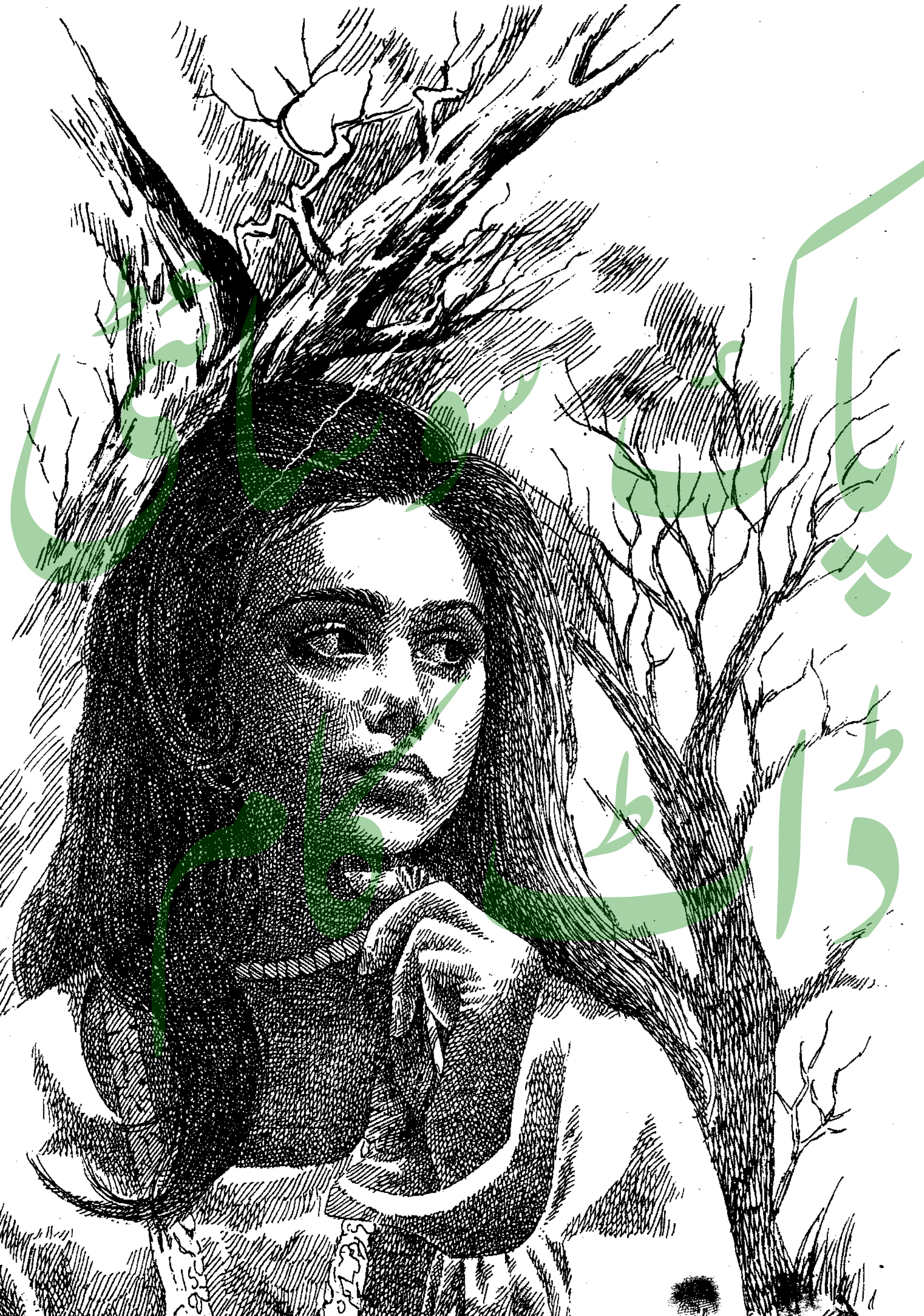
شیریں حیدر

قسط 10

تخلیقِ کائنات سے لے کر اب تک ... کئی ادوار بدلے مگر عورت کی کہانی ہر دور میں لگ بھگ وہی رہی ہے ۔اللہ تعالیٰ نے ہمیں رشتوں کی ڈور میں باندھا تو اس کا مقصد یہ تھا کہ ہم اپنی تخلیق کے مقصد کو اور بھی خوب صورت بنائیں مگر اس کے پیدا کردہ دل میں جذبے بھی اسی کے پیدا کردہ تھے۔ محبت، نفرت، رشک، حسد، رنج، غصہ اور خوشی ... اب ہم پر منحصر ہوتا ہے کہ ہم کس جذبے کو خود پر حاوی کر لیتے ہیں، یہ ہماری خصلت بن جاتا ہے اور ہماری کل شخصیت کا خلاصہ ... یہی ہمارے کردار کی تعمیر کرتا ہے اور ہم اسی کا تاثر دوسروں پر عمر بھر کے لیے چھوڑتے ہیں۔ ہماری عادات صرف ہم پر ہی نہیں بلکہ دوسروں کی زندگیوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔کسی کی زندگی کا سفر کس طرح سہل یا کٹھن ہوتا ہے اس کا انحصار ان لوگوں پر ہوتا ہے جو اُن کی زندگی کے اہم کردار ہوتے ہیں اور جن کا ہونا یا نہ ہونا اہمیت رکھتا ہے۔ پیدائش سے لے کر اپنی موت تک رشتوں کی ڈور سے بندھے ہوئے کردار زندگی کو ہنس کر گزارتے ہیں یا رو کر، مشقت سے سانس لیتے ہیں یا خوشیوں کے ہنڈولوں میں جھولتے ہوئے اس کا سارا دارومدار ان سے وابستہ رشتوں پر ہوتا ہے۔ وقت بدل جاتے ہیں مگر کہانی وہی رہتی ہے اور اپنی باری سے اس میں مختلف کردار شامل ہوتے رہتے ہیں۔

زندگی کے انہی پیچ وخم اور نشیب و فراز سے نبرد آزما ہوتی ایک چشم کشا تحریر......





آزمائش صبر گریز پا کب تک؟

''میں بہت بے بس اور مجبور ہوگئی ہوں سارہ...... سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح ان سب کا مقابلہ کروں۔''
میرے لہجے میں بے بسی تھی اور وجود میں صدیوں کی تھکن......

''بس دفع کرو ان لوگوں کو اور اس گھر کو!'' سارہ میرا ہاتھ اپنی گود میں رکھ کر اسے سہلا رہی تھی۔ ''اگر انہیں تمہاری قدر نہیں تو تمہیں ان کی خاطر یوں ہلکان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟''

''اتنا ہی آسان ہے ناں یہ پیاری......'' میں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بہت سی باتوں کو سوچ کر رہ جاتی ہوں، مجھ سے وابستہ بہت سے رشتے ہیں، بہت سی امیدیں ہیں۔''

''چونکہ تم نے خود کو ان کے حکم کا غلام بنا رکھا ہے اور ان سے خوفزدہ رہتی ہو، اسی لیے وہ ہر بات میں تمہارا استحصال کرتے ہیں۔'' سارہ نے غصے سے کہا۔

''مجھے جانا ہے...... شادی نام ہی غلامی نما پابندی کا ہے سارہ، سسرال والے اپنے گھر میں آنے والی لڑکی کو چھلنی میں سے چھان کر نکالتے ہیں، اس کے اندر باریک سے باریک نقص کا ذرّہ بھی انہیں نظر آ جاتا ہے...... حتیٰ کہ جو نقائص نہیں ہوتے وہ بھی۔''

''پھر بھی تم بہادر بنوگی؟ ان حالات اور لوگوں کا مقابلہ اسی طرح کرو جس طرح وہ تمہارے ساتھ کرتے ہیں۔''

مما نے اس روز مجھ سے کہا تھا کہ میں کسی کے ساتھ گھر پر ڈراپ ہو جاؤں کیونکہ کوئی گاڑی یا ڈرائیور اس روز فارغ نہیں تھا۔ جانتی تھی کہ وہ ایسا کیوں کر رہی تھیں...... مجھے جتلانے کے لیے کہ میرا وجود اس گھر میں اتنی سی بھی اہمیت نہیں رکھتا۔ تبھی اس روز اسکول سے چھٹی کے فوراً بعد سارہ اصرار کر کے مجھے زبردستی اپنے گھر لے گئی تھی۔

سارہ کا گھر کیا تھا، چھوٹے، چھوٹے دو کمروں کا اپارٹمنٹ، ایک چودہ مربع فٹ کا سونے کا کمرا اور لاؤنج بہ مشکل بارہ فٹ لمبائی اور اتنی ہی چوڑائی کا تھا اور چھوٹی سی بالکنی کو شامل کر کے اس کے اسی کونے میں باورچی خانہ بنایا گیا تھا اور ایک غسل خانہ، جس کا ایک دروازہ لاؤنج میں تھا اور ایک اس کے سونے کے کمرے میں۔ تھوڑا عرصہ قبل ہی اپنے بھائیوں اور بھابیوں کے رویّے کی وجہ سے اس نے اپنی ماں کا گھر چھوڑ دیا تھا، کچھ رقم اس کے پاس جمع تھی، ایڈوانس تنخواہ لے کر اور کچھ کمیٹیاں ڈال کر اس نے اس فلیٹ کا ایک سال کا کرایہ ایڈوانس میں دیا تھا۔

''اپنے مرے ہوئے باپ کی بات کی لاج رکھی ہوئی ہے سارہ...... ان کی عزت کی خاطر خاموش ہوں، بھائیوں کی اپنی زندگیاں ہیں، امو جان خود ٹوٹ گئی ہیں ابو جان کی وفات سے...... اس گھر کو چھوڑ کر کہاں جاؤں، کس کا آسرا ہے مجھے؟'' میں نے بے بسی سے کہا۔

''کیا تمہاری امو جان اتنی بے حس ہیں کہ یہ سب کچھ جان کر بھی چاہیں گی کہ تم اسی جہنم میں رہو؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیا تم نے کبھی انہیں بتا کر دیکھا ہے یا خود ہی اندازہ کر لیا ان کے بارے میں؟''

''ایسا نہیں ہے سارہ...... یہ سب جان کر وہ مجھے کبھی اس گھر میں نہیں رہنے دیں گی۔ بھائی بھی میرا بوجھ بچے سمیت اٹھانے کو تیار ہوں گے مگر میں خود ہی ایسا نہیں چاہوں گی کہ ان سب کو کسی آزمائش میں ڈالوں، میکا باپ کے بغیر تو یوں بھی مختلف ہو جاتا ہے۔'' میں نے دکھ سے کہا۔ ''مگر اب اس گھر میں بھی دم گھٹتا ہے...... خصوصاً اس واقعے کے بعد......''

''تم نے کبھی اپنے چاچو کو بتایا کہ ان کے گھر والوں کا رویّہ تمہارے ساتھ کیا ہے، بس اپنے گھر میں ڈال کر وہ تمہاری طرف سے بالکل غافل ہو گئے ہیں۔'' سارہ کا سوال تھا۔ ''ممکن ہے کہ انہیں علم ہو تو وہ اور طرح سے اس معاملے کے بارے میں سوچیں۔''

''مجھے ان سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں مل رہا سارہ......اس روز چاچو جس وقت گھر آئے تو تب سے مما ان کے ساتھ سائے کی طرح لگی ہوئی تھیں، یہاں تک کہ رات کھانے کی میز پر چاچو نے زائنہ کو دیکھ کر پوچھا کہ وہ کیوں اور کیسے آئی تھی اور ارسل اس کے ساتھ کیوں نہیں تھا تو بھی مما نے فوراً ان کا دھیان ہٹا دیا تھا۔'' میں نے اسے بتایا۔

''تم اپنے چاچو کو فون پر پیغام بھیجو کہ تم اکیلے میں ان سے کوئی بات کرنا چاہتی ہو......'' اس نے مجھے راہ سجھائی۔

''ہوں......'' میں نے گہری سانس لی۔

''تم نے بتایا ہے کہ ارسل نے زائنہ کو طلاق دینے کا صرف ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا بلکہ واضح طور پر طلاق کے الفاظ کہے تھے؟'' سارہ نے ذہن پر زور دے کر سوال کیا۔

''ہاں......میں نے بتایا تھا کہ جب مما نے اس سے کہا کہ اتنی سی بات سے وہ اپنی بیوی کو طلاق دینے کی دھمکی دے رہا ہے تو اس نے صاف کہا کہ وہ اسے دھمکی نہیں دے رہا بلکہ وہ بقائمی ہوش وحواس اسے طلاق دیتا ہے۔''

''اور اتنی بڑی بات انہوں نے اپنے شوہر سے چھپالی ہے کہ ان کی بیٹی کو اس کا شوہر طلاق دے کر چلا گیا ہے۔''

''ہاں......مگر ابھی اس نے صرف ایک طلاق دی تھی اسے سارہ......'' میں نے واضح کیا۔ ''کہ میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اسے روک لیا تھا تاکہ ان کے مابین واپسی کا راستہ کھلا رہے۔ تھوڑا وقت گزرے گا تو معاملہ ٹھیک ہو جائے گا، انہیں میری سچائی کا یقین آ جائے تو بگڑی ہوئی بات بھی سنور جائے گی۔''

''کس کو......کس کو تمہاری بات کا یقین آ جائے گا پیاری؟'' اس نے استہزائیہ لہجے میں سوال کیا۔

''مما کو......زائنہ کو......''

''تم اپنی مما اور زائنہ کی شاطر چال کو نہیں سمجھ رہی ہو امرت......انہیں اپنے دل میں یقین ہوگا کہ ان کا شک بے بنیاد ہے مگر تب بھی وہ اپنے اس الزام کو جھوٹا نہیں کہیں گی۔'' سارہ نے مجھے تنبیہ کی۔ ''تم دیکھنا وہ کس طرح تمہیں بے بس کر کے ماریں گی، تمہارے پاس کوئی جائے فرار نہ رہے گی، وہ اپنی چال سوچ رہی ہیں، تمہاری سچائی کو وہ خود تو ماننا درکنار، اس طریقے سے سب کے سامنے پیش کریں گی کہ سب کو اس بات پر یقین آئے گا جو وہ کہیں گی۔''

''مگر وہ اس حد تک کیوں جائیں گی پیاری؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''کیونکہ میں ایک ایسی ہی ساس کو بھگت چکی ہوں امرت...... مجھ پر بھی میری ساس کو بے بنیاد شکوک رہتے تھے اپنے باقی بیٹوں کے بارے میں، وہ میرے قدم اپنے گھر میں جمنے ہی نہیں دینا چاہتی تھیں اسی لیے تو اپنے بیٹے کو میری کردار کشی کر کے میرے خلاف ورغلاتی رہتی تھیں اور وہ مجھ پر ہاتھ اٹھاتا تھا......عورت جب اپنے جیسی عورت کی دشمن بنتی ہے تو اس کی زبان سے زیادہ خطرناک زہر دنیا کے کسی موذی سانپ کے اندر بھی نہیں ہوتا۔''

''جو بھی ہو......میں ان کی بہو ہوں، ان کے شوہر کی سگی بھتیجی ہوں......ان کی بیٹیوں جیسی ہوں، وقتی طور پر انہیں غصہ تھا اور کچھ زائنہ نے بات کو اس طرح فوراً موڑ توڑ کر پیش کیا کہ وہ اسی کی زبان بولنے لگیں۔'' میں نے کہا۔ ''مگر تم دیکھنا سارہ، جب وہ ٹھنڈے دماغ سے سوچیں گی تو انہیں میری بات کا یقین آ جائے گا، وہ کوئی میری دشمن تو نہیں ہیں ناں، میری ماں جیسی ہیں۔'' مجھے اپنے لہجے میں بھی بودے پن کا احساس تھا، میں جو کچھ کہہ رہی تھی وہ میری خواہش تو ہو سکتا تھا مگر حقیقت میں ایسا ہونا شاید ممکن نہ تھا۔

''ماں جیسی ساس......ہونہہ!'' اس نے طنز سے کہا۔ ''صرف خواب دیکھا جا سکتا ہے ایسی صورتِ حال کا۔''

''اللہ کا یہ بھی شکر ہے کہ خواب دیکھنے پر کوئی پابندی نہیں لگا سکتا۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''جس طرح کے حالات میں انسان رہتا ہو، اسے خواب بھی تو ویسے ہی آتے ہیں۔'' وہ بھی ہنسی۔

''ویسے مجھے خواب کبھی اپنے حالات کے مطابق نہیں آتے۔'' میں نے کچھ سوچ کر کہا تھا۔

''چلو...... چائے ختم کرو اور پھر ڈرائیور کو کال کرو اور گھر جاؤ...... اللہ تمہارے لیے بہتر کرے۔'' اس نے مجھے تسلی دی۔ ''ورنہ میں تمہیں گھر چھوڑ دیتی ہوں۔''

''تم بتاؤ سارہ مجھے ایسے میں کیا کرنا چاہیے......؟'' میں نے کھوئے، کھوئے لہجے میں سوال کیا۔

''اگر ایمانداری سے جواب دوں امرت تو...... تم بہت صبر، برداشت اور حوصلے والی ہو۔ یقین کرو کہ اس نوعیت کے واقعے کے بعد...... میں تمہاری جگہ ہوتی تو ایک لمحہ اس گھر میں نہ رہتی...... کم از کم اتنا تو ضرور کرتی کہ فوراً چاچو کے سامنے ان کے الزامات کا پول کھولتی۔'' اس نے سختی سے کہا۔

''تمہیں کیا لگتا ہے سارہ...... چاچو اپنی بیوی اور بیٹی کے مقابلے میں میری بات پر یقین کریں گے؟'' میں نے امید طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''نہیں......'' ایک لمحہ سوچے بغیر اس نے جواب دیا تھا۔ ''مگر ہم کوئی بھی کوشش اس لیے کرنا نہیں چھوڑ دیتے کہ ہمیں اس کے مثبت نتیجے کی یقین دہانی نہیں کروائی جاتی۔''

''چلو میں کوشش کرتی ہوں۔''

☆☆☆

واپسی کے سفر میں مجھے اپنا چند دن پہلے کا دیکھا ہوا خواب یاد آ رہا تھا جو میرے ذہن کے کسی نہاں خانے میں محفوظ ہو گیا تھا، خوب مجھے یوں بھی کم یاد رہتے تھے، شاید میں بہت خواب دیکھتی ہی نہ تھی۔ تمنا کی عادت تھی کہ ہر روز صبح مجھے وہ اپنے گزری رات کے خواب سناتی تھی، چاہے مجھے دلچسپی ہوتی یا نہیں، میں توجہ سے سنتی یا نہیں مگر اسے تسلی ہو جاتی کہ اس نے اپنا خواب مجھے سنا دیا۔ مجھے عادت نہ تھی کہ اگر کوئی خواب دیکھتی بھی تو کسی سے شیئر کرتی۔ میں کسی ایسی عجیب سی جگہ پر تھی جہاں چھوٹے، چھوٹے ٹیلے اور کھائیاں بھی تھیں، ٹیلے گرم چٹانوں جیسی سختی لیے ہوئے تھے اور کھائیوں میں پانی کھڑا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا، ان پتھریلے ٹیلوں پر کہیں، کہیں سبزہ اگا تھا، بیٹھ کر دیکھا تو ان گڑھے نما کھائیوں میں پانی میں کوئی چیز حرکت کر رہی تھی۔ غور سے دیکھنے پر علم ہوا کہ وہ چھوٹے، چھوٹے سے سانپ تھے...... بے شمار۔ میں ان ٹیلوں پر چل رہی تھی، چلتے ہوئے یوں ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے کہ میں کسی عام سڑک پر چل رہی ہوں، کھائیاں اور ٹیلے مجھے مشکل نہیں لگ رہے تھے۔ مجھے ان سانپوں سے خوف بھی نہیں آ رہا تھا اور نہ ہی ان میں سے کوئی میری طرف لپک رہا تھا۔ میں کسی کا ہاتھ تھامے چل رہی تھی، اس لیے دل میں تسلی تھی کہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

''یہ جگہ اتنی خطرناک ہے تو ہم یہاں ہنی مون منانے کیوں آئے ہیں زین؟'' میں نے سوال کیا، کوئی جواب نہیں ملا۔ ''تم سن رہے ہو ناں زین؟'' میں نے پھر سوال کیا مگر تب بھی خاموشی رہی۔ ''جواب کیوں نہیں دے رہے ہو تم زین؟'' میں نے پلٹ کر دیکھا۔

''تم زین نہیں ہو......'' میں نے اپنا ہاتھ کھینچا۔ ''تو پھر میں تمہارے ساتھ کیوں ہوں؟'' اس نے میرا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ ''میرا ہاتھ چھوڑو۔'' میں نے ہاتھ کو اور زور سے کھینچا اور احتجاج بھی کیا۔ ''تمہاری جرأت کیسے ہوئی میرا ہاتھ پکڑنے کی؟'' میں نے چیخ کر کہا تھا کیونکہ مجھے اپنے پیروں کے اوپر سرسراہٹ محسوس ہو رہی تھی، گویا وہ چھوٹے، چھوٹے سانپ میرے پیروں پر چل رہے تھے۔ میں خوف سے ٹھنڈی ہو گئی اور چیخنے کی کوشش کی مگر میرے حلق کو جیسے بند کر دیا گیا تھا۔

آنکھ کھلی تو میں پسینے، پسینے ہو رہی تھی۔ ''کامل کیوں میرے ساتھ تھا؟'' کانپتے وجود کے ساتھ میں نے خود سے سوال کیا۔ کمرے میں اے سی کی خنکی کے باوجود میری ہتھیلیوں پر بھی پسینہ تھا۔ بیڈ پر میں تنہا تھی کیونکہ زین اپنے دوستوں کے ساتھ پہاڑی علاقے میں ویک اینڈ گزارنے گیا ہوا تھا۔ چاچو نے اسے ڈانٹا بھی کہ اسے کوئی ایسا

پروگرام نہیں بنانا چاہیے جس میں اس کی بیوی ساتھ نہ جاسکتی ہو۔
''تو چلے ناں وہ میرے ساتھ۔'' اس نے دوبدو کہا تھا۔ ''میں نے منع کیا ہے کیا اسے؟'' اس کے جانے کے پلان کا علم مجھے اس کی اور چاچو کی اس تلخ کلامی کے باعث ہی ہوا تھا۔
''اس کی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ اس کے ساتھ جائے۔'' مما نے اپنے بیٹے کی صفائی پیش کی تھی۔ ''بعد میں کسی وقت اس کے ساتھ بھی پروگرام بنا لے گا وہ۔''
''تو ایسی صورتِ حال میں اس کا گھر پر ہونا زیادہ ضروری ہے یا دوستوں کے ساتھ؟'' چاچو نے برہمی سے سوال کیا۔
''گھر پر ہی ہوتا ہے وہ...... اب بیوی سے بندھ کر دوستوں کو چھوڑ دے کیا؟'' مما نے بھی تیور دکھائے۔ بات بڑھ رہی تھی اور میں خود کو بے وجہ اس سارے قصے میں مجرم سمجھ رہی تھی۔ جہاں چاچو میری حمایت میں ایک لفظ بولتے، وہیں مما کو شاید حسد محسوس ہوتا تھا۔
''چاچو میں نے خود ہی انکار کر دیا ہے جانے سے...... زین نے تو کہا تھا مجھ سے کہ میں ساتھ چلوں۔'' میں نے جھوٹ بولا کہ مما اور چاچو کے درمیان جنگ نہ چھڑ جائے۔ چاچو نے مشکوک، زین نے مشکور اور مما نے فاتحانہ نظروں سے مجھے دیکھا تھا۔
'تو کیا زین کسی مشکل میں تھا؟' میں نے سوچا تھا۔ مجھے تو یہ بھی علم نہ تھا کہ وہ کن دوستوں کے ساتھ تھا اور کس پہاڑی علاقے میں گیا تھا، میں بے چین ہو گئی۔ یا زین کسی اور لڑکی کے ساتھ تھا؟ عجیب سی سوچ میرے دماغ میں آئی تھی۔ مجھے ہمیشہ سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ خواب میں سانپ دیکھنا اچھا نہیں ہوتا۔ خواب میں، میں نے کیوں اپنا ہاتھ کالی کے ہاتھ میں دیکھا تھا؟ کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا...... کیا میں اب بھی لاشعور میں کالی کو سوچتی ہوں؟ اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ میں بد دیانتی کی مرتکب ہو رہی ہوں...... یہ چھوٹے، چھوٹے سانپ اس بات کی علامت ہو سکتے ہیں کہ میرے گناہوں میں اضافہ ہو رہا تھا؟ میں اپنے ہر خواب کے بارے میں خود ہی سوچتی اور اس کی ممکنہ تعبیر بھی خود ہی ڈھونڈ لیتی تھی۔

☆☆☆

''چاچو...... مجھے آپ سے کوئی ضروری بات کرنی ہے۔'' میں نے چاچو کے موبائل پر پیغام بھیجا۔
کافی دیر تک میں بار، بار چیک کرتی رہی کہ اس پیغام کا جواب آئے مگر مایوسی ہوئی۔ پھر میں نے ہمت کر کے کال کی، چاچو سے براہِ راست یہ سب کہنے کے لیے بڑی ہمت چاہیے ہوتی، اسی لیے میں نے پیغام بھیجا تھا۔ کال کے جواب میں اطلاع آئی کہ چاچو سے اس وقت بات نہیں ہو سکتی تھی۔ شاید چاچو کسی میٹنگ میں ہوں گے اور فون بند کر رکھا ہو گا، میں نے سوچ کر مزید انتظار چھوڑ دیا۔ مما کی یوں خاموشی نے مجھے خوف زدہ کر دیا تھا اور میں چاہ رہی تھی کہ چاچو کو اس معاملے کے بارے میں ان کے اپنے انداز میں بتانے سے پہلے میں خود بتاؤں۔ سارہ نے مجھے ڈرا دیا تھا کہ اس بہت بڑے معاملے میں میری خاموشی میرے خلاف جا سکتی ہے۔
میں تیار ہو کر کمرے سے نکلی اور نیچے کی طرف چل دی، گھر میں خاموشی تھی، آہستگی سے سیڑھیاں اترتی ہوئی میں لاؤنج میں پہنچی، وہاں نیم اندھیرے میں چاچو بیٹھے تھے، میں تو سمجھی کہ وہ گھر پر نہ تھے۔
''کیسی ہے میری بیٹی؟'' انہوں نے بشاشت سے پوچھا۔
''میں ٹھیک ہوں چاچو......'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''آپ اس وقت گھر پر کیسے چاچو، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟''
''یہی تو موج ہے اپنے کام کی بیٹا۔'' انہوں نے ہنس کر کہا۔ ''دل چاہے تو کام پر جاؤ اور دل نہ چاہے تو گھر

بیٹھے فون پر کام چلالو۔'' انہوں نے وضاحت کی۔ ''طبیعت بالکل ٹھیک ہے میری۔''

''میں تو آپ کو فون پر پیغام بھیج رہی تھی' یہ سوچ کر کہ آپ گھر پر نہیں ہیں۔'' میں نے کہا۔ شاید اسی لیے انہوں نے میرا پیغام دیکھا تھا اور نہ جواب دیا تھا...... جو مجھے علم ہوتا کہ وہ گھر پر ہی ہیں تو میں پیغام بھیجتی ہی نہیں۔

''میں نے فون کمرے میں چارجنگ پر لگایا تھا...... ابھی منگوا کر دیکھتا ہوں، زیبا۔'' انہوں نے بیٹھے، بیٹھے مما کو آواز دی، میں گھبرا گئی، اس طرح تو مما میرا پیغام دیکھ لیں گی۔

''میں آپ کا فون لے آتی ہوں چاچو!'' میں فوراً اٹھی۔

''بیٹھی رہو بیٹا...... لے آتی ہے زیبا۔'' چاچو کے روکتے، روکتے بھی میں اٹھ گئی مگر اُن کے کمرے کا دروازہ اندر سے لاکڈ تھا۔

''دروازہ تو بند ہے چاچو!'' میں نے بے بسی سے کہا۔

''زیبا شاور لے رہی ہوگی، اسے عادت ہے باتھ روم کے ساتھ بیڈ روم کو بھی لاک کر لیتی ہے......'' میں مرئے مرے قدموں سے واپس جا کر بیٹھ گئی۔ ''تم ٹھیک رہتی ہوناں بیٹا...... سب ٹھیک ہیں ناں تمہارے ساتھ... کچھ سست سی لگ رہی ہو؟''

''جی چاچو۔'' میں ذہن میں الفاظ ترتیب دینے لگی کہ کس طرح چاچو سے جلدی جلدی اور مختصراً بات کروں اور اس سے تفصیل سے بات کرنے کا وقت مانگوں۔

''گرمیوں کی چھٹیوں میں گاؤں جانا چاہو تو چلی جانا۔'' انہوں نے پیش کش کی۔ ''ڈرائیور چھوڑ آئے گا تمہیں، کچھ دن رہ آؤ، بھابی بھی خوش ہو جائیں گی۔''

''میں ٹھیک ہوں چاچو، گاؤں میں گرمی زیادہ ہوگی اور لوڈ شیڈنگ بھی۔''

''مگر وہاں جنریٹر بھی تو ہے!'' انہوں نے کہا۔ ''میں تو سمجھا کہ میری پیش کش سے تم خوش ہو جاؤ گی۔''

''نہیں وہ بس یونہی......'' میں نے ہولے سے کہا۔ ''چھٹیوں کے ساتھ ہی تو میری جاب بھی ختم ہو رہی ہے چاچو...... پھر میں فارغ ہی ہوں گی، جب جانا چاہوں گی، چلی جایا کروں گی۔''

''کوئی پریشانی ہے بیٹی؟ تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو، فون کیوں کر رہی تھیں مجھے، کیا پیغام بھیجا تھا تم نے مجھے؟'' ان کے سوال پر میرے حلق میں آنسو ضبط کرنے کے باعث پھندا سا لگا۔

''نہیں چاچو۔'' میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی مجھے کمرے سے مما نکلتی ہوئی نظر آئیں۔

''یہ لیں جمال...... آپ کا فون!'' مما شاور لے کر کافی دیر کے بعد کمرے سے نکلی تھیں، انہوں نے میک اپ بھی کر رکھا تھا اور بال بھی خوب وقت لگا کر بنائے تھے۔ میں ان کے چہرے سے جانچنے کی کوشش کر رہی تھی کہ انہوں نے چاچو کا فون دیکھا ہوگا کہ نہیں۔

''بھئی میں امرت سے کہہ رہا ہوں کہ اسکول کی چھٹیوں میں چند دنوں کے لیے گاؤں سے ہو آئے۔'' چاچو نے کہا۔

''میری طرف سے تو اس پر کوئی پابندی نہیں ہے...... چاہے تو ہمیشہ کے لیے گاؤں چلی جائے۔'' مما نے چتون چڑھائے۔

''اس کے ساتھ اس طرح کیوں بات کر رہی ہو زیبا...... یہ کوئی انداز ہے اسے اجازت دینے کا؟'' چاچو نے خفگی سے کہا۔

''کسی نے مجھ سے اجازت مانگی تھی؟ میں سمجھی کہ آپ مجھے اطلاع دے رہے ہیں۔'' ہمیشہ کی طرح طنز میں

بجھا ہوا لہجہ۔

''میں بتا تو رہا ہوں کہ میں نے خود ابھی اسے تجویز دی ہے...... جب وہ اس پر غور کرے گی یا جانے کا پروگرام بنائے گی تو ظاہر ہے کہ جانے سے قبل تم سے اور اپنے شوہر سے اجازت تو لے گی ناں۔'' چاچو نے اپنے لہجے کو دبایا۔ ''ابھی تو اس کی چھٹیاں ہونے میں کچھ دن باقی ہیں۔''

''ہاں جیسے وہ اس سے پہلے ہر جگہ مجھ سے اجازت لے کر ہی تو جاتی ہے۔''

''کہاں گئی ہے وہ آج تک تمہاری اجازت کے بغیر؟'' چاچو نے حیرت سے پوچھا۔

''بس رہنے دیں......'' وہ فوراً بولیں۔ ''میرا منہ نہ کھلوائیں تو بہتر ہے۔''

''مجھے علم ہو تو بہتر ہے زیبا، میں جانتا ہوں کہ امرت ایسی منہ زور نہیں ہے کہ تمہارے سامنے دم مار سکے۔'' چاچو کہاں مقابلے میں ان سے کم رہ جانے والے تھے۔

''میں ٹھیک ہوں چاچو...... میرا جانے کا جی ہوگا تو میں مما سے پوچھ کر چلی جاؤں گی۔'' میں نے دل پر پتھر رکھ کر کہا، حالانکہ دل تو چاہ رہا تھا کہ ایک لمحہ وہاں نہ رکوں۔

''اپنے آپ تو مما کو اس بات کا کبھی خیال نہیں آنے والا۔'' چاچو کہہ کر پیر پٹختے ہوئے اٹھ کر چلے گئے، میں وہاں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی، اٹھ کر جانا بھی چاہ رہی تھی مگر میرے یوں فوراً اٹھ جانے سے جانے وہ کیا سوچیں۔

''تمہیں یاد ہے کہ میں نے تمہاری شادی کے بعد پہلے دن تم سے کیا کہا تھا؟'' مما نے میری طرف خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ میں مستفسرانہ نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ ''کہا تھا ناں کہ تمہیں کوئی مسئلہ ہو تو مجھ سے بات کرنا، اپنے چاچو سے براہِ راست بات کرنے کا مطلب ہے کہ تم اپنی حد کو توڑ رہی ہو۔'' انہوں نے دانت پیس کر کہا۔ ''اور مجھے بھی تو علم ہو کہ تمہیں اپنے چاچو سے کیا بات کرنی ہے؟''

''جی!'' میں نے بہ مشکل تھوک نگل کر کہا۔ تو گویا انہوں نے میرا پیغام دیکھ لیا ہوگا اور یقیناً delete بھی کر دیا ہوگا۔

''آج میں تمہیں آخری بار سمجھا رہی ہوں کہ مجھے یوں تمہارا تنہائی میں جمال کے ساتھ جڑ، جڑ کر بیٹھنا بھی پسند نہیں ہے، تم ایک بدکردار اور اخلاق سے گری ہوئی لڑکی ہو، تم سے کچھ بھی بعید نہیں کہ تم......''

''مما......'' میں نے سسکی لے کر کہا۔ ''وہ چاچو ہیں میرے...... میرے باپ جیسے...... سسر کا رشتہ بھی محرم ہوتا ہے مگر وہ تو میرے سگے چچا ہیں۔'' مما کی ذہنیت ایسی تھی مجھے شدید افسوس ہوا۔

''اس دنیا میں بہت کچھ ہو رہا ہے بی بی...... بہت گندگی اور فساد مچا ہوا ہے زمین پر، کسی محرم اور نامحرم رشتے کی کوئی پہچان نہیں رہی، سگے باپ تک......'' انہوں نے بات خود ہی ادھوری چھوڑ دی۔

''آپ کیوں اس طرح کی باتیں کرتی ہیں مما؟'' میں نے ہچکی لی۔ ''میں آپ کو قسم دینے کو تیار ہوں کہ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا جو آپ نے مجھے میری ہی نظروں سے گرا دیا ہے۔'' سارہ نے بھی ان کے بارے میں بہت کم اندازہ لگایا تھا، وہ اس کی اور میری سوچ سے کہیں بڑھ کر گر سکتی تھیں۔

''اپنے یہ ڈھکوسلے بند کرو اور اس کے بعد اگر مجھے علم ہوا کہ تم جمال کے ساتھ مل کر کوئی پلان بنا رہی ہو...... یا تم نے جمال سے میرے یا اس گھر کے کسی بھی فرد کے بارے میں کوئی فضول بات کی، کوئی پیغام بھیجا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔'' ان کے لہجے میں صاف دھمکی تھی، وہ اپنا چولا پوری طرح اتار کر میرے سامنے آ گئی تھیں۔ ان کے ساتھ اس موضوع پر بلکہ کسی بھی موضوع پر بات کرنا بالکل فضول تھا۔

☆☆☆

میں نے کمرے میں آ کر غصے سے اپنا سامان پیک کرنا شروع کیا، میرا دماغ ماؤف ہو رہا تھا، غضب خدا کا، وہ اپنے معیار سے کتنی گری ہوئی باتیں کرتی ہیں، ان کی سوچ کتنی گھٹیا ہے...... میں سوچ، سوچ کر پاگل ہو رہی تھی۔ سامان سمیٹ چکی تو پھر میں نے ٹھنڈے دل سے بیٹھ کر غور کرنا شروع کیا کہ گاؤں جا کر اموجان کو کیا بتانا ہے۔ اس وقت صورتِ حال یہ تھی کہ چند دنوں میں تمنا کی شادی کے ہنگامے شروع ہونے والے تھے، ایسے میں، میں جا کر اموجان کو کسی طرح کی پریشانی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ تمنا کی شادی پر جانے کا جواز تو اچھا بنتا تھا مگر انہیں بعد میں کس طرح صورتِ حال سے آگاہ کروں گی، وہ سوچ زیادہ اہم تھی۔

''چلو...... اس پر بعد میں سوچوں گی۔'' میں نے خود کو سوچوں سے آزاد کیا۔

''کہاں کی تیاری ہے؟'' کمرے میں پیک ہوا سامان سامنے پڑا تھا، اسے نظر کیوں نہ آتا۔ میں نے خود ہی کوشش نہ کی تھی کہ سامان اوجھل کر لیتی۔

''میں گاؤں جانے کا سوچ رہی ہوں۔'' میں نے اسے اطلاع دی۔ ''تمنا کی شادی کے لیے تیاری میں اموجان کی مدد کر دوں گی۔'' وہ سگریٹ سلگا رہا تھا۔

''اچھا کب جا رہی ہو...... کیوں اور کیسے؟'' اس نے لمبا سا کش لے کر دھواں آہستہ، آہستہ منہ سے خارج کرتے ہوئے پوچھا۔ ''بھئی مجھ سے توقع نہ کرنا کہ میں تمہیں چھوڑنے جاؤں گا۔''

''میں ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤں گی۔'' میں نے ضبط سے کہا۔

''کب جا رہی ہو؟'' اس نے اطمینان کی سانس لے کر اگلا سوال کیا۔

''جلد ہی۔'' میں نے سوچا کہ اگلا سوال کرے گا کہ واپس کب آؤ گی...... مگر وہ بے نیازی سے سگریٹ پھونک رہا تھا۔

''کافی مل سکتی ہے ایک کپ؟'' جانے اسے اتنی گرمی میں بھی کافی کی طلب کس طرح ہوتی تھی۔ میں خود پر جبر کرتی ہوئی اٹھی تھی۔

''شکریہ!'' کافی کا مگ پکڑتے ہوئے اس نے کہا۔ ''پریشان ہو تم کسی بات پر؟'' مجھے حیرت ہوئی کہ اسے نہ صرف میں بلکہ میرے چہرے پر پریشانی بھی نظر آ گئی تھی۔

''تمہیں کیسے نظر آ گیا زین کہ میں پریشان ہوں؟'' میں نے حیرت سے سوال کیا۔

''بیوی ہو تم میری آخر...... کس طرح نہ نظر آئے تمہاری پریشانی۔''

''ہوں......'' میں نے گہری سانس لی۔

''مما کی وجہ سے پریشان ہو، ارسل والی بات کو لے کر؟'' اس نے میرے سر پر دھماکا کیا تھا۔ تو گویا مما نے اسے بتا دیا تھا اور کیا بتایا تھا، اس کا مجھے علم نہ تھا، وہی ہو رہا تھا جس کا ڈر تھا، میری خاموشی اور اس بات کا مما کی زبانی سننا۔ میں حیرت سے اسے تک کر رہ گئی۔

''ریلیکس رہو ڈیر، مما ذرا پرانے خیال کی ہیں اور زائنہ بھی اوور ری ایکٹ کر رہی ہے......'' وہ اپنی اتنی ماڈرن مما کو بھی پرانے خیالات کا کہہ رہا تھا۔

''کیا مطلب......؟ تمہیں یقین ہے ناں مجھ پر زین کہ میں ویسی نہیں ہوں، جیسا کہ وہ کہہ رہی ہیں؟'' مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ مشکل مرحلہ اتنی آسانی سے حل ہو جائے گا۔

''اٹس اوکے ڈیر...... اگر ایسا ہے بھی تو مجھے اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کوئی آدمی، کسی بھی وقت اپنے جیون ساتھی کے علاوہ بھی تو کسی اور کو پسند کر سکتا ہے ناں...... کون سا ہم نکاح نامے میں کچھ ایسا عہد کرتے ہیں کہ اپنی

بیوی یا اپنے شوہر کے علاوہ کسی اور پر نظر بھی نہ ڈالیں گے...... مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے پیاری، کوئی اعتراض نہیں، اگر تمہیں ارسل اچھا لگا اور تم نے اس کے ساتھ دوستی کرلی، گپ شپ لگالی یا کچھ اچھا وقت گزار لیا۔'' میں ہونقوں کی طرح اس کا منہ دیکھ رہی تھی، نہ وہ پاگل تھا، نہ نشے میں اور نہ ہی وہ مذاق کر رہا تھا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو تم زین؟'' میں چیخی۔

''سمجھانا چاہ رہا ہوں تمہیں کہ جیون ساتھی ہونے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ آپ نے ایک دوسرے کو خرید لیا ہے، ہر کوئی اپنی سوچ اور عمل کے لیے آزاد ہوتا ہے...... یہی وہ باتیں ہیں جو میں تمہیں ہمیشہ اپنے بارے میں سمجھانا چاہتا تھا مگر تم مجھے میری فرینڈز کے ساتھ دیکھ کر ہمیشہ شدید ردِعمل کا اظہار کرتی تھیں۔''

''میری ارسل بھائی یا کسی اور مرد کے ساتھ کوئی دوستی ہے نہ کوئی اور تعلق...... نہ ہی میں اس دن زائنہ کے کمرے میں جان بوجھ کر گئی تھی زین۔'' میں نے غصے کو دبانے کی کوشش کی۔ ''مجھے یہ بھی علم نہیں تھا کہ اس روز زائنہ ہمارے ہاں آئی تھی اور یہ کہ وہ گھر پر نہ تھی اور اس کمرے میں ارسل بھائی سو رہے تھے...... میں تو اپنے کمرے کا اے سی خراب ہونے کی وجہ سے کہیں کمر سیدھی کرنے کی جگہ ڈھونڈ رہی تھی۔''

'اچھا...... کمرے کا اے سی کب خراب ہوا، مجھے بتایا نہیں تم نے؟'' اس نے جان بوجھ کر اصل بات کو نظر انداز کیا تھا۔

''میں تم سے کوئی اور اہم بات کر رہی ہوں زین...... اور تم بات کو بدل رہے ہو۔''

''کہا ناں کہ اگر ایسا ہوا ہے جیسا کہ مما نے مجھے بتایا ہے تو بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے پیاری......'' اس نے سگریٹ کا دھواں اڑایا۔ ''تم ہرگز ٹینشن نہ لو، مما کی جنریشن کے لوگوں کا المیہ یہی ہے کہ وہ آج کل کی نسل کے طور طریقوں کو سمجھتے نہیں اور ہر وقت ان پر تنقید کرنے کو تیار رہتے ہیں۔'' میں ہونقوں کی طرح اس کا منہ دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

''تم اپنے گھر واپس نہیں گئیں زائنہ...... کہیں ارسل سے کوئی کھٹ پٹ تو نہیں ہوگئی؟'' چاچو نے کھانے کی میز پر سوال کیا، میرا وجود ٹھنڈا ٹھار ہوگیا، زائنہ نے کرسی پر ہی پہلو بدلا، مما کے ماتھے پر بلوں میں اضافہ ہوگیا، انہوں نے ابرو اچکا کر چاچو کی طرف اِک نگاہِ غلط ڈالی۔

''کیوں، آپ کو کیا اعتراض ہے...... پرسوں ہی تو آئی ہے۔'' مما نے غصے سے کہا۔ ''کیا اس پر اس گھر میں آنے اور رہنے پر کوئی پابندی ہے؟''

''ارے نہیں، کوئی پابندی نہیں ہے...... ایسا کیوں ہوگا، میں تو یونہی ایک سوال کر بیٹھا، پوچھا اس سے ہے اور چڑھائی تم کر رہی ہو۔'' چاچو کو بھی کوئی ادھار نہیں رکھنا آتا تھا۔

''ویسے بھی اب میں اس کو واپس نہیں بھیجوں گی۔'' انہوں نے اگلا اعلان کیا۔

''تو کیا یہ ڈلیوری تک یہیں رہے گی، ابھی سے......'' چاچو نے پھر پوچھا۔ ''ارسل کیا کرے گا؟''

''کس چیز کے لیے کیا کرے گا ارسل؟'' مما نے دوبدو کہا۔ ''جہاں دل چاہے منہ مارتا پھرے وہ، اس سے پہلے جو کچھ کرتا تھا وہی کرے وہ۔''

''لگتا ہے کہ میرا اندازہ درست ہی ہے، کوئی گڑبڑ ضرور ہوئی ہے۔ تمہاری بیٹی کسی بات پر اس سے ناراض ہو کر بیٹھ گئی ہے اور تم بجائے اس کے کہ اسے سمجھاؤ...... تمہارا بھی سارا عتاب اسی بیچارے پر نازل ہو رہا ہے۔''

''صرف میری بیٹی ہے ناں تو پھر آپ خاموش رہیں اس معاملے میں، مجھے خود ہینڈل کرنے دیں۔'' مما نے چتون چڑھائے۔ ''ایک آپ بیچارے اور پھر آپ کا داماد بیچارہ۔ کیونکہ آپ کے عزیز دوست کا چہیتا بیٹا پہلے تھا اور

زائنہ کا شوہر بعد میں بنا۔''

''اس سے مجھے پیار تھا، وہ ایک اچھا اور سلجھا ہوا انسان ہے، اسی لیے میں نے اسے اپنی بیٹی کے لیے چنا اور وہ میری پہلے سے بھی زیادہ عزت کرتا ہے۔'' چاچو نے کسی مصلحت کے تحت مفاہمانہ لہجہ اختیار کیا۔

''اور جو کبھی آپ نے اپنے چہیتوں کے کرتوت سن لیے تو کانوں کو ہاتھ لگائیں گے......'' چہیتوں کہنے سے ان کا اشارہ واضح طور پر میری طرف ہی تھا، میں دل ہی دل میں شرمسار سی ہوگئی۔ سوچ رہی تھی کہ اب سب گھر والوں کی موجودگی میں میری جی بھر کر بے عزتی کریں گی وہ۔

''چاچو...... مجھے گاؤں جانا ہے، کیا میں ابھی جا سکتی ہوں؟'' میں نے گھبرا کر کہا۔

''ابھی، اس وقت بیٹا...... یہ تو بہت لیٹ ہے۔'' انہوں نے کہا۔ ''صبح فجر کے بعد نکل جانا مگر اس وقت سفر کرنا اور وہ بھی تنہا تو ٹھیک نہیں......''

''مجھے جانے بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے چاچو، پلیز۔''

''چلو...... میں تمہیں آئس کریم کھلا کر لاتا ہوں اگر تمہیں گھبراہٹ ہو رہی ہے تو۔'' زین نے مداخلت کر کے بات سنبھالی۔

''میں بھی ساتھ چلوں گی آئس کریم کھانے۔'' حسنہ مچلی تھی۔

''کیا خیال ہے امرت، لے چلیں اسے بھی؟'' زین نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''نہیں زین، تھینک یو، میں اس وقت آئس کریم کھانے نہیں جاؤں گی۔'' میں نے اس سے کہا۔

''چلو...... جاؤ تم لوگ!'' حسنہ نے کہا۔ ''میری وجہ سے اپنا پروگرام خراب نہ کرو۔''

''ایسی بات نہیں ہے حسنہ...... میں واقعی نہیں جانا چاہ رہی اس وقت، میرا جی اچھا نہیں ہے۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔

''جانتی ہوں سب کو میں۔'' کہہ کر وہ پیر پٹختی ہوئی اٹھ کر چلی گئی۔

''جاؤ زین...... اگر حسنہ نہیں جانا چاہتی تو بھی امرت کو لے جاؤ آئس کریم کھلانے۔'' چاچو نے زین سے کہا تو وہ نیپکن سے ہاتھ صاف کر کے اٹھ گیا، ایسا اس کی عمومی فطرت کے خلاف تھا، یوں پہلی دفعہ میں چاچو کی بات ماننے کی عادت تو نہ تھی اسے۔ میں نہیں جانا چاہ رہی تھی مگر چاچو کے اصرار کے سامنے میری نہ چلی۔

''بہتر ہے کہ گھر کا ماحول خراب نہ کرو......'' اس نے گاڑی کے گیٹ سے نکلتے ہی کہا۔ ''تم سے جو غلطی ہوئی ہے مما کی دانست میں ہے کیونکہ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں...... تم اعتراف کر لو اور مما اور زائنہ سے معافی مانگ لو۔''

''میں نے ایسا کچھ نہیں کیا زین اور میں اس بات پر اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے قرآن اٹھانے کو بھی تیار ہوں۔'' شدید احتجاجی لہجے میں، میں نے کہا۔

''تو کیا قرآن اٹھانے سے ان دونوں کو یقین آ جائے گا کہ جو کچھ انہوں نے دیکھا تھا وہ ان کی نظر کا دھوکا تھا؟'' اس نے حیرت سے سوال کیا۔

''انہوں نے کیا دیکھا تھا...... یہ جانتے ہو تم؟'' میں نے دانت بھینچ کر اپنے غصے پر قابو پایا۔

''ہاں...... بتایا تھا مما نے مجھے!'' اس نے کندھے اچکائے۔

''کیا اس کمرے کے دروازے کے باہر مجھے کھڑے ہوئے دیکھ کر انہوں نے یہ یقین کر لیا کہ میں بدکردار تھی اور ارسل کے ساتھ...... زین تم میں کوئی کمی ہے جو میں تمہیں چھوڑ کر کسی اور کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھوں؟''

''انہوں نے تمہیں اور ارسل کو ایک ہی بستر پر......'' اس نے الجھے ہوئے انداز میں کہا۔

''شٹ اپ...... جسٹ شٹ اپ!'' اس کی بات کاٹ کر میں چیخی۔ ''جھوٹ ہے یہ، بہتان ہے...... اتنا بڑا جھوٹ بول رہی ہیں تمہاری مما اور بہن...... یا اللہ!! میرا انصاف تو ہی کرنے والا ہے......'' میری آنکھیں سمندر بن گئیں۔

''بہتر یہ ہے کہ تم زبان سنبھال کر میری مما اور بہن کے بارے میں بات کرو......'' وہ دہاڑا۔ ''میں اگر اس معاملے میں لچک دکھا رہا ہوں اور تم سے نرمی سے بات کر رہا ہوں تو اس کا ناجائز فائدہ نہ اٹھاؤ۔ مجھے مجبور نہ کرو کہ میں ان کے کہنے میں آ کر تھپڑ مار، مار کر تمہارا چہرہ بگاڑ دوں۔''

''تم مجھ پر شک کر رہے ہو زین...... تمہاری مما نے تمہیں انتہائی غلط بتایا ہے......''

''ہاں وہ دو لوگ جھوٹ بول رہے ہیں اور تم اکیلی اپنی صفائی صرف اس طرح پیش کر سکتی ہو کہ مما اور زائنہ کو جھوٹا کہہ دو۔''

''اگر ایسا ہے زین تو ان سے بھی کہنا کہ وہ قرآن پر ہاتھ رکھ کر اس بات کو دُہرائیں اور میں بھی قرآن پر ہاتھ رکھ کر کہوں کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ سچ ہے۔''

''میں اس وقت تمہاری بکواس سننے کے موڈ میں قطعی نہیں ہوں۔''

''ہاں...... کیونکہ وہ دونوں چاہتی ہیں کہ وہ مجھے تمہارے ذریعے نیچا دکھائیں، تمہاری نظروں کے سامنے مجھے بدکردار کہہ دیں تاکہ تمہیں جواز مل جائے مجھے چھوڑنے کا...... مما نے پہلے دن سے ہی مجھے اس گھر کی بہو جیسی عزت نہیں دی۔''

''تمہیں وہی مل رہا ہے، جس کے قابل تم ہو۔'' وہ دہاڑا۔

''گاڑی واپس موڑو...... مجھے آئس کریم نہیں کھانی۔'' وہ گاڑی آئس کریم پارلر کے سامنے پارک کر رہا تھا۔

''مجھے گھر جا کر اسی وقت سچ اور جھوٹ کا فیصلہ کرنا ہے...... چاچو کے سامنے۔''

اس نے بغیر کچھ کہے گاڑی واپسی کے لیے موڑ لی۔ اسے علم تھا کہ اب وہ مجھے کسی صورت آئس کریم کھانے پر آمادہ نہیں کر سکتا تھا اور پارلر میں موجود باقی لوگوں کے سامنے کوئی بھی ناگوار صورتِ حال ہو سکتی تھی۔

''سوری امرت......'' گھر کے گیٹ کے سامنے پہنچ کر اس نے گاڑی روک کر کہا۔ ''مجھے مما سے بات سننے کے بعد تم سے تصدیق کر لینی چاہیے تھی۔'' میں نے بے یقین نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''میرے ہاتھوں کی طرف دیکھو۔'' اس نے دونوں ہاتھ معافی کے انداز میں باندھ رکھے تھے۔ ''مجھے معاف کر دو...... مجھے یقین ہے کہ جو کچھ تم کہہ رہی ہو وہ سچ ہے، پاپا کے سامنے کوئی بات نہ کرنا پلیز۔'' میں نے اپنے دوپٹے کے پلو سے رگڑ کر اپنی آنکھوں کو صاف کیا اور بغیر اس کی طرف دیکھے یا کچھ کہے گاڑی سے نکلی، اس کی بات ماننے کا میرا کوئی ارادہ نہ تھا۔

لاؤنج میں مما بیٹھی تھیں...... ''چاچو کہاں ہیں مما...... مجھے ان سے انتہائی ضروری بات کرنا ہے۔'' میں نے جانے کہاں سے اپنے اندر اتنی ہمت پیدا کر لی تھی کہ میں تن کر ان کے سامنے کھڑی تھی۔

''سو رہے ہیں جمال...... نیند کی گولیاں لے کر۔'' انہوں نے چتون چڑھا کر کہا۔ ''تمہیں ان سے جو کچھ کہنا ہے صبح کہہ لینا، ورنہ مجھے بتاؤ کہ تمہیں کیا مسئلہ ہے؟''

''مجھے اب اپنے مسئلے پر صرف چاچو سے بات کرنی ہے۔'' میں نے ضبط کی کئی منزلوں کو طے کیا تھا۔

''کل کا انتظار کرو پھر......'' کہہ کر وہ اٹھیں۔ ''اور ہاں یاد رکھنا کہ جس مسئلے پر تمہیں بات کرنی ہے وہ تمہارا اپنا ذاتی مسئلہ ہی ہو، ورنہ اگر اس میں اس گھر کے کسی اور فرد کو گھسیٹا تم نے تو اپنے انجام سے ڈرنا!'' کہہ کر وہ اپنے کمرے میں غائب ہو گئیں اور میں وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ کمرے میں جانے سے پہلے میں لاؤنج میں بیٹھ گئی، کیا کہنا ہے مجھے چاچو سے، میں خالی دماغ سے سوچ رہی تھی۔ زین باہر سے آیا اور بغیر رکے اپنے کمرے کی

سیڑھیاں چڑھ گیا۔

☆☆☆

کمرے میں آئی تو وہ کمرے میں نہیں تھا، غسل خانے میں تھا۔ غسل خانے سے شاور کی آواز آرہی تھے۔
اس کا لیپ ٹاپ بیڈ پر کھلا پڑا تھا، شاید کچھ ڈاؤن لوڈ کررہا تھا یا کوئی اور کام ادھورا چھوڑ کر غسل خانے میں چلا گیا تھا۔ میں اپنی سائڈ کے بیڈ کی طرف بیٹھ گئی۔ کسی بیپ کی آواز آئی تھی۔ جیسے فون پر پیغام کی ہوتی ہے۔ لیپ ٹاپ کی نیچے کی طرف ایک چھوٹی سی window کھلی تھی اور اس پر پیغام آیا تھا۔ ''اب تو تمہارے پاس وقت ہی نہیں میرے لیے پیارے......'' نہ چاہتے ہوئے بھی میری نظر پڑ گئی تھی۔ صنم نام کی کسی لڑکی کی طرف سے وہ پیغامات تھے۔
میں نے غسل خانے کی طرف دیکھا، ابھی تک شاور کا پانی کھلا تھا۔ انتہائی غیر اخلاقی حرکت کرتے ہوئے میں نے اسے scroll کیا اور پہلے کے چند پیغامات دیکھے۔ بیچ بیچ میں وڈیو چیٹ بھی تھی، اس کی کچھ تصاویر بھی تھیں، شاور لے کر نکلی تھی اور تولیا انگریزی فلموں کی ہیروئین کے اسٹائل میں لپیٹ رکھا تھا۔ 'صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں' کی تفسیر بنے ہوئے...... ''ہائے یہ ظالم تولیا۔'' زین نے اسے پیغام بھیجا تھا۔ میرے کان اس پیغام کو پڑھ کر گرم ہوگئے۔ میں گھبرا کر اٹھی اور کھڑکی کے سامنے رکھے ہوئے صوفے پر بیٹھ کر ٹیلی وژن آن کرلیا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، چوری وہ کررہا تھا اور پکڑے جانے کا خوف مجھ پر سوار تھا۔ میں نے گہری سانسیں لیں، اس کے باہر نکلنے سے پہلے مجھے اپنے چہرے کے تاثرات کو نارمل کرنا تھا۔
''اس جمعے کو ملنے کو آؤ گے؟'' میں مسلسل آتے ہوئے پیغامات کی بیپ کو سن کر رہ نہ سکی اور اس کے تازہ پیغام کو پڑھنے کے لیے اٹھی۔ دل چاہا کہ اس کو جواب دوں اور بتاؤں کہ میں اس کی بیوی تھی جس کے ساتھ وہ بے ہودہ پیغامات کا تبادلہ کررہی تھی۔
'شاید اسی لیے زین نے وہ اخلاق سے گری ہوئی بات کی تھی کہ میں ارسل کے ساتھ......' میں نے دل ہی دل میں سوچا، جانے مما نے اسے کس طرح اور کیا بتایا ہوگا اور وہ سمجھ رہا ہے کہ میں ایسی ویسی لڑکی ہوں، اس لیے کہ وہ خود ایسا ہے، اس کے نزدیک شادی شدہ لوگ کسی ایک سے تعلق رکھنے کے پابند نہیں ہوتے بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ ہر کسی کی زندگی میں چور دروازے ہوتے ہیں، کوئی کبھی نہ کبھی پکڑا جاتا ہے اور کوئی کبھی بھی نہیں۔
''سوری ڈیئر...... بہت دیر ہوگئی۔'' وہ میرے قریب بیٹھا ہوا مجھے سرگوشی میں کہہ رہا تھا۔ میں صوفے پر بیٹھے، بیٹھے اونگھ گئی تھی، قدرت نے میری مدد کی تھی کہ اتنی سی نیند سے میں شانت ہوگئی تھی ورنہ وہ جان جاتا کہ میں اس کا لیپ ٹاپ چیک کرچکی تھی۔ میں نیند میں ہی کچھ بڑبڑائی تھی، اس نے میری کمر کے گرد ہاتھ ڈالا اور مجھے صوفے سے اٹھا کر سہارا دے کر بیڈ تک لایا۔ میرے بالوں کو اپنے ہاتھ سے سہلایا، چہرے پر آنے والی لٹوں کو ہٹایا۔ ''ریلیکس رہا کرو میری جان!'' اس نے میرے اوپر چادر اوڑھائی۔ ''تمہارے لیے پُرسکون ہونا بہت ضروری ہے۔'' وہ مجھ پر سوتے میں پیار لٹا رہا تھا۔
میں نے مندی، مندی آنکھوں سے دیکھا۔ بیڈ سے اس نے اپنا لیپ ٹاپ اٹھالیا تھا، اب وہ اس صوفے پر بیٹھا، اپنی گفتگو کے ٹوٹے ہوئے سلسلے کو جوڑ رہا تھا غالباً...... وہ لیپ ٹاپ پر کچھ ٹائپ کرتا ہوا مسکرا رہا تھا۔ میں سو رہی تھی مگر میرے حواس جاگ رہے تھے، مجھے بتا رہے تھے کہ میری نسبت لیپ ٹاپ میں زیادہ دلچسپ مواد تھا اس کے پاس۔

☆☆☆

گاؤں جا کر جانے کیوں اجنبیت کا احساس ہورہا تھا، ایک تو اس گھر کو ابو جان کے بغیر دیکھنا اچھا ہی نہ لگتا تھا، اوپر سے جانے نکاح کے دو بول پڑھتے ہی بیٹیوں کو میکا پہلے جیسا کیوں نہیں دکھتا۔ وہی ماں باپ اور بہن بھائی ہوتے

ہیں، وہی گھر ہوتا ہے اور وہی آنگن، وہی چھت اور وہی دیواریں...... جن کی ایک ایک اینٹ جس کے ساتھ ہمارے بچپن کی ہزاروں یادیں وابستہ ہوتی ہیں۔ یہ ساری اینٹیں یک دم اپنا رنگ کیوں بدل لیتی ہیں؟ تمنا میرے پہنچنے کا سن کر بھاگتی ہوئی آئی تھی، اس کا چہرہ کھل اٹھا تھا یا ویسے ہی اپنے بیاہ کی تیاریوں کی وجہ سے کھلا ہوا تھا۔

''بہت پیاری لگ رہی ہو تم۔'' میں نے اسے بھینچ کر کہا۔

''تم کمزور لگ رہی ہو......'' اس نے بھی مجھے جواباً کہا۔

''تمہیں مس کرتی ہوں ناں اس لیے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''مجھے؟'' اس نے مجھے کندھوں سے تھام کر اپنے سامنے کیا۔ ''کیا واقعی مجھے، میرا مطلب ہے کہ صرف مجھے؟''

''بھئی سب کو...... اپنے گاؤں کو، گھر کو، اموجان کو، بھائیوں کو، فاطمہ کو، کمیل کو......''

''اور؟'' اس نے سوال کیا۔

''اور...... اور کون ہوگا؟'' میں نے ناسمجھی سے پوچھا۔

''اس لسٹ میں کامل کہیں نہیں ہے امرت؟'' اس کے الفاظ نے میرے دل کو مٹھی میں لے لیا۔

''کون کامل؟'' میں نے لہجے میں پتھروں کی سی سختی پیدا کی، اندر سے اٹھنے والی سسکی کا گلا گھونٹا۔

''ہونہہ...... میں جانتی ہوں کہ تم کسی کامل کو نہیں جانتیں۔'' اس نے طنز کیا۔

''ہاں میں جس کامل کو جانتی تھی وہ اتنا بزدل اور ہمت ہار دینے والا نہیں تھا تمنا...... اس لیے میں اس کے ساتھ خوش ہوں، جس کے ساتھ میرے ابوجان نے مجھے رخصت کیا تھا، اب تم بار، بار مجھے کسی احساسِ ندامت میں مبتلا کرنے کی کوشش نہ کرو۔''

''کاش...... ابوجان تمہارے ساتھ ایسا نہ کرتے...... یا اس میں اتنی جلدی نہ کرتے کم از کم۔'' اس نے وہی سوچا جو میں نے ابوجان کی وفات کے بعد سوچا تھا۔

''اس سے کیا فرق پڑتا تمنا...... جو کھلاڑی میدان چھوڑ کر بھاگ جائیں وہ تو مقابلے سے ہی خارج ہو جاتے ہیں۔''

''وہ میدان چھوڑ کر نہیں بھاگا تھا امرت...... وہ تو تمہارے ساتھ کورٹ میں جا کر شادی کرنے کو بھی تیار تھا۔''

''میں اپنے باپ کو ناراض کر کے کیسے خوش رہ سکتی تھی۔'' یہ اور بات ہے کہ جہاں ابوجان نے میرے لیے بہتر سوچا تھا وہ راہ بھی میرے لیے پھولوں کی نہیں بلکہ پتھروں کی تھی۔ وہ پتھر جو میرے پیروں میں ہی نہیں چبھتے تھے بلکہ میرے ماتھا پھوڑنے پر بھی نرم نہیں ہوتے تھے۔

''انسان کی اپنی خوشی سب سے اہم ہوتی ہے پیاری...... تم اور کامل کورٹ میرج کر لیتے...... ابوجان تھوڑا عرصہ ناراض رہتے اور پھر سب ٹھیک ہو جاتا۔''

''ابوجان کے پاس تو اتنی مہلت ہی نہ تھی تمنا کہ وہ کچھ عرصے کے بعد ٹھیک ہو جاتے......'' میں نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''مگر تمہاری اور کامل کی راہ تو ایک ہوتی ناں...... منزل ایک ہوتی......''

''جانتی ہوں تمنا...... مگر مجھے وہ راہ بہت خاردار لگتی تھی۔'' مجھے یاد آیا کہ اس روز......

جب میں چاچو کے ساتھ کمیل کو دیکھنے لاہور گئی تھی، گل پھپھو کے گھر اس دن دوپہر کا کھانا تھا اور انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں سارا دن وہیں گزارنا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد سب قیلولہ کرنے کی غرض سے اپنے، اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔ مہر پھپھو کے گھر والے واپس چلے گئے تھے کیونکہ فاطمہ گھر پر تھی، صرف میں اور اموجان وہاں رہ گئے تھے، ہمیں گل پھپھو نے رات کے کھانے تک روک لیا تھا۔ میں اور تحریم لاؤنج میں کوئی انگریزی فلم لگا کر بیٹھ گئیں۔

”تحریم، ایک کپ چائے تو بنا دو پیاری!“ کامل وہاں آ گیا تھا۔ ”میرا سر بھاری ہو رہا ہے۔“ اس کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔

”اچھا بھائی!“ تحریم سعادت مندی سے اٹھی تھی، عام حالات میں وہ لاکھ بہانے کرتی، بحث کرتی مگر اسے بھی نظر آ گیا تھا کہ کامل کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ تحریم نے مووی روک دی تھی، میں اس کی تقلید میں اس کے ساتھ ہی اٹھی مگر اگلے ہی لمحے میری کلائی کامل کے ہاتھ میں تھی۔

”میرا ہاتھ چھوڑو کامل......“ میں نے فوراً اپنا ہاتھ کھینچا جیسے مجھے کرنٹ لگا ہو، اس کی اتنی جرأت۔

”سوری......“ اس نے ہاتھ چھوڑ دیا۔ ”مگر صرف چند منٹ کے لیے میری بات سنو۔“

”تمہیں معلوم ہونا چاہیے کامل کہ میں ایک شادی شدہ عورت ہوں اور رشتے میں تمہاری بھابی بھی لگتی ہوں۔“

”جانتا ہوں...... جانتا ہوں کہ میں تمہارے لائق تھا نہ تمہارا مستحق، جانتا ہوں کہ میرے پاس سوائے کورٹ میں شادی کرنے کے کوئی آپشن نہ بچا تھا اور وہ بھی تم نے رد کر دیا...... میں نے ممانی عائشہ کو بھی اس پر منا لیا تھا مگر کوئی نہ مانا تو وہ صرف تم تھیں امرت۔“ وہ سسکا۔ ”جو تم مان جاتیں تو آج ہم دونوں کی زندگیاں مختلف ہوتیں۔“

”اچھا ہی ہوا کہ میرا باپ اس دنیا سے مجھ سے راضی گیا ورنہ میں عمر بھر اپنے آپ سے ہی نظریں نہ ملا پاتی۔“

”جانے والوں سے اہم وہ ہوتے ہیں جو ابھی باقی ہیں، کیا تم نے میری ماں کو کبھی اپنے فیصلے پر پچھتاتے ہوئے دیکھا ہے؟“ اس نے سوال کیا۔

”ہو سکتا ہے کہ ایسا ہوا ہو مگر ہم جانتے نہ ہوں......“ میں نے پورے وثوق سے کہا۔ ”ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ انہیں کبھی اس بات کا احساس ہی نہ ہوا ہو کہ انہوں نے کیا پانے کے لیے کیا، کیا کھویا...... خوشی اور تکلیف کے کس کس لمحے میں انہیں اپنے پیاروں کی یاد نہ آئی ہو...... انہیں اپنے پاس دیکھنا چاہا ہو، انہیں ملنے کی تڑپ نے بے قرار کیا ہو۔“

”تو تم نے ان بے بنیاد خدشوں کی وجہ سے میرا ساتھ دینے سے انکار کیا؟“ اس کے لہجے میں دکھ تھا۔

”جو وقت بیت چکا اس پر میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔“

”کیا میری محبت میں اتنی طاقت نہ تھی امرت کہ تمہیں ایسی خوشی دیتی کہ جس کو پا کر دنیا کا ہر دکھ ہیچ لگتا؟“

تمہیں ہمیشہ سے میری محبت پر شک تھا ناں کامل...... تو وقت نے ثابت کر دیا کہ تم صحیح تھے۔“

”میں مان ہی نہیں سکتا کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتی ہو امرت۔“ وہ ضد پر اڑا تھا۔

”میں پورے وثوق سے تمہیں بتا رہی ہوں کامل...... میں اب تم سے محبت نہیں کرتی۔“ ہاں میں نے اسے بالکل سچ کہا تھا۔ میں کبھی اس کی محبت کو سمر کر سانس لیتی تھی مگر جس دن سے میں زین سے بیاہی گئی تھی میں نے پوری ایمانداری سے زین کو اپنایا تھا۔

”تمہارے دل کے کسی گوشے میں میری اس سوختہ محبت کی راکھ پڑی ہوگی امرت۔“

”میرے دل میں زین کی محبت کے پھول کھلے ہیں کامل...... جہاں پھول ہوتے ہیں وہاں راکھ کا کیا کام۔“ میں نے دل کڑا کر کے کہا تھا۔ حقیقت یہی تھی، میں نے ابو جان کے انتخاب کو دل سے قبول کر لیا تھا۔ اگر ابو جان کی وفات میرے ولیمے کے دن ہونا لکھی گئی تھی اور وہ ولیمہ کامل کے ساتھ ہوتا تو میں عمر بھر اس پچھتاوے کے ساتھ جیتی کہ میں نے اپنے باپ کا مان نہیں رکھا اور میرا باپ مجھ سے ناخوش گیا، اسی طرح، جس طرح گل پھپو کی زندگی میں ہر خوشی کے باوصف پچھتاوؤں کے رنگ بھی ضرور تھے۔

”تم نے تو زین کو پا کر مجھے بھلا دیا...... میں کیا کروں امرت...... اس دل کا کیا کروں میں؟ اسے کسی پل قرار ہی نہیں آتا۔“

''کسی اچھی لڑکی سے شادی کرلو، مجھے بھلا دو، شرعی رشتے سے بندھ کر کسی کو خوشی سے اپناؤ گے تو زندگی میں سکون آجائے گا......'' میں نے اسے مشورہ دیا۔ ''اور ہاں، مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے کاٹل کہ اس کے بعد تم مجھ سے اس موضوع پر کوئی بات نہ کرنا، نہ آج نہ پھر کبھی...... میں نہیں چاہتی کہ میری زندگی میں کوئی خرابی تمہاری وجہ سے ہو اور تم پچھتاؤ۔''

''تم اتنی ظالم نہیں ہوسکتیں امرت......'' وہ میرا چہرہ تک کر رہ گیا تھا۔

''اپنے شوہر سے وفا کو ظلم نہیں کہتے......'' میں نے رسان سے کہا۔ ''تم بھی نہیں چاہو گے کہ تمہاری بیوی ہو تو تمہاری مگر اس کا دل اور دماغ کسی اور کے پاس گروی رکھا ہو......کوئی مرد اپنی محبت میں شراکت برداشت نہیں کرتا۔''

''میں کسی اور کو نہ اپنی بیوی کے روپ میں دیکھنا چاہوں گا نہ ہی میں کسی اور لڑکی کو خوش رکھ سکوں گا......''

میرے اندر کیا ٹوٹ پھوٹ ہوئی تھی، اس کے بارے میں کوئی کیا جانتا۔ اسے سامنے دیکھ کر جن زخموں کے ٹانکے ادھڑے تھے ان کی رفوگری میں جانے کتنا وقت لگ جاتا۔

☆☆☆

''تم اپنے گھر میں بالکل خوش ہوناں پیاری؟'' اموجان نے سوال کیا، ایک تو یہ ماؤں کی آنکھوں کی خوردبین۔

''کیوں آپ کو خوش نہیں لگ رہی؟'' میں نے ہنس کر سوال کیا۔ آنسوؤں...... میری آنکھوں کی دہلیز پار نہ کرنا! میرا پردہ رکھ لینا! میں نے کہا بھی مگر......

''تو پھر میرے سوال پر یہ آنسو کیوں؟'' اموجان کا وہ سوال جس کا جواب میرے پاس تھا تو مگر میں بات بدل گئی۔

''آپ اب تنہا ہوگئی ہیں ناں امو......'' میں نے عذر تراشا۔

''وہ تو میں پہلے بھی تھی۔'' ان کا لہجہ بھی اداس ہوگیا۔

''پہلے تمنا تو تھی ناں!'' میں نے کہا۔

''تمنا تو اب زیادہ وقت اقبال لالہ کی طرف گزارتی تھی......'' انہوں نے اداسی سے کہا۔ ''مجھے تو تمہارے ابوجان تنہا کر گئے ہیں پیاری!'' انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔ ہم بے آواز رو رہی تھیں، سانجھے غموں پر بھی اور وہ غم بھی جو ہمارے اپنے دلوں میں پوشیدہ تھے۔ ''مگر میں نے اپنا دل کافی حد تک کمپل کے ساتھ مصروف رہ کر بہتانا سیکھ لیا ہے۔''

''اچھا ہے اموجان......'' میں نے اپنے آنسو صاف کیے۔ ''اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو آزمائش آتی ہے وہ ہمیں برداشت کرنے کی ہمت بھی خود ہی دیتا ہے۔''

''تم ٹھیک ہوناں، بچہ بھی ٹھیک ہے؟'' اموجان نے سوال کیا۔ ''امید ہے کہ زیبا اس خبر سے تو خوش ہوئی ہوگی؟ شادی کے ہنگاموں میں تو اس کے پاس بیٹھنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔''

''سب ٹھیک ہے میری پیاری اموجان!'' میں نے ان کے ساتھ لپٹ کر انہیں جھوٹی تسلی دی۔ جانتی تھی کہ شادی پر میری سسرال سے سب لوگ جس موڈ میں آئے تھے۔ زائنہ کے پاس اپنی حالت کا ٹھوس بہانہ تھا...... یوں بھی اگرچہ کوئی جانتا نہ تھا مگر وہ عدت میں تھی۔ باقی لوگ مہندی کے وقت وہیں سے تیار ہو کر گاؤں پہنچے تھے اور بارات کے رخصت ہوتے ہی لاہور روانہ ہوگئے تھے کہ انہیں اگلے روز وہاں ولیمے میں شرکت کرنا تھی۔ زین نے جاتے وقت مجھ سے ساتھ چلنے کو کہا بھی مگر میں نے کہہ دیا کہ میں باقی لوگوں کے ساتھ آؤں گی، یوں بھی ولیمے میں ایک دن کا وقفہ تھا۔

''اگر کوئی مسئلہ ہو تو اپنی ماں سے ضرور شیئر کرنا پیاری...... باپ کے نہ ہونے سے خود کو لاوارث نہ سمجھنا۔''

دل چاہا کہ چیخ چیخ کر حالِ دل کہہ دوں ان سے مگر جانتی تھی کہ وہ سہہ نہ پائیں گی۔

☆☆☆

''تم خوش نہیں ہو امرت!'' اس کی آواز میں یقین تھا۔ جانے کس وقت وہ میرے پیچھے آن کھڑا ہوا تھا کہ چائے کی ٹرے میرے ہاتھ سے چھوٹتے، چھوٹتے بچی۔ ولیمے کے بعد ہم سب مہر پھپو کی طرف رات رک گئے تھے، تھکاوٹ سے سب کا برا حال تھا، اس وقت سب بزرگ خواتین لاؤنج میں بیٹھی گپ شپ لگا رہی تھیں۔ میثاق اور تمنا اپنے کمرے میں جا چکے تھے اور چائے کی فرمائش پر مجھے اٹھنا پڑا تھا کیونکہ ملازمین بھی اپنے کمروں میں جا چکے تھے اور مہر پھپو نے کہا بھی کہ وہ فاطمہ کو بلا لیتی ہیں مگر میں نے خود ہی اپنی خدمات پیش کر دیں۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''مما کو گھر لے جانے کے لیے آیا ہوں، معلوم ہوا کہ تم یہاں چائے بنا رہی ہو......''

''میں چائے بنا رہی ہوں تو اس کا مطلب تم نے یہ نکالا کہ میں ناخوش ہوں؟'' میں نے چہرے کا رخ بدلا۔

''میں تمہیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں امرت...... ایک لمحے میں بتا سکتا ہوں کہ تم کس حال میں ہو۔'' اس نے یاسیت سے کہا۔ ''میں جینا تو سیکھ رہا ہوں مگر تمہیں ناخوش دیکھ کر میں سکون میں نہیں ہو سکتا۔''

''میں خوش ہوں...... تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور اگر میں ناخوش بھی ہوتی تو اس کے لیے تمہارا بے سکون ہونا کوئی معانی نہیں رکھتا......'' میں نے دانت بھینچ کر اپنے غصے پر قابو پایا۔ ''بلکہ مجھے افسوس ہے کہ ایک ایسا شخص میرے لیے پریشان ہے جسے میں اپنے ماضی سے بھی نکال دینا چاہتی ہوں۔''

''کیا یہ اتنا آسان ہے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''میں اپنے شوہر کو دھوکا نہیں دے سکتی، اپنے ماضی کے اس حصے پر شرمندہ ہوں جس میں، میں نے... بے سوچے سمجھے ایک ایسے شخص کو چاہا جو میرا نصیب نہ تھا...... خدارا مجھے مزید پچھتاوؤں میں مبتلا نہ کرو۔''

''کیا دل کو سمجھانا اور منانا اتنا ہی آسان ہوتا ہے؟''

''زندگی سب سے بڑی استاد ہے، مشکل سے مشکل کام بھی سیکھ لیتا ہے انسان۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے چائے لے کر جانا ہے۔'' گویا میں نے اسے اپنے راستے سے ہٹنے کو کہا تھا۔ وہ سامنے سے ہٹ گیا، میں کچن سے چائے کی ٹرے لے کر نکلی۔

''لو بھئی ہماری پیاری بیٹی چائے بنا کر لے آئی ہے...... کتنی پیاری خوشبو آ رہی ہے چائے کی۔'' مہر پھپو نے بہ آواز بلند کہا۔

☆☆☆

گھر واپس لوٹ کر بھی میرے دل سے اجنبیت کا احساس نہ جاتا تھا، سوچ سمجھ کر ہی امو جان کو نہ بتایا تھا کہ میں کس طرح کے حالات سے گزر رہی تھی۔ میں کسی معمول کی طرح سب کے سامنے نارمل نظر آنے کی اداکاری کرتی رہی۔

''ہماری بیٹی نے بہت دن لگا دیے اس بار تو!'' چاچو نے چہکتی ہوئی آواز میں کہا۔

''بس چاچو، امو جان یک دم تنہا ہو گئی ہیں ناں اس لیے......''

''بھابی پر کوئی پابندی تو نہیں یہاں آنے پر بیٹا؟'' چاچو نے ناراضی سے کہا۔ ''جب سے تم اس گھر میں بیاہ کر آئی ہو......'' ان کا لہجہ بھرّا گیا۔ ''وہ ایک بار بھی یہاں نہیں آئیں......'' شاید انہیں میری شادی کے ذکر کے ساتھ ہی ابو جان کی یاد آ گئی تھی۔

''عموماً میں ہی جو چلی جاتی ہوں چاچو!'' میں نے بات بنائی۔

''اس کے بعد تمہیں جانے کی اجازت نہیں ہے، جب تک بھابی جان خود آ کر تمہارے ساتھ وقت نہ گزاریں، کچھ دن یہاں رہیں، اپنی بیٹی کو ہنستا بستا دیکھیں......'' اچھا ہوا کہ انہوں نے میرے چہرے پر لہرانے والے سائے کو دیکھا نہ مما کے چہرے پر آنے والی ناگواری کو۔

''میں کہوں گی ان سے......'' انہیں جھوٹا آسرا دیا، جانتی تھی کہ اموجان نہیں آنے والی تھیں۔
''تم نہ کہنا...... میں خود جا کر ان کو لے کر آؤں گا۔'' انہوں نے کہا۔
''جی اچھا۔'' میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔
''ایک دلچسپ بات سنو......'' انہوں نے آہستہ آواز میں کہا، مما اٹھ کر کمرے میں چلی گئی تھیں۔ ''تم نے پوچھا نہیں کہ زائنہ کہاں ہے؟''
''اوہ......'' میں الجھ گئی، مجھے تو احساس ہی نہ ہوا تھا کہ وہ گھر پر نہ تھی۔ میں اپنی پریشانیوں اور سوچوں میں ہی گم تھی اور یوں بھی اسی دن پہنچی تھی تو غور کرنے کا وقت ہی نہ ملا تھا۔ ''کہاں ہے وہ چاچو؟''
''جب ہم شادی کے لیے جا رہے تھے اور زائنہ نے وہاں جانے سے انکار کر دیا......'' انہوں نے رازداری سے کہا۔ ''تو میں نے خفیہ طور پر فون کر کے ارسل سے کہہ دیا تھا کہ وہ یہاں تنہا ہے اور وہ آ کر اسے لے جائے......'' میں ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ ''اس سے قبل میں ارسل سے بھی پوچھ چکا تھا اور زائنہ سے بھی، اگرچہ کوئی بتا نہ رہا تھا مگر مجھے اندازہ تھا کہ میاں بیوی کے مابین کوئی کھٹ پٹ ہے اور یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ زیبا جیسی مائیں اپنی بیٹیوں کو جھکنا اور بسنا نہیں سکھاتیں...... اور دیکھو جیسے بھی ہوا وہ آ کر اسے منا کر لے گیا۔'' میں دل ہی دل میں چاچو کے فہم کی داد دے رہی تھی۔ اچھا ہوا کہ انہوں نے مما کی لاعلمی میں ارسل بھائی کو سمجھایا اور وہ اپنا گھر بچانے کی خاطر یا چاچو کے احترام میں...... مگر خود آ کر اور منا کر زائنہ کو لے گئے ورنہ ہر گزرنے والا دن ان کے رشتے کے بیچ خلیج کو اور بھی گہرا کرتا کیونکہ زائنہ میں تو جھکنے کی ادا نہ تھی۔ سوچا کہ موقع اچھا ہے، چاچو کو اس الزام کی بابت بتانے کا مگر پھر یہ سوچ کر خاموش ہو گئی کہ بات تو اب ختم ہو گئی ہے، اتنی فضول بات سن کر خواہ مخواہ چاچو کا دل دکھے گا۔

☆☆☆

''آپ کی فیملی میں کسی کو کینسر ہے یا تھا؟'' ڈاکٹر یاسمین نے سوال کیا۔
''ہوں...... میرا خیال ہے کہ نہیں۔'' میں نے سوچا مگر میرے علم میں کچھ ایسا نہ تھا اس لیے میرے لہجے میں وثوق نہ تھا۔
''اس کا مطلب ہے کہ آپ یقین سے نہیں کہہ رہیں؟'' اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔
''اصل میں موجودہ لوگوں کا تو مجھے علم ہے مگر اوپر کی نسل میں...... کچھ کہہ نہیں سکتی...... کیونکہ ہمارے گاؤں میں اس زمانے میں بھی بیماریوں کی تشخیص ہی نہیں ہو پاتی۔'' میں نے حسرت سے کہا۔ وہاں علاج معالجے کی بنیادی سہولیات کے لیے ایک ڈسپنسری کے علاوہ کچھ نہیں۔ اس ڈسپنسری میں بھی کوئی کمپاؤنڈر یا نرس ہی ہوتے ہیں، ڈاکٹر کوئی بھی گاؤں میں تبادلہ نہیں کروانا چاہتا۔ اسپتال کے نام پر ایک چھوٹا سا ہیلتھ یونٹ تو سرکاری طور پر تعمیر کر دیا گیا ہے مگر اس میں سامان ہے...... دوائیں نہ عملہ۔
''تو گویا آپ کی دادی، نانی، پھوپیوں یا خالاؤں میں سے کسی کو کینسر رہا ہوگا؟'' اس نے اگلا سوال کیا۔ ''کیا ان میں سے کسی کی موت ایسی تھی کہ جس کے بارے میں علم نہ ہوا ہو کہ کیوں موت ہوئی؟''
''معلوم نہیں...... میں اپنی اموجان سے پوچھ کر بتا سکتی ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''مگر ان سوالوں کا یہاں کیا ذکر؟''
''اصل میں جس درد کا تم ذکر کر رہی ہو، ایسا اس حالت میں ہوتا نہیں ہے تاوقتیکہ کوئی غیر ممکنہ صورتِ حال نہ ہو...... مجھے شبہ ہے کہ کہیں تمہیں کوئی رسولی وغیرہ نہ ہو...... ایسا درد ہونا نارمل نہیں ہے، میں ایک دو ٹسٹ کروا کر دیکھ لیتی ہوں۔'' اس نے صاف گوئی کی انتہا کر دی تھی۔

''کیا ٹسٹ ہیں یہ؟'' میں نے فکر سے سوال کیا۔ ''ان میں سے کوئی ٹسٹ بچے کے لیے نقصان دہ تو نہیں ہے؟''

''تم فکر نہ کرو پیاری...... ہمارا ہر روز ایسی چیزوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے، کوئی پریشانی والی بات نہیں۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''اگر کچھ ہوا بھی تو اس کا علاج ممکن ہے۔''

''کیا آپ کو لگتا ہے کہ مجھے کوئی رسولی ہے یا کینسر......'' میرا اندیشہ زبان پر آیا۔

''اللہ نہ کرے...... مگر کسی شبہے کے تحت ہمیں مریض کی فیملی ہسٹری چیک کرنا پڑتی ہے۔'' اس نے سمجھایا۔ ''جس نوعیت کا درد تم بتا رہی ہو، اس میں میں نے یونہی ممکنات کا سوچ کر تم سے سوال کیا تھا۔ کوئی بھی ڈاکٹر اتنا ماہر نہیں ہوتا کہ بغیر کسی ٹسٹ کے کینسر یا رسولی تشخیص کر دے۔'' اس نے کہا۔ ''اور ہاں بے مقصد وہم نہ کرنا، بچے کی صحت کے لیے ایسی چیزیں نقصان دہ ہوتی ہیں۔''

''ٹھیک ہے......'' میں نے ہولے سے کہا۔ ''کیا میں جا سکتی ہوں اب؟''

''تمہاری ساس نہیں آئیں آج؟'' اس نے کچھ لکھتے ہوئے سوال کیا۔

''ان کی کوئی اور مصروفیت تھی۔'' میں نے بہانہ گھڑا، مجھے اس کو یہ بتانے کی کیا ضرورت تھی کہ وہ مجھے نظر انداز کر رہی تھیں۔

''امید ہے کہ تم اپنی خوراک کا خاص خیال رکھتی ہو گی اور اپنی وٹامن وغیرہ باقاعدگی سے لیتی ہو گی؟'' اس نے پھر سوال کیا۔ ''یہ کچھ ٹیسٹ لکھے ہیں جو تمہیں کروانا ہیں۔'' اس نے کاغذ میری طرف بڑھایا۔

''جی بالکل......'' کہہ کر میں اٹھی۔ ''یہ ٹیسٹ کب تک کروا سکتی ہوں میں؟''

''جب بھی تمہیں سہولت ہو......'' اس نے کہا۔

میں اسے خدا حافظ کہہ کر باہر نکلی، ریسپشن پر موجود لڑکی سے پرچی لی اور اسے ادائیگی کر کے باہر آ گئی۔ ڈرائیور چاچا میرے انتظار میں مؤدب کھڑے تھے، مجھے دیکھا تو بھاگ کر پارکنگ کی طرف گئے کہ گاڑی لے آئیں۔ میں نے گاڑی میں بیٹھ کر انہیں ایک مستند لیبارٹری کا پتا بتایا اور خود سیٹ سے ٹیک لگا لی۔ چند منٹوں میں گاڑی اس لیبارٹری کے سامنے موجود تھی۔ ٹسٹ کروا کے میں واپسی کے لیے نکل رہی تھی۔

''ارے تم تو بہت پیاری لگ رہی ہو۔'' وہ مس صبا ہی تھی، لگتا تھا کہ کسی لمحے بھی اس کی ڈلیوری ہونے والی تھی۔

''شکریہ!'' میں لجا گئی۔ ''آپ بھی بہت اچھی لگ رہی ہیں۔''

''میں؟'' وہ ہنسی۔ ''اتنی کسرِ نفسی سے کام لینے کی ضرورت نہیں...... تمہاری لغت میں اچھی غالباً موٹی کو کہتے ہیں۔''

''اس موٹاپے کا اپنا ایک حسن ہے......'' میں نے سچائی سے کہا تھا۔

''تم سناؤ......'' اس نے سوال کیا۔ ''لگتا ہے میرے ہی نقشِ پا پر چل رہی ہو؟'' اس نے میری ظاہری حالت سے بھی اندازہ کر لیا تھا۔ ''کیا تم نے بے بی پہلے سے پلان کر رکھا تھا؟''

''میں آپ کے نقشِ پا پر چل تو رہی ہوں مگر ابھی کافی فاصلے سے آپ کے پیچھے ہوں۔'' میں نے ہنس کر کہا تو وہ بھی دل کھول کر ہنسی۔ ''اور رہی بات پلاننگ کی، کسے، کب دنیا میں آنا ہے، اس کی پلاننگ تو اللہ تعالیٰ ہی کرتے ہیں ناں۔''

''پرنسپل تو بہت اپ سیٹ ہوئی ہوں گی؟'' اس نے سوال کیا۔

''نہیں...... وہ کیوں اپ سیٹ ہوں گی، اللہ کے کاموں میں تو کسی کو دخل نہیں نہ ہی اس کے حکم کی سرتابی کی مجال۔'' میں نے گھما پھرا کر جواب دیا۔ کل کلاں کو وہ واپس اپنی ملازمت پر جاتی اور میرے کہے ہوئے الفاظ کو توڑ موڑ کر پیش کرتی تو۔

''تو استعفیٰ دے دیا تم نے؟''

''ہاں...... دینا پڑا۔'' میں نے کہا۔ ''ارادہ تو تھا کہ جب تک ممکن ہوا کام کرتی رہوں گی مگر میری طبیعت کافی خراب رہنے لگی تو انہوں نے بھی نئی ٹیچر رکھ لی، یوں بھی چند دن میں چھٹیاں ہونے والی تھیں۔''

''تو گویا انہوں نے ایک ٹیچر کی گرمیوں کی چھٹیوں کی تنخواہ بچالی......'' وہ مسکرائی۔ ''نہ تمہیں دی اور نہ نئی بھرتی ہونے والی ٹیچر کو دیں گی۔''

''مجھے تنخواہ نہیں ملی، اس کا دکھ ہے......'' میں نے بھی جواباً مسکرا کر کہا۔ ''نئی کو دیں یا نہ دیں، اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''ہاں یہ تو ہے......'' معانقہ کر کے وہ رخصت ہوئی۔ بھرے، بھرے جسم کے ساتھ، چمکتا ہوا چہرہ......اس کے چہرے پر ممتا کا حسن بکھرا ہوا تھا۔ میرے دل سے اس کے اور اس کے بچے کے لیے دعا نکلی۔

☆☆☆

''تمہارے جانے کے بعد میں نے مما اور رزائنہ کو بٹھایا تھا اور پوچھا تھا کہ انہوں نے تم پر ایسا الزام کیوں لگایا اور یہ کہ کیا وہ دونوں پاپا کے سامنے قرآن پر ہاتھ رکھ کر وہی بات کہنے کو تیار تھیں جو انہوں نے مجھ سے کہی تھی تو وہ دونوں کوئی جواب نہ دے سکیں۔''

''اچھا تو؟''

''مما نے کہا کہ وہ اس کمرے سے نکل رہی تھی تو یقیناً اس کے ساتھ......'' اس نے وہ گھٹیا فقرہ پورا کیا جسے میں دہرا بھی نہیں سکتی۔ ''اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ پہلی بار جو بیان انہوں نے دیا تھا وہ سراسر ان کے اپنے اندازے تھے اور انہوں نے ایسا کچھ دیکھا ہی نہیں تھا۔'' اب وہ صاف نہیں مگر ڈھکے چھپے الفاظ میں اپنی مما کو خود جھوٹا کہہ رہا تھا۔

''تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں تھا زین؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''میں تو قرآن تک اٹھانے کو تیار تھی اپنی صفائی کے لیے... پھر بھی تم نے اپنی مما کی تصدیق کے بغیر میری بے گناہی کو نہیں مانا۔''

''مجھے جس طرح بتایا گیا تھا، اس طرح کوئی بھی سنتا تو اس کا یہی ردِعمل ہوتا۔'' اس کا انداز بے بسی لیے ہوئے تھا۔

''جس طرح تم نے اپنی مما اور بہن کی باتیں سنیں، میری طرف کی کہانی بھی سن لیتے تو کم از کم کوئی فیصلہ کرنے کے لیے سہولت ہو جاتی تمہیں۔''

''دیکھو امرت......'' میں اور تم میاں بیوی ہیں، ایک رشتے کی ڈور میں بندھے ہوئے...... مگر ہماری اپنی، اپنی شخصیت بھی ہے، سوچیں ہیں، نظریات ہیں، اعمال ہیں......'' میں اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ''میں نے تم سے کہا تھا کہ اگر تمہیں کوئی اچھا لگنے لگے میرے علاوہ تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' میرے اندر غصے کے ابال اٹھنے لگے۔ ''بس یہ برا لگا کہ تم ارسل کے علاوہ کسی اور کے ساتھ انوالو ہوتیں تو......'' وہ رکا۔ ''ارسل میری بہن کا شوہر ہے۔''

''زین!'' میں دہاڑی۔ ''کیا سمجھ رکھا ہے تم نے مجھے؟''

''سکون سے بات کرو......'' اس نے کہا۔ ''غصے میں آنے کی ضرورت نہیں۔ میں بہت وسیع ذہن رکھتا ہوں اور حقیقتاً کہہ رہا ہوں کہ اگر تمہیں میرے علاوہ کوئی اچھا لگے اور تم اس سے دوستی کرنا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے...... اسی طرح تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے اگر میری زندگی میں تمہارے علاوہ کوئی اور لڑکی ہو تو۔''

''تم چاہو تو جو مرضی کرتے پھرو مگر میں اتنی گھٹیا بات سوچ بھی نہیں سکتی......'' دل چاہا کہ اسے بتاؤں کہ میں اس کی گھٹیا حرکتوں کے بارے میں جانتی تھی مگر جبر کیا۔ ''صرف ایک بات بتاؤ زین۔''

''پوچھو؟''

”کیا تمہیں میرے کردار پر اس کے علاوہ بھی شک ہے؟“ میں کہتے، کہتے رکی۔ ”میرا مطلب ہے کبھی تمہیں لگتا ہے کہ یہ بچہ تمہارا نہیں بھی ہو سکتا؟“

”ایسا میں نے کب کہا؟“ اس نے حیرت سے سوال کیا۔

”تم نے تو نہیں کہا مگر مما نے تو ایسا سوچا بھی اور مجھ سے کہا بھی......“ میں سسکی۔ ”میں نے تو پوری ایمانداری سے اپنے ماں باپ کی خواہش کا احترام کیا، تمہیں اپنا سب کچھ سمجھا اور اپنایا، اس گھر کے مکینوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش میں ہلکان ہوتی رہی......تم نے یہاں لا کر اس کے بعد میری ضروریات اور فرائض سے غفلت کی۔ کبھی سوچا نہ پوچھا کہ مجھے کیا چاہیے اور کہاں سے لاؤں...... میں نے خود ہی مجبور ہو کر مما سے اس بات کی شکایت کی، اس کے جواب میں مما نے مجھے ملازمت کی راہ سجھائی اور وہی مما اگلے روز مجھے کہنے لگیں کہ ملازمت کرنے والی لڑکیاں گھروں سے نکلتی ہیں تو سو لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے، اس لیے انہیں یقین نہیں کہ یہ بچہ بھی تمہارا ہے کہ نہیں...... بجائے اس کے کہ وہ تمہیں سمجھاتیں کہ تم مجھے خرچہ دو، انہوں نے مجھے ملازمت کرنے کے لیے گھر سے نکالا۔“

”تمہیں پتا ہے امرت کہ میں پاپا کے ساتھ کام کرتا ہوں اور وہ مجھے اسی طرح تنخواہ دیتے ہیں جس طرح اپنے باقی کام کرنے والوں کو دیتے ہیں......“

”کیا وہ تنخواہ اتنی کم ہے کہ تم میرا خرچہ نہیں اٹھا سکتے؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”اگر ایسا تھا تو پھر تمہیں شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ تمہارے خاندان اور گھر میں سوائے میرے کون سی لڑکی ملازمت کرتی ہے؟ کیا میرے اخراجات ہی اس گھر کے لیے ناقابلِ برداشت تھے؟ میرے حق مہر کی رقم تم نے مجھ سے ادھار لی اور کبھی لوٹائی نہیں۔ ابو جان نے جو رقم مجھے دی اس کی بھی تمہیں ضرورت پڑ گئی اور جب میں نے تم سے مطالبہ کیا تو بات مما تک پہنچی اور اس کا حل انہوں نے میری ملازمت نکالا۔ میں دن بھر گرمی، سردی کی شدتوں میں گھر سے باہر سر کھپا کر لوٹتی ہوں، مجھے مہینے بھر کے بعد اتنی رقم ملتی تھی جتنی اس گھر کی استری اور صفائی کرنے والی ملازمہ کو ملتی ہے...... کیا تمہیں یہ سب نظر نہیں آتا؟“ میں پھٹ پڑی۔

”تم اپنی جگہ بجا ہو امرت مگر میری بھی مجبوریاں ہیں...... پاپا مجھے لگا بندھا خرچہ دیتے ہیں، اس سے میرا مہینہ بھی نہیں گزرتا، کئی بار مجھے مما سے پیسے ادھار لینا پڑتے ہیں جو میں آج تک لوٹا بھی نہیں سکا...... رہی بات شادی کی تو اگر میں پاپا کی بات نہ مانتا تو وہ میرا حقہ پانی بند کر دیتے......“ اس نے تھیلے سے بلی باہر نکالی۔

”تو وہ محبت؟“ میں سسکی۔

”تم مجھے اچھی لگتی تھیں امرت...... شاید میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا، دوستی رکھنا چاہتا تھا مگر میں مما کی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو گیا، مما کو مجھ سے بہت محبت ہے، پاپا نے دھمکی دی کہ وہ مجھے عاق کر دیں گے تو مما نے اپنی محبت کا واسطہ دے کر مجھے منا لیا...... میں نے تو کبھی نہیں کہا کہ مجھے تم سے محبت تھی۔“ وہ میرے سر کے اردگرد انکشافات کے غبارے ایک، ایک کر کے پھاڑ رہا تھا۔

”تو کیا تم کسی اور سے شادی کرنا چاہتے تھے؟“ میں نے جانے کیوں سوال کیا۔

”شادی کبھی میری منزل تھی ہی نہیں۔ میں کسی پابندی میں رہ کر زندگی گزارنا ہی نہیں چاہتا تھا...... میرا سوچ کا اور جینے کا انداز اور ہے۔ مجھے پیاری، پیاری لڑکیاں دوستی کے لیے اچھی لگتی ہیں، اس حد تک جس حد تک وہ خود چاہیں، میں نے تو کبھی کسی سے جسمانی حد پار کرنے میں بھی پہل نہیں کی۔“

”تو گویا تم دوستی میں جسمانی حد بھی پار کر لیتے ہو؟“ میں نے اپنے اندر نفرت اٹھتے ہوئے محسوس کی۔

''مجھے لڑکیوں کو مایوس کرنا اچھا نہیں لگتا۔'' وہ خباثت سے مسکرایا۔
''تو گویا تم مجھ سے ایسی دوستی کے خواہش مند تھے؟''
''یہ تو تم پر منحصر ہوتا تھا...... کہانا ں کہ میں ابتدا نہیں کرتا مگر جو ابتدا کرے اسے مایوس بھی نہیں کرتا۔''
''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میرے ابو جان کسی کو پرکھنے میں اتنا دھوکا کھا سکتے ہیں یا چاچو اپنے گھر میں رہنے والے ایک فرد جو اُن کا بیٹا ہو کی اصلیت سے اس قدر غافل ہو سکتے ہیں۔''
''اگر تم نے اپنے چاچو سے کوئی فضول بات کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' اس نے مجھے کھلی دھمکی دی۔ اس سے برا تو اس وقت مجھے کوئی اور لگ بھی نہیں رہا تھا، میں نے وحشت بھری نظر سے اسے دیکھا۔ ''مجھے یقین ہے کہ تمہارے گاؤں میں طلاق یافتہ لڑکی کو کچھ اچھا نہیں سمجھا جاتا ہوگا......''

☆☆☆

جانے کس طرح چاچو نے امو جان کی منت سماجت کی ہوگی کہ وہ چند دن کے لیے ہمارے ہاں آگئیں۔ میری شادی کے بعد حالات ویسے نہ ہوتے، ابو جان زندہ ہوتے تو شاید اب تک کئی بار چکر لگا کر جا چکے ہوتے۔ میرے لیے ان حالات میں امو جان کا آنا خوشی کے بجائے الٹا تکلیف اور بے چینی کا باعث بن رہا تھا، میں ان کے سامنے زیادہ اداکاری نہیں کر سکتی تھی اور کوئی بیٹی ایسا نہیں چاہتی مگر میں چاہ رہی تھی کہ وہ واپس لوٹ جائیں۔

مما اپنے طور طریقوں اور معمولات میں اسی طرح مصروف تھیں، کوئی واقعہ، کوئی حادثہ ان کے معمول میں خلل نہیں ڈال سکتا تھا۔ وہ امو جان سے عموماً کھانے کی میز پر ہی ملتیں، دو تین رسمی فقرے ادا کرتیں اور اپنی مصروفیات کے رونے روتی ہوئی ان سے معذرت کرتیں کہ وہ انہیں وقت نہیں دے سکتیں۔ بچوں میں سے بھی کسی کے پاس اپنی پڑھائی کے بعد کم ہی وقت بچتا، وہ سب بھی صرف میز پر ہی اپنی تائی جان سے مل پاتے تھے۔ چاچو کوشش کر کے جلد لوٹتے مگر امو جان خود ہی ان کے پاس بیٹھ کر زیادہ بات چیت کرنے سے کتراتیں، وہ مما کی شخصیت کو اچھی طرح سمجھتی تھیں۔

میں دن کا زیادہ وقت امو جان کے پاس گزارتی، ان سے باتیں کرتی، ان کے لیے خود پھل وغیرہ کاٹ کر انہیں کھلاتی اور وہ میری خاطر مدارات میں مصروف رہتیں۔ ساجدہ سے کہہ کر میری مٹھی چاپی کرواتیں، پیروں پر مالش کرواتیں اور ہر نماز کے بعد مجھ پر کچھ نہ پڑھ کر پھونکتیں۔
''امو جان......'' مجھے اچانک یاد آ گیا۔ ''ہمارے خاندان میں کبھی کسی کو کینسر ہوا ہے؟''
''کیوں......؟'' حیرت سے انہوں نے پوچھا۔
''یونہی...... مجھے کچھ تکلیف تھی جس کی وجہ سے ڈاکٹر نے میرے ٹسٹ کروائے ہیں اور مجھ سے پوچھا کہ میرے حقیقی خونی رشتوں میں سے کسی کو کینسر تو نہیں تھا؟''
''ہاجرہ کو بچہ دانی میں کوئی رسولی سی تھی، گاؤں کی دایہ کو اتنا علم نہ تھا...... معلوم نہیں کہ کینسر تھا یا...... بس اچانک ہی وہ چلی گئی، کوئی کچھ نہ کر سکا۔''
''مگر ہاجرہ پھپھو کون سا میری سگی پھوپھی تھیں...... وراثت عموماً اپنے حقیقی خونی رشتوں سے منتقل ہوتی ہے......''
''تو وہ بھی تو تمہاری حقیقی......'' وہ رک گئیں...... غالباً انہیں سمجھ میں آ گیا تھا۔
''دیکھیں ناں...... ان سے تو وراثت میں کوئی بیماری لینا ہوگی تو وہ تمنا لے گی ناں؟'' میں نے انہیں سمجھانا چاہا۔

''اچھا...... ہاں!'' وہ کھوئے، کھوئے لہجے میں بولیں۔ ''اللہ نہ کرے کہ تمہیں، اسے یا کسی کو بھی کوئی بیماری ہو، یہ ڈاکٹرنیاں تو خواہ مخواہ کوئی نہ کوئی وہم ڈال دیتی ہیں۔''

''بس آپ دعا کیا کریں......'' میں نے ان کے ساتھ لپٹ کر کہا۔

''تمنا سے دل بہت اداس ہو رہا ہے......'' انہوں نے شاید بات بدلی تھی۔

''واپس آئے گی ملائشیا سے تو اسے کہوں گی کہ یہیں آجائے۔''

''کب آ رہی ہے وہ؟''

''تین دن...... فقط تین دن کے بعد اموجان۔''

''لو بھئی، میں کوئی اگلے تین دن یہیں بیٹھی رہوں گی۔''

''اب آئی ہیں پہلی بار تو رہیں ناں۔'' میں نے اصرار کیا۔

''نہیں میری جان...... اس سے پہلے کہ زیبا اپنے تیور دکھائے، مجھے چلے جانا چاہیے۔''

''اگر آپ کو ان کے تیوروں کی اتنی فکر تھی تو مجھے بیاہتے وقت نہیں سوچا تھا آپ نے کہ وہ مجھے بھی تیور دکھا سکتی ہیں۔'' میں ٹھنکی۔

''میرے بس میں ہوتا تو میں کبھی نہ بیاہتی تمہیں یہاں...... یہ تو جانے والے نے جانے کیا سوچ کر......'' وہ اداس ہونے لگیں۔

''اللہ کی رضا تھی یہ اموجان......'' میں نے انہیں اس کیفیت سے نکالنا چاہا۔

''تم خوش نہیں ہو اپنے گھر میں بیٹا؟''

''یہ کس نے کہا کہ میں خوش نہیں ہوں اموجان؟''

''ابھی تو تم شکوہ کر رہی تھیں؟''

''نہیں امو...... میں شکوہ تو نہیں کر رہی تھی، میں تو کہہ رہی تھی کہ آپ کچھ دن رکیں میرے پاس...... اب میں تو اس حالت میں بار، بار سفر نہیں کر سکتی اور یوں بھی گھر میں کبیر بھائی ہوتے ہیں، ان کے سامنے مجھے جھجک محسوس ہوتی ہے۔''

''سچ پوچھو تو اب میرا دل سب سے زیادہ کمیل کے لیے اداس ہوتا ہے۔'' انہوں نے مسکرا کر کہا۔ ''جب تمہارا بچہ آئے گا تو اس کے لیے دل مچلے گا۔'' میں لجا گئی۔

☆☆☆

''اللہ کا لاکھ، لاکھ شکر ہے کہ تمہاری ساری رپورٹیں ٹھیک ہیں، میں نے تو جب سے سنا تھا جانے کتنی ہی منتیں مان لی تھیں، اللہ تمہیں اور اس بچے کو بھی اپنی خاص امان میں رکھے اور ہمیشہ عافیت میں رہو۔'' اموجان شکرانے کے نوافل پڑھ کر فارغ ہوئیں اور دعائیں دینے لگیں۔ ''اب مجھے واپس جانے سے نہ روکنا بیٹا۔''

''میرا آپ کے ساتھ اتنا دل لگا ہوا تھا اموجان۔'' میں نے اصرار کیا۔

پہلے چند دن تک تو یہ سوچ کر کہ اموجان خود کو اس گھر میں اجنبی محسوس کریں گی، میں چاہ رہی تھی کہ وہ جلد چلی جائیں مگر اس کے بعد مجھے احساس ہوا کہ وہ اس گھر میں صرف میری وجہ سے تھیں، کسی اور کے وقت دینے یا نہ دینے سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں نے بھرپور وقت دیا، ان کے ساتھ بیٹھ کر ڈرامے دیکھتی، ان پر ہم دلچسپ تبصرہ کرتیں، کتابوں کے بارے میں باتیں کرتیں، خاندان کے حالات زیر بحث لاتیں، دادی جان کو یاد کرتیں اور سب سے بڑھ کر ابو جان کو۔ اب دل چاہنے لگا تھا کہ وہ واپس نہ جائیں مگر میں چاہتی تھی کہ شوق سے

یہاں رہیں، مجبور ہو کر نہیں۔

''جلد آ جاؤں گی بیٹا......'' انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لگا کر کہا۔ ''جب تمہیں اسپتال جانا ہوگا، مجھے فوراً اطلاع کرنا، میں پہنچ جاؤں گی۔''

چاچو نے مما سے کہہ کر اموجان کے لیے قیمتی تحائف منگوائے تھے اور وہ وقتِ رخصت ان کے ہمراہ کیے۔ چاچو کا تو ارادہ تھا کہ وہ خود انہیں واپس چھوڑنے جائیں گے مگر اموجان کو ان کی صحت کی فکر تھی، انہوں نے انکار کر دیا اور چاچو کو بتائے بغیر فون کر کے گاؤں سے کبیر بھائی کو بلوا لیا۔ اموجان کے جانے کے بعد میرے دل میں عجیب سی اداسی اتر آئی تھی۔

اتنے دن تک تو مجھے سب کچھ بھولا ہوا تھا۔ زین بھی ان دنوں آزاد تھا، پہلے دن اموجان مہمان خانے میں رات کو سوئیں مگر اگلے دن زین نے اصرار کیا کہ وہ مہمان خانے میں سو جائے گا اور اموجان میرے پاس سوئیں گی۔ میں بھی اموجان کے ساتھ سکون میں تھی اور زندگی کے بہت سے تفکرات چھو کر نہ گزرے تھے اور زین بھی مکمل آزاد تھا، اسے کوئی پوچھنے والا نہ تھا کہ وہ کب گھر لوٹا، لوٹا بھی کہ نہیں۔

☆☆☆

تمنا اور میثاق ہنی مون سے لوٹے تو چاچو نے ان کی دعوت کی۔ گاؤں سے بھی سب کو بلایا گیا تھا اور لاہور سے بھی۔ ایک مقامی ہوٹل سے انتظامات کروائے گئے تھے اور کھانا گھر کے وسیع لان میں تھا۔ لان برقی قمقموں سے جگمگا رہا تھا، رنگوں اور خوشبوؤں کا طوفان تھا۔ مما نے اس روز سجاوٹ کا خاص اہتمام کیا تھا، خود بھی وہ سب کے ساتھ خوش نظر آ رہی تھیں۔ زائنہ اور ارسل بھی مدعو تھے۔ میں دانستہ کوشش کر کے ان دونوں سے دور رہی، شروع میں ان سے سلام دعا کے بعد میں ان سے کترا رہی تھی۔ زائنہ پر نظر پڑتی تو میرے دل کے زخم کھلنے لگتے تھے۔ یوں بھی اب میری ظاہری حالت ایسی ہو رہی تھی کہ میں ایک جگہ الگ بیٹھ کر بہتر محسوس کرتی تھی۔

گل پھپو کے گھر سے کوئی بھی نہیں آیا تھا، ان کے پاس اپنے آنے کا ہمیشہ کوئی نہ کوئی جواز ہوتا تھا۔ اچھا ہے کہ وہ نہ آئے تھے، میں کس طرح اس کا سامنا کرتی؟ دل میں جو درد تھے وہ جانے کس طرح دوسروں کی نظر سے بچا پاتی تھی مگر وہ...... وہ دیکھتا تو پھر جان جاتا اور میں کبھی نہ چاہتی تھی کہ وہ مجھے کسی بھی طرح ناخوش دیکھے، میرے چہرے سے میرے دل کی عبارتیں پڑھ لے اور سمجھ سے سوال کرے۔ میں اس کا سامنا ہونے کے خیال سے ڈرنے لگی تھی، میں تو خود سے بھی ڈرنے لگی تھی کہ جانے انجانے میں وہ میرے خیالوں اور خوابوں میں آنے لگا تھا۔ تکلیف میں وہ مجھے یاد آنے لگا تھا، یاد آتا کہ کس طرح وہ میرے چہرے سے میری خوشی یا تکلیف کا اندازہ لگا لیتا تھا۔ یوں تو کوئی بھی مجھے مجھ سے بڑھ کر نہ جانتا تھا۔

کیا میں اس کی محبت کو اپنے دل سے کھرچ نہ پائی تھی؟ میں کیوں بد دیانتی کی مرتکب ہو رہی تھی؟ میں خود سے سوال کرتی۔

☆☆☆

اس رات کھانے کے بعد میں اپنے کمرے میں گئی تو وہ پہلے سے کمرے میں موجود تھا، بڑی خاص شام تھی جو وہ اس وقت گھر پر تھا۔ صوفے پر بیٹھا وہ اپنے لیپ ٹاپ پر بظاہر کوئی کام کر رہا تھا، میں ذرا سی تھکی، اس کے قریب جا کر صوفے پر بیٹھنے لگی تو اس نے فوراً لیپ ٹاپ اسی طرح بند کر کے تپائی پر رکھ دیا۔

''کیا بات ہے...... کچھ کہنا ہے کیا؟'' وہ میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ''کوئی کام ہے...... کوئی مسئلہ؟''

''ہوں۔'' میں نے خالی دماغ سے اس کی طرف دیکھا۔ ''نہیں، کچھ بھی تو نہیں۔''

''تم ٹھیک تو ہوناں؟'' وہ چونکا تھا یا اسے میرے انداز سے تشویش ہوئی تھی۔
''ہاں، بالکل ٹھیک ہوں میں۔'' میں اسے کچھ کہتے، کہتے رکی تھی۔ میرے دل پر جو بوجھ تھا وہ کسی سے تو بٹانا تھا ورنہ میں ضبط نہ کر پاتی مگر کس طرح کہوں۔
''مجھے لگتا ہے کہ تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو؟'' اس نے میری طرف غور سے دیکھا۔
''ہاں......وہ......'' میں رکی۔ ''ہاں کچھ بات کرنا تھی......'' کچھ سوچا۔ ''اصل میں مجھے نیند آ رہی ہے اب۔''
''اگر صرف نیند آ رہی ہے تو سو جاؤ ناں...؟'' وہ مسکرایا تھا۔ ''یا پھر اس کے لبوں پر شرارت تھی۔
''ہوں......'' میں نے اس کی طرف کھوئے ہوئے انداز میں دیکھا۔ میں شاید اسے اس وقت لیپ ٹاپ سے ہٹانا چاہ رہی تھی، مجھے تجسس ہو رہا تھا، کسی طرح جاننا چاہتی تھی کہ وہ کیا کر رہا تھا۔ اس نے لیپ ٹاپ اسی طرح بند کر کے رکھ دیا اور میری طرف متوجہ ہوا۔ اپنے فون اور لیپ ٹاپ کو وہ عموماً کم ہی یوں چھوڑتا تھا...... جانے کیا کیا راز دفن تھے اس کے۔
''تم کچھ چھپا تو نہیں رہے مجھ سے؟'' میرے ہونٹوں سے سوال پھسل گیا۔
''مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے کہ تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔'' وہ نظر چرا کر الٹا مجھ سے سوال کر رہا تھا۔
''میں کیا چھپاؤں گی تم سے زین؟'' میں نے ہولے سے کہا۔
''اور میں کیا چھپاؤں گا؟'' اس نے پیار سے مجھے اپنے نزدیک کیا۔ جانے وہ مجھے بہلا رہا تھا یا وہ رات ایسی ہی راتوں میں سے ایک رات تھی جب وہ اپنے ہوش و حواس میں مجھ پر محبت لٹاتا تھا...... شاید ان راتوں میں بھی اس کے تصور کی دنیا کسی اور کے تصور و خیال سے آباد ہوتی تھی۔
''تم لیپ ٹاپ پر کام کرتے ہوئے بہت خوش تھے...... مسکرا رہے تھے۔''
''ارے ہاں...... کچھ تصاویر دیکھ رہا تھا، مری کے ٹرپ کی اور پچھلے چند دن دوستوں کے ساتھ باہر گھومتا رہا تھا...... جب تائی جان یہاں تھیں، ہم نے بہت انجوائے کیا۔'' اس نے شاید سچ بولا تھا اگرچہ اس نے دوستوں کی وضاحت نہیں کی تھی۔ ''کسی وقت دکھاؤں گا تمہیں وہ تصویریں۔''
''اچھا......'' میں نے اس کے جوش کے جواب میں سرد مہری سے کہا۔ ''میں سمجھی کسی سے چیٹ کر رہے تھے تم......وڈیو چیٹ۔''
''تمہیں کچھ بات کرنا تھی مجھ سے۔'' اس نے میری بات کے جواب میں کہا، میرے لہجے میں چھپا طنز اسے سمجھ میں ہی نہ آیا تھا یا وہ نظر انداز کر گیا تھا۔
''جو بات میں تمہیں بتانے والی ہوں زین...... اسے تم انجوائے نہ کر سکو گے، اس لیے اسے کسی اور وقت پر اٹھا رکھتے ہیں۔''
''نہیں، مجھے ابھی بتاؤ ورنہ میں تجسس سے رات بھر سو نہ پاؤں گا۔'' اس نے بے قراری سے کہا۔
''جان لو گے تو بھی سو نہ پاؤ گے زین۔''
''پھر تو میں ضرور جاننا چاہوں گا۔'' اس نے مجھے اپنی بانہوں سے آزاد کیا اور میرے سامنے بیٹھ کر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔
''اس انکشاف کا بوجھ اٹھا نہ پاؤ گے تم، زین!'' میں سسکی۔ ''مگر پھر بھی مجھے بتانا تو ہے تمہیں...... تو سنو۔'' میری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں اور ان آنسوؤں کے پار مجھے اس کے چہرے پر خوف کا لیپ صاف نظر آ رہا تھا۔
(جاری ہے)



ٹپ... ٹپ... ٹپ

صبیحہ شاہ

سائنس دانوں نے آسمان میں تو تھگلی لگالی ہے لیکن ایک وہ ریموٹ کنٹرول نہ ایجاد کرسکے جو وقت کو فارورڈ، اسٹل یا ری وائنڈ کرسکتا...... اگر وہ ریموٹ ایجاد ہو چکا ہوتا تو یقین کریں آج فاریہ زید وہ ریموٹ چاہے جتنا بھی مہنگا ہوتا خرید لاتی...... خواہ اس کے لیے اپنے آپ کو بھی بیچ دینا پڑتا تب بھی...... تب بھی خرید لاتی اور وقت کو ری وائنڈ کرلیتی...... درمیان میں سے کچھ فارورڈ کرلیتی، کچھ اسٹل کرلیتی...... اور پھر وہ زندگی

کے اس دور کو اسٹل کر لیتی جب وہ ٹپ ٹپ......ٹپ ٹپ......ٹپ سے نجات کے لیے سار یہ اور ماریہ پر حکم چلا لیتی تھی، شور و ہنگامہ ڈال کر اپنی باتیں منوا لیتی تھی......اکثر دھونس دھڑی، زیادتی اس کی ہی طرف سے ہوتی مگر اماں اور بابا کا ووٹ اکثر ہی اس کے ساتھ ہوتا......لیکن......مسئلہ یہ بھی تھا کہ وقت کو کنٹرول کرنے والا کوئی ریموٹ اگر نہ تھا تو مقابل بھی سار یہ اور ماریہ اس کی چھوٹی بہنیں نہیں زارا اور سارہ تھیں......اس کی اپنی نو عمر بیٹیاں......نئے دور کی، الیکٹرانک ایجادات کے درمیان پروردہ چھوٹی، چھوٹی معصوم سی (اسے تو لگتی تھیں) مگر بہت باخبر (یہ بھی آج ہی پتا چلا) بچیاں......اور ٹپ ٹپ......ٹپ ٹپ سے تکیوں میں منہ دے کر کسی بھی طرح بچا جا سکتا تھا، کسی بھی طرح بچ ہی جاتی تھی لیکن اب......اب جو زارا کا کہا، زارا کا جواب ٹپ ٹپ......ٹپ ٹپ......ٹپ کے مانند بجتا سازِ زندگی کا ساتھی بنتا لگتا ہے، اس سے کیسے نجات پائے؟'' وہ بات جو اس کے خیال میں راز تھی۔ بجتا ساز بن جائے گی۔ یہ تو پتا نہ تھا......

☆☆☆

وہ تینوں بہنیں فاریہ، سار یہ اور ماریہ ایک ہی کمرا شیئر کرتی تھیں......کچھ عجیب ہی طریقۂ تعمیر چل نکلا ہے بھئی......گھر 120 گز کا ہو، 240 گز کا یا 400 گز کا......بیڈ روم تین ہی بنتے ہیں۔ وہ......ابا کا گھر جو دو سو چالیس گز کا تھا۔ اس کے بھی تین ہی بیڈ روم تھے اور تینوں بہنوں کو ایک ہی کمرا شیئر کرنا پڑتا تھا۔ عابس اور عابد دونوں بھائیوں کا ایک کمرا تھا اور ایک بیڈ روم ظاہر ہے اماں اور ابا کے تصرف میں تھا......دادی جان دو چار مہینے بعد آتیں تو ٹی وی لاؤنج میں ایک صوفہ کم بیڈ اور ایک دروازوں والی سائڈ ٹیبل پر مشتمل کارنر ان کے لیے مختص تھا اور دادی اماں گھر کے اس مرکز و محور میں خوش رہتیں کہ گھر سے نکلتے اور داخل ہوتے ہر فرد سے سلام دعا سب سے پہلے ان سے ہی ہوتی۔ تین بہنیں، بالترتیب فاریہ، سار یہ اور ماریہ تینوں کے مزاج مختلف اور کمرا ایک اور یہ ایک کمرا اکثر محاذِ جنگ بنا ہوتا۔ فاریہ بڑی اولاد ہونے کے ناتے لاڈلی، نخریلی، حاکمانہ مزاج اور نفاست پسندی کی انتہا......سار یہ بے پروا، مست ملنگ، زندگی میں اور زندگی کے معمولات میں آسانیاں ڈھونڈ نکالنے میں ماہر......ماریہ بہنوں میں ہی نہیں بھائیوں میں بھی چھوٹی تھی جس کا رونا تھا کہ آدمی جیون میں کتا بن جائے، چھوٹا نہ بنے......وہ چھوٹی ہونے کے ناتے لاڈلی تو تھی مگر حکم کی غلام بھی تھی۔ جس کا جب دل چاہتا لاڈ دلار کر لیتا، سر پہ بٹھا لیتا، کلیجے میں گھسا لیتا اور جب دل چاہتا ''چھوٹا'' بنا لیتا......بہنوں کا مشترکہ کمرا میدانِ کارزار بن جاتا جب سار یہ بستر سے اٹھ کر سمٹی ہوئی چادر، ترچھے، اوندھے پڑے تکیے درست کیے بغیر اٹھ کر چل دیتی، باتھ روم میں ٹوتھ پیسٹ بنا ڈھکن بند کیے چھوڑ آتی۔ اکثر فیس واش کا ڈھکن کہیں ٹیوب یا بوتل کہیں پڑی ہوتی، فاریہ کو بے ترتیبی سے چڑ تھی وہ ماریہ کی کوتاہی تو پھر بھی نظر انداز کر دیتی مگر سار یہ سے الجھ پڑتی۔ ڈریسنگ پر کنگھے میں لگے بال، پرفیوم یا لپ اسٹک جگہ سے بے جگہ اور ان کے کھلے ڈھکن اسے چراغ پا کر دیتے اور سب سے زیادہ چڑ تو اسے تب ہوتی جب وہ سونے کے لیے لیٹتی اور دوپہر یا رات کے نیند بھرے سناٹے میں باتھ روم سے ٹپ ٹپ......ٹپ ٹپ پانی کے قطرے گرنے کی موہوم سی آوازیں......ساعت پر ہتھوڑے کی دھمک بن کر لگتیں......وہ تکیوں میں سر دیے جب کروٹ بدل کر عاجز آ جاتی تو چلا پڑتی۔

''سار یہ کی بچی......''

''ہیں......کہاں؟ کہاں ہے میری بچی......؟'' سار یہ انتہائی مکاری سے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے کی اداکاری کرتی۔

''نلکا تو صحیح بند کر دیا کرو......'' فاریہ چلّاتی۔

''کون سا نل......کا؟'' تجاہلِ عارفانہ۔

''ہاتھ ٹوٹے ہوئے ہیں تمہارے۔ بند نہیں ہوتا ٹھیک سے نلکا؟''

"چلو بند کر کے آؤ......" نیند میں خلل پڑنے کا غصہ اس کا لہجہ اس کے جملے توڑ، توڑ دیتا۔

"خواہ مخواہ؟" ساریہ پسر جاتی۔ "یہاں لیٹے، لیٹے تمہیں الہام ہو جاتا ہے کہ نلکا کھلا ہوا ہے۔"

"بدتمیز نہ ہو تو......" فاریہ دانت پیستی اٹھتی اور نلکا صحیح سے بند کر کے باتھ روم کا دروازہ بند کر کے آتی۔

"پتا نہیں یار...... تمہارے دماغ میں کیا مالیخولیا ہے۔" ساریہ منہ پر چادر ڈالے، ڈالے بولتی۔ "ایک موہوم سے قطرے کی آواز تم کو ایٹم بم لگنے لگتی ہے۔ اتنا نہ سوچا کرو بہن...... زندگی بڑی مشکل ہو جائے گی۔"

اسے مفت مشورہ ملتا...... اور یہ ہر دوسرے، تیسرے دن کی کہانی ہوتی...... جب بھی ساریہ کو فاریہ سے کوئی بدلہ لینا ہوتا وہ اسے نیند میں جاتے دیکھ کر خاموشی سے اٹھتی۔ نلکا ذرا، بالکل ذرا سا کھولتی، اتنا کہ ایک، ایک قطرہ بالٹی میں ٹپکے اور آ کر سوتی بن جاتی اور ایسا کرتے ہوئے باتھ روم کا دروازہ کھلا چھوڑنا کبھی نہ بھولتی...... اور سوئی ہوئی فاریہ کو تو پہلے گہری نیند میں بھی قطروں کا ٹپکنا خواب لگتا جو جلد ہی عذاب بن جاتا وہ کروٹیں بدل، بدل کر کانوں کو تکیوں میں دبا، دبا کر تھک جاتی تو بلبلا کر جھنجلا کر چیخ پڑتی...... ساریہ کا مقصد پورا ہو چکا ہوتا اور وہ چین کی نیند سو رہی ہوتی۔ اور اب جانے اس کی بلا، دنیا میں بم پھٹے یا فاریہ قیامت کا سور پھونکے...... اماں سر پکڑ، پکڑ کر ہولا کرتیں کہ "یا اللہ اتنی بڑی، بڑی گھوڑیاں بچوں کی طرح لڑتی ہیں۔ ایک بہن کو دوسری بہن برداشت نہیں تو سسرال کیسے برداشت ہوگی؟"

"اماں مجھے تو سب کچھ برداشت ہے اللہ قسم......" ساریہ معصوم بن جاتی۔

"دفع ہو نیک بخت......" اماں جوتا اٹھا لیتیں۔

"تو کتنی معصوم ہے مجھے نہیں پتا ہوگا تو اور کون جانے گا۔ ارے غنیمت جانو، یہ وقت۔" وہ روہانسی ہو جاتیں۔

"کیوں......؟ اس وقت کے بعد فاریہ کے سینگ نکل آئیں گے؟" ماریہ کی معصومیت عروج پر ہوتی اور دھم سے اماں کا دھموکا پڑتا۔

"کل جب خیر سے اپنے، اپنے گھروں میں ہوگی، اپنے، اپنے کمروں میں تو یہی مشترکہ کمرا یاد کرو گی...... بہن کیا نعمت ہے، یہ بھی تب ہی پتا چلے گا۔"

"توبہ...... میں تو کبھی یاد نہ کروں گی۔" فاریہ بڑبڑاتی۔ اور آج فاریہ کو ہی وہ سارے جھگڑے جو وہ ساریہ سے کرتی تھی، وہ سارے احکامات جو ماریہ، عابس اور عابد سے ان کے چون و چرا...... کیے بغیر منوا لیتی تھی تمام جزئیات کے ساتھ ایک حسین خواب کی طرح یاد آ رہے تھے...... آج کی خوفناک صورتِ حال سے بچنے کی شاید یہی صورت تھی۔

فاریہ کی شادی طے ہوئی تو شاید فاریہ سے زیادہ ساریہ خوش تھی۔

"ہا......" وہ کمرے میں دونوں ہاتھ پھیلائے گول، گول گھوم رہی تھی۔

"کتنا سکون ہوا کرے گا اِس کمرے میں......" وہ ماریہ سے کہہ رہی تھی اور ماریہ منہ چھپا کر ہنس رہی تھی۔

"کھل کر رہیں گے اب ہم کھل کر......" شرارت سے اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"اللہ کرے تجھے یہاں رہنا نصیب ہی نہیں ہو...... تیری بھی شادی ہو جائے۔ دفع ہو یہاں سے۔" فاریہ جل بھن کر بولی تھی۔

"ہا...... ہائے...... بندے کی صوت اچھی نہیں ہو بات تو اچھی کرے۔" ساریہ نے ماسی نذیراں کی طرح ناک پر انگلی رکھ کر کہا تھا۔

شاید بہنوں کی بددعائیں بھی دعائیں بن کر لگتی ہیں۔ فاریہ کی شادی طے ہوئی، ڈیٹ سات مہینے بعد کی رکھی گئی اور ابھی دو مہینے نہیں گزرے تھے کہ ابا کے دوست اپنے بیٹے کے لیے سوالی بن کر آ کھڑے ہوئے، چھان پھٹک تحقیق کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ سالوں کے جانے، بوجھے، پرکھے ہوئے تھے۔ اظہار چچا اور ان کا گھرانا...... سو کسی سوچ بچار، انکار کا سوال

ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ساریہ نے بڑا واویلا مچایا۔
''ہائے، ہائے ابھی تو مجھے اس کمرے میں چین سے سونا تھا، کسی ڈانٹ، ڈپٹ، جھگڑے ٹینشن کے بغیر...... پیاری ماں، ظالم ماں...... تم سے میری خوشی دیکھی نہیں گئی۔ میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ تم میری ماں نہیں...... فاریہ کی ایجنٹ ہو......'' اور ابھی جملہ مکمل ہی ہوا تھا کہ اماں کی جوتی اڑتی ہوئی اور ساریہ کے کندھے کو سینکتی دور جا گری...... وہ اوئی، ہائے کر کے کندھا سہلاتی، منہ بسورتی مگر ہنستی کھلکھلاتی ساریہ آج بھی فاریہ کی آنکھوں میں تصویر تھی۔

شادی کے دن قریب آ رہے تھے، فاریہ پر کبھی خوشی کبھی غم والی کیفیت طاری تھی، جہاں نت نئے کپڑے، زیور کی خریداری، دنیاوی اور بہت سی نئی چیزیں طمانیت و خوشی کا احساس بن کر دل و جان میں اترتیں وہیں نا معلوم سے خدشات، اوہام دل کی پریشانی کا باعث بھی تھے۔ اور ساریہ کبھی، کبھی تو سچی بات ہے کہ فاریہ کو اس پر رشک بھی آتا...... عجیب ٹینشن فری سی شخصیت تھی اس کی، جو اس کو کبھی تو...... بے بس لگتی اور کبھی وہ الجھ جاتی کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ شادی ہو رہی ہو اور اس حوالے سے کچھ بھی خاص کرنے، سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرے کوئی...... یہ ٹھیک ہے کہ اظہار چچا کا گھرانا اور مظہر دیکھے بھالے تھے...... لیکن اس نے کبھی یہ کیوں نہیں سوچا کہ مظہر کے پاس تو بائیک ہے، زید کے پاس گاڑی؟ فاریہ بیاہ کر گلشن جائے گی اور ساریہ...... وہ فیڈرل بی ایریا...... مظہر اور زید کے گھرانوں کے رکھ رکھاؤ، رہن سہن میں ایک واضح فرق ہے...... ساریہ نے تو شاید نہیں...... مگر فاریہ نے ساریہ کی ہمدردی میں یہ سوال ضرور اٹھایا تھا...... اور اماں نے بڑی رسانیت سے جواباً کہا تھا۔

''ہاں ہمارے پیش نظر یہ نکتہ ہے اور تھا...... لیکن مظہر نسبتاً کم عمر ہے...... ابھی تو وہ پاس آؤٹ ہی ہوا ہے اور جاب شروع کی ہے، ایک دم ہی تو سب کچھ نہیں مل جاتا ناں...... اظہار بھائی کا گھرانا ساریہ کو اچھی طرح جانتا اور سمجھتا ہے...... اور ساریہ بھی مطمئن ہے تو تم کو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''مظہر کم عمر......؟ تو آپ میری شادی بڈھے سے کر رہی ہیں؟'' فاریہ حسب عادت بھڑک گئی تھی اور اماں نے تاسف سے اسے دیکھا تھا۔

''اپنے مزاج پر قابو پاؤ فاریہ...... تم ساریہ سے تین برس بڑی ہو اور مظہر ساریہ سے صرف سال بھر بڑا ہے اور زید تم سے کم و بیش پانچ برس بڑا ہے...... تو وہ بڈھا ہو گیا؟ بیٹا خوش ہونا اور شکر گزار ہونا سیکھو...... چھوٹی، چھوٹی چیزوں، باتوں کو تنقیدی نظر سے دیکھنے کے بجائے نظر انداز کرنا سیکھو...... ورنہ بڑی مشکل ہو جائے گی، شادی شدہ زندگی میں تو زندگی کو سیٹل رکھنے کے لیے بڑی، بڑی باتوں کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔''

''کیا مطلب ہے، میں ناشکری ہوں؟'' فاریہ تنک گئی۔ ''اور میں تو ساریہ کے لیے کہہ رہی ہوں...... آفٹر آل بہن ہے میری۔''

''اور میری بیٹی......!'' اماں نے ہاتھ میں پکڑی کتاب ٹھک سے بند کی۔

''تم مت پریشان ہو۔'' ان کے انداز میں واضح ناراضی اور ناپسندیدگی تھی۔ ''اور ہاں......'' انہوں نے گھور کر اسے دیکھا۔ ''اپنے یہ نادر خیالات اور فکر مندی ابھی یہیں دفن کر دو...... ساریہ کے سامنے کچھ بک کر اس کا ذہن خراب کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''لو بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ اونہوں......'' فاریہ کا موڈ خراب ہو گیا...... اس نے سر جھٹکا۔

ویسے بھی دو شادیاں ایک ساتھ نہیں ہونی چاہئیں...... نہ بہنوں کی نہ بھائیوں کی...... ایک نامحسوس سی مقابلے و تقابل کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ فاریہ کا لباس، زیور، تمام بری جو وہاں سے آئی بہت اعلیٰ تھی...... دولہا بنا زید گو کہ سنجیدہ نظر آ رہا تھا لیکن خوش شکل اور جامہ زیب تھا۔ گھر والے سب ہی اسٹائلش

اور امارت کی بولتی تصویر...... جبکہ مظہر کے گھر سے آئی بری گو کہ معمولی یا کم تر نہ تھی مگر زید کے گھر سے آئی بری کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی۔ ساریہ کے کپڑے فاریہ کے لباس کے مقابلے میں واضح طور پر کم قیمت تھے۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ مہمان تو دبے الفاظ اور آواز میں تقابلی جائزے میں مشغول تھے لیکن اماں، ابا کی نظروں میں ان چیزوں کی کوئی اہمیت و وقعت محسوس نہیں ہو رہی تھی...... حد تو یہ ہے کہ ساریہ بھی بے حد مطمئن نظر آ رہی تھی، اس نے فاریہ کی چیزیوں کو سراہا ضرور تھا مگر اس کے انداز میں کہیں بھی کسی محرومی یا احساسِ کمتری کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ زید کے مقابلے میں مظہر نہایت خوش مزاجی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ وہ کچھ بے چین فطرت کا حامل لڑکا تھا، یا شاید اس گھرانے سے پرانے تعلقات تھے، جس کی وجہ سے بے تکلفی تھی اور ذرا دیر ہی وہ اسٹیج پر دولہا بن کر بیٹھا پھر وہ کسی سے ملنے اسٹیج سے اترا تو دلہن کی آمد پر باقاعدہ اس کی ڈھنڈیا پڑی اور وہ ڈنر ٹیبل سے ڈھکنا ہٹا کر ڈش سے کانٹے میں گلاب جامن پرو کر کھاتا ہوا پایا گیا۔ دلہنیں اسٹیج پر بیٹھیں تو کم قیمت لباس و زیور کے باوجود ساریہ کے حسن و معصومیت اور بے پناہ روپ کو سب نے ہی محسوس کیا اور ڈسکس بھی کیا...... وقت کے ساتھ یہ تقابلی جائزے بظاہر تو ختم ہو گئے، دعوتوں، آؤٹنگ وغیرہ کی پُر ہنگام مصروفیات سے گزر کر زندگیاں معمول پر آنے لگی تھیں۔ ساریہ اور فاریہ کی چھیڑ چھاڑ، جھگڑوں، لڑائیوں سے گونجتا کمرا اب ماریہ کی خاموشیوں سے آباد تھا۔ وہ فلسفی ٹائپ اپنے آپ میں گم رہنے والی بچی بھی اکثر اپنی فاریہ آپی کے احکامات اور ساریہ باجی کی دوستانہ مگر پُر ہنگام موجودگی کو مس کرتی...... جبکہ فاریہ ہر ویک اینڈ پر جب آ کر رہتی تو اسے لگتا کہ گھر میں سب ہی تو ہیں...... بس ایک ساریہ ہی تو نہیں ہے پھر بھی کیسی خاموشی اور کیسے سناٹے کا راج ہے گھر پر...... ایک دن اس نے اماں سے کہہ بھی دیا...... اماں مسکرائیں۔

”ہاں بیٹا......! اب یاد آتی ہے ناں بہن......“

شکست کا اعتراف فاریہ کا مزاج نہیں تھا...... اور اب یہ اعتراف کرنا کہ بہن یاد آتی ہے، اسے شکست ہی لگا۔

”نہیں...... اب ایسی بھی بات نہیں......“ اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔ ”میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ ساریہ آتی نہیں......؟ پندرہ دن پہلے میری ملاقات ہوئی تھی اس سے...... مظہر کیا ایک دن بھی اسے آف نہیں دے سکتا۔“

”آف......؟“ اماں نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

”ہاں، ہاں......ں...... میرا مطلب ہے کہ ہفتے میں ایک دن تو اسے یہاں چھوڑ جایا کرے......“ فاریہ گڑبڑا گئی۔

”ہوں......“ اماں نے گہری سانس بھری۔ ”چھوڑ جایا کرے کا کیا مطلب......؟ وہ کوئی قید میں تو ہے نہیں...... جب اس کا دل چاہتا ہے آ جاتی ہے۔“

”چہ...... میں تو کہہ رہی......“

”بس بیٹا......“ اماں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”تم کچھ نہ کہو...... ساریہ کو پتا ہے کہ کب اسے کیا کرنا...... کہاں جانا اور آنا ہے...... تم اپنی سناؤ...... زید کی دادی کیسی ہیں اب؟“ اماں نے بات کا رخ ہی موڑ دیا۔

فاریہ اب برانڈڈ کپڑے پہن رہی تھی، گاڑی کے ساتھ وقتِ ضرورت ڈرائیور بھی مل جاتا...... جس دن اور جب اسے اماں کے گھر جانا ہوتا یا بازار جانا ہوتا زید آفس پہنچ کر ڈرائیور گھر بھیج دیتا۔ شروع، شروع میں تو فاریہ نے چاہا کہ وہ ہر جگہ زید کے ساتھ جائے لیکن زید نے سہولت سے سمجھایا کہ تمہاری شادی ایک بینکر سے ہوئی ہے۔ بینکر کے جانے کا وقت مقرر ہوتا ہے واپسی کا نہیں...... سو، اپنے کام خود کرنے کی عادت ڈالو...... بینک میں ہفتے کو چھٹی ہوتی لیکن اکثر ہی زید کو ہفتے کو بھی جانا پڑتا...... زید سب سے بڑا بھائی تھا، لاڈلا...... حکم ماننے نہیں بلکہ حکم منوانے کا عادی ...... چھوٹے دو بہن، بھائی...... ساریہ اور عابس نہیں

تھے، جی باجی کرنے والے بلکہ وہ دیور اور نند تھے اور وہ ''بھابی......'' زندگی اور اپنا آپ اچانک ہی بیچارہ، بیچارہ لگنے لگا تھا۔ کبھی اس کو ساریہ اور عابد کی شرارتیں بدتمیزی اور زہر سے بھی زیادہ بری لگتی تھیں، ساریہ کی مستقل بولنے کی عادت سے وہ تنگ تھی اور اب زید کی خاموش اور سنجیدہ طبیعت اس کے اندر ایک چڑچڑاپن اور جھلاہٹ کے احساس کو توانا کر رہی تھی، خصوصاً تب جب وہ ساریہ اور مظہر کو طوطا، مینا کی طرح مستقل سر جوڑے باتیں کرتے دیکھتی، ایک دوسرے کے ہاتھوں پر ہاتھ مار کر قہقہے لگاتے دیکھتی...... کبھی یہ سب اسے چھچھور پن لگا کرتا تھا مگر اب...... آہ......

اس روز اس کی اور ساریہ و مظہر کی ملاقات تقریباً مہینے بھر بعد اماں کے گھر ہوئی تھی۔ زید بینکنگ کا ایڈوانس کورس کر رہا تھا۔ ہفتے اور اتوار اس کی کلاسز ہو رہی تھیں، اسے رات واپسی میں فاریہ کو پک کرنے آنا تھا، وہ جاتے ہوئے اسے ڈراپ کر گیا تھا۔ اندر گئی تو عالبس، عابد، ماریہ کے ساتھ، ساتھ ساریہ اور مظہر بھی موجود تھے اور اس کا گرمجوشی سے استقبال کیا گیا...... لان کے معمولی سے سی گرین سوٹ میں ساریہ کھلی، کھلی بہت ہی حسین سی لگی...... سیاہ اور سی گرین بڑی، بڑی بالیاں ہنستے ہوئے اس کے گالوں پر جھول، جھول جاتیں...... وہ ہمیشہ کی طرح اچھلتی کودتی پھر رہی تھی۔

''یہاں بیٹھ جاؤ باجی آرام سے......'' وہ تخت پر اس کے لیے کشن اور گاؤ تکیہ سیٹ کر رہی تھیں۔

''لو باجی...... یہ جوس پی لو۔'' وہ گلاس میں سے ایک سپ لے کر اورنج جوس کا گلاس اس کی طرف بڑھا رہی تھی۔

عجیب ہی بات تھی کہ ساریہ کی اتنی توجہ اور خاطر داری بھی اسے خوش نہیں کر رہی تھی۔

''میں خالہ بننے والی ہوں۔'' یہ خوشی ساریہ کو نہال کیے دے رہی تھی۔

اور فاریہ کو...... وہ بھی خوش تھی مگر مظہر اور ساریہ کے رشتے میں جو قربت، محبت، گرمجوشی اور بے تکلفی تھی وہ اسے ایک نامحسوس سے احساسِ محرومی سے دوچار کر رہی تھی۔

☆☆☆

زارا اور پھر ڈیڑھ برس بعد ہی سارہ کی پیدائش نے زندگی کے ٹھہراؤ اور فرصتوں کو اچانک ہی بے پناہ مصروفیات کے تلاطم میں گھن چکر بنا دیا تھا۔ بچیوں کو سنبھالنے میں مدد دینے کے لیے ایک فل ٹائم ملازمہ تھی مگر اب زندگی کے ڈھنگ اور رنگ بالکل بدل گئے تھے...... زید بچیوں کی پیدائش پر خوش تھا مگر وہ اس کی عملی طور پر کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے نیا بینک جوائن کیا تھا، عہدہ اچھا تھا تو ذمے داریاں اور مصروفیات بھی دو چند ہوگئی تھیں...... اب ڈرائیور صرف فاریہ کے لیے مختص تھا مع ایک چھوٹی کار کے...... بچوں کی شاپنگ، ان کی ویکسینیشن، ڈاکٹروں کے وزٹ...... اور رشتے داریاں بھی اسے ہی نبھانی ہوتیں...... دیور اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرون ملک اور نند سسرال سدھار چکی تھی اور ساس...... ان کا وجود بے ضرر اور پُرسکون تھا...... دادی بھی اللہ کو پیاری ہوگئی تھیں۔ دیکھنے والوں کو فاریہ کی زندگی قابلِ رشک لگتی...... لیکن کوئی فاریہ سے پوچھتا...... وہ شاپنگ سینٹرز میں، کلینک میں، سڑکوں پہ، پارکوں میں بچوں کو باپوں کے ساتھ دیکھتی تو ایک بے بس غصہ اس کے اندر دھوئیں کی طرح بھرنے لگتا اور دھواں جس گھٹن اور جس کاڈک کا باعث بنتا، اس کا ذہن بن رہا تھا...... وہ اپنی اس گھٹن کا اظہار نہیں کر رہی تھی کہ اظہار اس کے نزدیک شکست تھی اور وہ شکست تسلیم نہیں کر سکتی تھی...... ہاں...... اس کا غصہ بڑھ گیا تھا، طبیعت میں بے کلی آ رہی تھی، بظاہر وہ نک سک سے درست خوش باش نظر آتی مگر ماں کی آنکھ نے اس کے اندر پلتے طوفان کے جھکڑوں کو محسوس کر لیا تھا...... آنے بہانے وہ اس کو سمجھانے کی کوشش کرتیں...... اکثر زید کی غیر موجودگی پر مثبت انداز میں ری ایکٹ کرتیں...... اور جب، جب وہ دیر سے آتا تو اسے خصوصی پروٹوکول اس

کی مصروفیات کے پیشِ نظر دیا جاتا......ایسے میں فاریہ کے اندر ابال سا اٹھتا۔

''ہونہہ...... پاکستان کے سارے بینک ان کے سر پر ہی تو دھرے ہیں، ذرا ہلے تو دھڑام سے آگریں گے......'' لیکن......ساتھ، ساتھ وہ غائر نظروں سے مظہر اور ساریہ کو بھی دیکھتی کہ......زید کو دیے جانے والے پروٹوکول اور اہمیت کو وہ کیسے لیتے ہیں......اور وہ دونوں تو جانے کون سے باغ کے پرندے تھے۔ویسے ہی معمول کے مطابق چہچہاتے، وہ بھی زید کی خاطر داریوں میں بچھ رہے ہوتے......کبھی کسی آفیشنل ڈنر میں جہاں فیملیز بھی انوائٹ ہوتیں یا زید کے کسی کولیگ کے انوائٹ کرنے پر بیگمات سے ملاقات ہوتی تو وہ سب بھی شوہروں سے کم ٹائم ملنے پر نالاں وشاکی تو نظر آتیں مگر مطمئن بھی نظر آتیں......تو خود اپنے مطمئن نہ ہونے پر ہی وہ الجھ جاتی۔

اس روز اماں کے گھر سب جمع تھے......زید بینکنگ انسٹی ٹیوٹ گیا ہوا تھا......کھانے پر سب انتظار کررہے تھے، جھنجلا کر فاریہ نے فون نکالا کہ پتا کروں اور کتنی دیر انتظار کیا جائے......ساریہ کی نظر فون پر پڑی تو وہ اچھل کر آئی اور بڑے اشتیاق سے اس کے ہاتھ سے فون لے کر دیکھا۔

''کب لیا باجی......؟ فلاں ہے ناں...... ہائے......کتنا پیارا ہے۔'' وہ الٹ پلٹ کر فون چیک کررہی تھی۔

''تمہارا دل نہیں چاہتا نیا فون لینے کا؟'' اچانک ہی فاریہ نے ساریہ سے پوچھ لیا۔

''ہاں......کیوں نہیں؟'' وہ شہادت کی انگلی اسکرین پر پھیرتے ہوئے مگن تھی۔

''تو لیتی کیوں نہیں؟'' فاریہ گہری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''ہاں......لوں گی۔'' وہ ویسے ہی مگن تھی۔

''مظہر کہہ رہے تھے کہ دو تین مہینے ٹھہر جاؤ۔''

اور فاریہ گہری سانس لے کر رہ گئی......''یہ

قابلِ غور

☆ ہر شخص کو اپنی عقل سب سے اعلیٰ اور اپنا بیٹا سب سے پیارا نظر آتا ہے۔

☆ جو شخص طاقت کے دنوں میں نیکی نہیں کرتا، ناتوانی کے دنوں میں سختی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔

☆ اس سے برا کوئی نہیں جو اپنے اوپر مہربانی کرنے والے کو بھی برا سمجھے۔

☆ جو اللہ کا ہو جاتا ہے وہ کسی کا محتاج نہیں ہوتا سوائے خود اللہ کریم کے۔

☆ کمزور پر رحم کرو گے تو زبردستوں کے ظلم سے بچ جاؤ گے۔

☆ تو جتنی چاہے مجھے نصیحت کر، حبشی کی سیاہی کبھی دھونے سے دور نہیں ہوتی۔

☆ جب آمدنی نہ ہو تو خرچ تھوڑا، تھوڑا کر کیونکہ ملاح گایا کرتے ہیں کہ پہاڑوں پر بارش نہ ہو تو دریائے دجلہ بھی ایک سال میں خشک ہو جائے گا۔

☆ خدا کے دوستوں کی اندھیری رات بھی روزِ روشن کی طرح چمکتی ہے۔

☆ زمانے کی گردش سے دل شکستہ ہو کر نہ بیٹھ، اس کے لیے تو صبر کراگر چہ کڑوا ہے لیکن اس کا پھل میٹھا ہے۔

☆ اگر تمہیں اپنے دشمنوں سے اپنے جائز حق کے لیے جھگڑنا پڑے تو بھی انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دینا۔

☆ ہر دانا، مخلص اور اچھا آدمی گفتگو کم کرتا ہے اور عمل زیادہ......مالی طور پر اپنے سے بہتر لوگوں کے ساتھ دوستی نہ کرو۔

☆ میں نے ایلوا کھایا اور کڑوی چیزوں کو پیا مگر محتاجی سے زیادہ کڑوا کسی چیز کو نہ پایا۔

از: نگہت غفار، کراچی

بے حس ہے یا...... صابر...... یا شو کرتی ہے اور اندر......"
فاریہ الجھی، الجھی سی اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیا یہ واقعی جیلس نہیں ہوتی؟ تو...... میں کیوں ہوتی ہوں؟ میں کیوں ہوتی ہوں اس کے.... بے وقوفی سے ہنسنے پر، اس کے اور اس کے میاں کے چھچھورپن پر......؟ اس کے میاں کی کمر میں بانہیں ڈال کر بائیک پر بیٹھنے سے؟ ہونہہ بائیک پر یوں نہ بیٹھے گی تو کہیں ٹپکی نہ پڑی ہوگی روڈ پر...... ہونہہ......" اپنے خیال کو تصور کرتے ہوئے وہ خود ہی ہنس پڑی۔

☆☆☆

زارا کا اسکول میں پہلا دن تھا جسے سیلی بریٹ کرنے کے لیے غیر معمولی طور پر زید نے آج چھٹی کی ہوئی تھی۔

"آج زلزلہ تو نہیں آجائے گا؟" اس نے ناشتے کے برتن سمیٹ کر نذیراں کو دیتے ہوئے سرسری سے لہجے میں مسکراتے ہوئے زید کو چھیڑا۔

"زلزلہ آئے یا سونامی...... آپ خوش رہیے بس......" زید نے اخبار سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا اور مسکرا کر کہا...... اور شام کو بچوں کو پارک میں سلائڈز پہ پھسلتے، ہنستے کھلکھلاتے دیکھ کر فاریہ کی ایسی ہی کسی ٹیڑھی سی بات پر زید نے رسانیت سے کہا۔

"بیگم صاحبہ...... پیسہ زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے، محبت سے بھی زیادہ...... اور پیسہ اس دور میں صرف دو طرح کے افراد کے پاس ہے، ایک تو وہ جن کو چور راستے پتا ہیں اور وہ ان پر سفر کرتے کر سکتے ہیں...... یا پھر...... میرے جیسے گدھوں کے پاس...... جو اس پیسے کے حصول کے لیے واقعی گدھے بن گئے ہیں یا...... کولہو کے بیل کہہ لو...... ایک دائرے میں مسلسل چکر لگا رہے ہیں تب ہی تو تیل کے پیسے بھر رہے ہیں...... یعنی اہلِ خانہ، بیوی، بچوں کے لیے بہتر سے بہتر زندگی کا حصول ممکن ہو پاتا ہے...... اب ہماری ایفرٹس، جن کے لیے ہم کر رہے ہیں، وہ ہی نہ انڈراسٹینڈ کر پائیں تو کیا کہا جا سکتا ہے۔"

زید کی بات دل کو تو لگی...... لیکن وہ اپنے دل کا کیا کرتی...... اس کا بھی تو دل چاہتا بہت سی باتیں کرنے کا...... اور...... جب اسے وقت ملتا تو اس وقت زید اکثر ٹاک شوز دیکھتے، دیکھتے خراٹے لے رہا ہوتا...... اکثر اس کا دل چاہتا کہ لاؤنج میں رکھا یہ لیدر کا آرام دہ صوفہ ہٹا کر موڑھے رکھ دے جن پر بیٹھ کر کم از کم سویا تو نہ جا سکے۔

☆☆☆

وہ بھی ایک طویل تھکا دینے والے دن کی گہری ہوتی شام تھی۔

زارا سات برس کی ہو چلی تھی، سارہ بھی اسکول جانے لگی تھی۔ دونوں کو اسکول چھوڑ کر وہ ساس کے ساتھ ایک عزیز کے گھر تعزیت کے لیے گئی، واپسی پر گروسری لی، بچوں کو اسکول سے پک کیا، گھر آئی تو نذیراں صفائی کر کے، کپڑے دھو کر اب روٹیاں ڈال رہی تھی...... فریج سے رات کا سالن نکال کر اس نے مائیکرویو میں رکھا، کباب تلنے کو رکھے آپا شبانہ نے بچیوں کو اتنے میں صاف ستھرا کر کے ڈائننگ ٹیبل پر لا بٹھایا تھا۔ امی بھی نماز پڑھ کر آگئیں، کھانا کھایا گیا۔ کھانا کھا کر شبانہ اور نذیراں کو کھانا کھانے اور کچن صاف کرنے کا کہہ کر وہ کمرے میں آئی تو نماز کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ بستر پر لیٹی تو بے اختیار آہ...... نکل گئی۔

"کیا ہوا مما......؟" زارا نے کروٹ بدل کر پوچھا۔

"تھک گئی بیٹا؟" اس نے کنپٹیاں شہادت کی انگلی اور انگوٹھے سے دباتے ہوئے جواب دیا۔

"کیوں مما......؟" زارا سوالات بہت کرتی تھی۔

"کیا مطلب......؟" فاریہ نے کروٹ بدل کر تکیے پر کہنی رکھتے ہوئے ہتھیلی کے پیالے میں سر رکھا۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ......" زارا ذرا سا گڑبڑائی۔

"میرا مطلب ہے کہ آج آپ نے کیا سارا کام، نذیراں آنٹی نے نہیں کیا......" فاریہ نے غور سے

اپنی بیٹی کی شکل دیکھی، معصومیت بھرا استفسار اور فکر مندی اس کے بشرے سے عیاں تھی۔

''چلو......سو جاؤ......فالتو باتیں نہیں۔'' سارہ کو تھپکتے ہوئے اس نے زارا کو ٹالا۔

لیکن......دیر تک اس کا سوال ذہن میں چبھتا رہا۔

''کیوں......پتا نہیں......ہونہہ......'' فاریہ نے سر جھٹک کر موبائل اٹھالیا۔

فیس بک چیک کرتی رہی، عابس کا پیج... حسبِ معمول نت نئی ہاٹکس کی تصویروں اور وڈیوز سے بھرا ہوا تھا۔ عابد نے دو نئی میوزک وڈیوز شیئر کی ہوئی تھیں۔ ماریہ کو گڑیاں پسند تھیں۔ اس کی وال پر انواع و اقسام کی ڈولز سجی تھیں، ساریہ کا اسٹیٹس تھا۔

''آج میں اوپر، آسماں نیچے......'' نیچے ایک طویل استفسار و اشتیاق بھرے جملے تھے اور جواب میں ساریہ خاموش......

''پاگل......'' فاریہ نے انگلی سے صفحات آگے بڑھائے۔

ڈیزائنرز کی نئی کلیکشن......کلرز بہت اچھے، ڈیزائن کوئی خاص نہیں......

''ماما......'' کروٹ دوسری طرف کیے لیٹی زارا نے اچانک گردن موڑی۔

''تم سوئی نہیں۔'' فاریہ چونک گئی۔

''ماما......''

''کیا ہے......؟'' وہ درشت ہوگئی۔

''ماما......وہ......'' وہ جھجکی، ٹھٹکی......اور پھر کروٹ بدل لی۔ ''اچھا کچھ نہیں......'' فاریہ نے ذرا دیر بعد دیکھا وہ بے خبر سو رہی تھی۔

ابھی کل ہی کی تو بات ہے یہ میری گود میں سوتی تھیں......فاریہ نے سوچا اور مسکرائی۔ لڑکیوں کو ککڑی کی بیل اگر کہا جاتا ہے تو صحیح ہی تو کہتے ہیں......ہا......ہا......گہری سانس لے کر وہ بھی سیدھی ہوکر لیٹ گئی......اے سی کی کولنگ لوری بن کر آنکھوں میں نیند کے آنچل پھیلا رہی تھی۔

''میری چڑیاں......'' فاریہ نے سارہ اور زارا کے بال پیار سے سہلائے اور نیند کی آغوش میں جاگری۔

☆☆☆

کہتے ہیں یہ کبھی پتا نہیں چلتا کہ نیند کب آئی اور کس قوم کا زوال کب شروع ہوا......ہم سب ہی زندگی و سیاست کے موضوعات پر کس قدر بقراطی جھاڑتے ہیں، سب کچھ ہمیں پتا ہوتا ہے......نہیں پتا ہوتا تو صرف اپنی کمزوریوں کے بارے میں، کبھی ہم مظلوم بن جاتے ہیں، کبھی بہت عاقل و باخبر......فاریہ کو یہ پتا تھا کہ ساریہ اور مظہر کتنے احمق اور چھچھورے ہیں، یہ پتا تھا کہ ماریہ کو ایم بی بی ایس میں داخلہ لینا چاہیے، مطلوبہ نمبر ہوتے ہوئے بھی اس گدھی نے بی ڈی ایس میں داخلہ کیوں لیا؟ عابد کو ایم بی اے کے ساتھ پی ایم پی بھی کرلینی چاہیے، عابس نے جو لڑکی شادی کے لیے پسند کی ہے ایک نمبر کی چلتر ہے، دو دن میں ہی دن میں تارے دکھادے گی......لیکن نہیں پتا تھا تو ناک کے نیچے بیتنے والے شب و روز کے معمولات کا......زارا اور سارہ میں ڈیڑھ برس ہی کی تو چھوٹائی بڑائی تھی۔ اب وہ کیمرج کی اسٹوڈنٹ تھیں۔ زید کی تعیناتی دو برس کے لیے چائنا میں ہوگئی تھی۔ چھ ماہ بعد زارا اور سارہ کے امتحانات کے بعد انہیں بھی جانا تھا......زید سارا دن گھر میں نہیں ہوتا تھا۔ لیکن پھر بھی اس کے ہونے کا احساس تو تھا......اب دن یک دم خالی، خالی بے مقصد سے ہوگئے تھے۔ فرصتیں لگتا تھا کہ ٹوٹ کر برس رہی ہیں۔

''آج الماریوں کی صفائی کرلوں......'' اس نے سوچا۔

''پہلے بچیوں کے کمرے کی الماریاں صاف کرلوں......'' اس نے موبائل آف کیا اور دونوں ہاتھوں سے بال سمیٹ کر کیچر میں قید کیے......کمرے میں داخل ہوکر لمحے بھر کو رک کر تنقیدی جائزہ لیا......کافی دن سے وہ اس کمرے میں نہیں آئی تھی......بچیاں پڑھ رہی ہوتی تھیں، ان کو پانی، کبھی

فرائز اور کبھی، کبھی کھانا بھی شبانہ ہی کمرے میں پہنچا دیتی تھی، کمرا بظاہر سمٹا ہوا، صاف ستھرا تھا تکیے اپنی جگہ، بیڈ شیٹ بے سلوٹ، اوڑھنے کی چادر پائنتی قرینے سے تہ کی ہوئی...... ڈریسنگ پہ ذرا چیزیں بے ترتیب تھیں، شاید جلدی میں تھیں آج دونوں...... اس نے میٹ جھاڑ کر دوبارہ بچھایا، برش، کنگھے، بوتلیں قرینے سے رکھتے ہوئے اماں کے گھر میں اپنا کمرا یاد آ گیا، بے ساختہ ہی مسکراہٹ لبوں پر تیر گئی...... سارہ کی سائڈ کی درازیں قاعدے اور ترتیب میں تھیں۔ زارا کی سائڈ ٹیبل ہوچ پوچ ہوئی ہوئی تھی...... وہ بیڈ پر بیٹھ کر انہیں ٹھیک کرنے لگی......

اچانک ہی اسے خیال آیا کہ اماں کیسے چپکے، چپکے ہمارے بیگ چیک کیا کرتی تھیں، الماریاں چیک کیا کرتی تھیں، ایک دن ساریہ نے اماں کو ”رنگے ہاتھوں“ پکڑ لیا تھا۔

”اماں......“ وہ چپکے سے ان کے پیچھے جا کھڑی ہوئی تھی۔ ”ملا کوئی محبت نامہ؟“

”کیا مطلب......؟“ اماں گڑبڑا گئی تھیں اور ساریہ شرارت سے ہنس رہی تھی۔

”بدتمیز، بدلحاظ۔“ اماں نے ایک ہاتھ اس کے کندھے پر مارا تھا۔

”میں تو اپنا نیلا دوپٹا ڈھونڈ رہی تھی، مل نہیں رہا۔“

”ہوں...... پھر ملا......؟“ وہ شرارت پہ آمادہ تھی اور لطف لے رہی تھی۔ جبکہ خود اسے اور ماریہ کو برا لگا تھا۔ کیا اماں کو ہم پر اعتماد و اعتبار نہیں......

”ارے یار...... اماں ہیں، ان کا کام ہے...... برا ماننے کی کیا بات ہے۔“ ساریہ کے لیے تو ہر بات بڑی لائٹ ہوتی تھی، وہ کسی قسم کا بردن شاید لینے کی اہل ہی نہیں تھی۔ لیکن...... اس وقت ایک ان جانا سا بوجھ تھا جو اس پر یعنی فاریہ پر آ پڑا تھا، کاغذوں، کتابوں کے نیچے ایک مہنگا سلور کلر کا موبائل رکھا تھا......

”یہ؟“ وہ ہاتھ میں لیے سوچ رہی تھی۔ ”یہ نہ تو زارا کا ہے نہ سارہ کا...... پھر......؟ اور دراز میں بالکل پیچھے کر کے کاغذوں کے نیچے کیوں رکھا ہے......؟“

ہاتھ پیر جانے کیوں یک دم شل، بے جان سے ہو گئے...... وہ موبائل لے کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

موبائل اس نے آن کرنا چاہا تو اس پر پیٹرن لگا پایا...... دو تین مرتبہ اوپن کرنے کے لیے ٹرائی کیا ہو نہ سکا۔

”ہوں......“ تھک کر اس نے موبائل تکیے کے نیچے سرکا دیا...... اور اٹھ کر لاؤنج میں آ گئی...... شبانہ اور نذیراں معمول کے کاموں میں مصروف تھیں، نذیراں کچن میں تھی اور شبانہ ڈرائیووے اور گھر کے چاروں طرف دھلائی میں مصروف تھی...... ٹی وی آن کیا، آواز بری لگنے لگی...... اپنا موبائل اٹھایا۔ آج کچھ بھی نہیں اچھا لگ رہا تھا۔ بے کلی سی بے کلی تھی۔ اسے راتوں کو پورے گھر میں دبے پاؤں چکراتی اماں یاد آ گئیں...... وہ اکثر سوچتی تھی کہ یہ چین سے سو کیوں نہیں جاتیں۔ ایک اور دن پوچھ ہی لیا تھا...... وہ دھیرے سے ہنسی تھیں۔

”بیٹا...... مائیں بے خبر سو جائیں...... کیسے......؟ کیسے ممکن ہے؟“

”کیوں......؟ کیوں نہیں سو سکتیں۔“

”نہیں سمجھو گی بیٹا۔“ انہوں نے کہا تھا۔

اور اب اس کی سمجھ میں کچھ، کچھ آ رہا تھا۔ مگر سمجھنا نہیں چاہ رہی تھی۔ تب لاؤنج کی قدِ آدم کھڑکی سے گاڑی اندر آتی نظر آئی اس نے دیکھا۔ گاڑی رکتے ہی دونوں طرف کے دروازے کھلے اور سارہ اور زارا اترتی نظر آئیں...... سفید یونیفارم پر میرون وی کی شکل میں سکیش کی طرح بڑے دوپٹے۔

سارہ کی پونی اونچی بندھی تھی، زارا کے بال کیچر میں کچھ سمٹے، کچھ بکھرے تھے...... وہ آج اپنی بیٹیوں کو اتنی توجہ اور غور سے دیکھ رہی تھی جیسے پہلی مرتبہ دیکھ رہی ہو۔

”ماما......“ سارہ نے حسبِ عادت اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر کس کیا جواباً اس نے بھی اس کا ماتھا چوما۔

''ہائے ماما......؟'' زارا نے مسکرا کر اپنا سر اس کے کندھے پر رکھا۔ جواباً اس نے اس کا سر سہلایا۔ لیکن طبیعت میں ایک پژمردگی سی تھی۔

''آر یو اوکے ماما......؟'' زارا زیادہ سمجھدار اور...حساس تھی شاید اس نے ماں کی طبیعت کو محسوس کر لیا تھا۔

''ہوں......'' فاریہ نے دھیرے سے ہنکارا بھرا...... ''چلو جلدی سے فریش ہو کر آؤ۔''

کھانا روز کی طرح ہلکی پھلکی باتیں کرتے ہوئے کھایا گیا۔ آج فاریہ کے پاس لگتا تھا بہت فرصت ہے، وہ بہت غائر نظروں سے دونوں بیٹیوں کے انداز و اطوار چیک کر رہی تھی۔ سارہ حسبِ معمول دوستوں کی، ٹیچرز کی، پڑھائی کی، دوستوں سے لڑائیوں کی باتیں کر رہی تھی......اور زارا وہ صرف سن رہی تھی۔ فاریہ کو لگا جیسے وہ کہیں اور ہے......سامنے ہوتے ہوئے بھی سامنے نہیں ہے......کھانے کے بعد دونوں بچیاں اپنے کمرے میں چلی گئیں......اور اپنے کمرے میں آکر اس نے بھی اے سی کا ریموٹ اٹھا کر آن ہی کرنا چاہا تھا کہ دروازہ کھلا۔

''ماما......'' زارا اندر آئی......

''جی؟'' فاریہ نے پلٹ کر دیکھا۔

''ماما......آپ نے ہمارے کمرے کی چیکنگ کی ہے؟'' زارا کا انداز انتہائی پُراعتماد، خفا، خفا اور جواب طلب تھا۔

''واٹ ڈو مین بائے چیکنگ......؟'' فاریہ کے تلوے سے لگی سر پہ بجھی۔

''آئی ڈونٹ نو......'' زارا چڑ سی گئی۔

''میرا کوئی موبائل لیا ہے آپ نے؟''

''کوئی موبائل......'' فاریہ کو غصہ آ گیا۔

''ہم نے کتنے موبائل دلوائے ہیں تمہیں؟ اور یہ وہ موبائل تو نہیں جو ہم نے دلوایا تھا؟'' فاریہ نے تکیے کے نیچے رکھا ہوا موبائل ہاتھ میں لیا۔

''میری فرینڈ نے گفٹ کیا ہے۔'' زارا ہنوز روڈ تھی۔

''گفٹ ہے یہ......؟ اتنا مہنگا گفٹ تم کو لینے کی اجازت کس نے دی؟ اور کس دوست نے دیا؟''

''ماما......اٹ از ٹو مچ......'' زارا کی تیوریوں پر بل تھے۔

''اسے اوپن کرو......'' فاریہ نے برداشت و مصلحت کی انتہائی حدوود پر کھڑے ہو کر حتی الامکان نرم لہجے میں موبائل اس کے سامنے کیا جسے اس نے جھپٹ لیا۔

''ماما......'' زارا بولی۔ ''ماما......مجھے پتا ہے آپ کس سے چیٹنگ کر رہی ہوتی ہیں، بابا کے ہوتے ہوئے بھی......اور کون سی سائٹس چیک کر رہی ہوتی ہیں۔ بٹ اٹ از ٹو نیچرل......آئی نو......اور اسی لیے میں آپ کو بلیم نہیں کر رہی......آپ بھی مجھے 1852ء کی بُو بُو بننے کو نہ کہیں......میں 2017ء کے دور کی لڑکی ہوں......دوستیاں، گفٹس کا لین دین معمولی باتیں ہیں، میں نے آپ کو اسپیس دی ہے، آپ بھی مجھے دیں۔''

زارا......اس کی ننھی سی بچی ایک بہت بڑا سا آئینہ اس کے سامنے رکھ گئی تھی، جس میں فاریہ کو......اپنی شکل نہیں دیکھنی تھی۔ مگر دکھ رہی تھی۔ اور وہ زارا......بہت آرام سے دروازہ بند کر کے جا چکی تھی......اور فاریہ......وہ دونوں ہاتھوں سے بیڈ کی چادر مٹھیوں میں بھینچے زمین تکے جا رہے تھی۔

''ٹپ ٹپ......مجھے پتا ہے کہ آپ کس سے چیٹنگ کر رہی ہوتی ہیں۔''

''ٹپ ٹپ ٹپ......پاپا کے ہوتے ہوئے بھی۔''

''ٹپ، ٹپ......اور کون سی سائٹس چیک کر رہی ہوتی ہیں۔''

''ٹپ، ٹپ، ٹپ دھڑ، دھڑ، دھڑام......دھڑ......'' ننھے، ننھے ٹپکتے قطرے، بم کے گولے بن گئے۔ اور اس کا وجود چیتھڑوں کی شکل اڑ رہا تھا۔ کاش......کہ وقت کو کنٹرول کرنے والا، اسٹل، فارورڈ کر لینے والا ریموٹ ہوتا کوئی تو......



منی ناول

ہم کو عبث بدنام کیا

سیما رضا ردا

تیرھواں حصہ

جو آنا چاہو ہزار رستے نہ آنا چاہو تو عذر لاکھوں
مزاج برہم، طویل رستے، خراب موسم، برستی بارش

شام کا خوب صورت منظر ہیمبرگ سے پھیلتا ہوا جانے کن شہروں تک چھایا ہوا تھا۔

کار فیری میں داخل ہوئی اور جھیل کو پار کرتے ہوئے پرے کنارے پر جا لگی جھیل پُرسکون تھی...... پانی نے سبز رنگ کی چادر اوڑھ رکھی تھی...... ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی...... آفتاب کو بادلوں نے گھیر رکھا تھا...... اور



اس کی کرنیں باہر آنے کو ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔
جھیل کے کنارے پر چھوٹے، چھوٹے ریستوران بنے تھے...... جہاں لوگ ہلکی، ہلکی موسیقی سے لطف اندوز ہوکر کافی کی چسکیاں لے رہے تھے۔
شام ملگجی تھی......فضا میں رومان تھا...... ہوا میں خنکی تھی......دور کہیں سورج ڈوب رہا تھا...... یہ جرمنی اور سوئٹزر لینڈ کی سرحد پر واقع کوسنانز نامی ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔
وہ جہاں نور کے ساتھ تفریح کی غرض سے اس مقام پر موجود تھا......خوب صورت مناظر قدم، قدم پر فطرت کے عکاس تھے۔
جرمنی میں اس کے پاس اب صرف پچیس دن تھے......اور یہ دن وہ بہت یادگار بنانا چاہتا تھا......اس کا اسکالرشپ پیریڈ مکمل ہو چکا تھا...... اور تحقیقی مقالا بھی جمع ہو چکا تھا......زندگی اب اس کے لیے بے حد خوب صورت ہوتی جارہی تھی...... اسے پاکستان واپس جانا تھا اور انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد میں پڑھانا اس کا خواب تھا۔
''امی کا ویزا مل جائے تو کتنا اچھا ہوگا۔ یہ زندگی کا سب سے خوب صورت لمحہ ہوگا۔ وہ میرے ساتھ ہوں گی اور میں جب ڈاکٹریٹ کی سند وصول کروں گا تو امی کتنا خوش ہوں گی......'' وہ سوچ ،سوچ کر مسکرانے لگا۔
جہاں نور نے اس کے چہرے پہ مسکان دیکھی تو وہ حیران ہوگئی کہ وہ کسی اور سمت دیکھ رہا ہے...... کسی گہری سوچ میں غرق مسکراتا ہوا۔
''ہیلو......'' اس نے درمیان میں رکھی میز پہ ہاتھ سے جیسے دستک دی......میز پر ارتعاش پیدا ہوا۔
''ہوں......'' ریبال چونک کر واپس اس لمحے سے نکل آیا۔
''کیا ہوا؟'' وہ اپنے مخصوص لب و لہجے میں پوچھ رہی تھی......''تم کیوں مسکرا رہے ہو......؟''
''کچھ نہیں......'' وہ اپنے چہرے کی مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوا۔
''بتاؤ ناں......'' اس نے ملتجی لہجے میں کہا......اسی دوران ویٹر کافی کے دو مگ رکھ رہا تھا...... بھاپ اڑاتی کافی کی بھینی، بھینی خوشبو......
''میڈم جہاں نور......میری مسکراہٹ کا راز یہ ہے کہ میں نے یونیورسٹی میں اپنی فائنل تقریب کے لیے امی کو بلانے کی اجازت لی ہے...... یہ میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے اور میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ اعزاز لیتے وقت میری ماں میرے ساتھ ہو۔ میں اس لمحے اپنی ماں کی آنکھوں کی وہ چمک دیکھنا چاہتا ہوں جو اُن کی آنکھوں سے معدوم ہوگئی ہے...... مجھے یہاں تک پہنچانے میں میری ماں نے دن رات محنت کی ہے......بہت جدوجہد سے پیسہ کمایا ہے اور اب جب بہت کچھ اچھا ہوگیا ہے بلکہ ہونے جارہا ہے تو میں اپنی امی کو زندگی کی وہ ساری خوشیاں دوں گا جو اُن سے روٹھ گئی ہیں......'' وہ بے حد جذب کے عالم میں بول رہا تھا۔
''تمہیں معلوم ہے نور، جب ہم مفلسی کی چادر میں لپٹے دن گزار رہے تھے تو کوئی ہمارے نزدیک نہیں آتا تھا......اور جب اسکول سے کالج اور پھر یونیورسٹی پہنچا تو پھر شناسا چہرے اپنے بن کر آگئے...... بلکہ زبردستی میرا رشتہ بھی طے کردیا گیا......'' اس کے سامنے خالہ زینب کی تصویر پھر گئی۔
''اوہ......'' جہاں نور کے لبوں سے نکلا۔
''ہاں...... بہت کچھ ہوا پھر میری ماں نے زبردستی ان لوگوں کے حصار سے نکلنے کا راستہ نکالا اور اس طرح میری خالہ نے اپنی لالچی فطرت کے ہاتھوں بہ مشکل ہماری جان چھوڑی اس کے بعد کی زندگی اور مشکل تھی......میرا ویزا آچکا تھا......میری امی چاہتی تھیں میں کسی طرح سے بھی فوراً جرمنی چلا جاؤں...... معاشی حالات انتہائی خراب تھے۔ خالہ نے زبردستی ناجائز طریقے سے گھر قبضے میں کرلیا تھا...... کرایے کا

گھر لینا، نئے سرے سے اس گھر میں رہنا.....اُف ہمارے لیے وہ دن بہت مشکل تھے.....میرے پاس صرف پانچ دن تھے.....امی کو ان حالات میں اکیلا و تنہا چھوڑنا.....میرے لیے بہت صبر آزما تھا.....میں بہت ڈسٹرب تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا.....کیا کروں.....مگر پھر اعزاز شاہ میرے لیے رحمت کا فرشتہ بن کر آ گیا، میرا دوست میرا جان نثار.....اس نے مجھے ایسے سمیٹ لیا.....یوں میری پریشانیاں حل کر دیں.....جیسے کوئی مسئلہ ہی نہ ہو.....اگر آج میں یہاں اطمینان سے تعلیم حاصل کر رہا ہوں تو صرف اور صرف اعزاز کی وجہ سے وہ میری امی کا مجھ سے بڑھ کر خیال رکھتا ہے.....اگر میرا کوئی بھائی ہوتا تو یقیناً اعزاز جیسا ہوتا.....اللہ اسے ہمیشہ خوش رکھے.....میری ہر پریشانی کو وہ اپنی پریشانی بنا لیتا ہے.....میرے ہر دکھ کو وہ خود پہ سہتا ہے..... میری امی اس کی اتنی باتیں کرتی ہیں.....اتنی تعریفیں کرتی ہیں کہ لگتا ہے کہ اعزاز اور امی کا جنم، جنم کا رشتہ ہے.....جیسے وہ ان ہی کا بیٹا ہو.....سوچتا ہوں میں اس کے احسان کیسے اتاروں گا.....بعض لوگوں کے قرض تو اتارے جا سکتے ہیں مگر اعزاز کا احسان تو مجھ پہ فرض ہے.....میں یہ فرض کیسے ادا کروں گا.....جہاں نور تم دعا کرنا اللہ مجھے توفیق دے کہ میں اعزاز کے کام آ سکوں.....اس کی زندگی کی کوئی خواہش جو میرے ذریعے پوری ہو سکتی ہے اس کے لیے میں خود کو قربان کر سکوں.....کاش.....!'' وہ اعزاز کے لیے خود کو پیش کرنا چاہتا تھا.....تاکہ وہ سرخرو ہو سکے۔

وہ اپنے دکھ درد کی داستان سنا کر خاموش ہوا تو کافی کے بڑے، بڑے گھونٹ بھرنے لگا.....کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

جہاں نور نے اس کی پوری بات بہت غور سے سنی تھی۔ اِدھر اُدھر پھرتے مقامی لوگ اپنی دُھن میں تھے.....سیاحوں کی ٹولیاں فیری میں سوار ہو رہی تھیں۔ ریبال کی پوری گفتگو میں کہیں بھی اس کے والد کا ذکر نہ تھا.....''کیا وہ دنیا میں نہیں تھے یا پھر.....؟''

اس کے آگے وہ سوچ نہ سکی کہ ریبال نے اس کی سوچ کو سوال کر کے توڑ دیا۔

''کیا سوچنے لگیں.....؟''

''ریبال کبھی تم نے اپنے والد کے بارے میں نہیں بتایا.....میں نے کبھی تمہارے منہ سے ان کا ذکر نہیں سنا.....'' اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

ریبال کا چہرہ یک دم دھواں، دھواں ہو گیا.....اس کے چہرے کے تاثرات بالکل بدل گئے۔

''اوکے اگر تم نہ بتانا چاہو تو کوئی بات نہیں.....میں نے یونہی پوچھ لیا..... sorry for that دل آزاری کی معافی چاہتی ہوں.....''

وہ خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا.....اب وہ اسے کیا بتاتا کہ امی نے اسے کہا تھا کہ جب وہ اپنے پیروں پہ کھڑا ہو جائے گا تو وہ اس کی ملاقات اس کے والد سے کروا دیں گی.....مگر وہ اس قابل تو ہو جائے اس کے لیے اس نے دن رات محنت کی تھی.....اس کے تعلیمی سرٹیفکیٹ میں اس کے والد کا نام اس کے نام کے ساتھ ریبال احمد زوار تھا.....یہ نام اس کے ذہن پہ چسپاں تھا.....اس نے ماں کی بات سعادت مندی سے قبول کی تھی.....اور اپنی ساری توجہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں صرف کر دی.....مگر ماں سے اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ آئندہ کبھی اپنے بابا کے بارے میں نہیں پوچھے گا.....اسکول، کالج اور یونیورسٹی تک اس نے ہر پل ہر لمحہ اپنے بابا کو تلاش کیا تھا.....مگر ماں کی چپ نے اسے چپ رکھا.....ان کی خاموش نگاہوں کو دیکھ کر وہ سوال کرنے کی جرأت نہ کر سکا.....اور آج بھی اسے جرأت نہ تھی کہ وہ اپنے باپ کے بارے میں دریافت کر لے.....مگر اب وہ وقت آ گیا تھا جب اس کو اپنے سوال کا جواب مل جائے گا۔

وہ اپنے اضطراب پہ قابو پاتا جہاں نور کے ساتھ چل رہا تھا.....

فضا کا حسن اور دو آتشہ ہوتا جا رہا تھا سیاحوں کی ایک اور ٹولی آ کر رکی تھی اور وہ اس شہر کے سحر میں گم

ہو کر جیسے تا حدِ نگاہ قدرت کے کرشمات کو سراہ رہے تھے اور ریبال احمد اس سارے ماحول سے بے پروا سوال کے کٹہرے میں کھڑا تھا......

☆......☆......☆

گلوں کا، نغموں کا، خوابوں کا، چاندنی کا سلام
کھلی فضاؤں کا، خوشبو کا، روشنی کا سلام
گلی، گلی کا یہ جوگی نگر، نگر کا فیض
تمہارے شہر میں لایا ہے زندگی کا سلام

وہ زندگی کا سلام قبول کر چکی تھی...... ایک نئی زندگی معجزے کی صورت میں اس کے وجود میں موجزن تھی۔

ڈاکٹر راحیل سمیت تمام میڈیکل اسٹاف تشمیرہ کی حیرت انگیز بہتر ہوتی حالت پہ ششدر تھے۔

ڈاکٹر راحیل نے فوراً وڈیو کالنگ کے ذریعے تشمیرہ کی ریکوری رپورٹ سے انہیں آگاہی دی۔

''یہ صرف پہلی کامیابی ہے...... ابھی کئی سیشن میں مریضہ کو ہوش میں لانا ہے...... جو حادثہ اس کے ساتھ ماضی .... میں پیش آیا تھا اس کی باتیں کی جائیں...... تاکہ اس کے دماغ کی منجمد رگوں کو سگنل ملے...... یہ جھنجوڑنے کا عمل کہلائے گا...... وہ سائیکو اینالسٹ ...... کے ذریعے کہہ رہے تھے...... اعزاز شاہ بھی ان کے ساتھ تھے...... ڈاکٹر جوزف بہت خوش تھے۔

''اس آخری لمحے میں جو باتیں اس کو ہوش سے بے گانہ کر گئی تھی۔ دراصل وہی عمل اسے حال میں لے کر آئے گا ویل ڈن مسٹر اعزاز تمہاری کاوش قابلِ تحسین ہے...... مجھے یقین ہے کہ وہ لڑکی مکمل طور پر ہوش میں آجائے گی...... کیپ اٹ اپ......

جینٹل مین اللہ بہتر جانتا ہے کہ کس کے ہاتھ میں شفا ہے...... انشاء اللہ اگلے ہفتے ملتے ہیں ہم...... take care of each other......''

روشنی کے جھماکے کے ساتھ وڈیو کال کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔

ڈاکٹر راحیل نے گہری سانس لی اور مسکرا کر اعزاز شاہ کو دیکھا...... باقی پینل ڈاکٹرز اٹھ کر جا چکے تھے۔

''بیٹھو یار...... تم سے ایک بات کرنی ہے......''

ڈاکٹر راحیل نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''کیا......'' اعزاز شاہ نے راحیل کی طرف رخ موڑا۔

''تمہیں پتا ہے تم بہت اہم انسان ہو...... تمہارا وہ وقت جو تم نے اپنے لیے رکھا تھا...... وہ وقت جو تمہارے لیے بہت قیمتی ہے...... مگر دوست...... یہ تمہارا وقت ضائع نہیں ہو رہا...... بلکہ تم کسی کی خوشی کی وجہ بن رہے ہو...... تمہاری ذات کسی کے آنسو پونچھنے کا سبب بن رہی ہے...... میرے دوست تم بہت ہر دلعزیز ہو...... خوش رہو یار...... great man......''

ڈاکٹر راحیل نے اس کے کندھے تھپکتے ہوئے کہا۔

''بہت شکریہ تمہارا......'' اعزاز نے اپنی مخصوص مسکراہٹ سے کہا۔

''وقت ضائع ہونے کا تو میں نے نہیں سوچا...... لیکن اگر واقعی میں اس کی خوشی کی وجہ بن جاؤں تو یہ میری کامیابی ہے...... اور ہاں مجھے اس سائیکی لڑکی سے دوبارہ ملنا ہے......'' اعزاز کو یاد آیا۔

''اگر وہ دوبارہ آجائے گی تو میں ڈاکٹر جوزف کی advise کے ذریعے بہت کچھ پِک کر سکتا ہوں...... یہ آخری نکتہ واقعی بہت کمال کا اٹھایا ہے ڈاکٹر جوزف نے......'' اعزاز نے پُرجوش ہو کر کہا...... ''مجھے اس ملازمہ سے ملنا ہے...... جس کا نام مینا ہے......''

☆......☆......☆

مسکراتے ہوئے سورج نے کہا
خود کو ڈھونڈو تو اجالے ہوں گے

تایا جی اعزاز کے دفتر میں بیٹھے تھے...... ان کے سامنے چائے کی پیالی اور بسکٹ بھی ساتھ ہی رکھے تھے...... وہ بہت افسردگی سے کہہ رہے تھے...... ''بہت چھوٹی تھی تشمیرہ جب میرا بھائی اور بھابی یعنی تشمیرہ کے ماں باپ ایک کار ایکسیڈنٹ میں ختم ہو گئے...... تشمیرہ کی عمر اس وقت پانچ سال تھی...... اس روز اس کی سالگرہ تھی...... تشمیرہ کی ماں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ واپسی پر اس کے لیے سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی گڑیا لے کر ضرور آئیں گی...... میں نے اسے بہت بہلایا کہ اندر آکر بیٹھ جاؤ...... مگر لاؤنج سے

باہر جانے والی سیڑھیوں پر بیٹھ کر وہ انتظار کرنے لگی... حالانکہ شاپنگ سینٹر صرف چار پانچ منٹ کی ڈرائیو پر تھا...... کئی گھنٹے گزر گئے مگر وہ لوگ واپس نہ آئے...... شام میں تشمیرہ کی سالگرہ کی تمام تیاریاں مکمل تھیں...... بہت بعد میں پتا چلا کہ ان کی کار کا بہت بھیانک ایکسیڈنٹ ہو گیا...... واپسی کے لیے انہوں نے سپر ہائی وے کا روٹ اختیار کیا تھا...... مگر بدنصیبی کہ ان کی گاڑی پہ آئل ٹینکر الٹ گیا...... اور بھی کئی گاڑیوں کو نقصان پہنچا جس میں میرے بھائی کی گاڑی بھی تھی...... بالکل تباہ ہوگئی تھی گاڑی...... اور آگ نے میرے بھائی اور بھابی کو نگل لیا...... ان کی لاشیں بھسم ہوگئی تھیں...... کوئی پہچان نہیں بچی تھی...... اخبارات میں کافی عرصے تک آتا رہا...... DNA کے ذریعے ڈیڈ باڈیز شناخت ہوئیں...... اور جب میں گھر لے کر آیا تو تم سمجھ سکتے ہو گھر میں قیامت صغریٰ کا منظر تھا...... تشمیرہ معصوم گڑیا سی بچی...... چھٹی، چھٹی آنکھوں سے یہ سب دیکھ رہی تھی...... اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ تابوت میں رکھے بے جان وجود اس کے ماں باپ ہیں...... اس نے بہت حیران ہوکر میری طرف دیکھا تھا...... ”یہ کیسے ہوسکتا ہے ممی پاپا یہاں...... کیوں، کیسے......؟ ممی تو میری گڑیا لے کر آئیں گی...... آج تو میری سالگرہ ہے......“ وہ اپنا سر نفی میں ہلا رہی تھی...... ”مجھے گڑیا چاہیے...... ممی کو اٹھائیں آپ......“ وہ ضد کرتی رہی اور میں اسے یقین دلاتا رہا...... سب نے سمجھایا...... مگر وہ روتی رہی، بلکتی رہی کہ یہ میرے ممی پاپا نہیں ہیں اور پھر دن گزرتے رہے...... میں اس کو اپنے پاس لے کر آگیا...... قدرت نے مجھے اولاد کی نعمت سے محروم رکھا تھا...... میں تشمیرہ کو اپنی بیٹی بنا کر گھر لے آیا مگر میری بیوی نے کبھی اسے برداشت نہیں کیا۔ میں نے اس سے کہا کہ تم اس کو ماں کا پیار دو مگر ہمیشہ اس نے میری بات کی نفی کی......

اسے بہت سمجھایا لیکن وہ تشمیرہ کے ساتھ برا سلوک ہی کرتی رہی ...... میرے پاس تشمیرہ کو کہیں اور بھیجنے کا یارانہ تھا...... کہ لوگ کیا کہیں گے کہ ایک بھتیجی کو نہ رکھ سکے...... اولاد ہماری قسمت میں نہ تھی...... بیوی بانجھ تھی...... اس کی سمجھ میں میری باتیں نہیں آتی تھیں۔

وہ کسی کی اولاد کو اپنی اولاد نہیں کہہ سکتی تھی......

اس کا نظریہ تھا کہ اولاد صرف اپنی ہوتی ہے...... وہ لالچی اور خودسر تھی...... میری ضد کو دیکھتے ہوئے وہ خاموش تو ہوگئی تھی مگر اس نے تشمیرہ کے ساتھ ہمیشہ ناروا سلوک رکھا...... میں خاموشی سے اس کی حرکتیں دیکھا کرتا کہ وہ کس طرح تشمیرہ کے ساتھ زیادتی کرتی ہے...... مگر وہ بیچاری بچی سہمی، سہمی رہتی...... وقت نے اسے سہمی تصویر بنادیا تھا...... وہ انہی احساسات کے ساتھ بڑی ہوتی گئی...... میں نے اسے اچھی تعلیم دلوائی...... گھر کا ہر کام وہ کرتی...... میری بیوی نے کبھی اس سے زیادہ بات نہ کی...... وہ بیچاری ''جی...... جی'' کی رٹ لگا کر اسے خوش کرتی...... تابعدار تھی وہ...... اس کی شخصیت کا سہاپن دور کرنے کی میں نے بہت کوشش کی...... میں نے اسے کبھی تنہا نہیں چھوڑا...... اسے خود یونیورسٹی لے کر جاتا تھا...... میری بیوی کا بس نہیں چلتا تھا کہ کسی طرح اسے یہاں سے کہیں اور بھیج دے...... اس نے داؤ پیچ آزمائے...... میری نظروں میں تشمیرہ کو گرانے کی کوشش کی...... اس کا بھانجا فاطر، تشمیرہ کو پسند کرتا تھا...... مگر وہ ہر لحاظ سے بدکردار لڑکا تھا...... بگڑا ہوا تھا...... اس کے باپ نے اسے ہمارے گھر بھیج دیا...... مگر یہاں اس کے مزید جوہر کھلے...... وہ ڈرگز کا استعمال کرتا تھا...... غلط قسم کے کاموں میں ملوث تھا...... اس کا علاج کروایا...... وہ بہتر ہوا تو اس نے مجھ سے معافی مانگی کہ مجھے ان راستوں پر نہیں چلنا جو تباہی کی طرف جاتے ہیں۔ آپ تشمیرہ سے میری شادی کروادیں، میں وعدہ کرتا ہوں اسے کوئی دکھ نہیں دوں گا...... میں نے اس کی بات سن کر بہت سوچا بہت غور کیا کہ کیا تشمیرہ اس کے ساتھ خوش رہے گی......؟ میری بیوی تو تشمیرہ کو منحوس سمجھتی تھی... یہاں بھی اس نے بہت مخالفت کی...... مگر میں یہاں اپنی بات پر اڑ گیا...... اور تشمیرہ سے بات کی تو اس نے میرے فیصلے پر سر جھکا دیا...... نہ اس کی مرضی پوچھی...... نہ کوئی خواہش...... حالانکہ وہ پڑھنا چاہتی تھی اور نوکری بھی کرنا چاہتی تھی...... مگر میری آنکھوں کے آگے پردہ آگیا تھا...... میں نے دونوں کی شادی کا فیصلہ کرلیا تھا...... کیونکہ فاطر اس سے شادی کرکے اسے گاؤں لے جانا چاہتا تھا...... مگر ہونا تو وہی ہے جو قسمت میں لکھا ہو......'' وہ ایک سرد آہ بھر کے گویا ہوئے۔ ''عین شادی والے دن اسے میرے گھر کے لان میں ہی گولی ماردی گئی...... اور خون میں لت پت اس کی لاش دیکھ کر دلہن بنی میری بیٹی' میری تشمیرہ کی کیا حالت تھی...... تم سوچ بھی نہیں سکتے...... میری بیوی نے اسے سب کے سامنے لعن طعن کی...... اس کے دوپٹے کو نوچ لیا...... اس کی چوڑیاں توڑ دیں کہ منحوس تو نے میرے بھتیجے کو مار ڈالا...... وہ ہذیان بکے جارہی تھی کہ تو قاتل ہے...... اپنے ماں باپ کو کھا گئی...... میرے بھانجے کو مروادیا...... اور پھر تشمیرہ سر پکڑے بیٹھتی چلی گئی...... اِدھر فاطر کا جنازہ اٹھا اور تشمیرہ اسپتال میں داخل ہوکر دنیا سے ہی بے نیاز ہوگئی۔

میں نے اپنی بیوی کو گاؤں بھجوادیا...... اس سے میں نے قطع تعلق کرلیا ہے...... بہت ساری باتیں مجھے ہماری ملازمہ مینا سے بھی پتا چلی ہیں...... کہ وہ کس قدر تعویذ گنڈوں کے چکر میں رہ کر اس پر ظلم کرتی تھی حتیٰ کہ مجھ پہ بھی...... خیر بیٹا......'' تایا جی بہت ساری باتیں کہہ کر چپ چاپ سسکنے لگے۔ ''میں خود کو اس کا مجرم سمجھتا ہوں...... میری بچی نے میرے حکم پہ سر جھکا دیا مگر احتجاج نہ کیا۔'' فضا میں عجیب سی اداسی گھل گئی تھی...... اعزاز شاہ کا دل بھی بوجھل سا ہوگیا...... چائے کے بھرے مگ ٹھنڈے ہوگئے تھے...... سگار کا کش لے کر اعزاز شاہ نے بے دلی سے ایش ٹرے میں مروڑ کر رکھ دیا...... پھر تایا جی کی طرف دیکھا۔

''دیکھیے انکل...... جو کچھ ہونا تھا ہو چکا...... خود کو سنبھالیے...... اب ہمیں آگے دیکھنا ہے اور فتح ہمارا مقدر ہوگی......''

''ہاں بیٹے تم ٹھیک کہتے ہو...... بس میری تشمیرہ ہوش میں آجائے تو جو وہ کہے گی...... میں وہ کروں گا......'' وہ ایک عزم سے بولے۔

''انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا جیسا آپ کہہ رہے ہیں...... یہ تو تھے تشمیرہ کی زندگی کے وہ پہلو جو آپ نے بتائے...... وہ جو آپ کی ملازمہ تھی...... ہاں بیٹا...... اس سے ایک بار پھر میری ملاقات کروادیں...... کچھ باتیں وہ ان دنوں کی ضرور بتائے گی۔ جب تشمیرہ کی شادی ہونے جارہی تھی...... گھر کا ماحول اور اس کا انداز...... کیا پھر ممکن ہے میری اس سے ملاقات......؟''

''جی بیٹا...... وہ کراچی میں ہی ہے...... میں اس سے بات کرکے تمہاری طرف آنے کا کہوں گا......'' تایا جی کے لہجے میں اطمینان در آیا تھا۔

''بہت شکریہ انکل...... آپ نے بہت ساری معلومات دے دی ہیں...... اب آپ دیکھیے گا کہ فتح ہمارے ہاتھ ہوگی...... ڈاکٹر جوزف کی سائیکو اینالسٹ فائل ہم تک پہنچ جائے گی...... ان تمام نکات کی روشنی میں انکل آپ دیکھیے گا آپ کی بیٹی صحت وسلامتی کے ساتھ ایک روز آپ کے ساتھ ہوگی......'' وہ پُرعزم اور جوش وجذبے سے کہتا ہوا ان کے قریب آیا اور ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی دی...... ''سب ٹھیک ہوجائے گا...... آپ بے فکر ہوجائیں، میں آپ کے ساتھ ہوں......'' تایا جی نے اعزاز کو دیکھا جو محبت اور خلوص کا پیکر نظر آرہے تھے...... ریاکاری سے بالکل پاک، صاف ستھرا بے داغ چہرہ...... آنکھوں میں ذہانت، خوشگوار گندمی رنگت...... مگر ایک انجان اداسی اس کے وجود کا حصہ تھی...... جسے وہ مسکراہٹ کے قالب میں ڈھالے ہوا تھا۔

''مجھے اب کوئی فکر نہیں...... اللہ نے میرے لیے وسیلہ تمہیں بنایا ہے...... اور تشمیرہ جب ہوش میں آئے گی تو میں اسے بتاؤں گا کہ اصل مسیحا تم ہو...... تم اس سے مل کر بہت خوش ہوگے...... وہ بہت اچھی لڑکی ہے...... عام لڑکیوں سے مختلف...... وہ چڑیا کی طرح سہم جانے والی...... اس کی صرف یہ خواہش تھی کہ میں کچھ کرنا چاہتی ہوں اور میں نے اس کا راستہ روک دیا...... لیکن اب نہیں روکوں گا......''

وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ اعزاز کے سہارے اٹھ کھڑے ہوئے اور اسے خدا حافظ کہہ کر گھر کی طرف روانہ ہوگئے...... گھر میں تھا ہی کون......؟ بیوی کو تو گاؤں بھجوادیا تھا...... اور سختی سے منع کردیا تھا کہ اس گھر میں قدم نہ رکھنا...... اور تشمیرہ اسپتال میں تھی......'' دیکھو آگے کیا ہوتا ہے...... اللہ خیر کرے'' انہوں نے ایک سرد آہ بھری...... دور سورج سمندر میں اپنے عکس کو آہستہ، آہستہ گم کرتا جارہا تھا...... اور کہیں دور موسمی ہوائیں خوشیوں کی دستک دے رہی تھیں۔

☆......☆......☆

''امی آپ کو مبارک ہو...... مجھے اجازت مل گئی ہے آپ کو بلانے کی...... بس آپ تیاری کرلیں...... پھر ہم دونوں ماں بیٹا خوب جرمنی میں گھومیں گے۔ خوب باتیں کریں گے...... اور بہت کچھ......'' ریبال فون پر تیز، تیز بولتے ہوئے اپنی خوشی وجوش کو چھپا نہیں پارہا تھا...... اس نے بھاگ دوڑ کرکے سارے کام نبٹالیے تھے اور جہاں نور نے بھی اس سلسلے میں اس کی مدد کی تھی۔

''بیٹا پیسے کہاں سے آئیں گے......؟'' مہرالنساء بہت خوش...... تھیں مگر حیران پریشان بھی تھیں...... اتنی جلدی سب کیسے......؟

''ارے امی...... میری بھولی امی...... سب ہوچکا ہے انتظام...... اعزاز آپ کو ائرپورٹ لے جائے گا...... ڈونٹ وری...... خوش رہیں بس اور شکرانے کے نوافل ضرور پڑھ لیجیے گا...... چلیں پھر بات کرتا ہوں...... اللہ حافظ......!''

''اللہ حافظ بیٹا......'' انہوں نے ریبال کو دعا دیتے ہوئے کہا۔

''اللہ میرے بچے کو قدم ،قدم کامیابی نصیب کرے...... یا اللہ تونے مجھے سرخرو کردیا...... تیرا شکر کیسے ادا کروں......میری ذات کو بدنام کرنے والوں کو ضرور دکھانا کہ میرا بیٹا آج میری تربیت کا عکس لے کر کہاں اپنے آپ کو منوار ہا ہے...... اے میرے اللہ ان لوگوں کو ضرور دکھا یہ سب......تو نے مجھے کبھی مایوس نہیں کیا...... تیری رحمت کے وسیلے سے میں انصاف چاہتی ہوں اس دنیا میں......میرا شوہر جو مجھ سے محبت کا دم بھرتا تھا......شک کے چھینٹوں سے اس نے میرا دامن داغ دار کردیا......غلط فہمی کے جال میں پھنس کر مجھے تنہا اور بے آبرو کردیا...... پروردگار اگر تیری مدد میری مددگار نہ ہوتی تو میں کیا کرتی...... تیرا کرم ہے مولا...... تیرا کرم ہے......میری سگی بہن نے کیا کچھ نہیں کیا میرے خلاف......اور میرا شوہر بِنا میرا قصور بتائے......الزامات کی فہرست دے کر چلتا بنا۔'' وہ ایک دم سسکی تھیں۔

''بھلا کوئی بہن اپنی بہن کو بدنام کرسکتی ہے......؟ ہاں تم نے تو مجھے رسوا کردیا زمانے میں زیبو......مگر صبر کا دامن میں نے تھامے رکھا...... یا اللہ تیرا شکر ہے......تو نے مجھے ہونہار، سعادت مند اولاد دی......اب میں اپنے بیٹے کے سوال کا جواب دوں گی کہ اس کا باپ کون ہے......''

وہ چپکے، چپکے روتی رہیں اور اللہ کے حضور سربسجود ہوگئیں......ان کے دل کو قرار آتا جارہا تھا......انسان کو معلوم ہی نہیں دل کا قرار کتنی بڑی نعمت ہے...... اور بے قراری کتنی بڑی اذیت......اور یہ اذیت خالہ زینب کے حصے میں آگئی تھی......اور وہ مکافاتِ عمل سے گزر رہی تھیں۔ روزی ناگن بنی ان کے اردگرد پہرہ دے رہی تھی اور اس کے ڈسے کو تو پانی بھی نصیب نہیں ہوتا۔

☆......☆......☆

جرمنی کے شہر ہیمبرگ میں اسلامک اسکولز ویک اینڈ پر کھلتے ہیں...... بیشتر مسلم گھرانوں نے کام خود کیا ہے اپنے طور پر...... جہاں نور نے بھی اپنی خدمات اسلامک اسکولز کے لیے وقف کردیں اور اس کی کوششوں سے اب ہفتے میں تین دن یہ اسکول کھلتے تھے......اس کی شخصیت بالکل بدل گئی تھی اسکول میں اچھے خاصے بچے، بچیاں تھے......جن میں بڑی عمر کی لڑکیاں بھی تھیں۔

روشن دن کا اجالا پھیلا ہوا تھا......صاف ستھرے بچے، بچیاں اپنی نشستوں پر براجمان اسے انہماک سے سن رہے تھے۔

''ہم سب اچھی زندگی گزارنا چاہتے ہیں......مگر ہمیں غور کرنا چاہیے کہ اچھی زندگی کا مطلب کیا ہے؟ اب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اچھی زندگی کیا ہے؟'' وہ مسکراتے ہوئے پوچھنے لگی......پھر وہ خود ہی گویا ہوئی۔

''اچھی زندگی وہ ہے جو ہمارے اور آپ کے خالق، اس دنیا کے بادشاہ یعنی اللہ کی مرضی کے مطابق ہو......اس کے دوسرے بندوں کے لیے راحت اور سکون کا سبب بنے اور خود ہمیں سکون اور اطمینان عطا کرے......ایسی زندگی سارے دنیا کے لیے نعمت ہوتی ہے......اللہ نے ہمیں اچھی زندگی گزارنے کے طریقے بھی سکھائے ہیں...... یہ طریقے اللہ کی کتاب اور رسول اکرم ﷺ کی سیرت سے معلوم ہوتے ہیں......دیکھیں ساتھیو! ہر حال میں ہم سچ بولیں، اخلاق اچھا ہو...... نرم، شیریں اور شریفانہ، امانت داری، ایفائے عہد، سادگی، درگزر، حلم اور ہر کام کے لیے اچھی نیت...... یہ تمام باتیں اگر ہم اپنی زندگی میں شامل کرلیں تو زندگی بہت خوب صورت ہے اور ہر لمحے اللہ کا شکر ادا کریں......'' اس کے لہجے کی اثر پذیری نے ماحول میں سکتہ طاری کردیا تھا......تب ہی ایک بارہ سالہ بچہ اس کے پاس آیا۔

''مس...... آپ سے ملنے کوئی صاحب آئے ہیں...... باہر لابی کی طرف بیٹھے ہیں......'' وہ اشارہ کرتے ہوئے بتانے لگا۔

''کون آسکتا ہے اس وقت......؟'' وہ اپنے

سوال کو دل میں دُہراتی ہوئی لابی کی طرف آ گئی...... ریبال اس کی طرف پشت کیے کھڑا تھا۔

''اوہ...... ریبال...... تم اس وقت......؟'' اسے خوشی کے ساتھ حیرت بھی ہوئی۔

''السلام علیکم! ریبال......'' اس نے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام!'' وہ پلٹ کر اس کے سلام کا جواب دیتا ہوا گویا ہوا......''معافی چاہتا ہوں جہاں نور آپ کو ڈسٹرب کیا۔''

''آپ کا ڈسٹرب کرنا اچھا لگا......'' وہ مسکراہٹ کے ساتھ کہہ رہی تھی۔

''اصل میں جہاں نور......'' وہ بغیر کسی تمہید کے بولا......''میری امی آ رہی ہیں......اور میں چاہتا ہوں کہ وہ آپ کے ساتھ آپ کے گھر پہ ٹھہریں......آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا......؟'' وہ ہچکچاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''ریبال...... یہ تو میرے لیے خوشی کی بات ہے کہ آپ نے اپنی والدہ کی میزبانی کے لیے مجھے چنا......آپ بالکل بے فکر ہو جائیں...... میں ان کا اتنا خیال رکھوں گی......اتنی محبت دوں گی کہ وہ مجھے کبھی نہ بھول پائیں گی......ان کو خوب سیر کراؤں گی......ان کو میونخ بھی دکھاؤں گی......اور شاعر مشرق علامہ اقبال کے نام سے جو گلی موسوم ہے وہ بھی...... اللہ کتنا مزہ آئے گا......'' وہ بے حد خوش ہو رہی تھی......اور ریبال اس کی خوشی دیکھ کر مطمئن ہو گیا...... خوب صورت گرے رنگ کے عبایا اور حجاب میں اس نے خود کو لپیٹا ہوا تھا صرف چہرہ نظر آ رہا تھا اور چہرے پر رونق اور نور تھا...... ماتھے کی حجاب پٹی پر سیاہ نگ نمایاں تھے۔

''ٹھیک ہے جہاں نور...... میں چلتا ہوں...... بہت جلد ملاقات ہوگی......'' خدا حافظ کہہ کے وہ جیسے ہی نکلنے لگا......اعزاز شاہ کا فون آ گیا...... جہاں نور اس کی پشت دیکھتی ہوئی الٹے قدموں لوٹنے لگی۔

اسے دیکھ کر ہمیشہ اسے کسی سائبان کا احساس ہوتا تھا......ایسی چھاؤں جس کے سائے میں سارے

سمجھدار حکمران

ایک بوڑھی عورت نے دربارِ خلافت میں شکایت کی کہ میرے گھر میں کیڑے مکوڑے نہیں ہیں، خلیفہ نے اس کے گھر کا پتا پوچھ کر یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ تمہاری شکایت دور کر دی جائے گی۔ وہ چلی گئی تو ہر کوئی حیرت کا پہاڑ بنا ہوا تھا ،اتنے میں خلیفہ کی آواز گونجی......''امیر بیت المال اس عورت کے گھر پہنچنے سے پہلے اس کا گھر، کھجور، شہد، اور اناج سے بھر دو۔'' حیرت سے دیکھنے والی آنکھوں ...سنو، جس گھر میں کھانے کو کچھ نہ ہو اس میں کیڑے مکوڑوں کا کیا کام...''یا اللہ ایسے سمجھدار حکمران ہمیں بھی عطا فرما۔ الٰہی آمین......

از: نرگس نسیم، صابہ موہڑہ، چکوال

تہی داماں

میں غریب آدمی تھا......پھر میں نے خود سے وعدہ کیا میں خود کو بدل کر رہوں گا۔ میں زندگی مین آرام وسکون حاصل کروں گا کیونکہ دولت سے ہی راحت و آرام آتی ہے......پھر میں پوری طرح دولت اکھٹا کرنے میں لگ گیا...... مجھے دولت کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آیا پھر رفتہ، رفتہ زندگی میں سب کچھ آ گیا دولت کے انبار، گاڑی عیش وعشرت لیکن، لیکن......

میں نے سکون جیسی نعمت کھو دی رشتوں جیسے احساس سے محروم ہو گیا......کیونکہ میرے پاس کسی کو دینے کے لیے وقت نہیں تھا......اور پھر جب مجھے ضرورت ہوئی، میں ان کے پاس جانے لگا تو تب تک میرے پیارے مجھے پیسوں کی مشین سمجھ کر بھول چکے تھے......رشتوں پر گرد وغبار جم چکی تھی......اور میں خالی ہاتھ رہ گیا سب کچھ ہوتے ہوئے بھی میں تہی داماں رہا......

مرسلہ: راحیلہ بنت مہر علی شاہ، گاؤں آما خیل ضلع ٹانک

دکھ، سکھ میں بدل جاتے تھے۔

''یا اللہ اسے آپ میرا اہم سفر بنا دیں...... اس دعا کے بعد کوئی دعا نہیں کروں گی......'' شدت کے ساتھ دعا مانگتی ہوئی وہ اندر چلی گئی...... کیا دعاؤں کی قبولیت کا بھی وقت مقرر ہے......؟

وہ دو رویہ سڑک پر پیدل چلتے ہوئے فون پر اعزاز سے گفتگو کر رہا تھا...... ہیمبرگ کا موسم بہت خوشگوار تھا...... ہر طرف چمپئی رنگت والے جرمن نظر آ رہے تھے۔

''ہاں یار...... اللہ کا شکر ہے......'' وہ اعزاز کی بات کا جواب دے رہا تھا...... ''امی کو بخیر و عافیت جہاز میں سوار کرانا تیری ذمے داری ہے دوست......''

''دوست نہیں بھائی......'' دوسری جانب اعزاز نے غصے سے کہا تھا۔

وہ قہقہہ مار کر ہنس دیا۔

''او میرے پیارے بھائی، میرے دوست...... میں تو چاہتا ہوں تو بھی اس موقع پر میرے ساتھ ہو...... تیرے لیے کیا مشکل ہے یار...... آفس کے بہانے آ جا......''

''ضرور آتا...... بس ایک اہم ذمے داری مجھے سونپ دی گئی ہے...... مکمل کرنا ضروری ہے......''

''اور ایک ذمے داری میں نے بھی آپ کو دی ہے...... اس کا کیا ہوا......؟'' اسی اثنا میں ریبال کا پیر زور سے ایک چھوٹی سرخ رنگ کی اینٹ سے ٹکرایا تھا...... ایک لمحہ کو اس کی توجہ کان سے لگے موبائل سے ہٹ گئی تھی...... اس کا انگوٹھا اینٹ کے قریب رکا تھا...... اگر وہ بہت تیزی سے آگے بڑھتا تو پیر بھی زخمی ہوتا اور وہ منہ کے بل گرتا...... ''رکاوٹ کھڑی کرنے میں یہ بھی ہماری طرح ہیں......'' اسے اپنے اہلِ وطن کی یاد آ گئی۔

''کیا ہوا......؟'' دوسری طرف سے اعزاز بار، بار پوچھ رہے تھے۔

''کچھ نہیں...... پاکستانی محلے میں آ گیا تھا......''

''کیا......؟'' اعزاز شاہ کچھ نہ سمجھے...... تو ریبال بے اختیار ہنس دیا۔

''اچھا...... یہ بتا میری دوست تشمیرہ کا پتا کیا...... کہیں وہ کسی پریشانی میں تو نہیں ہے......''

''اگر وہ پریشانی میں ہوگی تو اعزاز شاہ اسے اس پریشانی سے نکال دے گا...... ڈونٹ وری سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میرا تم سے وعدہ ہے......'' وہ عزم سے بولے۔

''خوش رہے یار تو...... میرے اکاؤنٹ میں تو دعاؤں کا ذخیرہ ہے......''

''کچھ مجھے بھی دے دے......'' ریبال نے ہنستے ہوئے کہا۔

''یہ سب تیری وجہ سے آیا ہے میرے دوست......'' اعزاز شاہ سنجیدہ ہو کر بولے۔ ''تیری امی نے مجھے جینے کا سلیقہ دیا ہے دوست...... وہ اگر میری زندگی میں نہ ہوتیں تو میں کبھی خود کو اتنا مضبوط محسوس نہ کرتا...... تمہیں کیا پتا میرے دوست تم لوگوں سے مل کر میں نے کیا پایا ہے...... تم نہیں سمجھو گے......'' وہ جذباتی ہو کر کہہ رہے تھے...... ''یہ وہ خزانہ ہے جسے کوئی چرا نہیں سکتا......''

''بس کر یار...... بس کر...... میں اب رونے لگوں گا...... اور میری بھی سن......'' ریبال جھوٹ موٹ کے آنسو بہانے لگا تو اعزاز کا زندگی سے بھرپور قہقہہ ریبال کے کانوں میں پڑا...... اور ریبال بھی اس قہقہے میں شامل ہو گیا۔

''اچھے دوست خزانے کی طرح ہوتے ہیں اس قیمتی خزانے کو بھی کوئی چرا نہیں سکتا......'' یونیورسٹی جانے والی بس سامنے سے آ رہی تھی...... ''سن اعزاز سامنے بس اسٹاپ ہے اور مجھے یہاں سے بس پکڑنی ہے اور یونیورسٹی پہنچنا ہے...... بہت ضروری کام ہے بعد میں بات کرتے ہیں......''

''او کے...... پھر ملاقات ہوتی ہے...... میری ذمے داری نہ بھولنا......''

وہ اعزاز کو دوبارہ یاد دہانی کرواتا ہوا بھاگتے قدموں سے بس میں سوار ہو گیا...... پھولی سانسوں پر

قابو پانے کے باوجود وہ ابھی تک کانوں میں گونجتے اعزاز کے قہقہے کی بازگشت سن رہا تھا...... اعزاز میں یہ تبدیلی اس کے لیے حیرت کا باعث تھی...... ہمیشہ اس نے اعزاز کو افسردہ پایا تھا...... زندگی میں یوں تو تبدیلیاں آتی رہتی ہیں اور تبدیلی ہونی بھی چاہیے...... وہ اعزاز کی زندگی کے بہت سے پہلوؤں سے واقف تھا...... اور اُدھر اعزاز کے ذہن میں ریبال کا جملہ ''میری ذمے داری نہ بھولنا'' گونج رہا تھا...... کیا تشمیرہ بھی ریبال میں انوالو تھی......؟ سوال صحیح تھا...... مگر انہیں اپنے اندر کی بے چینی نے آن گھیرا۔

☆......☆......☆

نہ جانے کون سی دولت ہے تمہارے لہجے میں
بات کرتے ہو تو دل خرید لیتے ہو

ڈاکٹر راحیل نے اعزاز کو آسودگی سے دیکھا...... جو سبز رنگ کی ڈائری کو پڑھتے جارہے تھے...اور پھر اپنی یادداشت کے لیے کچھ پوائنٹس بھی اپنی نوٹ بک میں لکھ رہے تھے۔

ڈاکٹر راحیل سوچ رہے تھے کہ اللہ کو جس سے جو کام لینا ہوتا ہے...... وہ اپنے بندوں کو منتخب کرلیتا ہے...... یہ ہمارے بس کی بات ہی نہ تھی۔ اعزاز کے ذریعے یہ کام ہونا تھا......

''بینا سے مل کر تمہیں بہت کچھ معلوم ہوگیا ہوگا...... ابْ فائنلی تم نے محبت کے لیکچرز تو بہت دے دیے...... اب ڈاکٹر جوزف کے سائیکو اینالسس کے مطابق تمہیں تشمیرہ بانو کی painful memories کو اس کے سامنے لانا ہے...... اس کی زندگی کے وہ تکلیف دہ پہلو اور واقعات جس نے اس کی زندگی کو متاثر کیا ہے اور یہاں تک پہنچا دیا ہے...... تکلیف دہ یادوں کے ذریعے وہ لاشعور سے شعور میں آئے گی...... انہی دردناک واقعات کے ذریعے تم اس کو جھنجوڑو گے...... یہ درد اسے کال کرے گا...... تب وہ ہوش میں آئے گی...... اس کا بچپن، جوانی، جس میں زندگی کی محرومیاں، جس نے اس کو منجمد کردیا ہے...... وہ fixation ماحول میں چلی گئی ہے...... وہ اپنی ناآسودگی، محرومی اور دکھ کے واقعات کو سنے گی تو حال میں واپس آئے گی...... اس کے سارے conflics خود resolve ہوجائیں گے...... اور یقین کرو وہ اب پیچھے مڑ کر نہیں دیکھے گی...... وہ آگے جائے گی......''

ڈاکٹر راحیل نے اسے بہت وثوق سے بتایا تو وہ اثبات میں گردن ہلانے لگے۔

''تم نے عامر خان کی مشہورِ زمانہ فلم تھری ایڈیٹ دیکھی ہے ناں......؟''

''ہاں...... پھر......؟'' وہ الجھے، الجھے انداز میں ڈاکٹر راحیل کو دیکھنے لگے۔

''اس فلم میں عامر خان کا دوست کوما میں چلا گیا تھا...... وہ بالکل بے سدھ ہوگیا تھا...... صرف اس کی آنکھیں کھلی تھیں...... ڈاکٹرز مایوس نہیں تھے...... نفسیات اتنا بڑا سبجیکٹ ہے کہ اگر نفسیاتی حربے نہ آزمائے جائیں تو ہر تیسرا شخص مایوس ہوکر دنیا سے چلا جائے...... وہ فلم دوبارہ دیکھو تمہیں بہت مدد ملے گی......''

''یار راحیل...... یہ بتاؤ کیا مجھے نفسیات کی ڈگری ملنے والی ہے......؟ تم لوگوں نے مجھے کس طرف لگادیا ہے......''

وہ چڑ کر بولے...... ''یہ بہت مشکل کام ہے......''

وہ لمحے بھر میں پریشان نظر آنے لگے تو راحیل مسکرادیا۔

''کم آن یار...... تمہیں تو خود اس کام میں مزہ آرہا ہے......''

''نہیں یار...... میں اپنے حصے کی شمع روشن کررہا ہوں...... محبت بھی تو ایک نیکی کی طرح ہے...... تم نے ہی تو کہا تھا محبت اور پیار سے اس کو ہوش میں لانا ہے...... وہ تیر تو آزمالیا ہے...... اب نفرتوں کے وار کے ذریعے جس سے اس کے اندر سانس لیتے اعضا کو تکلیف پہنچے اور وہ بلبلا اٹھے...... اس کی روح کو تکلیف دینی ہے...... وہ آرزوئیں اسے یاد دلاؤں گا میں

خیر......'' وہ اٹھتے ہوئے بولے......''میرے دوست ریبال کی امی ہیں...... وہ اکثر ایک شعر سناتی ہیں مجھے......تم بھی سنو۔''

آؤ اِک عہد کریں ایک اقرار کریں
زندگی جن سے گریزاں ہے انہیں پیار کریں

سوراحیل......فکر نہ کرو...... میں تمہارے ساتھ ہوں......'' وہ ہاتھ ملاتے ہوئے پارکنگ کی طرف آگئے۔

اس سے وہ بالکل بھول گئے کہ تشمیرہ کے ماضی کا تعاقب کرتے، کرتے احساس ہی نہ ہوا کہ دن کہاں گیا اور رات کہاں گئی......؟ سبز ڈائری کو اعزاز شاہ نے ہاتھ میں سنبھالا...... گاڑی کی چابی اٹھائی......اور گھر کی طرف چل دیے......رات اپنے سرمئی آنچل سمیٹے شب کو ڈھانپ رہی تھی...... گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بھی ان کا ذہن ڈیش بورڈ پہ سامنے رکھی سبز ڈائری پہ چلا گیا...... یونہی بے خیالی میں اٹھالیا...... ڈائری کا ایک ورق یونہی کھل گیا...... تشمیرہ کی خوب صورت ہینڈ رائٹنگ میں تحریر تھا......

''میرا دامن بہت صاف ہے
کوئی تہمت لگا دیجیے

آج پھر ۳۴۵واں الزام لگا دیا ہے تائی نے...... میں تو کسی کو آنکھ بھر کر نہیں دیکھتی...... آئینے سے بھی نظر چراتی ہوں...... تائی کیوں مجھے ایسے الزامات سے نوازتی ہیں۔ میرا کیا قصور ہے...... ان کا بھانجا خود عجیب نظروں سے دیکھتا ہے...... تائی سے کہوں تو بتنگڑ بنالیں گی اور تایا...... وہ پتا نہیں کیا سوچیں گے...... کیا کروں......کہاں جاؤں...... میرے اللہ مجھے بچالے سب سے...... میں اپنے ممی پاپا کے پاس جانا چاہتی ہوں......اور ریبال بھی چلا گیا ہے...... اب کس سے بات کروں گی۔ اللہ اسے کامیاب کرے......

دل میں اتری ہے تنہائی
تنہائی میں جاگ رہی ہے
خاموشی کی آگ
خاموشی کی آگ میں جل کر
مچلے میرے ہونٹوں پہ
درد کے گہرے راگ''

تشمیرہ کی زندگی واقعی درد کا راگ تھی......اس کی پوری ڈائری میں اس کی تنہائی اور بے زبانی پوشیدہ تھی......اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔

''میرے خدا......'' وہ ڈائری ڈیش بورڈ میں رکھتے ہوئے دعا گو ہوئے۔

''بہت گہرائیوں سے آپ سے دست بہ دعا ہوں...... میرا اس لڑکی سے کوئی رشتہ نہیں ہے مگر میں خود کو اس کے لیے تڑپتا پا رہا ہوں...... نہ کبھی میں نے اس سے ملاقات کی...... نہ آواز سنی...... مگر ایک درد کا رشتہ ہے ہمارے درمیان...... میں درد آشنا بننا چاہتا ہوں...... میرے خدا...... میرا اس سے ملنا، بات کرنا میرے حق میں بہتر ہے تو، تو مجھے اس سے ملا دے......وگرنہ......میرے دل سے اس کی تمنا مٹا دے۔''

اعزاز شاہ نے دل کی گہرائیوں کے ساتھ دعا کی اور اپنا معاملہ اللہ پہ چھوڑ دیا کیونکہ وہ ستارالعیوب ہے......اور وہی مسبب الاسباب ہے......

''یا اللہ......اسے زندگی اور صحت دے دے......تو رحیم ہے......رحمٰن ہے......کریم ہے......تو شفا دینے، عطا کرنے والا ہے......میرے الفاظ میں......میری زبان میں...... اتنی تاثیر دے دے کہ وہ ہوش میں آجائے......سب مجھ پہ اعتبار کرتے ہیں...... مجھے سرخرو کردے......''

وہ ہوش وخرد سے بیگانہ ہوکر گاڑی میں بیٹھے دعاؤں کو ہتھیار بنا کر تشمیرہ کے لیے شفا مانگ رہے تھے......آنکھوں سے آنسوں رواں تھے۔

شیشہ کھٹکھٹاتے ہوئے ایک بچہ انہیں حال میں لے آیا...... اس کا ہاتھ پھیلا ہوا تھا...... اعزاز نے پچاس روپے کا نوٹ ڈیش بورڈ کے اندر سے نکالا جو تشمیرہ کی ڈائری کو چھوتے ہوئے اس بچے کے ہاتھ

میں آ گیا۔

''خوش رہو صاحب...... اللہ آپ کی مراد پوری کرے......'' چھوٹا سا بچہ دعا دیتا ہوا جانے کدھر چلا گیا...... اعزاز شاہ نے اسٹیئرنگ کو تھاما، گاڑی گیئر میں ڈالی اور گھر کی طرف چل دیے...... یوں لگتا تھا جیسے بہت دن ہو گئے سب سے ملے ہوئے...... موبائل فون بج رہا تھا...... محب اللہ انکل کا فون تھا...... اعزاز شاہ نے لائن بزی کر دی کہ اب گھر ہی تو جانا تھا...... وہ تیزی سے گاڑی راستوں پر دوڑانے لگے۔

اعزاز شاہ کے ذہن میں صرف اور صرف وہ خاص لڑکی تشمیرہ سوار تھی...... تشمیرہ کتنا خوب صورت اور منفرد نام تھا...... اس کی ڈائری میں مکمل نام تشمیرہ بانو لکھا تھا......

''تشمیرہ بانو......'' اعزاز کے لبوں نے بے آواز جنبش کی...... ''رس بھرا نام...... اچھی لڑکی میں تمہیں زندگی کی طرف خود لے کر آؤں گا...... یہ میرا خود سے وعدہ ہے......''

☆......☆......☆

مرد کا گناہ وقت کے تالاب میں کنکر کی طرح ڈوب جاتا ہے...... جبکہ عورت کا گناہ ساری عمر کنول کے پھول کے مانند سطح آب پہ رہتا ہے...... بس یہی ایک سچ ہے......'' وہ یہ تحریر کئی دفعہ دہراتی رہتی تھیں...... مہرالنساء بیگم...... دکھی دل کے ساتھ کپڑوں کی پیکنگ کر رہی تھیں...... ویزا آتے ہی انہیں جرمنی روانہ ہونا تھا۔

''کاش زوار شاہ آج تم بھی میرے ساتھ ہوتے...... تو دیکھتے تمہارا بیٹا کتنا کامیاب و کامران ہے...... تہمتوں کی فصل تم نے بو دی...... بہت آرام سے چلے گئے...... مگر میرا کردار میرا بیٹا ہے...... جب تمہیں معلوم ہوگا تو بہت پچھتاؤ گے...... بہت پچھتاؤ گے......''

☆......☆......☆

اعزاز گاڑی گیٹ سے پورچ تک لائے تو مما، بابا اور محب انکل کھڑے تھے۔

''خیریت...... آپ لوگ یہاں کیوں کھڑے ہیں......؟'' اعزاز شاہ نے حیرت سے سب کو دیکھا۔

''وقت دیکھا ہے کیا ہوا ہے......؟'' ردا بیگم غصے سے بولیں...... ''تمہاری دیکھا دیکھی چھوٹے صاحب بھی بالکل گھر سے غائب رہنے لگے ہیں...... کسی چیز کا ہوش نہیں...... نہ جانے کن چکروں میں ہیں صاحبزادے۔''

''کن چکروں میں ہے وہ آج کل......؟ میری دیکھا دیکھی...... کیا مطلب مما......'' وہ جواباً الجھ کر بولے...... ''میں تو ایک اسائنمنٹ پر کام کر رہا ہوں...... بابا کے علم میں ہے...... کیوں بابا......؟''

اعزاز شاہ نے زوار شاہ کی طرف دیکھا جو بہت مضمحل سے لگ رہے تھے...... ابھی وہ بابا سے ان کی طبیعت کے بارے میں پوچھتے کہ وہ اتنے کمزور اور جھکے ہوئے کیوں لگ رہے ہیں...... تب ہی محب انکل نے اپنے موبائل پر سخت لہجے میں بات کرتے ہوئے کہا۔

''یار تم نے مجھے کتنا انتظار کروایا ہے...... حد ہوتی ہے غیر ذمے داری کی بھی...... دو دن سے شکل نہیں دکھائی...... تمہاری ماں کتنی پریشان ہے...... تمہیں احساس ہی نہیں ہے......''

''کیا......؟'' وہ کچھ دیر خاموش ہو کر سننے لگے...... ''کب کہا تھا مجھے تم نے کہ تم اسپتال میں ہو...... کون سی ایمرجنسی...... تمہاری گاڑی سے کسی خاتون کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا...... بہت زخمی ہیں...... اوہ کیا روزی تمہارے ساتھ تھی...... واٹ ربش......'' محب اللہ کے منہ سے یہ انکشافات سن کر حیرت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے...... سب عجیب سے ہو گئے تھے۔

''ابھی کہاں ہو تم......؟ اوکے پولیس تمہارا بیان ریکارڈ کرلے تو فوراً گھر آؤ......''

''میری بات کروائیں انکل......'' اعزاز نے موبائل فون لینا چاہا...... تب تک وہ فون بند کر چکے تھے۔

"وہ گھر آجائے تو آرام سے بات کرلینا۔"
"کس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے......اور روزی اس کے ساتھ کیا کررہی ہے......؟"
"دیکھو زوار......میں نے تم سے کہا تھا کہ روزی کا معاملہ کچھ مشکوک ہے......اس پہ نظر رکھو......مگر تم نے یہاں کوتاہی کی ہے......تم نے اسے وانیہ کی نگرانی پر لگادیا......وہ بہت خطرناک ہے میرے دوست......وہ پتا نہیں کیا سوچ رہی ہے......وہ جو نظر آتی ہے......اصل میں وہ ہے نہیں......be careful زوار......اور بہت دنوں سے روزی کی فیضان کے ساتھ بڑھتی دوستی اور تعلقات میری سمجھ سے باہر ہیں......"

فضا میں عجیب تناؤ سا گھلا ہوا تھا......وہ سب وہیں کار پورچ کے اطراف لگی باڑھ پہ سیمنٹ کی بینچ پہ بیٹھ گئے......وہ فیضان کے منتظر تھے۔

اسی لمحے اعزاز کا موبائل بج اٹھا۔

"السلام علیکم امی......!" وہ یک دم احترام و جوش سے بولے اور تھوڑا آگے چلے گئے۔

"امی......؟" ردا بیگم نے حیرت کے ساتھ دہرایا......محب اللہ نے فوراً زوار شاہ کو دیکھا جو خود کو سنبھالنے کی ناکام کوشش کررہے تھے۔

"آپ بالکل پریشان نہ ہوں......سب ہوجائے گا......ابھی چار دن باقی ہیں......میں نے ائرلائن سے پتا کرلیا ہے......ٹکٹ کی آپ پروا نہ کریں......جی ریبال سے میری بات ہوچکی ہے......میں کل صبح آتا ہوں آپ کے ساتھ تیاری کروالوں گا......بالکل فکرمند نہ ہوں......آپ کا یہ بیٹا آپ کے لیے حاضر ہے......بے فکر ہوجائیں......اللہ حافظ۔" وہ فون بند کرکے دو چار قدم چل کے واپس آکر بیٹھے تو ردا بیگم نے پوچھا۔

"یہ کون تھیں جنہیں تم امی کہہ رہے تھے......؟" لہجہ تیکھا تھا۔

"یہ ریبال کی امی ہیں......مجھے ان کو امی کہنا اچھا لگتا ہے......اس لیے انہوں نے بھی منع نہیں کیا......مما ان کے بیٹے ریبال کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل رہی ہے جرمنی میں......اور ریبال نے سفارت خانے میں جاکر اجازت نامہ حاصل کیا ہے......صرف بیس دن کا ویزا لگا ہے......مگر یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے......جسے وہ اپنی ماں کے ساتھ ان کے سامنے وصول کرنا چاہتا ہے......مما ریبال وہی ہے جس کے ہاتھوں ایک لڑکی نے اسلام قبول کیا ہے......وہ بہت بلند کردار ماں کا بلند اوصاف بیٹا ہے......اور مجھے اس کی دوستی پر فخر ہے......"

وہ زوار شاہ کے احساسات سے بے پروا ریبال اور مہرالنسا کے گن گارہے تھے۔

محب اللہ نے زوار شاہ کے کندھوں پہ مضبوطی سے ہاتھ رکھا اور انہیں آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ دیا کہ وہ خود کو سنبھالیں جو ہونا تھا ہوچکا......آگے دیکھا جائے گا......اللہ بہتر کرے گا......فیضان شاہ ابھی تک نہیں لوٹا تھا......رات آہستہ، آہستہ بیت رہی تھی......وہ لاؤنج میں آگئے......تھکن سوار تھی......وہ وہیں صوفے پر ڈھے گئے......

☆......☆......☆

اعزاز شاہ نے بہت دھیرے سے روم نمبر ۱۳ کا دروازہ کھولا......سبز ڈائری ان کے ہاتھ میں تھی......سفید بے داغ بستر پر کشمیرہ لیٹی تھی......"سنو کشمیرہ بانو......" وہ منفی جملے ترتیب دیتے اس کے نزدیک بیٹھ گئے......آج کا سیشن فائنل بھی ہوسکتا تھا......وہ بہت تیاری کے ساتھ آئے تھے......آج پیار کی کہانی نہیں بلکہ نفرت انگیز باتوں کے ذریعے اس کے وجود کو ہلانا چاہتے تھے۔ "خود کو پانے کی جستجو میں اپنا آپ کھو دینا بڑی پرانی بات ہے......مگر ہے سچی بات......سنو کشمیرہ......تمہاری بچپن کی ایک سہیلی ہوا کرتی تھی......تمہاری ماں جو پل بھر میں تمہارے جلتے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر پل بھر میں وجود کے سارے دکھ چن لیتی تھی......اور تمہاری وہ گڑیا جو بہت عزیز تھی تمہیں

''اور جب تم نے اپنی مما سے کہا تھا میری سالگرہ ہے آپ وہی گڑیا لائیے گا...... کیا ہوا تھا تمہیں پتا ہے ناں...... یاد کرو...... سفید تابوت میں لپٹے دو مردہ وجود...... تمہاری پھٹی، پھٹی حیرت زدہ آنکھیں...... تمہارا ننھا سا پیکر اس دن ٹوٹ گیا تھا...... سن رہی ہو ناں تشمیرہ......'' وہ اس کے قریب بیٹھے سرگوشی میں کہہ رہے تھے۔

''تمہارے دکھوں کے سارے در میں کھولوں گا آج......''

''تم نے ہمیشہ ردائے عفت اوڑھی...... مگر تم ہمیشہ بدنام ہوئیں...... میں غلط تو نہیں کہہ رہا...... تمہاری محرومی کی ساری داستانیں تمہاری سبز رنگ کی ڈائری میں تحریر ہیں...... یہ دیکھو میرے پاس ہے ڈائری جسے تم نے سب سے چھپا کر رکھا...... اب تمہارے سارے راز افشا ہو جائیں گے...... دنیا کو تمہارے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو جائے گا...... تم نے اپنی تائی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ تعویذ گنڈوں کے ذریعے تمہیں اپنے گھر سے نکالنا چاہتی تھیں...... اور تم نے اپنی محرومی کا بدلہ اس طرح لیا کہ ان ہی کے بھانجے سے شادی کرنے کی ضد کی...... پھر اسے منع کیا تو وہ تمہارے عشق میں ڈر گز لینے لگا...... تم نے بہت ظلم کیا ہے تشمیرہ...... بہت ظلم...... بہت سے دل توڑے ہیں......'' تشمیرہ کے وجود میں بالکل بھی جنبش نہیں ہوئی...... وہ اس کی طرف دیکھتے رہے۔

''تمہیں اپنے بوڑھے تایا کی بھی کوئی فکر نہیں...... تم نے ان کی عزت کا بھی خیال نہیں کیا...... پوری زندگی ناامیدی کے ساتھ گزار کے تم ایک طرف فاطر کو جھوٹی محبت کے خواب دکھاتی رہیں اور ایک طرف تمہارا دوست ریبال جرمنی جا کر بھی تمہیں نہیں بھولا...... تمہیں یاد ہے ناں ریبال...... تمہارا یونیورسٹی فیلو......! تمہاری ڈائری میں اس کی محبت کی خوشبو کی بکھری ہے......

زبان کے تیر

جب لوگ ہی جذبوں کی توقیر نہیں کرتے
ہم بھی کوئی دکھ اپنا تحریر نہیں کرتے
دل چیرتا ہے کیسے لہجے کا روکھا پن
کرتی ہے زباں وہ کچھ جو تیر نہیں کرتے

از: ساجدہ ظفر، کمالیہ

غزل

کہاں اے دوست چلتے جا رہے ہو
بہت آگے نکلتے جا رہے ہو

چلے جاؤ مگر یہ تو بتا دو
یہ رستے کیوں بدلتے جا رہے ہو

دلوں کو عشق کی سولی چڑھا کر
کہاں اب ہاتھ ملتے جا رہے ہو

ہمیں سمجھا رہے ہو پیار سے تم
سنو تم بھی بدلتے جا رہے ہو

اٹھا کر بوجھ کاندھوں پر جفا کا
سنا ہے پھر سنبھلتے جا رہے ہو

لگی ہو چوٹ کوئی دل پہ جیسے
اٹھا کر درد چلتے جا رہے ہو

رُتوں کا بے وجہ ہی پوچھ بیٹھے
خبر کیا تھی کہ جلتے جا رہے ہو

بڑھا کر دوستی سورج سے ارشد
کہاں سایوں میں چلتے جا رہے ہو

کلام: ارشد ملک

انتخاب: شازیہ اعجاز شازی، راولپنڈی

''اور پھر تم نے سب کچھ بھلا کر فاطر سے شادی کی ہامی بھرلی اور دلہن کا جوڑا پہن لیا...... بے حسی کی چادر تان کے تم اس کی دلہن بننے جارہی تھیں مگر تمہارے منحوس وجود نے اس کو مار دیا...... تمہارے ہی گھر میں فاطر کو مار دیا گیا...... وہ لہو میں نہایا تمہارے سامنے پڑا تھا اور تم دلہن بنی اسے دیکھ رہی تھیں...... تم نے اسے مار دیا تشمیرہ...... تم قاتل ہو...... تم منحوس ہو...... تم نے اسے مار دیا...... تم نے اسے مار دیا...... تم منحوس ہو......'' وہ جذباتی انداز میں سر جھکا کے کہے جارہے تھے۔

''نہیں نہیں...... نہیں نہیں...... میں نے نہیں مارا...... میں منحوس نہیں ہوں...... میں نے کچھ نہیں کیا......'' تشمیرہ کی پلکیں میکانکی انداز میں کھل رہی تھیں...... اور اس کے لبوں سے تکرار جاری تھی۔ ''میں منحوس نہیں ہوں...... میں نے نہیں مارا...... ریبال مجھے بچالو...... مجھے بچالو...... مجھے بچالو......''

''تشمیرہ کو ہوش آگیا ہے...... ایکسی لینٹ......'' ڈاکٹر راحیل نے قریب آتے ہوئے کہا...... ''یار اعزاز معجزہ ہوگیا ہے...... تشمیرہ اپنا سر پٹخ رہی ہے...... گویا مردہ وجود میں نئی روح پھونک دی گئی......'' جیتا جاگتا وجود اعزاز کے سامنے تھا...... جسے دیکھنے کی خواہش میں اس نے کتنی دعائیں کی تھیں...... ڈاکٹر راحیل نے فوراً نرسوں کو اس کی ذہنی کیفیت کے پیشِ نظر الرٹ کررکھا تھا۔

''مجھے بچالو...... میں نے کچھ نہیں کیا......'' وہ تڑپ تڑپ کر کہہ رہی تھی...... رکے ہوئے خشک آنسو بہنا شروع ہوگئے تھے۔

''سنو اب تم نے جو اس کے زخم ابھارے ہیں انہیں resolve بھی کرو......'' ڈاکٹر راحیل نے فوراً اعزاز شاہ کو اشارہ کیا۔

''تشمیرہ...... تشمیرہ......'' اعزاز نے اس کے ماتھے پہ ہاتھ رکھا...... ''تمہارا کوئی قصور نہیں ہے...... تم بالکل بے قصور ہو...... میں ہوں تمہارا گواہ...... تمہارا ضامن...... اچھے لوگوں سے ہمیشہ امتحان لیا جاتا ہے......'' تشمیرہ نے کھلتی اور بند آنکھوں سے مسیحائی کے لمس کو محسوس کیا اور اطمینان سے آنکھیں بند کرلیں...... اعزاز شاہ کا ہاتھ اس کی پیشانی پہ عقیدت سے جمارہا۔

''تم اب میری پناہ میں ہو...... تمہارے راستے کے سارے پتھر میں چن لوں گا......'' وہ دھیرے، دھیرے سرگوشی کرتا رہے تھے اور زندگی آہستہ، آہستہ مسکراتی رہی......

☆......☆......☆

فیضان شاہ نے موبائل بند کیا تو اس کے چہرے پہ پریشانی کے واضح آثار تھے......

''کیا میں نے اس دن محبّ انکل کو نہیں بتایا تھا کہ میں آرہا ہوں......'' وہ سوچنے لگا۔

کوئی چیز غلط تھی جو اسے بار، بار غلط لگ رہی تھی...... وہ پریشان ہونے لگا...... وہ اپنا موبائل چیک کرنے لگا...... کیا اس نے واقعی محبّ انکل کو فون یا میسج نہیں کیا تھا...... وہ call log چیک کرنے لگا......

دو دن پہلے کی محبّ انکل کی کال تھی...... جبکہ میسج کے خانے میں send کیا ہوا میسج send نہیں ہوا تھا۔

وہ حیرت میں پڑ گیا...... ''یہ میسج کیوں نہیں گیا...... نیٹ ورک تو صحیح کام کررہا تھا......'' اس ایکسیڈنٹ کے بعد سے اسے سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں ملا...... پھر وہ معاملات دوسرے ہوگئے تھے...... روزی کے ساتھ، ساتھ ان بزرگ خاتون کو ساری مراعات دلوانا...... پولیس کے چکر...... یہ سب پریشانیاں اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھیں...... کہ اس کے ساتھ ہو کیا رہا ہے......

''anything serious?......''

روزی نے اسے موبائل اسکرول کرتے ہوئے دیکھا تو پوچھنے لگی......

''محبّ انکل غصہ ہورہے تھے کہ میں نے انہیں اطلاع نہیں دی کہ میں کہاں ہوں......''

''تو تم نے بتایا نہیں کہ تم کہاں تھے......؟'' روزی نے کہا۔

''میں نے میسج کیا تھا...... انہیں نہیں ملا......؟ اور کال بھی شاید کی تھی...... مجھے یاد نہیں آرہا ٹھیک سے......''

''اوہ فیضان...... کم آن...... تم دو دن سے ان سے ملے نہیں ہو......تو ان کا شکوہ بجا ہے......'' روزی نے شوخی سے اپنی آنکھوں کو گھماتے ہوئے کہا۔

''واٹ...... دو دن سے......؟ ہیں......کیا بات کررہی ہو تم...... میں......گھر نہیں گیا......'' وہ الجھ رہا تھا۔

''جی......ہاں جناب...... میں آپ کو بتاتی ہوں کہ آپ کہاں تھے...... دیکھیں...... پرسوں رات کو ایکسیڈنٹ ہوا تھا...... ہم وہاں تقریباً ساری رات رہے...... پھر آپ مجھے چھوڑنے گئے تو کافی پینے کے لیے رکے اور پھر میں کافی کے مگ لینے واپس آئی تو آپ سو چکے تھے......صبح تک آپ کی گہری نیند تھی...... مجھے علی الصباح اٹھنے کی عادت ہے......سو میں تو آفس بھی گئی تھی...... زوار صاحب کو میں نے کچھ نہیں بتایا......اور نہ انہوں نے پوچھا......اور آج تو...آپ میرے ساتھ اسپتال میں ہیں...... صبح سے ان مریضہ اور پولیس کی کارروائی کو بھگت رہے ہیں......'' فیضان شاہ ہکا بکا ہوکر اسے دیکھے گیا...... وہ سمجھنے سے قاصر تھا......اسے کچھ بھی سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا ہوا ہے......؟

روزی مسکراتے ہوئے آگے بڑھی۔ ''تھینک یو ویری مچ تم میرے ساتھ، ساتھ رہے...... ورنہ میں بہت اکیلی ہوجاتی......'' وہ بہت ادا سے مسکرا کر بولی تھی......روزی کے انداز دیکھ کر وہ پھر بہت کچھ بھول گیا...... روزی کے سوال پر وہ کچھ سوچ نہ سکا......

روزی اپنی انگلی میں پڑی انگوٹھی گھماتی ہوئی موبائل اٹھانے کے لیے مڑی تو اس کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ تھی...... جو کسی خاص معرکے کو فتح کرنے پر ہوتی ہے......

وہ سامنے دیکھتے ہوئے خود کلام تھی...... ''وہ تو تم نے بتا دیا کہ تم اسپتال میں ہو...... میرے ساتھ......ورنہ اغوا ہوجاتے......خیر ہے......اب تو کام نبٹ ہی رہے ہیں......مگر فیضان شاہ' روزی کے وار سے بچنا بہت مشکل ہے......تم کبھی سمجھ نہیں پاؤ گے کہ کافی کی ایک پیالی نے تمہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا......'' یک دم اس کے لہجے میں سانپوں کی پھنکار سرسرانے لگی۔

''جس دن مجھے ثبوت مل گیا کہ تم میری بہن کے قتل میں براہِ راست انوالو ہو تو وہ حشر کروں گی تمہارے خاندان کا کہ سپنوں میں بھی نہیں سوچا ہوگا......'' روزی کی پشت پہ کھڑا فیضان شاہ مستقل پریشانی کا بت بنا کھڑا تھا...... اگر وہ روزی کا اصل روپ دیکھ لیتا تو وہ بہت کچھ جان جاتا......مگر ہائے ری کم بخت محبت کہ۔

دل کی باتوں میں آکے پچھتائے\
سانپ پہ پاؤں آگیا ہو جیسے

اور روزی کے ڈنک سے بچنا اس کے لیے ناممکن تھا...... وہ ایک ایسی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہوچکا تھا...... جہاں سے رہائی مشکل تھی......اور اسے تو روزی کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا......مگر کچھ حواس بحال ہونے کے بعد اسے گھر کا خیال آیا تو وہ آہستہ آہستہ قدموں سے باہر نکل گیا......روزی نے پُرسوچ انداز میں دیکھا اور اس کی سوچ کا محور زینب خالہ پر رکا تھا۔

''بہت ہوگیا...... یہ معاملہ اب سمیٹنے کا وقت ہے......'' وہ بڑبڑاتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔

☆......☆......☆

کبھی ہم خوب صورت تھے\
کتابوں میں بسی خوشبو کے مانند\
سانس ساکن تھی\
بہت سے ان کہے لفظوں سے\
تصویریں بناتے تھے\
پرندوں کے پروں پر نظم لکھ کر\
دور کی جھیلوں میں بسنے والے\
لوگوں کو سناتے تھے......\
ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو

کہ ہم کو جگنوؤں کے......
تتلیوں کے دیس جانا ہے

نیرہ نور کی میٹھی آواز میں کلام اس کے کمرے میں گونج رہا تھا...... تایا جی اس کے قریب رکھی کرسی پر براجمان تھے...... اور تشمیرہ آنکھیں بند کیے کچھ سوچ رہی تھی۔

”وہ مرہمی لہجہ کس کا تھا...... وہ خوش کلام کون تھا...... ریبال تو ہو نہیں سکتا۔“ وہ بے اختیار چپ چاپ روئے گئی...... رونا تو اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی...... اور یہی آنسو اس کے دکھ کی دوا بن کر اسے سکون دے رہے تھے۔

تایا جی کے منہ سے وہ کئی بار اعزاز شاہ کا نام سن چکی تھی...... اس کے قصیدے ڈاکٹر راحیل نے بھی سنائے تھے...... وہ اس ناخدا سے ملنا چاہتی تھی...... جس کے ہاتھوں کا لمس اس نے اپنی پیشانی پہ محسوس کیا تھا۔

وہ دو دن سے نظر نہیں آیا تھا...... ”وہ کہاں ہے......؟“ اسے اس کا انتظار تھا...... وہ کیسے اس کا شکریہ ادا کرے گی...... اس کا احسان کیسے اتارے گی......

☆......☆......☆

موبائل فون کی گھنٹی نے اعزاز کو نیند سے جگا دیا۔ وہ لاؤنج کے صوفے پر نیم دراز ہو کر سو گئے تھے...... فیضان اب تک گھر نہ آیا تھا...... مما کو زبردستی زوار شاہ اندر لے گئے تھے...... تا کہ وہ کچھ دیر آرام کر لیں۔

”ہیلو...... جی......“ وہ بوجھل آنکھوں کے ساتھ کہہ رہے تھے...... اور دوسری طرف سے ہوش اڑا دینے والی خبر نے اسے جیسے چاروں شانے چت گرا دیا۔

فیضان شاہ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا...... اور وہ بری طرح زخمی تھا۔

”تیز قدموں سے باہر بھاگے...... محب اللہ انکل اور زوار شاہ باہر ہی کھڑے تھے...... ان کی حالت بھی اس سے کم نہ تھی...... آناً فاناً گاڑی بتائے گئے اسپتال کی جانب رواں تھی۔

☆......☆......☆

زوار شاہ کے لیے اب زندگی امتحان بن کر طلوع ہوئی تھی۔

فیضان ایمرجنسی وارڈ میں تھا...... ڈاکٹرز کی رپورٹ کے مطابق وہ گاڑی چلاتے ہوئے ہوش میں نہ تھا...... اور اس کے خون میں ڈرگز کے آثار ملے تھے...... وہ تینوں لابی میں کھڑے تھے۔

”ڈرگز...... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا......“ زوار شاہ نے سختی سے نفی میں سر ہلایا...... ”وہ کبھی ان لغویات میں شامل نہیں ہوا......“

”لیکن بابا ایسا ہو چکا ہے...... آپ اس رپورٹ کو جھٹلا نہیں سکتے......“ اعزاز نے افسردگی سے رپورٹ دکھائی۔

محب اللہ نے کچھ دیر سوچا...... اور پھر زوار سے کہا۔

”ہمیں روزی پہ نظر رکھنی ہے...... اور اسے آزاد نہیں چھوڑنا......“

”او کے......“ زوار نے فون پہ کسی کو ہدایات دیں...... ڈاکٹر اسی وقت ان کے قریب آ گئے تھے۔

”اللہ کا شکر ہے کہ آپ کا بیٹا خطرے سے باہر ہے۔“

”thank God......“ اعزاز شاہ نے شکر ادا کیا۔

”تھوڑی دیر بعد آپ اس سے مل سکتے ہیں......“

”او کے......“

اعزاز اسے دیکھنے چل دیے...... سفید پٹیاں اس کے سر پہ بندھی تھیں...... جسم پر بھی خراشیں تھیں...... وہ خاموش کھڑے اسے دیکھنے لگے۔

”روزی...... روزی...... روزی...... مجھے چھوڑ کر نہیں جانا......“ فیضان بڑبڑا رہا تھا...... اسے ہوش نہ تھا...... مگر اعزاز باہوش تھے۔

”یہ روزی کو کیوں آواز دے رہا ہے...... آخر یہ معاملہ کیا ہے......؟“

چودھواں اور آخری حصہ اگلے ماہ



ناولٹ

اے عشق مجھے پارس کر دے

طیبہ عنصر مغل

"عبد السمیع بیٹے، تم کھانا کھالو تو مولوی صاحب کو کھانا دے آنا۔" اماں نے ٹرے میں رکھے روٹی اور سالن پر سلیقے سے دسترخوان ڈالا اور میرے حوالے کر دیا۔

آج جمعرات تھی اور اماں ہر جمعرات کو مسجد میں کھانا باقاعدگی سے بھجواتی تھیں۔

ابا کا تو محض ایک ہیولا سا تھا جو مجھے دھندلا، دھندلا سا یاد تھا کیونکہ میں بہت چھوٹا تھا جب ابا کا

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
- ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
- کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ایڈ فری لنکس
- ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ کا ایک پیج پر
- ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-



انتقال ہوگیا۔ چھوٹے سے گاؤں میں غنیمت تھا کہ مکان ہمارا اپنا تھا۔ ابا قریبی قصبے کے ایک نیم سرکاری اسکول میں پڑھاتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد میں اور اماں اکیلے پڑ گئے۔ جانے والے تو چلے جاتے ہیں مگر زندہ لوگ تو جیتے جی درگور ہوجاتے ہیں، اماں اور ابا کے قریبی جتنے رشتے تھے وہ خود اپنا پیٹ بہ مشکل پالتے تھے۔ خالہ تو پھر بھی اماں کی خبر گیری کرتی تھیں مگر ابا کے تو قریبی رشتے دار تھے ہی نہیں جو دور پار کے تھے انہوں نے بھی وقت پڑنے پر منہ پھیر لیا تھا۔ اور اماں نے تب سے سلائی مشین سنبھالی اور آج تک اس کو سنبھالے بیٹھی تھیں۔ گاؤں والے اچھے تھے، وہ اپنے کپڑے اماں سے سلواتے تھے، یوں ہمارا وقت گزر رہا تھا۔ زندگی رکتی نہیں رواں رہتی ہے مگر اس کی روانی کے قائم رکھنے کو کتنی جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے، یہ تو اماں کی مشین کا دن رات کا چلتا پہیا مجھے بتاتا تھا۔

ذرا ہوش سنبھالنے پر میں نے چاہا کہ میں کوئی مزدوری یا کوئی چھوٹا موٹا کام کرلوں۔ مگر اماں کو ہرگز منظور نہیں تھا کہ میں اپنی پڑھائی سے دھیان ہٹاؤں، وہ مجھے ایک بڑا افسر بنانا چاہتی تھیں اور میں بھی دلجمعی سے پڑھتا جارہا تھا۔

☆☆☆

صبحِ کاذب کا وقت تھا، پو پھٹنے والی تھی اگرچہ گرمی ابھی سے تھی مگر جیسے ہی گاؤں کی پگڈنڈی پر قدم دھرا تو ذرا دور ٹیوب ویل چل رہا تھا۔ اس کے ٹھنڈے پانی سے گلے ملتی ہوا رگ و پے میں سکون سا بھر گئی۔ تا حدِ نگاہ پھیلا ہوا سرسبز کھیتوں کا سلسلہ آنکھوں کو تراوٹ بخش رہا تھا۔ گاؤں کی ساکت فضا میں پرندوں کی چہچہاہٹ میں اللہ کی تسبیحات عروج پر تھیں جو سماعت کو بے حد بھلی لگ رہی تھیں۔

ہوا کے زور سے پتوں کی تالیاں جلترنگ بجا رہی تھیں۔ گاؤں کی چکی کی آواز ان آوازوں میں مل کر ایک سرگم بنا رہی تھیں۔ میں نے سکون سے آنکھیں بند کرکے ان راحت آمیز لمحات کو روح میں اتارا اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر پگڈنڈی پر قدم آگے بڑھا دیے۔

''سلام ابا......!'' ابا جو چلم پر گڑ ڈال رہے تھے بلائیں لیتی نظروں سے چودھری اورنگزیب کو دیکھا اور زور سے سلام کا جواب دیا۔

''اماں لے آ ناشتا'' رات بھر کھیتوں کو پانی لگوانے کے بعد اورنگزیب صبح سویرے گھر آیا تھا۔

''ماں صدقے! آ گیا میرا پتر لے یہ تازہ، تازہ مکھن والے پراٹھے تے لسی۔'' اماں نے گھی سے تر بتر پراٹھے اور ان پر مکھن کے پیڑے والی چنگیر اور لسی سے بھرا جگ پتر کو پیش کیا۔

''او بھلی لوک! مجھے بھی کوئی چا (چائے) پلا دے۔'' چودھری اسلم نے حکیماں بی بی کو یاد دلایا۔

''نہ جی چودھری صاحب اتنے سارے ملازم ہیں کسی کو بھی کہہ دیں بنا دیں گے۔ 'چا......'' چاپلی کے چا جیسے تو ہوگئے ہو......رنگ سڑ کے سواہ (رنگ جل کے سیاہ) ہو رہا ہے تسی وی لسی پیا کرو۔'' چودھرائن نے جواب دیا۔

''او رہنے دے پتر کو پراٹھے خود بنا کے دیتی ہے، میری چاہ بنانے کو تیرے گٹوں (ٹخنوں) میں درد شروع ہوجاتا ہے۔''

''آہو تے میرا اکلو اک (اکلوتا) پتر ہے سو واری صدقے جاواں میں اپنے شہزادے کے۔'' چودھرائن کے لہجے میں ممتا چھلک رہی تھی۔

''نہ تو وہ جو دو شہزادیاں ہیں میری ان کی شادی کیا ہوئی ان کی تو گنتی ہی نہیں اس گھر میں۔'' چودھری اسلم نے پیار بھرے لہجے میں اپنی بیٹیوں کو یاد کیا۔

''کیوں نہ جی......! ان کی اپنی تھاں اے (جگہ ہے) پر میرے پتر دی ہور ای جگہ اے۔''

اورنگزیب، اماں، ابا کی تکرار سے بے نیاز دلجمعی سے ناشتا کررہا تھا جیسے اس سے زیادہ ضروری کوئی کام ہی نہیں ہو۔ اب ایک لمبی ڈکار لے کر اٹھا۔

''میں اب سونے لگا ہوں اماں...... وقت سے جگا دینا، ڈیرے پر بھی جانا ہے۔'' لمبی جمائی لیتے

ہوئے وہ اندر کمرے کی طرف بڑھ گیا اور اماں برتن اٹھانے کو پینو کو آواز دینے لگیں۔

چودھری اورنگزیب کے اصلی نام سے تو سب ہی بہت دیر سے واقف ہوئے تھے۔ گھر والوں اور دوستوں نے ''اچھو'' بولا تو پھر وہ بے تکلف دوستوں کے لیے بھی اچھو ہی ہوگیا۔ ماں کا لاڈلا تھا۔ آٹھویں جماعت کے بعد گاؤں میں اسکول بھی نہیں تھا اور کچھ اچھو کا من بھی پڑھنے میں نہ لگتا تھا۔ اس لیے وہ بہ مشکل آٹھویں جماعت پاس کر کے اب مزارعوں کے ساتھ زمینوں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔

☆☆☆

''سیمو دیکھ ذرا گندم کے دانے سمیٹ لے، شام ہونے کو ہے۔'' صغریٰ نے سیمابی بی کو آواز دی۔

''آئی اماں، دودھ ابلنے کو رکھا ہے ابل جائے تو کرتی ہوں۔'' سیما نے باورچی خانے کی کھڑکی سے جواب دیا۔

''نی سیما اپنا سمیع نہیں آیا بہت دن ہو گئے ہیں، پہلے تو دو چار دن میں چکر لگا جاتا تھا۔ اب کے زیادہ وقت نہیں لگا دیا اس نے۔'' اماں کے لہجے میں بھانجے کے لیے پیار کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

''اس نے وہ وڈے والے کالج میں داخلہ لے لیا ہے جس کو یورسٹی (یونیورسٹی) کہتے ہیں۔'' سیما نے فخر سے کہا آخر کو آٹھویں فیل تھی۔ ''اب اس کو ویلا (وقت) نہیں ملتا ہوگا۔'' سیما نے مسکراتے ہوئے کن انکھیوں سے زرینہ کو دیکھا۔ زرینہ جواب کے بنائے ہوئے برتن سمیٹ رہی تھی اس کی آنکھوں میں چھم سے بانکا سجیلا عبدالسمیع آدھمکا چہرے پر اس کے ذکر سے لالی چھا گئی اور ایسا کیوں نہیں ہوتا آخر کو وہ اس کی منگ تھی۔

''چلو بھی رنگ والی گڑویوں اور گھڑوں پر شیشے لگا دو، چودھری اسلم کے گھر دینی ہیں۔'' کرم دین کمہار کی مداخلت پر دونوں بیٹیوں نے جلدی، جلدی برتن سمیٹ لیے۔

☆☆☆

''رابیل ایک منٹ یار میری بات تو سنو۔'' سنبل اس کے پیچھے تقریباً بھاگ رہی تھی لیکن رابیل اپنی رفتار کم کرنے کو تیار ہی نہیں تھی۔

''تمہیں جو کہنا ہے مجھے پہلے سے پتا ہے، اس لیے تم بار، بار وصی کی وکالت مت کیا کرو...... ہم اچھے دوست تو ہو سکتے ہیں، کم از کم جس پوائنٹ آف ویو سے وہ مجھے دیکھتا ہے میری زندگی میں ان خرافات کی ہرگز گنجائش نہیں...... مجھے زندگی میں بہت آگے بڑھنا ہے اور یہ عشق و عاشقی محض بیکار کے مشغلے ہیں۔'' وہ تیز، تیز چلتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی اور اس کے الفاظ صرف سنبل کو سمجھ آرہے تھے۔

وصی یونیورسٹی میں سنبل اور رابیل سے دو سال سینئر تھا، وہ بے حد ذہین اور نفیس لڑکا تھا اور سب سے بڑی بات کہ رابیل کو دل و جان سے چاہتا تھا۔ جب تک وصی نے اظہار نہیں کیا تھا تب تک وہ، سنبل اور رابیل بہترین دوست تھے لیکن جب سے وصی نے اپنی چاہت کا برملا اظہار کیا تھا رابیل اس سے کترانے لگی تھی اور سنبل اس کو چاہنے کے باوجود وصی کے لیے ہموار نہیں کر پا رہی تھی۔

رابیل ایک امیر کبیر اور لائق فیملی سے تھی اور اس مختصر سی فیملی میں اس کے پیارے سے بابا امتیاز ملک جو سول سروسز میں ایک اہم عہدے پر فائز تھے...... اور والدہ تابندہ غوری ایک مشہور و معروف گائنا کالوجسٹ تھیں۔ رابیل کو ایک ڈسپلن لائف کی عادت تھی اور اسے اپنے والدین سے دو قدم آگے رکھنے ہیں، یہ اس نے طے کر رکھا تھا اور کچھ ایسا کرنا ہے کہ اس کے والدین کی عزت اور وقار میں چار چاند لگا دے۔ کسی کو پسند کرنا ان کے طبقے میں کوئی خاص ممنوع نہ تھا۔ مگر اب ایسا بھی نہیں تھا کہ وصی کے ساتھ یونیورسٹی میں بغیر کسی رغبت کے افیئر چلاتی اور خود کو اس کا پابند کر لیتی۔ اس کا آئیڈیل اس کے بابا جان تھے۔ اسی وجہ سے اس کا ٹارگٹ بھی سول سروسز ہی تھیں۔ ماما کے پروفیشن سے اسے لگاؤ

محسوس نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

میں نے عینک اتار کر صاف کی۔ اب گاؤں کی اصل حدود شروع ہو چکی تھیں۔ اِکا دُکا بچے ہاتھوں میں بستے تھامے یا کاندھوں پر لادے اسکول کی سمت رواں تھے۔ گھروں میں سے دھواں اٹھ رہا تھا یقیناً ناشتے کا اہتمام ہو رہا تھا۔ گھروں اور مسجد سے آتے ہوئے لوگوں کی آوازیں، مرغوں کی بانگیں اور جانوروں کی آوازیں سب گڈ مڈ ہو رہی تھیں۔ روشنی پھیل چکی تھی۔ کچھ مکان جو پہلے کچے تھے وہ اب پکے اور کچھ رنگ برنگے بنگلوں کی شکل میں ڈھل چکے تھے۔ لیکن پھر بھی گاؤں کی فضا کا خالص پن اب بھی جوں کا توں تھا۔ سوچوں کے بھنور میں چکراتے مجھے ٹھوکر لگی تو میرا دھیان بھٹک گیا۔ اور سنبھلتے ہوئے میری نظر اپنے پیروں پر گئی قیمتی بوٹ گرد آلود ہو رہے تھے۔ عادتاً میرا ہاتھ جیب میں رکھے رومال کی طرف بڑھا لیکن پھر رک گیا۔ جس مٹی کی کشش مجھے پیدل چلا رہی تھی اس کو صاف کر کے کیا ثابت کرنا تھا مجھے اور سر جھٹک کر آگے بڑھنے لگا۔

☆☆☆

''چل زری برتن اٹھا۔ چوہدرائن کو دے آئیں۔'' اماں نے برتنوں کو گھما کے جھلملاتے شیشوں کا جائزہ لیتے ہوئے زرینہ کو آواز دی۔

''اماں میں پڑھ رہی ہوں ناں سیما کو لے جاؤ۔'' وہ ایف اے کی پرائیویٹ تیاری کر رہی تھی۔ سمیع اس کے لیے پورا کورس لے آیا تھا۔

''نہ پتر، سیما سارے گھر کا سیاپا بھی کرے اور میرے ساتھ، ساتھ بھی بھاگی پھرے۔ رکھ کتابیں کوئی ماسٹرنی نہیں بنانا تجھے۔'' وہ اماں کو پھر سے انکار کر دیتی لیکن سیما نے دروازے کے پیچھے سے اسے ہاتھ جوڑے تو اس کو اٹھنا ہی پڑا۔ ہمراز جو تھی بہن کی۔ سیما کو اپنے منگیتر خالد سے ملنے کا موقع مل جانا تھا۔ خالد ان کے چچا کا بیٹا تھا اور آج کل چھٹی پر آیا ہوا تھا وہ فوج میں تھا۔

''چل میری دھی جلدی کر...... دیر ہو گئی تو ویسے بھی چودھرائن کو باتیں بنانے کا موقع چاہیے ہوتا ہے۔'' زرینہ کتابیں سمیٹ کر رکھ چکی تھی اور کالی چادر میں اچھی طرح خود کو لپیٹ کر سیما کو چٹکی کاٹ کر ہنستی ہوئی اماں کے ساتھ چل دی۔

''چودھرائن کیسے لگے برتن؟'' اماں نے یوں سوال کیا جیسے چودھرائن ابھی برتنوں کی شان میں قصیدہ پڑھ دے گی۔ چودھرائن جو ستائشی نظروں سے گل دان کو دیکھ رہی تھی۔ جھٹ سے ناک چڑھا کر بولی۔

''ہاں ٹھیک ہے پر پہلے والا دم خم نہیں ہے اب تم لوگوں میں۔'' زرینہ کو جی بھر کے غصہ آیا۔ کتنی محنت کی تھی ابا نے ان کو بناتے ہوئے اور اس پر شیشے لگاتے ہوئے اس کے اور سیما کے ہاتھ بھی زخمی ہو گئے تھے اور اماں کی نقش نگاری تو دیکھ کر... کسی مصور کی رنگین تصویر کا گمان ہوتا تھا مگر یہ ایک کمہار کے برتن تھے کسی مصور کی مشہور پینٹنگ نہیں تھی جو سراہی جاتی اور خریدنے والی بھی چودھرائن جیسی عورت تھی۔ زرینہ کا دل چاہ رہا تھا برتن اٹھائے اور واپس گھر چل دے اور وہ ایسا کر بھی دیتی اگر اماں اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبا کے نہ بیٹھی ہوتیں۔

''سلام اماں......'' گورا چٹا اور بل کھاتی مونچھوں والا چودھری اورنگزیب عرف اچھو سیدھا برآمدے میں ان کے سر پر آ کھڑا ہوا تھا۔ کچھ کہتے، کہتے اگلی بات اس کے منہ میں ہی رہ گئی۔ قصوروار وہ بھی نہیں تھا۔

کالی چادر میں چمکتا ہوا گوری رنگت والا کتابی چہرہ اور بغیر کاجل کے کالی بدلیوں جیسی کجراری اور ستاروں کی طرح جھلملاتی آنکھیں......وسعت ایسی جیسے جہان سما جائے۔ تازہ گلاب کی پنکھڑیوں سے لب، لگتا تھا اوس کی بوندوں کی نمی لیے ہوئے تھے۔ ستواں مغرور ناک اور کالی چادر کے گھیرے سے نکلتے ہوئے گھٹاؤں جیسے سیاہ گھنگرالے بال اس کے صبیح رخساروں سے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ نظر تو رکی سو رکی

اورنگزیب کی تو لگتا تھا دھڑکن بھی رک گئی تھی۔اس کی محویت کو اماں کی کھنکھار نے توڑا تو وہ ہڑ بڑا کر چودھرائن کی جانب متوجہ ہوا۔

''اورنگزیب چودھری! یہ کرم دین کمہار کی بیوی صغریٰ اور اس کی بیٹی ہے۔'' پتا نہیں اچھو کو یہ سمجھایا کہ وہ چودھری ہے یہ یاد رکھے یا یہ بتایا کہ یہ کمہار کے گھر کی عورتیں ہیں ان کی اوقات بتائی۔

لیکن اس وقت اچھو، چودھرائن کے لہجے یا باتوں کے مطلب میں الجھ نہ سکا۔جھٹ سے صغریٰ کو سلام کر ڈالا۔

''السلام علیکم چاچی......''

''وعلیکم السلام چھوٹے چودھری جی۔'' اماں نے بھی جھٹ سے سلام کا جواب دیا۔

''چل بھئی صغریٰ شاواش تیرے پیسے منشی تجھے دے جائے گا۔'' چودھرائن نے گویا اس کو جانے کا اشارہ دیا۔(کہ اب چلتی بنو)

اور زرینہ تو پہلے ہی سے انتظار میں تھی۔جھٹ اٹھ کھڑی ہوئی اور ماں کو بھی کھینچ کر کھڑا کرلیا۔اماں جو الوداعی کلمات کہنے کے موڈ میں تھی۔ان کا سلسلہ زرینہ نے ''اچھا اللہ حافظ چودھرائن جی۔'' کہہ کر توڑ دیا اور حویلی کے برآمدے سے نکل کر باہر آ گئی۔ اماں بھی ہانپتی کانپتی اس کے پیچھے چل دی۔زرینہ کو اپنی کمر پر اورنگزیب کی والہانہ اور چودھرائن کی قہر برساتی دونوں نظریں محسوس ہو رہی تھیں۔اِدھر اچھو کا انہماک اس وقت ٹوٹا جب وہ دونوں ماں، بیٹی حویلی کے برآمدوں کو پار کر کے نظروں سے اوجھل ہو گئیں مگر نظر سے اوجھل ہونے والے ضروری نہیں دل سے بھی اوجھل ہو جائیں۔اورنگزیب کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔دل تو زرینہ کی قدموں کی دھول اڑا لے گئی تھی۔

☆☆☆

اتوار کا دن تھا اور سمیع دیر سے اٹھا تھا۔اماں نے ناشتا بنانا شروع کیا تب تک وہ نہا دھو کر سفید جوڑا پہنے سیدھا باورچی خانے میں ہی آ گیا اور پیڑھی گھسیٹ کر بیٹھنے لگا۔

''ارے پتر! تو چل میں اندر لاتی ہوں ناشتا اِدھر کیوں آ بیٹھا ماں صدقے۔''

''نہیں میری پیاری اماں یہاں ہی بیٹھنے دیں اپنے پاس اتنے دنوں بعد تو یوں موقع ملا ہے آپ کے پاس بیٹھ کر پیڑھی پر ناشتا کرنے کا۔''

''چل جیسے تیری مرضی پر آج ذرا بھائی کرم دین کی طرف بھی چکر لگا لیتے ہیں، صغریٰ آپا تیرا بہت پوچھتی ہے۔اور زرینہ کو بھی تو تیرا انتظار ہوتا ہوگا۔ تیرے نام پر بیٹھی ہے۔'' اماں جیسے اس کو یاد دہانی کروا رہی تھیں۔زرینہ کے نام پر عبداللہ کی دھڑکن میں خوشگوار سا احساس انگڑائی لے کر جاگا۔

''ٹھیک ہے اماں چلتے ہیں۔'' وہ کہہ کر ناشتے کی جانب متوجہ ہو گیا۔

☆☆☆

''رابی بیٹا! اب اٹھ بھی جاؤ...... یہ تم ہر سنڈے کو اتنی ڈل کیوں ہو جاتی ہو۔'' ممی اس کو جگانے کی سر توڑ کوشش کر رہی تھیں۔اور رابیل ہر بار بغل میں دبائے بھالو سمیت کروٹ لے لیتی تھی۔

اتوار کا دن ہی صرف ایسا ہوتا تھا کہ جب سب گھر پر ہوتے تھے۔سب کون مطلب رابیل، ممی اور بابا جان......اور اس دن کو وہ تینوں ہمیشہ زیادہ سے زیادہ اکٹھے گزارتے تھے۔بابا اور رابیل کی تو چھٹی ہوتی تھی لیکن ممی بھی اتوار کو آف ہی لیتی تھیں۔ ہفتے کے باقی دن تینوں ہی بے حد مصروف رہتے تھے۔

اب ممی رابیل کے پاس بیٹھ گئی تھیں اور رابی کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھیں۔

''اٹھ جاؤ میری جان! پاپا بغیر ناشتے کے بیٹھے ہیں، ذیابیطس (شوگر) کے مریض کے لیے اتنی دیر تک خالی پیٹ رہنا بہت نقصان دہ ہوتا ہے۔'' رابیل نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

''اوہ گاڈ آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا اور پاپا بھی ناں۔وقت پر کھا لیا کریں ناں......'' وہ تیز، تیز بولتی اپنے شاندار آرام دہ بیڈ سے اتری اور مخملیں سلیپر پاؤں میں ڈال کر

واش روم کی طرف بڑھتے ، بڑھتے بولی۔ ''میں فریش ہوکر آتی ہوں می..... آپ ناشتا لگادیں۔'' تابندہ نے مطمئن ہوکر اسے مسکراتے ہوئے دیکھا۔

''رابی کے بیڈروم کا انٹیریئر اب بدلنا ہوگا۔ کافی وقت ہوگیا ہے بدلے۔'' مڑتے ، مڑتے ایک اچٹتی ہوئی نظر تابندہ نے اس وسیع وعریض بیڈروم پر ڈالی۔ جگمگاتا ہوا یہ بیڈروم جو بیش قیمت فرنیچر خوب صورت پردوں سے لے کر قالین اور ڈیکوریشن تک ابھی چھ ماہ پہلے ہی بدلا گیا تھا اور خوب سیٹ تھا..... مگر تابندہ بیگم کو یہ چھ ماہ اس طرح کھٹک رہے تھے گویا چھ سال ہوں۔

☆☆☆

صغریٰ بی بی' تاجور سے مل کر اب بھانجے کے واری صدقے جارہی تھیں۔ سیما بھی ان سے مل کر باورچی خانے کا رخ کرچکی تھی۔ عبدالسمیع اتنے دنوں بعد آیا تھا خاطر میں کمی تھوڑی کرنا تھی۔ لیکن سمیع کی نظریں تو متلاشی انداز میں اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔

اور بالآخر اس کا انتظار تمام ہوا اور انتظار کی ساری کلفت بھی ڈھل گئی زرینہ کیا کمرے سے نکلی گویا بہار آگئی۔ گلابی کپڑوں میں امتیاز کرنا مشکل تھا کہ کپڑے زیادہ گلابی ہیں یا زرینہ کا چہرہ..... جارجٹ کا گلابی دوپٹا سر پر اوڑھے وہ جب خالہ سے پیار لینے کو جھکی تو کولہوں تک پھیلے لمبے کالے بال ابھی نم تھے ان میں سے پانی کی شفاف بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ لچکیلی کمر پر بوندیں تواتر سے گررہی تھیں لگتا تھا ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی نہائی ہو۔ بال گھٹاؤں جیسے اور ان میں سے بہتی بوندیں سمیع کو لگ رہا تھا۔ تاروں بھری رات اور وہ بھی بہار کی اس کی رم جھم بارش کا سماں ایسا ہی ہوتا ہوگا۔ خالہ سے مل کے وہ اس کو سلام کرنے کے لیے کھڑی ہوئی تو کجراری آنکھوں میں شکوؤں کی بارات بھی تھی۔ چہرے پر قوس قزح کے رنگ تو حیا نے بکھیر ہی ڈالے تھے اور بغیر کسی مصنوعی آرائش کے وہ ادھ کھلی گلاب کی کلی لگ رہی تھی۔

''پتر سمیع ہم تو تیری شکل کو ترس گئے ہیں، کب ختم ہوگی اب یہ تیری پڑھائی۔'' خالہ صغریٰ کی آواز نے اس کی محویت کو توڑا۔

''بس خالہ اب زیادہ ٹائم نہیں ہے، بہت جلد مکمل ہوجائے گی۔'' اس نے بہ مشکل زرینہ سے نظر ہٹا کر خالہ کو مطمئن کیا۔ خالہ سے بات کرتے ، کرتے بھی وہ بھرپور نظر بچا کر زرینہ کو دیکھ رہا تھا۔ زرینہ چپکے سے اٹھ کر باورچی خانہ میں چلی آئی سمیع کی نظروں کی تپش اس کا دامنِ دل جلارہی تھی۔

☆☆☆

گاؤں کے اندر داخل ہونے سے پہلے راستے میں پڑنے والا کنواں جو گاؤں بھر کی پانی کی ضرورت کو پورا کیا کرتا تھا، اب ویران پڑا تھا۔ اب وہاں ست رنگے آنچلوں کی دھنک تھی نہ قل، قل کرتی ہنسی کی کھنک..... نہ چوڑیوں کی چھنا چھن وہ تھوڑا آگے بڑھا۔ کنویں پر سایہ کیے درختوں کی شاخیں آج بھی مہربان تھیں پھر اس نے کنویں کی منڈیر پر غیر ارادی طور پر ہاتھ رکھا۔ دو سائے اس کی آنکھوں کی پتلیوں پر پھیلنے لگے۔

''باہو'' کی آواز پہ اس نے ڈرنے کی ایکٹنگ کی تو زرینہ کی کھلکھلاتی ہنسی نے اس کو سرشار کردیا۔

''توبہ ہے سمیع تم تو اب بھی ڈرپوک ہی ہو۔''

''ہاں اور تم اب تک جھلی کی جھلی۔'' سمیع نے چودھویں کے چاند کی روشنی میں اس کے چاند چہرے کو نظروں میں اتارا اور نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر لبوں سے لگا کر چھوڑ دیا۔ وہ دور سے ہی اس کی چاپ پہچان چکا تھا۔ دن کو سیما کو پیغام دے آیا تھا۔ رات کو کنویں پہ زرینہ کو لانے کا..... لیکن جان بوجھ کر ہمیشہ کی طرح کنویں کی جانب منہ کرکے انجان بنا کھڑا تھا۔ زرینہ کے ڈرانے اور اس کے ڈرنے کی ایکٹنگ پر زری کی ہنسی کی کھنک کے لیے وہ عمر بھر ڈرپوک بنا رہتا تو بھی کیا فرق پڑنا تھا۔

وہ کنویں سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا اور زری اس سے ٹیک لگا کے۔ لمحے چپکے، چپکے سرک رہے تھے، شاید وہ تو صبح تک یونہی خاموش بیٹھے ایک دوسرے کو محسوس

کرتے رہتے اگر مٹی کا ڈھیلا ٹھیک زری کے ماتھے پر نہ لگتا۔ سیما نے اس کو اٹھ جانے کا اشارہ کر دیا تھا۔ زری اٹھ کر کھڑی ہوئی تو اس کے نین کٹورے پانی سے لبالب بھرے تھے۔

''کنویں کا سارا پانی تو ان آنکھوں میں ٹھہر گیا ہے زری...... تو ایسا کر کے میری منزل کھوٹی نہ کر۔ بہت جلد میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر تجھے ہمیشہ کے لیے اپنا لوں گا۔'' اس نے زری سے کہا اور پھر پیٹھ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے زرینہ کے جاتے قدموں کو دیکھنا ہمیشہ بہت مشکل لگتا تھا۔

☆☆☆

''او خیر چودھری صاحب آج کوئی محفل نہیں کوئی تاش کی بازی تے نہ کوئی موج میلے کی گل اے سرکار!'' طیفے نے اورنگزیب سے ذومعنی انداز میں پوچھ کر بھونڈا سا قہقہہ لگایا۔

''چل اوئے ٹکڑ پانی کھاؤ پیو تے آنپڑیں کر یو کری جاؤ'' (چلو بھئی کھانا پانی کھاؤ پیو اور اپنے، اپنے گھروں کو جاؤ) اچھو نے دہاڑ کر سب کو کہا۔

''نہ پر نصیب دشمناں اج ساڈے یار دی طبیعت تے ٹھیک اے؟'' اس بار جیلا گجر بڑے پیار سے بولا۔

''ایک دفعہ بول دیا ناں مجھے اکیلا چھوڑ دو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے تو کیا دھکے دلواؤں مالشیوں سے۔''

''چنگا فیر'' (اچھا پھر) طیفے نے سب کو اٹھنے کا اشارہ کیا اور تھوڑی دیر میں وہ ڈیرے پر اکیلا رہ گیا۔ سب چلے گئے، جانتے تھے اورنگزیب (اچھو) یار باش آدمی ہے لیکن جب غصے میں آتا ہے تو کرتا اپنے دل کی ہے۔ سب رشتے ناتے بھول جاتا ہے۔

آج دو دن ہو گئے تھے اچھو گھر نہیں آیا تھا۔ چودھری اسلم نے کامے بھی بھیجے تھے بلوانے کو مگر وہ گھر نہیں گیا تھا نہ جانے کو تیار تھا۔ وہ اکیلے رہ کر اس کا حل سوچنا چاہتا تھا۔ جو مسئلہ اس کی زندگی بن چکا تھا۔

وہ پہلا دن تو تھا کہ اس نے زرینہ کو اپنے گھر میں دیکھا تھا لیکن آخری دن نہ تھا۔ اس کے بعد منشی کے بجائے وہ خود پیسے دینے کرم دین کمہار کے گھر گیا تھا۔ اور صغریٰ کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے کہ وہ چھوٹے چودھری کو کہاں بٹھائے اور کیا مدارات کرے۔ کڑکڑاتے ہوئے کلف والے سفید سوٹ اور سنہری کھسے میں اس کا سرخ و سفید رنگ، اونچا لمبا قد، گھنے سیاہ بالوں والا سر، چمکتی ہوئی بل کھائی مونچھوں پر چودھراہٹ کی اتراہٹ، بلاشبہ وہ دیکھنے لائق تھا۔ سیما کی آنکھیں تو پھٹی پڑ رہی تھیں۔ سب نظر آ رہے تھے لیکن زرینہ نظر نہیں آئی تو اسے اپنا آنا بیکار لگا لیکن لیکن چلتے، چلتے اس کو زرینہ کا دیدار بھی ہو گیا تھا اور اسے لگا تھا کہ اس کے آنے کا مقصد پورا ہو گیا ہے۔

پھر وہ گاہے بہ گاہے مختلف بہانوں سے چکر لگانے لگا۔ محبوب کا دل تو محبوب دیکھتا ہے، چوکھٹ کہاں دیکھتا ہے کہ کتنی خستہ حال ہے، دل کی بولی جب لگ جائے تو دماغ جیسے وکیل کی ہر دلیل رد ہو جاتی ہے۔ محبت کی نگری افلاس کا کھاتا کھول دیتی ہے، یہ عشق چیز ہی ایسی ہے کہ کب بادشاہ کا سر پکڑ لیتا ہے پتا بھی نہیں چلتا ہے...... اورنگزیب بھی اپنی آنکھیں ہمیشہ زرینہ کے قدموں کی دھول میں رہن رکھ آتا تھا۔ وہ اس کے قدموں کے نشانوں پر چلنے لگا تھا۔ جو کبھی کنویں پر... رو پہلی آنچلوں کے درمیان ستاروں کے جھرمٹ میں چاند کی طرح تو کبھی کھیتوں میں سے ساگ چنتی ہریالی پہ دھنک بکھیرتی...... وہ تو سارا دن گھوڑے پہ اس کو ہی تلاشتا پھر رہا تھا۔ ہر وقت دوستوں میں گھرا رہنے والا ہلا گلا کرنے کا شوقین اچھو اب تنہائی ڈھونڈتا تھا۔ زرینہ کے اڑتے گرتے آنچل اور اٹھتی گرتی پلکوں کی چلمن کی تکرار کے لیے اسے خاموشی سے پیار ہو گیا۔ وہ آنکھیں بند کیے گھنٹوں پڑا رہتا اور رات کی خاموشی میں سائیں مراد ہیر وارث یا بلھے شاہ پڑھ رہا ہوتا اور اورنگزیب کے دل میں وہ بول اترتے جاتے۔ رات بھید بنتی جاتی۔

☆☆☆

گاؤں پہنچ کر جب میں گلیوں تک پہنچا تو پتا چلا کہ کچی گلیاں اب پختہ ہو چکی ہیں، پکے گھروں کے بیچ کوئی، کوئی گھر بوسیدہ بھی تھے۔ دھوپ نکل چکی تھی......اور گرمی پھیلنے لگی تھی......اتنی گرمی میں بھی بچے پہلے کی طرح اب بھی گلی میں کھیل رہے تھے۔ پہل دوج، آنکھ مچولی کی جگہ کرکٹ نے لے لی تھی۔ ایک گلی کا موڑ مڑتے ہی ایک گیند میری طرف آئی تو غیر اختیاری طور پر میں نے اس کو کیچ کرلیا۔ سامنے گیند کو پکڑنے والے بچے کے چہرے پر خوشی کے رنگ میں مجھے اپنے بچپن کے رنگ نظر آئے۔ میں گیند اس کی طرف اچھال کر آگے بڑھ گیا۔ بچوں میں آؤٹ ہے، نہیں ناٹ آؤٹ ہے کی تکرار جاری تھی۔

☆☆☆

''اوہ آئی ایم سوری......'' رابیل جو یونیورسٹی سے لیٹ ہوگئی تھی اور اب سر فیض کی کلاس مس نہ کرنے کے چکر میں تقریباً اندھا دھند بھاگ رہی تھی سامنے سے آتے عبدالسمیع سے بری طرح ٹکرا گئی تھی۔ اور اب معذرت کے ساتھ کاغذوں کا وہ پلندا بھی اکٹھا کررہی تھی جو سمیع کے محنت سے بنائے ہوئے نوٹس تھے اب کاریڈور میں جا بجا اڑ رہے تھے۔ وہ ایک ہاتھ سے کاغذ سمیٹ رہی تھی تو دوسرے ہاتھ سے اپنے شانوں تک اسٹیپ کٹنگ والے سنہری بالوں کو مخروطی انگلیوں سے سنبھال رہی تھی۔ جدید تراش خراش کے سفید سوٹ میں اس کا لمبا قد نمایاں اور بے حد گوری شفاف رنگت دمک رہی تھی۔

عبدالسمیع نے بھی نیچے بیٹھ کر اس کی مدد کرنی چاہی لیکن اس بار سمیع کی کوشش اسے پھر سے مہنگی پڑی۔ اس بار دونوں کے سر آپس میں ٹکرا گئے۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد دونوں بے اختیار کھلکھلا کے ہنس پڑے۔

یہ تھی رابیل ملک کی عبدالسمیع سے پہلی ملاقات، دونوں ایک ہی ڈیپارٹمنٹ میں تھے اس لیے یہ سلام دعا جلد ہی دوستی میں بدل گئی۔ اب وہ دونوں اور تیسری سنبل اکثر اکٹھے نظر آنے لگے۔ بہت جلد رابیل ملک کو یہ انکشاف ہلا گیا کہ وہ کسی کی محبت میں گرفتار ہوگئی ہے۔ وہ جو محبت کے خلاف لمبی، لمبی دلیلیں دیا کرتی تھی خود محبت کی دلیل بن گئی۔ وہ جو راتوں کو جم کے سوتی تھی اور صبح بھی اٹھنا محال لگتا تھا اب نیند آنکھوں سے روٹھ بیٹھی تھی اور خواب پلکوں پر پہرے دینے لگے تھے۔ وہ خود کو جھٹلاتی رہی یہ محبت نہیں ہے۔ وہ عبدالسمیع کی ذہانت سے متاثر ہے۔ اس کی سادگی اس کو محض تحریک دے رہی ہے لیکن دماغ اور دل کی جنگ میں دماغ کی پسپائی مقدر ٹھہری۔ شاید اس کی آنکھوں کی زبان عبدالسمیع کے دل تک راستہ بنا چکی تھی لیکن وہ تو زری کا تھا ہمیشہ سے......پھر کیا تھا جو زری میں کم تھا اور رابیل ملک میں زیادہ......کیا تھا جو زری کی بھوری سی کالی آنکھوں کو سبز آنکھوں پر حاوی نہیں ہونے دے رہا تھا۔

زری کی پنجابی ملی اردو کی معصومیت پہ انگریزی کا جادو کیوں چل رہا تھا۔ وہ اودے، دھانی، گلابی چوڑیوں والی بھری کلائیاں کہیں کھونے لگی تھیں۔ نفیس سے گولڈ ڈائمنڈ بریسلیٹ سے چمکتی نفیس سی دھان پان کلائی کیوں پکڑنے کو دل مچلنے لگا تھا۔ جس دل میں ایک عرصے سے زری براجمان تھی ایک دم اس ہاتھ باندھی کنیزوں جیسی لڑکی کی جگہ کیا اس تخت افروز ملکہ نے لے لی تھی؟ اس سوال کا جواب سمیع ڈھونڈنے کی ادھیڑ بن میں تھا۔

☆☆☆

''دیکھ اماں میں تجھے بتارہی ہوں اچھو کے لچھن کچھ اچھے نہیں ہیں۔'' زبیدہ اور ریحانہ دونوں آئی ہوئی تھیں۔ دونوں ایک ہی گھر کی بہوئیں تھیں اور ان کے سسرال والوں کا اصرار تھا کہ اب اورنگزیب کی شادی وٹے سٹے میں ان کی بیٹی مہر النسا سے ہو......اور اب زبیدہ نے تمہید باندھی تھی کہ اپنی نند کے ساتھ رشتہ طے کرنے کو۔

''نہ کیا لچھن ہیں میرے بیٹے کے جو تم لوگ آتے ہی اس کے پیچھے پڑ گئی ہو۔'' چودھرائن کو اپنے

اچھو پر ناز تھا۔

''اماں وہ کمہاروں کی لڑکی کے در کے پھیرے لگاتا ہے، اس کے آگے پیچھے دم ہلاتا ہے۔ ہمیں دوسرے گاؤں خبر ہوگئی اور تو یہاں بے خبر بیٹھی ہے، تو نے اس کی بدلی ہوئی حالت نہیں دیکھی۔'' ریحانہ نے بھی زبان کھولی۔

''چل وے شیدائی جی نہ ہووے۔ یہ سب تو چودھریوں کے شوق ہوتے ہیں، تیرے ابا میں بھی تھے اور تم لوگوں کے شوہروں میں بھی ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کمہارن کو چودھرائن بنا دے گا۔ چار دن دل پشوری کرے گا پھر......'' آگے کا لفظ منہ ہی منہ میں ادا کیا تھا۔

''یہ تیری بھول ہے اماں۔'' اورنگزیب کی آواز پر تینوں نے گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اچھو سرخ آنکھیں لیے کھڑا تھا۔ ''میں اگر شادی کروں گا تو صرف زرینہ سے، زرینہ کمہارن سے۔''

''اچھو تجھے پتا ہے تو کیا کہہ رہا ہے؟ تو چودھری ہے تیری ہر فرمائش پوری کی ہے آج تک......لیکن یہ نہیں مانوں گی بتادوں تجھے۔''

''لے اماں! ایسی کون سی عجیب بات کردی میں نے......شادی ہی تو کرنے کو کہا ہے، تجھے تو میری شادی کی بڑی چاہ تھی ناں......'' وہ بلبلایا۔

''چاہ تھی نہیں ہے پتر...... پر اپنے جیسوں میں......اب کیا کمہاروں کی لڑکی کو لے آئیں تیری ووہٹی بنا کے؟ جن کو ہم اپنے برابر نہ بٹھائیں ان کی دھی کو نسلوں کا وارث بنادیں۔'' چودھرائن نے ماتھا پیٹ لیا۔

''تو پھر تو بھی سن لے میرا ویاہ زرینہ سے ہوگا، نہیں تو نسل کو ہی ترستی رہنا نہ میں نے کبھی ویاہ (بیاہ) کرنا ہے نہ تیری نسل نے دنیا تے آنا۔'' وہ غصے سے کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

''دیکھ اماں اب تو نے خود دیکھ لیا اور سن بھی لیا۔'' زبیدہ نے ماں کو طعنہ دیا۔

''اوہ تم چپ کرو، سب ٹھیک کرلوں گی میرا نام بھی حکیماں بی بی ہے۔ سارے علاج آتے ہیں مجھے۔''

☆☆☆

وقت کا پہیا گھومتا چلا جا رہا تھا۔ اس لپیٹے میں کب کس کی باری آوپڑتی اور کون نچلے حصے میں روندا گیا پہیے کو اس سے کیا غرض......اچھو یعنی اورنگزیب اپنی ضد سے ہٹ نہیں رہا تھا۔ چودھرائن کو اپنی نسل میں آمیزش گوارا نہیں تھی۔

ادھر عبدالسمیع اور رابیل کامیابی کی منزلوں کے ساتھ محبتوں کی سیڑھیاں بھی طے کرتے گئے۔ رابیل جو کہتی تھی کہ مجھے اپنی زندگی میں محبت جیسی خرافات کی گنجائش کہیں نظر نہیں آتی، غلط کہتی تھی۔ دراصل محبت اس کی زندگی میں آئی ہی نہیں تھی اور جب آئی تو وہ اس سے دامن نہیں بچا پائی۔ اس تمام معاملے سے آگاہی اس نے اپنی ممی کو بھی دے دی۔ شاید ابھی یہ ممکن نہیں ہوتا کیونکہ سمیع بھی گومگو کی کیفیت میں تھا۔ لیکن وہ دونوں اب تعلیم سے ٹریننگ کے مرحلے میں تھے تو وصی کے گھر والے امتیاز ملک کے پاس رابیل کے لیے سوالی بن کر آگئے۔ تابندہ بیگم کو شاندار بیک گراؤنڈ کا حامل نفیس سا وصی جمیل اور اس کے گھر والے بہت پسند آئے وہ تو ہاں بھی کردیتی لیکن امتیاز ملک کا خیال تھا کہ رابیل کا فیصلہ ہی حتمی ہوگا۔ تابندہ بیگم کو یقین تھا کہ رابیل کی ہاں ہی ہوگی۔ لیکن اس وقت ان کو شدید حیرت کا جھٹکا لگا جب اس نے نہ صرف اس رشتے سے انکار کردیا بلکہ سمیع کے بارے میں اپنے جذبات اور سمیع کی زندگی کے متعلق تمام حقائق سے والدین کو آگاہ بھی کیا اور اب امتیاز ملک نے سمیع کو ڈنر پر بلایا تھا۔

☆☆☆

بالآخر چودھرائن نے ہتھیار ڈال دیے کب تک اپنے لاڈلے کو ناراض رکھتی، دل میں کھٹاس لیے وہ زرینہ کا رشتہ مانگنے کو تیار ہوگئی۔ رشتہ ان چاہا سہی لیکن لے کر جانا تو چودھرائن نے ہی تھا اور وہ بھی ایک چودھری کا رشتہ۔ خوب تیاریاں ہوئیں، اتنا اہتمام ہوا کہ ایک اچھی خاصی شادی کی بری تیار ہوگئی۔ کپڑے تو

ایک سے بڑھ کر ایک تھے ہی مگر ساتھ زیور کا سیٹ......
مٹھائیوں اور پھلوں کے ٹوکرے تھے سو الگ......
چودھرائن نے پوری حویلی کو دوڑا رکھا تھا۔ اورنگزیب اور چودھری اسلم چودھرائن کی کایا پلٹ کو معجزہ سمجھ رہے اور چودھری اورنگزیب اپنی ماں کے پیار پر قربان ہو رہا تھا تو چودھری اسلم کچھ کھٹک بھی رہا تھا۔

چودھرائن کے خوب جوش میں چھپے ہوش سے تو اورنگزیب اور چودھری اسلم کیا خود چودھرائن کی بیٹیاں بھی بے خبر تھیں۔ اگر اتنے سے اہتمام اور ذرا سی گردن کو جھکا کر وہ دونوں چودھریوں خاص طور پر اورنگزیب کی نظر میں اچھی بن جاتی ہے تو کیا مضائقہ؟ آخر کو ہونا تو وہی تھا جو وہ چاہتی تھی۔ وہ بلاوجہ اپنی ضد سے ہٹنے والی عورت نہیں تھی بلکہ یہ تو اندر کی خبر اس کی ملازمہ پینو ہی کی تھی جس نے اسے بتا دیا تھا کہ زرینہ تو عبدالسمیع کی بچپن کی منگ ہے تو اب جب بیچاری چودھرائن تو اپنے بیٹے کی مرضی پہ کمہاروں کے گھر رشتہ مانگنے پر بھی تیار ہو گئی تھی۔ اگر اُدھر سے انکار ہو جاتا تو حکیماں بی بی غلط تھوڑا ہی تھی۔ یہ سوچتے ہوئے چودھرائن کے چہرے پر ایک مکارانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆☆☆

تاجور کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ سمیع نے سی ایس ایس پاس کر لیا تھا اور تاجور پھولی نہ سمارہی تھی۔ اُدھر صغریٰ کے گھر میں بھی خوشیوں کی بارات اتر رہی تھی۔ سیما کی شادی خالد سے کرنے کے بعد اب زرینہ کے فرض سے بھی وہ جلد سبکدوش ہو جاتے۔ عبدالسمیع نے دیر کروا دی تھی ورنہ تاجور تو کب کی اس کی شادی زرینہ سے کر چکی ہوتی۔ وہ تو سمیع ہی چاہتا تھا کہ وہ پہلے افسر بنے گا۔

''تو تو پڑھتے رہنا سمیع پتر......! وہ بیچاری کون سا تمہیں پڑھنے سے روکے گی۔'' اماں اصرار کرتیں تو سمیع جھنجلا جاتا۔ لیکن اب جب وہ افسر بن گیا تھا تو اماں مٹھائی بانٹنے پر یہ بتاتیں بھی سب کو کہ جلد سمیع کی شادی کی مٹھائی بھی کھلائے گی۔ بوڑھی آنکھوں کے سارے خواب پورے ہونے کو تھے۔

☆☆☆

اُدھر ڈنر پر ملاقات میں سمیع نے امتیاز ملک کو اگر بہت امپریس نہیں کیا تھا تو بہت زیادہ مایوس بھی نہیں کیا تھا۔ ایک بات وہ بھی سمیع کو باور کروانا نہیں بھولے تھے کہ وہ اپنی بیٹی کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔ پھر چاہے وہ اس کی من پسند گاڑی ہو کھلونا یا جیون ساتھی۔ امتیاز ملک کو عبدالسمیع کے فیملی بیک گراؤنڈ سے کوئی غرض تھی نہ ہی اعتراض اور تابندہ کو اگر کوئی اعتراض تھا بھی تو انہوں نے سمیع کو صاف، صاف بتا دیا کہ ''رابیل گاؤں میں ہرگز نہیں رہے گی۔'' اور سمیع کو اعتراض کی گنجائش کہاں تھی۔ زری تو کوئی قصۂ پارینہ ویسے ہی بن چکی تھی اور اماں کو تو ویسے بھی وہ وہیں رکھتا جہاں اس کی پوسٹنگ ہونا تھی جو کہ امتیاز ملک نے بہت پیار اور احتیاط سے سمجھا دیا تھا کہ اتنے سالوں کی محنت بھی امتیاز ملک کے ہاتھوں ہی ٹھکانے لگنی تھی یا تباہ ہو جانی تھی۔ رابیل کی محبت آکاس بیل بن چکی تھی۔ اب اس دوسری محبت میں مفاد کا پہلو بھی شامل ہو گیا تھا۔

تابندہ بیگم کے رہے سہے اعتراض کا منہ امتیاز ملک نے یہ کہہ کر بند کر دیا تھا کہ ہماری اکلوتی بیٹی کے لیے یہ ایک بہترین رشتہ ہے، لمبا چوڑا خاندان ہے نہیں اور اکلوتا لڑکا ہے۔ اس کا مستقبل بہت روشن ہوگا۔ ہماری بیٹی ہمیشہ ہماری نظروں کے سامنے رہے گی اور لڑکا ہم سے مرعوب رہے گا۔ تابندہ کو ان کی باتوں میں وزن لگا وہ تو خیالوں ہی خیالوں میں عبدالسمیع کو گھر داماد بنا چکی تھیں۔

عبدالسمیع کو رابیل کے گھر سے نکل کر اگر زرینہ کے معاملے میں کوئی احساس جرم ستا بھی رہا تھا تو اس نے اس احساس کو کچھ بودے دلاسوں سے سلا دیا تھا۔ زری اب زندگی کے سفر میں اس کا ساتھ نہیں نبھا پائے گی۔ ان کی سوچوں میں اب تضاد آ گیا ہے۔ اور اب جس طرح کے رہن سہن کا وہ عادی ہو چکا ہے اور جس پوزیشن میں آ گیا ہے تو فراٹے سے انگلش بولنے والی

رابی ہی اس کا ساتھ نبھا سکتی ہے۔ زرینہ کی اجڈ خوب صورتی کا گہنایا ہوا چاند اس کی سوشل لائف میں کہیں بھی اس کے راستے روشن نہیں کر سکتا۔

☆☆☆

اچھو کو لگا کہ اس کے کانوں کو دھوکا ہوا ہے، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ جس کو پسند کرے وہ چیز کسی اور کی ہو اور یہ تو معاملہ اس کی محبت کا تھا۔ چودھرائن منہ لٹکائے بیٹھی تھی پر اندر لڈو پھوٹ رہے تھے۔

''میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ کیا ضرورت ہے برادری سے باہر کے لوگوں سے ناتا جوڑنے کی مگر میری یہاں سنتا کون ہے۔ لو جی اگلوں نے صاف، صاف منہ پر ٹکا سا جواب دیا کہ ''زرینہ تو عبدالسمیع کی منگ ہے۔'' اس سے آگے اورنگزیب سے نہ سنا گیا اس کا چہرہ اور آنکھیں لہو رنگ ہو گئیں۔

''او چھوڑ اماں، منگنی ہے کوئی نکاح نہیں جو ٹوٹ نہ سکے اور نہ ٹوٹی تو عبدالسمیع کے تو ٹوٹے، ٹوٹے کرکے سمجھ۔ بتا رہا ہوں میں تجھے جا کے بتا دے ان لوگوں کو کہ زرینہ دلہن بنے گی تو میری ورنہ پھر کسی کی بھی نہیں۔'' وہ کہہ کر رکا نہیں اور کندھے پر دھری چادر کو جھاڑ کر دوبارہ کندھے پر ڈال کر باہر نکل گیا۔

''حکیماں بی بی! تجھے پتا تو ہے کتنا اتھرا (ضدی) ہے وہ۔ اور سمیع بھی اب کوئی ہمارے گاؤں کا عام آدمی نہیں ہے اے سی ہے پوری تحصیل کا۔'' چودھری اسلم نے ملامت بھری نظروں سے بیوی کو دیکھا۔

''سواہ تے مٹی میری جوتی سے۔ رہے گا تو ماسٹر کا بچہ ناں۔'' چودھرائن کے لہجے میں غرور ہی غرور تھا۔

☆☆☆

''میری ماں صغریٰ بی بی چودھریوں کو ہاں کہہ دے، تیرا بھانجا اب لاٹ صاحب بن گیا ہے۔ وہ اب نہیں کرے گا تیری بیٹی سے بیاہ...... تیری بیٹی تو اب اس کو جاہل، گنوار لگتی ہے۔ اور اب کیا سننے کو بیٹھی ہے۔'' کرم دین نے مٹی کے بدہیت تودے کو چاک پر رکھا اور مہارت سے چاک گھماتے اس کے چلتے ہاتھوں نے مٹی کو ایک خوب صورت شکل دینی شروع کر دی۔

''کہتا تو تو ٹھیک ہے کرم دین پر میری بہن تاجور بیچاری تو اکیلی رہ گئی ناں۔ جانے کون سی چڑیل چمٹی ہے کہ ماں کی قربانیاں بھی یاد نہیں رہیں اس کو۔ ماں کی بھی پروانہ کی اور اپنی مرضی کر ڈالی۔ ہا...... کیسا پردہ پڑا سمیع تیری عقل پر۔''

اور اندر خالہ تاجور کا سر دباتی زرینہ کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو کی جھڑی بخار میں مدہوش پڑی تاجور کے چہرے کو بھگونے لگی تو تاجور نے آنکھیں

کھول کر زرینہ کو دیکھا اور دھیرے سے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے اسے گلے لگالیا۔ سمیع نے ماں کے ناراض ہونے کے باوجود رابیل سے شادی کرلی۔ اپر کلاس کے لبرل لوگوں کی شاندار شادی جس میں رابیل کے والدین کو کیا فرق پڑتا تھا کہ عبدالسمیع کی ماں راضی ہوئی یا نہیں۔ پورے شہر کی کریم کی موجودگی میں ہونے والی شادی جس کا تذکرہ سالوں لوگوں کی زبان پر رہتا تھا۔

☆☆☆

گلی کا اگلا موڑ مڑتے ہی سامنے اس کی یادوں کا سائبان موجود تھا۔ باقی مکانوں کی نسبت قدرے پرانا گھر اب بھی در و دیوار پر چونا سفیدی نئے ہی تھے۔ اس نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا اور دروازے پر لگے تالے کو کھولنے کی کوشش کی لحہ بھر میں تالا کھل گیا۔ دونوں ہاتھوں سے ہلکا سا کواڑ کو دھکیلا تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔ دروازہ کیا کھلا یادوں کا در پوری طرح کھلنے لگا۔ برآمدے کے کونے پر بیٹھی ہوئی عورت جو مسلسل مشین پر جھکی ہوئی تھی۔ صحن میں سائیکل چلاتا ہوا بچہ پھر سیڑھیوں پر بیٹھا پڑھتا ہوا بچہ...... سامنے والے کمرے کے بند دروازے کے پیچھے اس بچے کو کنگھی کرتی اور بستہ پہناتی ہوئی عورت۔ جھاڑو لگاتی اور پودوں کو پانی دیتی ہوئی عورت...... مشین والے تخت پر عورت کے زانو پر سر رکھ کر پُرسکون سویا ہوا بچہ...... وہ تھوڑا آگے بڑھا اور صحن سے ہوتا ہوا برآمدے میں آ کھڑا ہوا۔ باورچی خانے کا دروازہ کھولا تو سب کچھ جوں کا توں تھا بس سیڑھیاں خالی تھیں اور چولھا بند تھا۔ وہ آگے بڑھ کر پیڑھی پر بیٹھا تو جی چاہا سامنے پیڑھی پر بیٹھنے والی عورت ایک بار کہے۔ ''اندر چل پتر اِدھر گرمی ہے۔''

☆☆☆

رابیل کے ساتھ شادی کے بعد گویا ہفت اقلیم کی دولت ہاتھ آ گئی تھی۔ اس نے اماں کو راضی کرنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن اماں تھیں کہ ٹس سے مس نہیں ہوئی تھیں۔

''عبدالسمیع تیری تو مت ماری گئی ہے۔ اتنے برسوں زری تیرے نام پر بیٹھی ہے۔ ابھی اس کا رشتہ چودھریوں کے گھر سے آیا ہے اتنی خوش بخت ہے وہ...... بے قدا نہ بن، پچھتائے گا اک دن۔'' اماں کا گلا رندھ گیا۔

''کردیں اس کا رشتہ چودھریوں کے لفنگے سے میں خود آزاد کرتا ہوں اس کو منگنی سے۔ اورنگزیب کو بتادوں گا۔ تجھے نہیں پتا اماں جس سے شادی میں کررہا ہوں اس کے سامنے تیرے یہ چودھری بھی کچھ نہیں ہیں، آپ کی بھانجی میری زندگی میں قدم سے قدم ملا کر نہیں چل سکتی میرے ساتھ۔ جاہل ہے وہ۔''

''تو جا کر لے شادی، میری بہو اگر بنے گی تو صرف زرینہ اس کے علاوہ کوئی نہیں اور آج کے بعد تو میرا امر امنہ بھی نہیں دیکھنا۔'' اور فیصلہ تو سمیع کر چکا تھا یہ اماں کو کب خبر تھی۔ عبدالسمیع کے دور جاتے قدموں کی آواز تو اماں نے سنی اور پھر چوکھٹ خالی رہ گئی اور دروازہ کھلا۔ اس کھلے دروازے سے زرینہ بھی تھوڑی دیر بعد اپنی محبت کی لاش اٹھا کر چپکے سے باہر نکل گئی۔

کچھ کمی تھی تو جو ساتھ، ساتھ چل رہی تھی۔ دل کا ایک گوشہ تو ہمیشہ سے ویران رہا تھا۔ مگر وہ کوشش کررہا تھا کہ اپنے آپ کو نئے ماحول میں ڈھال لے۔ تابندہ کی لاکھ کوشش کے باوجود وہ گھر داماد تو نہیں بن سکا ہاں رابیل نے اس کو عبدالسمیع سے سیم ضرور بنادیا۔ سمیع کو تو اب پتا چلا تھا کہ رابیل کے بابا کوئی خاندانی رئیس نہیں تھے اور نہ ہی یہ رئیسی ان کی تنخواہ کی وجہ سے وجود میں آئی تھی۔ یہ رئیسی تو کچھ اور ہی کارناموں کی چغلی کھاتی تھی اور وہ سمیع یعنی سیم سے بھی یہی امید رکھتے تھے۔ لیکن ماسٹر عبدالرزاق کا بیٹا رزقِ حلال جس کی رگوں میں لہو بن کر دوڑتا تھا وہ یہ نہ کرسکا۔ وہ اپنی تنخواہ سے مطمئن تھا۔

رابیل کی گود میں گزرتے وقت نے کوئی پھول نہ کھلایا۔ سمیع کو لگتا کہ یہ اس کی ماں کی بددعا ہے جو وہ صاحبِ اولاد نہ ہوسکا لیکن رابیل کو اس بات کی کوئی فکر

نہیں تھی کہ وقت کے ساتھ ساتھ عشق ومحبت کا بھوت بھی رابیل پر سے اترنے لگا تو اس کو سمیع میں خامیاں ہی خامیاں نظر آنے لگیں۔ رابیل تو اپنے بابا جان کے نقشِ قدم پر چل کر رشوت کا بازار گرم کرنے لگی سمیع کا ضبط جواب دے گیا۔

''رابی اگر تم میرے ساتھ مزید چلنا چاہتی ہو تو تمہیں میرے راستے پر چلنا ہوگا۔''

''اونہہ تمہارا، راستہ کیا ہے تمہارا راستہ جس پر چل کر آج بھی تم وہیں کھڑے ہو جہاں شادی کے ٹائم پر تھے۔ پروموشن تک تو کروا نہیں سکے۔'' اس نے ہاتھوں پر لوشن ملتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔

''مجھے سمجھ میں نہیں آتا آخر تمہیں کمی کس چیز کی ہے، اچھی خاصی تنخواہ ہے میری، رہائش ہے، سہولیات ہیں۔'' سمیع نے مصلحتاً لہجہ نرم کیا۔

''اوہ تنخواہ! تمہاری تنخواہ اس سیلری جتنی تو میری پاکٹ منی ہے اس وقت سے جب میری تم سے شادی بھی نہیں ہوئی تھی اور اب بھی جب میں تمہاری بیوی ہوں تو میری پاکٹ منی بابا ہی مجھے دیتے ہیں۔'' وہ طنزیہ ہنسی۔

''رابی تم اپنے بابا سے پیسے لیتی ہو شادی کے بعد بھی؟'' وہ سناٹے میں آگیا۔ وہ جو رابیل کی تنخواہ کو بھی گھر کے خرچ میں استعمال کرنے سے منع کرتا تھا کیونکہ رابیل بھی کرپشن میں حصہ دار بن چکی تھی۔ اس انکشاف نے کہ ملک امتیاز کی حرام کمائی بھی اس گھر میں آتی ہے اس کو شدید صدمے سے دوچار کر دیا۔

''سو واٹ....... تمہارا ہوتا ہوگا گزارہ اپنی سیلری میں، مجھے تو وحشت ہوتی ہے گورنمنٹ کے دیے ہوئے اس ٹوٹے پھوٹے بنگلے میں۔ میں بہت جلد اپنا ذاتی بنگلا خریدنے لگی ہوں اور اب تمہیں میرے ساتھ وہاں رہنا ہوگا۔ میرے اخراجات تم پورے کر سکتے ہو تو یہ تمہارا وہم ہے۔ تمہارے دیے پیسے تو میرا ایک بار کا بیوٹی پارلر کا وزٹ کا خرچ بھی پورا نہیں کر سکتے اور......''

''بس رابیل...... نہ تو مجھے تمہارے ساتھ کسی



غزل

وہ کہہ رہے تھے مجھ سے ہستی مری مٹا کے
پھر سے گلے لگا لو ظلم وستم بھلا کے
دیتے ہیں لوگ دھوکا نزدیک اپنے لا کے
یاں خاک ہوتے دیکھے ہم نے سبق وفا کے
بھیجا پیام ماں کو ہے ہاتھ سے ہوا کے
بس اک نظر تو دیکھو اس لاڈلی کو آ کے
تم کو ملے گا کیا ماں یوں مجھ کو آزما کے
رو رو کے تھک گئی ہوں تم کو بلا بلا کے
میں سوچتی ہوں اکثر یہ اک سوال الجھا
دنیا نہیں ہے تھکتی کیوں میرا دل جلا کے
کیسے بدل گئے ہیں سب جاں نثار میرے
کرتے ہیں مجھ سے باتیں آنکھیں دکھا دکھا کے
کہتی ہے بس شگفتہ اپنا مسیحا اس کو
ہاں زندگی ملی تھی شہرِ سخن میں جا کے

کلام: شگفتہ شفیق

بنگلے میں شفٹ ہونا ہے اور نہ تم ایک بھی پیسہ آج کے بعد اپنے بابا سے لوگی۔ یہ میرا حتمی فیصلہ ہے۔"

"مسٹر سمیع یہ تم نہیں تمہارا پیدائشی احساسِ کمتری بول رہا ہے، دراصل تم اندر سے اپنے آپ کو اب بھی نہیں بدل پائے۔ تم میں وہی دیہاتی عبدالسمیع ... ہمیشہ سے موجود رہا ہے جو کبھی سیم نہیں بن سکتا۔ مجھے اب احساس ہو رہا ہے کہ بندے کو اپنے اسٹیٹس سے کبھی کمپرومائز نہیں کرنا چاہیے۔ تعلیم، عہدہ، گرومنگ کچھ بھی تمہیں بدل نہیں سکا۔ ممی ٹھیک کہتی تھیں کہ تم ہمیشہ میرے ساتھ مس فٹ رہو گے۔ میرے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کے کبھی قابل نہیں ہو سکو گے۔ جتنا بھی تیز بھاگ لو مجھ سے دس قدم کے فاصلے پر رہو گے۔ یو آر جسٹ آلوزر سیم۔ تم ہمیشہ دیہاتی، اجڈ، گنوار ہی رہو گے۔"

"ہاں، ہاں ہوں میں دیہاتی...... اور اسی دیہاتی کا انتخاب تم نے خود اپنی رضا سے کیا تھا۔ تمہارا خود کا انتخاب تھا میں...... میرے راستوں کو تم نے کھوٹا کیا تھا، میں تو ایک سیدھے راستے کا مسافر تھا جسے راستے کی تنگ گلیاں ہی عزیز تھیں، مجھے اس ہائی وے پر تم لے کر آئی ہو۔" اس نے انگلی رابیل کے بازو پر رکھ کر کہا۔ اتنی سختی تھی کہ اس کی انگلی میں کہ رابیل کو وہ گوشت میں گھستی محسوس ہوئی۔ رابیل نے غصے سے اس کو پرے دھکیلا اور وہ پاس پڑی کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ بہت سال پہلے والے الفاظ کی بازگشت آج سمیع کی سماعت پر کوڑے برسا رہی تھی۔

☆☆☆

آج چودھرائن کو ایک بار پھر اس دہلیز پر جانا تھا دامن پھیلا کر...... اس کا سارا طنطنہ گویا جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ بات ہی کچھ ایسی تھی کہ اب جبکہ سمیع نے بھی زرینہ کے بجائے کسی اور سے مرضی سے شادی کر لی تھی تو چودھری اورنگزیب پھر سے زرینہ کے لیے رشتہ لے کر جانے پر بضد ہوا تھا۔ چودھرائن نے اس کو صاف صاف جواب دے دیا تھا کہ وہ اب کبھی اپنی زندگی میں کمہاروں کی دہلیز پر قدم نہیں رکھے گی۔ اس بار تو چودھری اسلم بھی اس کا حامی تھا اور دونوں بیٹیاں بھی لیکن اچھو تھا وہ اپنی دھن کا پکا...... شاید ماں، بیٹے کی اس تکرار کا نتیجہ کچھ اور بہتر انداز میں نکل آتا اگر دونوں میں سے کوئی ایک بھی ہار ماننے کو تیار ہوتا۔ لیکن ماں تو ماں تھی آج تک اچھو کی کوئی فرمائش ٹالی نہیں تھی۔ اس لیے اچھو بھی کہاں ہار ماننے والا تھا۔

"اماں میں آخری بار کہہ رہا ہوں کہ مجھے شادی زرینہ سے ہی کرنی ہے۔" اچھو کی آواز غصے سے کانپ رہی تھی۔

"چل جا میں نہیں جاتی رشتہ لے کر لے سمیع کی طرح تو بھی خود ہی شادی اور کمہاروں کا داماد بن جا۔ دیکھتی ہوں کیسے تیری چودھراہٹ کے نخرے اٹھاتے ہیں وہ لوگ۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہے تیری ماں اچھو...... ہمارا اور ان کا کوئی جوڑ نہیں اور وہ کمہار ہو کر ہمیں انکار بھی کر چکے ہیں۔ ضد چھوڑ دے میرا پتر۔" چودھری اسلم نے بیٹے کو پیار سے سمجھانا چاہا۔

"نہیں ابا جی اگر تم لوگوں نے میری بات نہیں مانی تو میں خود کو ختم کر لوں گا۔" اور تیزی سے جیب میں سے ریوالور نکال کر کنپٹی پر رکھ لی۔

"بول اماں جاتی ہے زرینہ کے گھر یا؟" چودھری اسلم جھٹ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ چودھرائن جو اس سے پیٹھ موڑے بیٹھی تھی غصے سے بولی۔

"میں خود شیرنی ہوں جان دوسروں کی لینا آسان ہوتا ہے اپنی نہیں، یہ دھمکیاں کسی اور کو دے۔" چودھرائن کی بات درمیان میں ہی تھی کہ زوردار دھماکا کی آواز سے گولی چلی اور وہ جو بیٹے سے پیٹھ موڑے بیٹھی تھی گھبرا کر پلٹی تو اچھو، ابا جی کے ہاتھوں میں گر رہا تھا۔

☆☆☆

رابیل اپنے ذاتی بنگلے میں شفٹ ہو گئی تھی اگر وہ اپنی ضد پر قائم تھی تو سمیع کو بھی اپنی اوقات کا اندازہ ہو گیا تھا۔ رابیل کی محبت تو پہلے دن سے ہی محبت کم احسان

زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ اس کے رویّے میں شروع دن سے ہی اکتاہٹ عود آئی تھی۔ وہ کانٹے چھری سے نفاست کے ساتھ کھانے والی لڑکی تھی اور سمیع جو ایک پکا دیہاتی تھا زیادہ دن تک فارمیلٹی بھری مصنوعی زندگی کو نہیں اپنا پایا تھا۔ تعلیم تو ایک سی تھی تربیت مختلف...... ذہانت سے متاثر دو لوگ جسے محبت سمجھ کر یکجا ہو بیٹھے تھے لیکن محبت تو ان کے درمیان کہیں بھی نہیں تھی۔ وہ ایک چھت کے نیچے بھی دور، دور تھے اور اب دو مختلف چھتوں کے نیچے محض نام کا رشتہ جوڑ رہ گیا تھا اسے بھی بالآخر رابیل ملک نے خلع لے کر بے نام کر دیا۔

”تو سمیع یہ تھی تمہاری محبت کی ادھوری کہانی......“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر اندرونی کمرے کی طرف بڑھا۔

☆☆☆

آج زرینہ کی بارات تھی۔ صغریٰ کے ساتھ، ساتھ تاجور بھی زور شور سے تیاریوں میں مگن تھی۔ بھولے سے بھی آنکھ میں آنسو نہ لاتی کہ گزرے دنوں کو بھلانا ضروری تھا۔

”کتنے کٹھور نکلے تم عبدالسمیع، کتنے وعدے کیے تھے مجھ سے کہ میرے علاوہ کسی اور کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھو گے۔ میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ مجھے یوں بے دلی سے دلہن بننا ہوگا۔ کتنی سوہنی ہوگی وہ لڑکی جس نے تمہارے دل سے میرے عکس کو دھندلا دیا تمہیں تو چودھویں کا چاند کا بھی میرے سامنے پھیکا لگتا تھا۔“ سی کی آواز نکلی اور وہ جو بے دھیانی سے چوڑیاں پہن رہی تھی ایک چوڑی ٹوٹ کر اس کی کلائی میں بھی چبھ گئی۔ وہ خاموشی سے آئینے میں سرخ جوڑے میں جھلملاتے اپنے عکس کو دیکھ رہی تھی۔ اتنے میں صغریٰ کمرے میں داخل ہوئی۔ بیٹی کی بھری ہوئی آنکھیں اس کے دل کے ٹوٹنے کی زبان تھیں۔

”بیٹا مرے ہوئے لوگ کا سوگ چالیس دن سے زیادہ نہیں مناتے اور خاوند کے علاوہ تو مولوی صاحب کہتے ہیں کہ قل کے بعد سوگ کی گنجائش نہیں رہتی تو بھی

اپنے دل میں پرانی یادوں اور تلخیوں کو دفنا دے۔ سوچ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اور اب پورے دل سے آنے والی زندگی کو خوش آمدید کہہ...... جس کی ہونے جا رہی ہے پورے تن، من سے اس کی غلطیوں کو بھول کر اس کی ہو جا ورنہ گناہ ہوگا...... رب سوہنا سب ٹھیک کردے گا تو اپنے ایمان کی سن اور دل کو راضی کر لے۔''

زرینہ نے ماں کی جھریوں بھرے چہرے پر سکون دیکھا اور پھر آئینے میں جھلملاتے عکس کو اور دھیرے سے مسکرادی۔

☆☆☆

ریٹائر ہونے کے بعد اس شہر میں رہنے کے سارے مقصد ختم ہو گئے تھے۔ یوں بھی کون تھا اس کا اس بے مہر شہر میں جو وہ یہاں رہتا۔ اولاد کوئی تھی نہیں اور دوسری شادی پر دل آمادہ نہیں ہوا۔ دل تو جان گیا تھا جس کی چاہ تھی وہ تو اب کھو چکا تھا اور جس کی چاہ نہیں تھی وہ نبھا نہیں سکی تھی۔ سو وہ اپنا مختصر سا سامان اور چابیوں کا وہ گچھا جو اس نے کسی خزانے کے مانند سنبھال رکھا تھا جو اس وقت سے اس کے پاس تھا جب وہ شہر میں پڑھنا شروع ہوا تھا تو اماں نے اس کے حوالے کیا تھا۔

''اماں میں کیا کروں گا ان چابیوں کا؟ میں گھر لوٹتا ہوں تو ہمیشہ تو آپ گھر پر ہوتی ہو دروازہ کھولنے کو۔''

''نہ پتر ضروری تو نہیں ہمیشہ گھر پر ہی ملوں، ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ کبھی تو تھکا ہارا آئے اور میں تجھے گھر پر نہ ملوں...... تو تو کتنا پریشان ہوگا۔ کبھی دروازے پر تالا لگا ملے تو چابیاں تو موجود ہوں تیرے پاس۔'' اماں نے سمجھایا اور اس نے چابیاں یونہی سنبھال لیں۔

اور آج جب گاؤں میں اس نے اپنے گھر کا تالا کھولا تو اماں کی زیرک نگاہی اور دور اندیشی ایک بار پھر اس کے کام آئی تھی۔ اندر اپنے والے کمرے کو کھولا تو لگا کہ جیسے وہ کبھی کہیں گیا ہی نہیں تھا۔

اماں کی خوشبو ہر جانب چکرا رہی تھی۔ ''اماں کتنی ساری حقیقتیں تھیں جو تجھے بتانا تھیں اور کتنی ساری معافی تھی جو تجھ سے مانگنا تھی لیکن مسافر نے پلٹنے میں دیر کردی۔'' وہ دیوار پر لٹکی اماں کی تصویر سے باتیں کررہا تھا۔

''تو تقدیر یوں بھی کرتی ہے کہ عبدالسمیع کچھ باتیں ہم بھید رکھنا چاہتے ہیں اور قدرت اس کے گواہ خود بنا دیتی ہے، مجھے نہیں پتا کہ تو پہلے کتنا قصوروار تھا اور بعد میں کتنے قصور تیرے کھاتے لکھے گئے تھے مگر اتنا جانتی ہوں کہ تاجور خالہ تجھے گناہ بخش کے اس دنیا سے گئی ہے۔ تو اپنے دل کا بوجھ بھی آج بانٹ لے تاکہ تو تنہا جھیلنے کی اذیت سے نکل سکے۔ میں یقین دلاتی ہوں جس طرح پہلے زبان بند رکھی اب بھی تیرے راز مجھ تک ہی رہیں گے۔'' اماں کی تصویر میں اپنے پیچھے جھلملاتے عکس کے منہ سے نکلتے الفاظ نے اس کو آنسوؤں میں ڈبو دیا۔

☆☆☆

اچھو نے گولی تو چلادی تھی لیکن چودھری اسلم کی بروقت پھرتی نے ریوالور کا رخ تبدیل کردیا۔ گولی سر کے بجائے کندھے کے آر پار ہوگئی۔ خون کا ایک فوارہ تھا جو اورنگزیب کے ساتھ چودھری اسلم کو بھی رنگین کرگیا۔ چودھری نے ڈرائیور کو جلدی گاڑی نکالنے کو کہا اور قریبی قصبے کے اسپتال لے گیا خون بہت بہہ جانے کی وجہ سے اچھو کو ہوش نہیں آرہا تھا اور چودھرائن اسپتال میں ہی مصلیٰ بچھائے آہ و زاری کررہی تھی۔

''اللہ میرے اچھو کو ایک بار پھر مجھے بخش دے، میں اس کی ہر بات مانوں گی۔ بس تو میرے پتر کی خیر رکھنا۔''

''اچھو کا خون بہت نایاب گروپ والا ہے چودھرائن تو بھی چیک کرادے شاید تیرا خون اس کے کام آجائے، میرا تو خون اس کے خون سے مل ہی نہیں رہا۔'' چودھرائن کے خون کا گروپ تو مل گیا لیکن اس کو شوگر اور بلڈ پریشر کی وجہ سے اچھو کو نہیں لگ سکتا تھا۔ لیکن میرے مولا کے رنگ نرالے...... شیدا نائی، فیقا موچی، جیلا گجر، مختلف قوموں اور ذاتوں کے دوستوں کے خون کا گروپ اچھو کے گروپ سے مل گیا تھا۔ اور تو

اور طیفے میراثی کا بھی۔ چودھرائن کا نہیں لگ سکا تھا تو چودھریوں کا خون بھی اس کو نہیں لگا تھا چودھرائن نے سر جھکا لیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کو اچھو کی زندگی منظور تھی اس لیے وہ بچ گیا تھا۔

آج اورنگزیب کی بارات شان و شوکت سے اپنی دلہن لینے نکلی تھی اور بالآخر اورنگزیب نے بھی اپنی منزل پالی اور اپنی تقدیر پہ راضی بہ رضا ہوا۔

☆☆☆

جانے کتنی دیر ہو چکی تھی اسے پتا بھی نہیں چلا تھا اور وہ سوتا رہا، آنکھ کھلی تو دھوپ کی شدت میں کمی آ گئی تھی۔ وہ ایک مرتبہ پھر سے اٹھا اور اماں کے ابدی گھر کو روانہ ہوا قبر پہ بیٹھے آنسو بہاتے کافی دیر ہو گئی تھی۔ چادر میں لپٹے وجود نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا گویا چلنے کا عندیہ دیا۔ وہ مڑا تو پاس سے دھول اڑاتی بڑی سی پراڈو کی اگلی سیٹ پر بیٹھا چودھری اورنگزیب اس کو کل کے جیسا ہی شاندار بلکہ پہلے سے زیادہ ڈیسنٹ لگا تھا۔ وہ وہیں کھڑا گاڑی کی دھول دیکھتا رہتا اگر ساتھ میں کھڑے وجود نے اس کو چلنے کا اشارہ نہ کیا ہوتا۔

سمیع نے سر اٹھا کے چارپائی پر بیٹھی اس عورت کو دیکھا جو اس کی سگی خالہ زاد تھی۔

''کہاں سے شروع کروں آخر......؟ میں وہیں سے شروع کرتا ہوں جہاں میرے قدم بھٹک گئے۔ پتا نہیں کب میں رابیل سے متاثر ہوتا چلا گیا۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گا، مجھے لگا تھا کہ ایک گاؤں کی میٹرک پاس لڑکی میرا ساتھ نہیں دے پائے گی اور رابیل ملک سے مرعوبیت کو میں محبت سمجھنے لگا تھا۔ جس دن اماں سے میری تکرار ہوئی تھی اور اماں نے مجھ سے صاف، صاف کہہ دیا تھا کہ اگر میں نے رابیل سے شادی کی تو وہ مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیں گی۔ رابیل کی محبت ہوتی تو شاید طاقتور ہوتی مگر وہ اماں کی محبت پر حاوی نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے اماں سے بحث تو کی اور بحث کر کے گھر سے بھی نکل گیا۔ لیکن میں اماں کو کسی کے لیے اور کسی بھی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتا تھا اس کا اندازہ تو مجھے سرِ راہ ہی ہو گیا تھا اور میں گھر کو لوٹ بھی آتا لیکن......''

''لیکن تجھے نہیں پتا تھا سمیع کہ اچھو کے دوست تیری گھات میں ہیں......اور مجھے تو ان دھمکیوں کا بھی علم ہے جو اس دن اچھو نے تجھے دی تھیں اور جن کی وجہ سے تو نے گاؤں چھوڑ دیا تھا۔'' کب سے خاموش بیٹھی اس کی یہ خالہ زاد اب بولے جا رہی تھی۔ ''تو نے کہا تھا اچھو سے کہ وہ بے شک ٹوٹے کر دے تیرے تجھے پروا نہیں۔''

''میں یہ تو نہیں کہتا کہ مجھے اسی دم محبت اور مرعوبیت میں فرق کا پتا چل گیا تھا۔ محبت کا پتا تو حقیقتاً اس دم ہوتا ہے جب ہم اس کو کھو دیتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ اس وقت مجھے رابیل اور اس کی فیملی کا جاہ و جلال نظر آتا تھا اور کچھ بھی نہیں۔ لیکن یہ میری برداشت سے باہر کی بات تھی کہ جس اماں کے لیے میں رابیل اور اپنے مستقبل سے دستبردار ہونے جا رہا تھا۔ اس اماں کو یا تم سب کو چودھری اورنگزیب قتل کروا دیتا۔ ایک محبت کا نقصان گوارا تھا مجھے اتنے رشتوں کی زندگی کے بدلے۔ میں اچھو کو بچپن سے جانتا تھا۔ وہ اتنا ہی جنونی ہو جاتا تھا اپنی کسی بھی خواہش کے لیے۔ دکھ ہے تو صرف اتنا کہ میں اماں کی بات کو رد کر کے گھر سے نکلا تھا۔ اماں بے خبر تھی کہ صبح کا بھولا تو پلٹنے کو تھا۔ وہ تو حقیقت سے ناآشنا تھی۔ میری نافرمانی کو کیسے سہہ گئی۔''

''تو بے خبر ہے میرے ویر کہ اس دن شام دھندلکے میں کوئی اور بھی تھا جس نے کنویں کے پاس ساری بات سن لی تھی۔'' سیما نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ ''خالد اس وقت شہر سے آ رہا تھا جب تجھے گھر کی طرف لوٹتے ہوئے اچھو اور اس کے بندوں نے گھیر لیا تھا اس کے بعد جو ہوا وہ سب خالد نے سن لیا تھا۔ وہ تیری مدد کو بھی آنا چاہتا تھا مگر اسے بھی تیری طرح چودھریوں کے انتقام سے ڈر لگتا تھا۔ وہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ ہمارے خاندانوں کو کوئی نقصان ہو۔ اور تو جب چلا گیا تو ہم نے یہ راز بھی سب سے چھپا لیا۔ اب کوئی فائدہ بھی جو نہیں تھا مگر تا جور خالہ کو میں نے سب کچھ بتا دیا تھا۔ جانتے ہو

آزمائش آپڑی تھی اس پر۔ جانتے بوجھتے کہ بیٹا کتنا فرمانبردار ہے، اتنی بڑی قربانی دے گیا ہے پھر بھی تجھے کوستی تھی تاکہ زرینہ کے دل سے تیری پہاڑ جیسی محبت اکھاڑ پھینکے اور وہ جھلی تو بھول بھی گئی ہے تجھے۔“

”سچ بتاؤں سیما آپا محبت تو وہی تھی جو زرینہ نے میرے دل کی بستی میں آباد کر دی تھی۔ رابیل تو ایک سایہ تھا، آسیب تھا جس نے میرے دل کی نگری اجاڑ ڈالی۔ کوئی ایک دن بھی، کوئی لمحہ بھی ایسا نہیں گزرا جو زری کی یاد سے خالی گیا ہو۔ میں اب بھی گاؤں نہ لوٹتا مگر مجھے اب یہاں ایک اسکول کھولنا ہے۔ کالج بھی بنانا ہے کل اس کا افتتاح ہے۔“

”چل چھوڑ اب میں تیرے لیے روٹی ڈال دوں پھر گھر جاؤں گی۔“ سیما اٹھنے لگی تو سمیع بھی اٹھ کر باورچی خانے کی طرف بڑھا۔ سیما آپا وہاں سے گزر گئی لیکن سمیع کو برآمدے کے فرش پر کوئی چمکتی ہوئی چیز پڑی نظر آئی۔ اس نے جھک کر اسے اٹھایا اور جیب میں رکھ لیا۔

☆☆☆

”زری کل کے فنکشن کے لیے بلاوا ہے مجھے کیا خیال ہے مجھے جانا چاہیے؟“

”جی کیوں نہیں؟“ زرینہ کے ہونٹوں پر تبسم تھا۔ ”آپ کو تو دو بلاوے ہیں۔ آخر کو آپ اسسٹنٹ کمشنر زری کے شوہرِ نامدار ہیں۔ اور یہ بندی تو آپ کی وجہ سے ہی آج اس مقام پر ہے۔“ زری نے پیار سے اپنے جیون ساتھی کو دیکھا۔

”اجی یہ تو آپ کا حق مہر تھا۔ وہ بھی منہ مانگا کہ آپ کو پڑھنا ہے اور ہمیں بھی پڑھانا ہے اس لیے تو ہم بھی آج بندے کے پتر بن گئے ہیں۔ ورنہ کیا، کیا نہ کیا آپ کے لیے یہ تو آپ کو سب پتا ہے۔ سب سے بڑا جرم تو آپ کے خالہ زاد کو دھمکانے کا تھا۔ لیکن سوری وہ ہم اگر آپ کو پہلے بتا دیتے تو نہ آپ ہمیں قبول کرتیں اور نہ ہمارے دو سپوتوں کی اماں بنتیں آخر کو منگیتر تھا وہ آپ کا۔ پر نکلا بڑا دلدار کہ ہم پر یہ احسان کر گیا کہ جو کہیں اور شادی کر لی ورنہ ہم تو کنوارے رہ جاتے۔“

آج اسکول کا افتتاح تھا جس کو سمیع نے ایک این جی او کے زیرِ اہتمام ممکن بنایا تھا۔ یہ این جی او جو زیڈ اوسی کے نام سے رجسٹرڈ تھی اس نے خصوصی دلچسپی لی تھی اس گاؤں میں اسکول اور کالج کی تعمیر میں اور بصد اصرار اس کے مالک نے عبدالسمیع کو اس کا انچارج منتخب کیا تھا۔

آج افتتاح کے ساتھ، ساتھ تحصیل بھر کی اسسٹنٹ کمشنر نے بھی معائنہ کرنا تھا۔ گاؤں کے چیدہ، چیدہ لوگوں سے لے کر ہر ذات کے لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ سمیع انتظامات کی حتمی شکل چیک کر رہا تھا کہ اس کو مہمان خصوصی کے آنے کی اطلاع دی گئی۔

آگے سرخ بتی والی گاڑی سے اترنے والی... پُروقار ہستی کوئی اور نہیں زرینہ تھی اس کی زری..... وقت نے اس میں ذرا سی تبدیلی کی تھی کہ وہ پہلے صرف خوب صورت تھی اب وہ ایک نفیس اور معتبر شخصیت میں ڈھل گئی تھی۔ سفید رنگ کے خوب صورت لباس پر سلیقے سے دوپٹا اوڑھے کندھوں پر کڑھائی والی چادر اوڑھے بے حد... دلنشین لگ رہی تھی۔ اس نے سر جھٹکا اور آگے بڑھا تو زرینہ کے چہرے پر بھی خیر مقدمی مسکراہٹ تھی۔ کوئی پچھتاوا، پرانی محبت کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اس نے ہاتھوں میں تھاما گلدستہ آگے بڑھایا۔

”لیجیے مس زرینہ کرم......“

”سوری، مسز زرینہ اورنگزیب......“ زرینہ نے اس کی بات کاٹ کر ہر لفظ پر زور دے کر جیسے اسے جتایا۔

”اور ہاں یہ گلدستہ مہمانِ خصوصی کو پیش کریں۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے پیچھے آتی شخصیت کی طرف اشارہ کیا۔

کڑکڑاتے سفید سوٹ پر واسکٹ پہنے سرخ و سفید چہرے پر کالا دھوپ کا قیمتی چشمہ پہنے سلیقے سے جمے ہوئے بالوں والا شخص بلاشک و شبہ چودھری اورنگزیب ہی تھا۔ قریب آ کر گرم جوشی سے عبدالسمیع سے مصافحہ کیا۔

سمیع بے جان قدموں سے چلتے ہوئے انہیں

اندر لایا۔ باری، باری نفیس سی اردو میں چودھری اورنگزیب نے اپنی این جی او جو اس کے اور زرینہ کے ناموں کے ابتدائی حروف پر مشتمل تھی کا مقصد بتایا۔ اور جب زرینہ نے انگلش میں مختصر الفاظ میں اسکول کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا تو عبدالسمیع تو گویا زمین میں گڑ گیا۔ چودھری اورنگزیب کو تو ذاتی نوعیت کے کاموں کی وجہ سے پہلے جانا تھا لیکن زرینہ چودھری کو رک کر اسکول کی عمارت کی سہولیات کا جائزہ لینا تھا۔ آفس سے نکلتے ہوئے اس نے کمزور سی آواز میں اسے روکا۔ زرینہ نے اپنے قدم مدھم کر لیے باقی عملہ باہر نکل چکا تھا۔ زرینہ نے سیکرٹری کو بھی جانے کا اشارہ کیا۔

عبدالسمیع نے اپنی جیب سے وہ پازیب نکالی جو کل اس کے گھر سے برآمدے سے ملی تھی اور یہ بہت پہلے سمیع نے عید پر زرینہ کو تحفے میں دی تھی۔

”مس...... اوہ مسز چودھری صاحبہ یہ غالباً کل آپ میرے گھر کے برآمدے میں بھول آئی تھیں۔“

اس نے لفظوں کو چبا، چبا کر ادا کیا۔ وہ اس پر جتانا چاہ رہا تھا کہ وہ اس کے آنے سے بھی باخبر ہو گیا ہے اور جانتا ہے کہ اب تک اس کا دیا ہوا گفٹ سنبھال کر رکھنے کا مطلب بھی یہ ہے کہ وہ جان چکا ہے کہ زری اب بھی اس سے محبت کرتی ہے۔

ایک عورت محبت اور پہلی محبت بے شک کبھی نہیں بھول سکتی۔ بے شک وہ اب بھی اپنی زندگی کا آدھا حصہ اپنے ماضی میں جی رہی تھی۔ اب بھی کنویں کی منڈیر اس کو بھاتی تھی۔ وہ بھی جانتی تھی کہ کل وہ... عبدالسمیع کو جتانے اس کے گھر گئی تھی۔

وہ یہ بھی جانتی تھی کہ کل سمیع کے اعترافِ محبت نے اس کو سرخرو بھی کر دیا تھا۔

وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ محبت کے سارے پنچھی وہ رہا کر چکی ہے، وہ اس کو یہ بھی بتانا چاہتی تھی کہ جو داستان وہ کل سیما کو سنا رہا تھا اور ہمیشہ کا مظلوم مرد اپنی محبت کی عدالت میں سرخرو ہوا جا رہا تھا۔ وہ تو بہت پہلے اس مرد نے اس کو بتا دی تھی جس نے اسے محبت ہی نہیں دی تھی، عزت بھی دی تھی۔ جس نے اس کی محبت کو حرف، حرف صحیفہ جانا تھا۔ اور پل، پل اس کا وظیفہ کیا تھا۔ بے کھوٹ محبت کی تھی۔ کھری، سچی چاہے اکھڑ سہی لیکن اس کی بے لوث محبت نے اسے مانا ہی نہیں منوایا بھی ہے۔ وہ بتانا چاہتی تھی کہ تم جو مجھے کھوٹا سمجھ کر چھوڑ گئے تھے اور رابیل کو پارس سمجھ کر اپنایا تھا رابیل تو تمہیں کبھی پارس نہ سمجھ سکی لیکن کہا تو صرف اتنا۔

”عبدالسمیع محبت کے درجات ہم طے نہیں کر سکتے یہ کام اللہ سبحان تعالیٰ کے ہیں۔ جو مرد، عورت کو رد کر دے تو پھر محبت اسے رد کر دیتی ہے۔ اور عورت ......عورت کے لیے محبت، عزت کے بغیر مرے ہوئے جانور سے بھی مکروہ شے ہوتی ہے۔ جب بھی دو محبتوں میں سے عورت کو کسی ایک محبت کے چناؤ کا... موقع ملتا ہے ناں عبدالسمیع رزاق تو یاد رکھنا ہر عقلمند عورت اسی مرد کو چنے گی جو اپنے دل کو صرف اس کے نام سے آباد کرتا ہے اور اسی کے نام پر ویران۔ تم نے تو میری نادان محبت کو کھوٹا سکہ جان کر سرِراہ پھینک دیا تھا کسی نے مجھے یعنی کھوٹے سکے کو اپنے سر کے تاج میں جڑ لیا اور جانتے ہو میرا سرتاج جو مجھے پارس سمجھتا ہے دراصل وہ خود ایک پارس ہے جس نے اس کھوٹے سکے کو کھرا سونا بنا دیا۔ رہی بات اس پازیب کی تو یہ تو بہت پہلے میں سیما آپا کو دے چکی ہوں۔ مجھے تو یاد بھی نہیں تھا کہ یہ بھی کبھی میرے پاس تھیں۔“ یہ جھوٹ اس عورت کو بولنا ضروری تھا جو نہیں چاہتی تھی کہ ایک کھوٹا سکہ اس کے ”پارس“ کے عشق میں اپنے لیے گنجائش ڈھونڈنے کی لاحاصل سعی کرے۔

عورت اپنی پہلی محبت کو کبھی نہیں بھولتی......لیکن وہ اپنے رد کیے جانے کے درد کو بھی نہیں بھولتی...... کچھ جھوٹ اس درد پر مرہم تب بنتے ہیں جب ان کا بھرم رکھا جائے۔ زرینہ مڑ کے دیکھے بنا باہر نکل گئی اور سمیع اپنے ہاتھوں میں اٹھائی پازیب کی سیاہی مائل چمک کو دھندلی نظر سے گھورنے لگا۔

مکمل ناول

عنان گیر

سحر ساجد



کبھی، کبھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وجود، وجود نہیں رہا، دل، دل نہیں رہا......کوئی کیفیت، کوئی حالت اس قدر کیسے بڑھ سکتی ہے کہ بڑھتے، بڑھتے وہ آپ کے پورے وجود پر حاوی ہو جائے۔ دل کو ڈھانپ کر رکھ دے۔ عقل کو باندھ دے۔ بس پھر......وہ ہی کیفیت، وہ ہی حالت آپ کی آنکھیں بن جائے وہ ہی کان اس کے سوا کچھ سنائی نہ دے اور اس کے علاوہ کوئی بات نہ بن پڑے......ایسا کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟ ہاں کہنے کو، سوچنے کو عجب بات ضرور لگتی ہے......مگر یہ عجب ہے نہیں......وہ یوں کہ میں اس کیفیت کو، اس حالت کو سالوں سے بھگت رہی ہوں کہ اس کے سوا سب...عجب



لگتا ہے...... بدنما سا دکھتا ہے۔ خواہش...... کہنے کو پانچ حرفی لفظ لیکن جب یہ پانچ حروف یکجا ہو کر جسم پر دھاوا بولتے ہیں اور دل کو فتح کر لیتے ہیں تو پھر یہ محض پانچ حروف تو نہیں رہ جاتے ناں...... یہ ایک ''فاتح'' کی سی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اور یہ فاتح آپ کا عنان گیر بن جاتا ہے...... خواہشیں بے لگام ہوتی ہیں مگر یہ انسان کے اتنے بڑے وجود کو لگام ڈالنا جانتی ہیں، اسے کھینچ کر اپنی مرضی، اپنی منشا اور اپنے راستے پر چلانا جانتی ہیں...... ضرورت پڑے تو کوڑا بھی مارتی ہیں، زخم بھی لگاتی ہیں اور تڑپ کی چوٹ سے بھی کام نکال لیتی ہیں، سچ بڑی ہی بے رحم شے ہے یہ خواہش...... کہ پنجوں کے بل کھڑا کیے رکھتی ہے...... سر کے بل چلانا جانتی ہے۔ انسان کو انسان نہیں رہنے دیتی، سراپا دشت بنا ڈالتی ہے۔ ایسا دشت، وہ صحرا جو مینہ کے نام پر صرف طلب کا پورا ہونا مانگے۔ کبھی، کبھی مجھے ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ میری ''خواہش'' نے مجھے کیا بنا چھوڑا ہے۔ یہ خواہش جیسے میرا ذاتی دوزخ ہے۔ خود کا بھڑکایا ہوا جہنم...... جس میں اپنی مرضی سے، اپنے اختیار سے جل رہی ہوں اور جلنا تو پڑتا ہی ہے ناں...... ہر کسی کو، ہر ایک کو اپنے، اپنے جہنم میں...... یہ تو سہنا ہی پڑتا ہے۔ کہ کیا جائے اس کے سوا اور چارہ بھی کیا؟ میری خواہش، میری تمنا کوئی خواہشات یا تمناؤں کا مجموعہ تو نہیں...... محض ایک، فقط اِک خواہش...... اور میں چاہتی ہوں کہ مجھے اس خواہش کو پورا کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ ہاں...... مجھے اجازت درکار ہے۔ مجھے اس جہنم میں بھسم ہونا منظور ہے...... راکھ بن کر بکھرنا منظور ہے اور اگر راکھ نہ بھی بنوں، بھسم نہ بھی ہوں تو اور اگر ساری عمر...... ساری عمریوں ہی جلتے رہنے کا عذاب بھی مجھ پر مسلط رہے تو یہ بھی منظور...... لیکن اجازت کے بنا مجھے خواہش کا پورا ہونا نہیں منظور...... اور خواہش...... خواہش بھی کیا؟ ایسی کہ جو گناہ کہلائے۔

''تو مجھے اِک گناہ کرنے کی تمنا ہے، صرف ایک گناہ......'' باقاعدہ سربہ مہر اجازت نامہ...... کہ فلاں بنت فلاں جاؤ تمہیں تمہاری خواہش پوری کرنے کی اجازت دی جاتی ہے...... اس طرح سے کہ مجھے محسوس نہ ہو کہ میں نے کوئی گناہ کیا ہے...... مجھے یہ ہی محسوس ہو کہ میں نے صرف اپنی خواہش کی تکمیل کی ہے اور اس طرح سے کہ مجھ سے پوچھا نہ جائے...... اس طلب، اس خواہش کا کوئی حساب نہ لیا جائے...... سوال کیا جائے نہ ہی جواب مانگا جائے۔ طلب کا کیا ہے وہ تو انسان کو ''خدا'' بننے پر بھی مجبور کر دیتی ہے اور میں، میں تھک گئی ہوں، ٹوٹ چکی ہوں اس طلب، اس خواہش کو دباتے، دباتے۔ خود کو سمجھاتے کہ یہ گناہ کرنے کی خواہش بھی دراصل گناہ ہی ہے۔ لیکن یہ خواہش...... یہ طلب کسی طرح سے تھمتی نہیں، دبتی نہیں۔ یہ مجھے مجبور کرتی ہے، اکساتی ہے، کوڑے مارتی ہے اور زخم لگاتی ہے اور میرا دل گھٹنوں کے بل گرتا ہے...... شرم سے سر جھکتا ہے...... لب جرأت نہیں کرتے مگر یہ آنکھیں، یہ دل، یہ خود بخود لب بن جاتے ہیں، میری مرضی کے بغیر ہی...... یہ شاید اختیار سے باہر کی چیز ہے...... ہاں یہ اختیار سے باہر کی چیز ہے...... جب کبھی آنکھیں نیلے آسمان کی طرف اٹھتی ہیں تو ایک ہی فریاد سوال بن کر ان میں امڈ امڈ آتی ہے دل ہمک، ہمک کر پوچھنے لگتا ہے۔

''کیا مجھے اجازت ہے؟ اجازت ہے مجھے؟''

لیکن...... لیکن کوئی جواب نہیں آتا...... کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ کوئی الہام بھی نہیں اترتا...... اور اُدھر...... خموشی، ایک ازلی...... ابدی خموشی...... اور میرا دوزخ، میرا ذاتی جہنم یہ کچھ اور بھڑک اٹھتا ہے۔ یہ بھڑ بھڑ جلنے لگتا ہے اور پھر بھی مجھے راکھ نہیں کرتا...... بس جلاتا ہے اور جلائے ہی چلا جاتا ہے۔

☆☆☆

اگر آپ دور سے اسے دیکھیں تو وہ اِک لمبا، سیاہ دھبا نظر آتی تھی اور جیسے، جیسے وہ دھبا واضح ہوتا جاتا تھا تو سمجھ میں آ پڑتا تھا کہ اچھا...... یہ تو کوئی لڑکی ہے۔ سیاہ عبایا، سیاہ نقاب، ہاتھوں پہ سیاہ ہی دستانے اور سیاہ جوتوں میں سیاہ ہی جرابوں میں مقید پیر اس کے پورے وجود میں اِک آنکھیں ہی تھیں جو نظر آتی تھیں اور وہ بھی اس طرح سے نظر آتی تھیں کہ دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ وہ اکثر فوٹو کل گلاسز لگائے رکھتی تھی سو اس کی پہچان یہ عبایا ہی تھا۔ لوگ اس کو اس کے نام سے کم اور اس کے لباس سے زیادہ جانتے تھے۔ سو لوگ بھی کھڑے ہوں تو وہ ان میں سے بھی پہچانی جا سکتی تھی۔ اس نے خود کو چھپائے رکھا تھا مگر نظر میں سب کی تھی...... اور اس

لیے تھی کہ لوگ اسے عجیب سمجھتے تھے۔
کوئی دوست نہ سہیلی...... بدروح کی طرح اکیلی ہی گھومتی نظر آتی تھی۔ کبھی جامعہ کی لائبریری میں تو کبھی کسی لان کے ویران کونے میں...... کبھی کسی خالی کلاس روم میں اور کبھی کسی استاد کے پاس...... اس کے ہاتھ میں ہر وقت کتابیں پائی جاتی تھیں۔ موٹی، موٹی نظر میں یک دم آجانے والی، سمجھ میں نہ آنے والی۔ اس کے ہم جماعت بتاتے تھے وہ جماعت میں بھی یوں موجود ہوتی ہے گویا کہ نہیں ہے اور یہ وہم یقین پکڑنے لگتا ہے کہ وہ نہیں ہے تو وہ یوں سامنے آجاتی ہے کہ بس وہ ہی تو ہے...... اس کی موجودگی بڑی بھاری ہوتی ہے۔ ہر طرف چھائی ہوئی۔ بولتی ہے تو لب سی لینے کو جی چاہتا ہے۔ سوال کرتی ہے تو خود جواب بن کر پیش ہونے کو من کرتا ہے۔ لڑکے تو لڑکے اکثر لڑکیاں بھی اس کی پُراسراریت کا شکار دکھائی دیتی ہیں۔ ذہین ہے اتنی کہ اس کی ذہانت اساتذہ کو بھی بوکھلانے پر مجبور کردیتی ہے۔ سوال زیادہ نہیں کرتی...... بس جو کبھی کبھار کردیتی وہ ہی کئی دن کے لیے کافی ہوتا ہے۔ جماعت میں سب سے پہلے موجود ہوتی ہے ایسے کہ ہر دوسرے آنے والے طالب علم کو لگتا ہے کہ وہ اس کے بعد آیا ہے اور بے اختیار اسے کوسنے کو دل کرتا ہے۔ کبھی تو یہ لیٹ ہو جایا کرے کبھی تو...... اس کی حاضری پر اسے کوسا جاتا ہے اور غیر حاضری میں حیرت سے مڑ، مڑ کر اس کی سیٹ کی جانب تکا جاتا ہے کہ ہائیں وہ نہیں آئی؟ کیا واقعی وہ نہیں آئی...... وہ معما ہے...... سمجھ میں آئے تو حل ہونا...... کہاں سے آتی ہے؟ کہاں رہتی ہے؟ کس کوچے، کس گلی سے تعلق ہے...... معلوم ہوگا تو صرف جامعہ کی انتظامیہ کو ہی ہوگا...... باقی سب کے لیے ہے تو وہ یوں وارد ہوتی جیسے ابھی، ابھی اسے کوئی خلائی گاڑی نیچے اتار گئی ہو۔ خاموش اتنی کہ بولتی ہوئی لگتی اور جب بولتی تو خموشی ہر طرف پھیل سی جاتی...... اب کیا یہ بھی بتاؤں کہ امتحان میں بھی اول آتی ہے اور کبھی موج میں ہو تو تقریری مقابلے میں بھی حصہ لے لیتی ہے اور جب لیتی ہے تو مجال ہے کسی اور کو آگے نکلنے کا موقع دے۔ اس کے بارے میں دو مفروضات عام ہیں، نمبر ایک، وہ بے حد بدصورت ہے اسی لیے تو یوں چھپا کر رکھتی ہے خود کو...... نمبر دو اس نے خود پر مغروریت کا خول چڑھا رکھا ہے تاکہ کوئی اس کے پاس نہ آئے اور حال ہی میں ایک تیسرا مفروضہ بھی زبان زد عام ہوا ہے کہ وہ کسی ایسے ویسے (سمجھ تو آپ گئے ہوں گے) علاقے سے تعلق رکھتی ہے۔ سب کو یہی لگتا ہے کہ وہ اپنے بارے میں پھیلے مفروضات سے بے خبر ہے اور جتنی بے خبر ہے اسی لیے بے ضرر بھی ہے...... تو یہ جس کا تعارف ہے، وہ...... وہ ''غزل مراد'' ہے۔

☆☆☆

''اوئے مانی...... ! اسلامیات ڈیپارٹمنٹ کی غزل مراد کا پتا ہے؟''
''نہیں پتا۔''
''ہا...... ہائے نہیں پتا؟'' جواباً زارا خالص لاہوری انداز میں ہا،ہائے کہتے ہوئے دُہری ہوئی تھی۔ ''بھلا اس جامعہ میں کوئی ایسا بھی ہے کہ جسے غزل مراد کا نہیں پتا......'' مانی نے اس کی حیرت کا نیون سائن بنی شکل کو دیکھا اور پھر پورے گروپ کو...... سب کم و بیش ایسے ہی انداز میں اسے دیکھ رہے تھے کہ جا مانی، تجھے غزل مراد کا نہیں پتا...... تو بس کچھ نہیں پتا...... در فٹے منہ تیرے پر مانی بیچارہ بھی کیا کرتا...... ایک تو وہ ہجرت کر کے میرا مطلب ہے کسی اور کالج سے مائیگریٹ ہو کر آیا تھا اور دوسرا یہ کہ وہ انگریزی کا طالب علم تھا...... اب انگریزی والے بھول چوک کر بھی اسلامیات ڈیپارٹمنٹ کی طرف رخ نہیں کرتے کہ خواہ مخواہ میں فتوے نازل اور پھر صادر ہونے لگتے ہیں تو ایسے میں اگر مانی کو ''غزل مراد'' کا نہیں پتا تو بس نہیں پتا...... یہ اتنا بڑا حادثہ تو نہیں تھا کہ جس پر یوں ہا ہائے کہا جاتا...... مانی کو خواہ مخواہ میں ہی بے عزتی سی محسوس ہونے لگتی تھی۔ ویسی ہی بے عزتی جیسی کہ اس وقت محسوس ہوتی ہے کہ جب یہ پوچھ لیا جائے کہ علامہ اقبال کی تاریخ وفات کیا ہے اور آپ جواب میں محض ہکلا کر رہ جائیں تو بس مانی کو بھی ویسی ہی شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔
''چل آ...... تجھے غزل مراد دکھاتے ہیں۔'' یاور نے اس کے کندھے پر ہاتھ اور زارا کو آنکھ مارتے ہوئے کہا تھا۔
''بڑی ہی متبرک شے ہے۔ اِک درشن سے ہی

سارے الٹے کام سیدھے ہو جائیں گے۔'' یہ حسن تھا۔
''کیا بکواس ہے...... میں اسلامیات ڈیپارٹمنٹ میں اب لڑکی دیکھنے جاؤں گا؟'' وہ بھنا ہی تو گیا تھا۔
''ہا...... ہائے۔'' زارا نے ایک بار پھر اسی انداز میں کہا۔ ''وہ لڑکی نہیں پا جی...... مطلب ''غزل مراد'' ہے۔'' زارا اطلاع دینے والے انداز میں بولی تھی۔
''ہیں......'' مانی نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا کہ وہ کہہ کیا رہی تھی۔
''صحیح کہہ رہی ہوں مانی۔'' اور پھر ان تینوں نے مل کر اس کے تجسس کو کچھ اس طرح سے پنکھا جھلا کہ وہ اسلام آبادی ہونے کے سارے مینرز گٹر میں پھینک کر اسے دیکھنے چل دیا تھا کہ جو لڑکی نہیں...... ''غزل مراد'' تھی۔

☆☆☆

''اس کلاس روم کے آگے سے ناک کی سیدھ میں یوں گزرتے جاؤ جیسے تم اپنے کسی کام کے لیے جا رہے ہو۔ غزل مراد کو دیکھنے نہیں...... وہ اسی کلاس روم میں بیٹھی فضہ کو پی رہی ہے۔'' یا ور اسے پٹی پڑھا رہا تھا۔
''تم مرواؤ گے مجھے......'' وہ ذرا سا متامل تھا۔
''یہ فائل پکڑو اور اسے کھول کر پڑھتے ہوئے سیدھے گزر جاؤ...... بس پڑھتے، پڑھتے بائیں آنکھ ذرا سی ٹیڑھی کر کے دیکھ لینا...... سامنے ہی تو ہے۔'' حسن نے اسے اپنی فائل پکڑاتے ہوئے کہا...... کل ملا کر کوئی دو منٹ اور پچیس سیکنڈز پہلے حسن نے بھی یونہی دیدار کی طلب کو ٹھنڈا کیا تھا۔ مانی نے ان تینوں کی شکلیں دیکھیں...... اور وہ سب شکلیں اس سے کہتی تھیں۔ ''جا بیٹا جا...... امرت ہے گھول کر نہ سہی ذرا سا چکھ ہی آ......''
اور مانی نے فائل پکڑی...... سر کو فائل کے تقریباً تقریباً اندر ہی گھسا لیا۔ وہ اس جماعت کے دروازے کے سامنے سے گزرا...... بائیں آنکھ کو ذرا سا ٹیڑھا کیا اور یہ کیا ہوا...... دھڑام...... فائل اس کے ہاتھ سے نیچے جا گری اور وہ حیرت کے پُراثر جھٹکے کے زیرِ اثر...... منہ کھول کر اسے دیکھنے پر خود کو روک نہیں سکا تھا۔ غزل نے کچھ گرنے کی آواز سنی...... لاشعوری طور پر سر اٹھایا اور پتا نہیں اب کے کتنواں فرد منہ کھول کر اسے یوں دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس بھری، سکون سے اٹھی، چیزیں اٹھائیں اور اس معلوم نہیں کتنے ویں فرد کے پاس سے سر جھکا کر گزر گئی تھی۔ اور اس کے دور جاتے ہی ان تینوں کا قہقہہ ابلا اور چوتھے پہ جا گرا......
''یہ...... یہ غزل مراد تھی؟'' وہ ابھی تک حیرت زدہ تھا...... وہ اس لڑکی نما چیز کو دیکھنے آیا تھا...... خاص طور پر...... انگریزی ڈیپارٹمنٹ سے اسلامیات ڈیپارٹمنٹ کی مسافت طے کر کے' اس کا نام تو برقع مراد ہونا چاہیے تھا...... وہ بھنا کر پلٹا تھا...... ''لعنت ہے مجھ پہ......'' سرخ چہرہ لیے وہ بڑبڑایا۔
''لالے تو کیا سمجھا تھا کہ تو لیٹ آیا ہے سو ریگنگ سے بچ جائے گا...... نہ بیٹا ناں......'' یا ور مزہ لیتے ہوئے بولا تھا...... اور وہ مانی...... شرٹ کے دونوں بازو اوپر چڑھاتے ہوئے سرخ منہ لیے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔
''بندہ کسی کو تو چھوڑ دیتا ہے اور تم لوگوں نے عبایا والی کو بھی نہیں بخشا...... کچھ نہیں تو اس کے عبایا کا ہی لحاظ کر لیتے......'' وہ کھولتے ہوئے، بولتے ہوئے ان کی جانب بڑھ رہا تھا اور وہ تینوں ہنستے ہوئے اِک ساتھ قدم، قدم پیچھے کو ہٹتے جا رہے تھے۔
اور وہ نہیں جانتا تھا کہ کاریڈور کے آخری سرے پر اس جملے پر کسی کے قدم یک دم ساکت ہو کر ٹھہر سے گئے تھے۔ اور دو آنکھوں نے بے حد حیرانی سے اس کی پشت کو دیکھا تھا۔
''تو اس بھری جامعہ میں واقعی ہی میں کوئی ایک انسان بھی تھا؟''

☆☆☆

مانی نے سمجھا تھا کہ وہ کوئی بے حد خوب صورت لڑکی ہوگی...... کوئی ماورائے عقل حسن کہ جس کے لیے اسے یوں مجبور کیا جا رہا تھا۔ اب مانی کوئی زاہد خشک تو تھا نہیں جو منکر ہوتا...... لیکن آگے سے جب ایک لپٹی لپٹائی لڑکی دیکھنے کو ملی تو...... تو...... ایک تو سبکی اور اوپر سے اسے غصہ بھی آیا کہ کسی کو تو بخش دیں...... جو نظر نہیں آنا چاہتی کم از کم اس کو تو...... مانی کے حلقۂ احباب میں جتنے لڑکے شامل تھے اس تناسب سے ایک، دو فیصد زیادہ لڑکیاں موجود تھیں۔ کچھ اسکول فیلوز، کالج فیلوز، یونی فیلوز، کزنز وغیرہ،

وغیرہ......سب کے ساتھ اس کا تعلق ایسا ہی تھا جیسا کسی دوست کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ کچھ، کچھ اخلاقیات کا بھی قائل ہی تھا۔ لیکن چونکہ انگریزی ادب کا طالب علم تھا جو تو جنس کو اتنی اہمیت نہیں دیتا تھا۔ قدرے ستھرے دماغ کا آدمی تھا۔ کوئی لڑکی کچھ پوچھنے آتی تو بس وہ بتانے پر ہی اکتفا کرتا تھا۔ کوئی ہیلو ہائے کرتی تو جواباً اس کا جواب بھی ہیلو ہائے تک ہی رہتا۔ زارا اور ٹینا کی بات دوسری تھی البتہ۔ زارا گروپ فیلو تھی اور وہ اسلام آبادیا......اس کی پنجابی نما انگریزی پر فدا تھا۔ رہ گئی ٹینا، تو ٹینا تو اسکول کے زمانے کی دوست تھی۔ جینز کے پائنچے چڑھا کر جمعہ بھی پڑھتا تھا اور ایک ہی سموسوں کی پلیٹ ٹینا اور زارا یا پھر کسی بھی دوسری، تیسری دوست لڑکی کے ساتھ شیئر بھی کر لیتا تھا۔ لڑکیوں سے ہاتھ ملانے کو بھی برا نہیں سمجھتا تھا۔ اور ٹینا سے Twilight کے رومانس اور اس رومانس کی شدت پہ سیر حاصل بحث بھی کر لیتا تھا۔ سو بحیثیت مجموعی مانی اپنے دوستوں کی نسبت اچھا بندہ تھا......باقیوں کو اگر آپ دس میں سے ایک بھی نمبر نہیں دیتے تو مانی کو آپ 6 یا 5 تو دے ہی سکتے تھے۔ مانی کو چند دن لگے تھے اس جامعہ میں پیر جمانے اور اپنا سکہ بٹھانے میں......وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ کا ذہانت کے لحاظ سے ”غزل مراد“ ہی تھا......دو ٹکر کے لوگ ٹکر ٹکر یوں وقوع پزیر نہیں ہو سکتی تھی کہ دونوں مختلف شعبہ جات سے تعلق رکھتے تھے۔ غزل مراد کی وجۂ شہرت ذہانت کے ساتھ، ساتھ اس کا خاص حلیہ اور ابنارمل رویّہ بھی تھا جبکہ مانی......مجھے کہنے دیں کہ لڑکیاں اس پر مرتی تھیں......نہ، نہ ذہانت پہ نہیں......صرف اور صرف اس پر......وہ کہانی کا ہیرو تھا تو اب اتنا تو بنتا ہی تھا کہ کم از کم لڑکیاں اس پر فدا تو ہوں......باقی رہ گئی ذہانت کی بات تو سمجھیں......یہ جلتی پر تیل تھا بلکہ پٹرول تھا......چلو جو اس کے ہینڈسم ہونے پر نہ مرے جس کا دل اس کی مسکراہٹ سے پاش، پاش نہ ہو تو کم از کم ذہانت تو اس کا ستیاناس کرے اور ضرور ہی کرے......اب ہر لڑکی اس ٹائپ کی تو نہیں ہوتی ناں۔ ”ہائے اللہ مانی......کتنا چارمنگ ہے ناں وہ......ڈریسنگ تو اس پر ختم ہے۔ اور بات کرنے کا اسٹائل......مائے گاڈ......“ اب ہر لڑکی تو اس ٹائپ کی نہیں ہوتی ناں......تو جو اس ٹائپ کی نہیں ہوتی......اس کے لیے ذہانت کڑا وار تھی۔ بھلا بتاؤ اب......لڑکیاں بیچاریاں بچیں تو کہاں تک بچیں آخر......

☆☆☆

”لو آ رہی ہے وہ......“ ٹینا کے جملے پر سب نے باجماعت ہو کر اس جانب تکا تھا کہ جس جانب تکتے ہوئے نک چڑھی ٹینا نے اپنی ناک اور چڑھائی تھی۔ وہ کوئی سیاہ سا لمبا سا دھبا نظر آتا تھا۔ ٹینا کو دیکھ کر ہی لگتا تھا کہ وہ انگلش میڈیم اسکول سے پڑھی ہے۔ برگر طرز کے ماحول میں ہی پرورش پائی ہے اور یہ کہ ممی کو موی ہی بلاتی ہوگی۔ منہ بس اتنا سا ٹیڑھا کر کے وہ دیکھنے میں دل کش محسوس ہو......”T“ اور ”R“ کی آواز ٹینا انگلش بولتے ہوئے یوں نکالتی تھی کہ بیچارے انگریز انگلیاں منہ میں دابنے پر مجبور ہو جائیں۔ phonetics (تلفظ) تو اس پر ختم تھے بس اس کو دیکھ کر لگتا تھا کہ اس کا نام ٹینا نہیں نازکی ہونا چاہیے تھا......تو جب ’نازکی‘ میرا مطلب ہے ٹینا نے غزل کو دیکھ کر ناک چڑھائی......تو وہ سب اس طرف ہی دیکھنے لگے۔

”انتہا پسند......دہشت گرد لوگ......معلوم نہیں انہیں یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہی کیوں دیا جاتا ہے......اسلام اور پاکستان کے سوفٹ امیج کو انہی جیسے لوگوں نے تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔“ نخوت اور تنفر دونوں ہی جھلکتے تھے ٹینا لہجے سے۔

”کم آن ٹینا......کیا ہو گیا ہے، تمہیں کیا کہتی ہے؟“ مانی حیران ہوا۔

”تم نہیں جانتے مانی......ان لڑکیوں کو چھپ کر بھی نظر آنے کا فن آتا ہے تم دیکھتے نہیں کہ کیسے پوری یونی ”غزل مراد“ کو جانتی ہے۔“ اس کا تنفر اور بڑھا تھا......مانی نے سر جھٹکا یوں جیسے اس کی بات سے اتفاق نہ ہو۔

”اب ذرا دیکھنا تم لوگ......“ ٹینا کو تو معلوم نہیں کیا سوجھی تھی کہ یک دم وہ اس طرف گئی تھی جس طرف سے غزل آ رہی تھی......اس نے اتنی آناً فاناً اپنی جگہ چھوڑی تھی کہ کوئی روک بھی نہیں سکا تھا۔

”ہائے......“ اس نے یک دم غزل کا رستہ روکا اور ببل چباتے......انگلی پر پاؤچ کی چین کو جھلاتے ہوئے ایکسرے کرتی نظروں سے غزل کو دیکھ کر کہا۔ غزل نے

اِک خاموش مگر گہری نظر اس پر ڈالی اور دوسری نظر ڈالے بغیر ہی وہ جان گئی تھی کہ اس کے باقی دوست بھی ذرا فاصلے پر موجود تھے۔

''ہیلو......'' بے حد سکون سے جواب آیا۔ خواہ مخواہ میں سلامتی بھیجنے کی قائل نہیں تھی وہ۔

''تم اتنا سخت نقاب کیوں کرتی ہو؟''

''مجھے اچھا لگتا ہے......'' ذرا سا توقف۔ ''جس طرح آپ کو دوپٹا نہ اوڑھنا اچھا لگتا ہے......'' آخری جملے پر ٹینا بے طرح سے چونکی اور پھر کھول کر رہ گئی تھی۔

''تم انتہا پسند ہو۔'' ٹینا کے لہجے میں پھر سے نفرت پھنکاری تھی۔

''میں انتہا پسند ہوں؟'' غزل نے حیرت سے سوال کیا۔

''میں......؟'' وہ اب تک بے یقین تھی۔ ''میں نے آپ کا رستہ روک کر...... آپ کے حلیے، آپ کے لباس پہ سوال نہیں اٹھایا...... یہ آپ ہیں...... تو پھر انتہا پسند میں کیسے؟'' وہ ابھی تک بے یقین اور حیران تھی۔

''شٹ اپ......'' ٹینا تلملائی اور بھڑک کر بولی تھی۔

''یو شٹ اپ......!'' جواب سرد، سخت مگر نیچی آواز میں آیا تھا۔ اتنا کرخت کہ ٹینا آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے پر مجبور ہوئی تھی۔ اور ٹینا کی اس حالت پر زارا تیز، تیز قدموں سے چلتی ہوئی ان تک آئی تھی اور اس کے پیچھے وہ تینوں بھی کہ بات بڑھ رہی تھی۔

''آئی ایم سوری...... یہ بس ایسے ہی......'' زارا نے غزل کو دیکھ کر کہا تھا۔

''ایک بات تو بتائیں۔'' غزل نے کتابوں کا وزن ایک بازو سے دوسرے بازو پر منتقل کرتے ہوئے نرم لہجے میں زارا سے پوچھا۔

''جی......'' زارا محتاط تھی۔

''انگریزی ڈیپارٹمنٹ میں ایسے ہی ابنارمل لوگ ہوتے ہیں کیا؟'' بے حد پیار سے مارا گیا اک اور تھپڑ...... مانی بے ساختہ رخ موڑ کر مسکرایا...... ٹینا پھٹ پڑنے بلکہ اس کا منہ نوچنے کو تیار جبکہ یاور اور حسن نے بھی مسکراہٹ روکی تھی۔

''جی......؟'' زارا اتنا ہی کہہ سکی تھی۔ اس کے جی کہنے میں اِک سوالیہ حیرت چھپی تھی۔

''تم......'' ٹینا غرائی اور حملے کے واسطے آگے کو بڑھی...... زارا نے بروقت اسے کندھوں سے پکڑ کر روکا تھا۔

''اور اب بھی میں ہی انتہا پسند ہوں؟'' غزل نے ٹینا کی آنکھوں میں براہ راست دیکھ کر کہا اور پھر سر جھٹک کر وہاں سے چلی گئی تھی۔ اور ٹینا...... وہ اب انگریزی میں اسے گالیاں دے رہی تھی۔

''تو تم نے یہ دکھانا تھا ہمیں کہ غزل مراد جب بے عزتی کرتی ہے تو وہ بے عزتی کیسی ہوتی ہے؟'' یہ مانی تھا۔

''شٹ اپ مانی۔'' ٹینا نے اپنا پاؤچ زور سے اس کے سینے پر دے مارا تھا۔ ان تینوں کا قہقہہ گونجا تھا۔ جبکہ زارا صرف مسکرائی تھی...... اور ٹینا کاش کہ اس کے پاس اس وقت بزوکا ہوتی تو وہ سب کو اڑا دیتی...... سمیت اس غزل مراد کے......

☆☆☆

وہ اسے وہاں موجود دیکھ کر مڑ جانا چاہتا تھا مگر حیرت نے اس کے پیر پکڑ ہی لیے تھے۔ ''غزل مراد اور انگلش ڈیپارٹمنٹ؟'' وہ سر تیمور سے کچھ ڈسکس کرنے آیا تھا مگر آگے غزل مراد کچھ بات کرتی نظر آئی تھی۔ وہ مڑ جانا چاہتا تھا مگر براہو سر کی نظر کا جو عین اسی لمحے اس پر پڑی تھی کہ جب وہ مڑنے کا ارادہ باندھ ہی چکا تھا۔

''مانی! آجاؤ یار!......'' سر تیمور بے تکلف سے انداز میں کہہ کر پھر سے غزل کی طرف متوجہ ہوئے تھے...... وہ اندر آیا اور حیرت سے اس کی پشت دیکھتے ہوئے صوفے پر جا بیٹھا تھا...... اسی دوران اس کے علم میں آیا تھا کہ سر تیمور اسلامیات والوں کی communiction skills کی کلاس لیا کرتے تھے...... سو وہ اسی وجہ سے وہاں موجود تھی۔ مانی اپنا سیل نکال کر اس پر مصروف ہو گیا تھا۔ اس بات سے یکسر بے خبر کہ وہ دونوں کیا گفتگو کر رہے تھے۔

''ہاں بھئی مانی......!'' تھوڑی دیر بعد وہ سر کی آواز پر چونکا اور سیل بند کر کے جیب میں ڈالتے ہوئے ان کی طرف متوجہ ہوا...... اور جیسے ہی اس نے بولنے کے لیے منہ کھولا تو وہ کھلا کا کھلا ہی رہ گیا بلکہ منہ بدمزہ سا ہو کر رہ گیا تھا۔ اس غزل نے پھر سے کچھ پوچھ لیا تھا، سر اسے جواب دینے لگے تھے۔ مانی نے ایک بار پھر اس کی پشت کو ایک عدد تیز قسم کی گھوری سے نوازا تھا۔

''ایک بات تو بتاؤ غزل......کیا گھول کر پیتی ہو...... تمہارے اسائنمنٹ میں تو غلطیاں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتیں۔'' سر تیمور اس کا اسائنمنٹ واپس کرتے ہوئے بولے تھے۔

''پینے شینے کا تو معلوم نہیں سر......! البتہ اماں خالص زیتون کے تیل سے سر میں مالش ضرور کرتی ہیں۔'' انداز ہلکا پھلکا سا تھا......سر ہنس پڑے......اور مانی ایک دفعہ پھر سے اسے گھورنے پر مجبور ہوا۔

''اچھا......تو یہ ہنس بول بھی لیتی ہے۔'' اس پر جیسے انکشاف ہوا تھا۔

''اتنی ذہانت کے باوجود آرٹس کیوں غزل؟ سائنسز کیوں نہیں؟''

''آرٹس کیوں نہیں سر......اور سائنسز ہی کیوں؟'' سوال کے جواب میں الٹا سوال اور مانی نے التجا کرتی نظروں سے سر کو دیکھا کہ اس کا ٹائم ویسٹ ہو رہا تھا اور وہ تھے کہ ''ہاں بھئی مانی......'' کہہ کر پھر سے غزل نامہ شروع کیے بیٹھے تھے......غزل کے سوال پر سر اِک لمحے کو چپ ہوئے۔

''سائنسز کا اسکوپ ہے، ترقی کے چانسز زیادہ ہیں۔ ایک بہتر مستقبل جبکہ اسلامیات......ایک ذہین دماغ کو معمولی ٹیکنیکس نہیں پڑھنے چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ کل کو تم کوئی کارنامہ ہی سر انجام دے دیتیں......اب اسلامیات میں بندہ زیادہ سے زیادہ کیا کرسکتا ہے۔''

''سائنس پڑھ کر بھی زیادہ سے زیادہ کیا کر لینا تھا سر میں نے؟''

''کوئی ایسا کارنامہ جو بنی نوع انسان کے کام آتا......رہتی دنیا تک......''

''تو کیا بنی نوع انسان کی خدمت اسلامیات پڑھ کر نہیں ہوسکتی سر......؟'' سر نے اچنبھے سے اس کا چہرہ دیکھا اور مانی نے اس کی پشت......

''بھلا اسلامیات پڑھ کر بندہ کون سا کارنامہ انجام دے سکتا ہے......کون سی انسانیت کی خدمت کی جاسکتی ہے......'' مانی نے ایسے ہی جملوں کو سوچا۔

''جواب دیں ناں سر......!'' وہ مصر تھی۔

''میرا نہیں خیال......! اسلامیات پڑھ کر آپ زیادہ سے اسے پڑھا ہی سکتے ہیں اور کر کیا سکتے ہیں......اب اسلامیات سے آپ بنی نوع انسان کے لیے کوئی ایجاد کوئی خدمت تو کرنے سے رہے......''

''آپ کو لگتا ہے سر کہ میرے جیسا دماغ جب کل کو اسلامیات پڑھائے گا تو وہ ویسے ہی پڑھائے گا جیسے کہ باقی اساتذہ پڑھاتے ہیں؟'' اس پر جیسے سر کے دلائل کا اثر ہی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بس ان کے جواب سے سوال نکالے جارہی تھی۔

''نہیں......یقیناً بہتر ہوگا مگر سوال وہیں پر...... انسانیت کے لیے کیا ہوگا؟''

''انسانیت کے لیے جو ہونا تھا سر وہ چودہ سو سال پہلے ہو چکا......اب کرنا بس اتنا ہے کہ اسے انسانیت تک پہنچانا ہے، کیسے؟ کس طرح؟ اور کس طریقے سے؟ یہ سب ہم پہ منحصر کرتا ہے......تو جب آپ بنی نوع انسان کی بات کرتے ہیں سر، ان کی خدمت کی بات کرتے ہیں تو آپ کے ذہن میں صرف سائنس ہی کیوں آتی ہے؟ اسلامیات کیوں نہیں؟ کیا مسلمان بنی نوع انسان کا حصہ نہیں......؟ کیا یہ کارنامہ نہیں کہ آپ دین کا علم کسی ایک مسلمان تک اس طرح، اس طریقے سے ڈیلیور کریں کہ وہ معاشرے کا فعال، مثبت اور ذمے دار حصہ بن کر جامعہ سے نکلے اسلامیات کے لیے سارے تھکے دماغ ہی رہ گئے ہیں کیا؟ میں یا مجھ جیسے دماغ کیوں نہیں سر......؟ آپ نے کبھی سوچا ہے سر کہ کنڈر گارٹن سے لے کر BA,BSC تک آپ یہ ہی پڑھاتے رہتے ہیں کہ جھوٹ نہیں بولنا......سچ بولنا ہے، چوری کرنا بری بات ہے اور اسی طرح کی بے شمار دوسری باتیں......کیا آپ نے عمل کہیں دیکھا......؟ دیکھا کہیں......آپ کو نہیں لگتا کہ ایسا......علم کو ٹھیک طرح سے ڈیلیور نہ کرنے کی وجہ سے ہے......میرا خواب ہے کہ میں اسلامیات میں پی ایچ ڈی کروں اور اور جب میں اسلامیات پڑھاؤں گی تو تب اگر ایک بھی I repeat sir ایک بھی طالب علم، باعمل بن کر میری کلاس سے نکلا تو میں اسے اپنا ایک کارنامہ ہی سمجھوں گی......ہم ہر وقت یہ دہراتے رہتے ہیں ناں کہ نپولین نے کہا تھا۔ ''تم مجھے اچھی مائیں دو، میں تمہیں عظیم قوم دوں گا......'' اور میں کہتی ہوں سر آپ مجھے باکمال استاد دیں میں آپ کو عظیم معاشرہ دوں گی اور تاریخ گواہ ہے کہ انسانیت کی بنیاد معاشرہ ہے۔''

لوگ ٹھیک کہتے تھے، جب وہ سوال کرتی ہے تو خود جواب بن کر پیش ہونے کو جی چاہتا ہے...... جب وہ بولتی ہے تو خاموشی...... ہا......اور ایسے ہی تو یہ قول زبان زد عام نہیں تھا کہ غزل مراد کی ذہانت ......اساتذہ کو بھی بوکھلانے پر مجبور کرتی ہے......سر تیمور اس کے تقریر نما جواب پر لاجواب ہوئے اور پھر مسکرا دیے۔

''میرا پہلا سوال اب بھی محفوظ ہے غزل ......؟ کیا گھول کر پیتی ہو؟''

''زیتون کا تیل سر!'' اس نے شگفتگی سے مگر ترنت جواب دیا تھا۔ اس بات پر سر ہنس دیے جبکہ مانی مسکرائے بنا نہیں رہ سکا تھا۔ اس نے اپنی چیزیں سمیٹیں اور مڑ کر دروازے کی جانب بڑھنے ہی لگی تھی کہ رک گئی۔ مانی کے پیر جو حائل ہو گئے تھے وہ ٹانگیں پھیلائے ،صوفے پر نیم دراز تھا۔

''سوری!'' مانی نے تیزی سے پاؤں پیچھے کیے تھے غزل سر جھکا کر گزر گئی تھی۔

''کیا چیز ہے یہ سر! قسم سے مجھے اب محسوس ہونے لگا ہے کہ انگلش کو ماروں لات ساتھ میں دو چار گھونسے بھی......اور اسلامیات میں آنرز پھڑکا دوں......'' مانی نے بہ مشکل اس کے دروازے سے باہر ہونے کا انتظار کیا تھا اور مانی نہیں جانتا تھا کہ غزل کے ذہن کے ساتھ، ساتھ اس کی حسِ سماعت بھی بہت تیزی سے کام کرتی تھی......اس نے سن لیا تھا اور سنتے ہی اِک خفیف سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر دوڑ گئی تھی۔

☆☆☆

عبدالحمید کا نام شہر بھر کے لیے نیا نہیں تھا...... پورا شہر ان کو اسی طرح سے جانتا تھا کہ جس طرح سے وہ شہر کے چوکوں سے واقف تھے۔ اپنی ملازمت کے دنوں میں بھی وہ سرکاری افسر سے زیادہ ایک چیرٹی ورکر کے طور پر جانے جاتے تھے۔ ان کی ایمانداری ان کا حوالہ تھی گو کہ بیوروکریسی میں یہ ناممکن سی بات تھی مگر یہ وہ ...ہی ''ممکن'' تھا کہ جس کے لیے لفظ ''ناممکن'' ایجاد ہوا تھا......ان کی باقاعدہ کوئی تنظیم تو نہیں تھی لیکن کسی بھی سوشل ویلفیئر کے لیے وہ اپنے وسائل اور تعلقات کام میں لاتے تھے۔ کہیں پہ نل لگوانا ہو...صاف پانی کا فلٹر یا شہر کے کسی کھلے مین ہول کا ڈھکن......وہ ہمیشہ اپنی مدد آپ کا کلیہ لگاتے اور پھر خدائی مدد کا انتظار کرتے تھے اور کبھی مایوس نہیں رہے تھے۔ اب بھی ایک خیال کیڑا بن کر ان کے دماغ میں گھس چکا تھا۔ انہیں اپنے شہر میں بھی دیوارِ مہربانی بنوانی تھی۔ یہ مثبت تحریک تھی اور انہیں بے حد پسند آئی تھی۔ چلو پاکستانی یوتھ نے بھی اپنی پوٹینشل کو کسی مثبت کام میں لگایا......وہ آج کل اسی اِک کام کے پیچھے لگے ہوئے تھے......مختلف جامعات کی ویلفیئر سوسائٹیز سے رابطہ کر چکے تھے۔ کئی نوجوانوں کا انٹرویو لے چکے تھے لیکن ابھی تک ان کے معیار پر کوئی پورا نہیں اتر سکا تھا......انہوں نے ایک جامعہ کی امید نامی ویلفیئر سوسائٹی سے بھی رابطہ کیا تھا اور آج امید کی نمائندہ ٹیم ان سے ملنے آنے والی تھی۔ وہ پانچ لڑکوں اور تین لڑکیوں کا گروپ تھا۔ اور چیریٹی کے کاموں کے لیے کافی فعال تھا۔ عبدالحمید ان سے مل کر بے حد خوش ہوئے تھے......یوں سمجھ لیجیے کہ... عبدالحمید اور وہ آٹھواں پزل کے وہ دو ٹکڑے تھے جنہیں باہم مل کر تصویر مکمل کرنی تھی......لیکن نہیں......ایک چھوٹا سا حصہ ابھی مس تھا......چھوٹا ضرور تھا مگر بنا اس کے تصویر مکمل نہ ہو سکتی تھی۔

''میں آپ کو اپنی پوتی سے ملواتا ہوں......آپ ہی کی جامعہ کی طالب علم ہے۔'' اتنا کہہ کر انہوں نے آواز دی تھی۔

''غزل......!'' اور چند لمحے بعد ان آٹھوں کے آٹھوں کی آنکھوں نے سیاہ لباس میں ملبوس اِک وجود کو اندر داخل ہوتے دیکھا تھا۔

''السلا......'' اور غزل کا سلام ادھورا ہی رہ گیا تھا۔ اس نے حیرت کے بھرپور تاثر کے ساتھ سنگل صوفے پر بیٹھے اس شخص کو دیکھا تھا۔

''السلام علیکم!'' ترنت اس نے خود کو کمپوز کیا تھا اور حلق میں اٹک کر رہ جانے والے سلام کو برآمد کیا تھا۔

وہ مانی تھا اور وہ بھی کم وبیش اسی کیفیت کا شکار دکھائی دیتا تھا۔ تصویر مکمل ہو چکی اب......عبدالحمید نے اس کا تعارف کروایا تھا۔ ان آٹھ میں سے چار اسے جانتے تھے اور ان چار میں مانی سر فہرست تھا۔

''مس غزل کو کسی تعارف کی ضرورت نہیں ہے سر!'' یہ مانی تھا۔

''میری بیٹی فخر ہے میرا۔'' عبدالحمید صاحب نے لاڈ سے اسے ساتھ لگایا تھا اور غزل کا جھکا سر مزید جھک گیا تھا۔ دادا سے یوں پیار کرتے تھے جیسے وہ بائیس سال کی نہیں دو سال کی ہے۔ چلو گھر میں تو سب چلتا ہی ہے مگر یوں...... سب کے سامنے......وہ ٹھیک ٹھاک بلش ہوئی تھی۔

''دادا......'' اس نے احتجاجاً دادا کو گھور کر دیکھا تھا یوں جیسے کہتی ہو......لوگوں کے سامنے تو خیال کرلیا کریں مگر وہاں پروا کسے تھی۔ دادا ان سے ڈسکس کرنے میں مصروف ہو چکے تھے......کون سی جگہ پر دیوار چنی جائے...... پینٹ کون کرے گا، ہینگرز اور کھونٹیوں کا بندوبست، مینجمنٹ، کپڑے کہاں سے لیے جائیں گے......کون، کیسے اور کیا......اکٹھا کرے گا......وہ چاہتے تھے کہ یہ سب آج کی میٹنگ میں ہی فائنل ہوجائے......وہ جلد از جلد یہ دیوار بنانا چاہتے تھے......غزل اور راحیلہ کے ذمے عورتوں کے کپڑے اکٹھے کرنے کی ذمے داری لگی تھی۔ وہ آٹھ سے نو ہو چکے تھے اور مانی کو اسی گفتگو کے دوران معلوم ہوا تھا کہ غزل، دادا کے ساتھ چیئریٹی کے کاموں میں معاونت کرتی رہی ہے......یوں سمجھ لیجیے کہ وہ ان کی سیکریٹری تھی۔

☆☆☆

وہ لائبریری میں کتاب ہاتھ میں لیے فقہ کے کسی مسئلے میں الجھی بیٹھی تھی کہ دفعتاً سامنے میز پر پڑا سیل تھرتھرا اٹھا تھا۔ اس نے کوفت سے اس تھرتھراہٹ ....کو دیکھا۔ سیل اٹھا کر انگوٹھے سے swipe کیا تو وہ راحیلہ کا میسج تھا۔ "come in office" اس نے بیچارگی سے سامنے کھلی کتابوں کو دیکھا اور پھر میسج کی شکل میں موجود ان الفاظ کو......

''آتی ہوں......'' کا میسج بھیج کر اس نے چیزیں سمیٹیں......کتابیں دوبارہ واپس رکھیں اور پیروں نے ... سوسائٹی کے آفس کا رخ کیا تھا۔

''جی راحیلہ......'' وہ اندر نہیں گئی......دروازے پر کھڑے، کھڑے ہی اس نے پوچھ لیا تھا۔

''آپ اندر تو آئیں۔'' وہ راحیلہ نہیں مانی تھا۔

''اٹس اوکے...... مجھے کچھ کام ہے...... آپ بتائیں؟''

''یہ کپڑے ہیں' ان پھوہڑ لڑکوں نے ہمارے ذمے انہیں ارینج کرنا لگا دیا ہے۔'' راحیلہ شرارت سے بولی تھی۔

''مجھے......دے دیں، میں کرلاؤں گی۔'' وہ اب کے اندر آتے ہوئے بولی تھی۔

''ارے نہیں، سارے تھوڑی آپ کریں گی......مل کر کریں گے۔ ہم لوگوں کا پروگرام ہے کہ راحیلہ کے گھر پر اکٹھے ہو کر یہ سارے کام نمٹا لیں...... سب آرہے ہیں تو آپ بھی وہیں آجایئے گا......'' وہ سلمیٰ تھی۔

''میرا آنا تو مشکل ہے سلمیٰ! آپ مجھے کپڑے دے دیجیے، میں ریڈی کر کے پہنچادوں گی۔'' اس نے شائستگی سے معذرت کی تھی۔ اور اس معذرت پر سب نے ایک دوسرے کو دیکھا اور اس طرح سے دیکھا کہ جیسے کہتے ہوں......''ہمیں پتا تھا کہ غزل مراد نہیں آنے والی۔''

''یہ غلط بات ہے......تمہیں سب کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیے......یہ بھی تو لڑکیاں ہیں......ہمارے ساتھ مل کر ہی کام کرتی ہیں اور ہم کھا نہیں جاتے ان کو......جو یوں تم اوائڈ کر رہی ہو۔'' سدا کا منہ پھٹ اور ماڈرن ازم کے شدید بخار میں مبتلا وہ قمر تھا......اسے سخت ناگوار گزرا تھا۔ یہ کیا بات ہوئی بھلا......کام کرنا ہے تو مل کر برقع چھوڑ آئے گھر ورنہ نہ آئے۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، آپ واقعی میں مجھے کھا تھوڑا ہی جائیں گے۔ لیکن ایک بات تو بتائیں آپ کی دلچسپی کام کے ہونے میں ہے یا اکٹھے ہونے میں ہے؟''

لو بیٹا اب تم بھی چکھو ذرا......بے عزتی کا مزہ......لہجہ سرد ہونے کے باوجود گلے کو تپا کر رکھ دینے کی صلاحیت سے مالا مال تھا......ماحول گرم سا ہونے لگا تھا اور وہ ساتوں پریشان۔

''میں نے کہا تھا ناں اسے رہنے ہی دو......یہ discriminate کرے گی......لیکن نہیں......یہ عبدالحمید کی پوتی ہے سو اسے لازمی شامل کرنا ہے۔'' قمر بھڑک اٹھا تھا......غزل کا دل چاہا وہ اسے منہ لگائے بنا آگے بڑھے......کپڑوں کا تھیلا اٹھائے اور نکل جائے لیکن نہیں......یہ اس کا اسٹائل نہ تھا۔

''ہاں......میں عبدالحمید کی پوتی ہوں اور ہاں مجھے کوئی شامل نہ کر کے دکھائے ذرا......میں کروں گی تفریق اور اس سے بھی کوئی مجھے روک کر دکھائے......'' قمر کی

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس نے اپنے ازلی پُرسکون مگر ٹھنڈے لہجے میں اپنی بات کہہ دی تھی۔ پھر آگے بڑھ کر آنا فانا کپڑوں کے تھیلے اٹھائے اور یہ جا...... وہ جا......

''سمجھتی کیا ہے خود کو...... ہے کیا چیز؟'' قمر مشتعل ہو کر بول رہا تھا۔ اور وہ سن سکتی تھی مانی کی آواز......

''یار قمر کیا ہو گیا ہے...... کچھ تو تمیز کر......'' مگر قمر...... وہ زہر بھی تھوکتا تو بھی غصہ کم نہ ہوتا اور لڑکیاں...... وہ اس کی جرأت پر اش، اش کر اٹھی تھیں۔ تھپڑ مار کر گئی تھی وہ قمر کے منہ پر......

''میں دیکھتا ہوں وہ کیسے لے کر جاتی ہے کپڑے......'' قمر سرخ خون منہ لے کر بازو چڑھاتے ہوئے اس کے پیچھے جانے کے واسطے اٹھا تھا۔

''اوئے...... اوئے......'' اور وہ چاروں کے چاروں اس پر یہ پل پڑے تھے۔

''تم لوگ اس کا...... اس کا فیور کر رہے ہو......'' وہ غزل کے پیچھے جانا بھول کر صدمے سے انہیں دیکھنے لگا تھا۔

''قمر بیٹھ جا......'' مانی نے اسے کندھوں سے پکڑ کر بٹھانا چاہا اس نے غصے سے خود کو چھڑوا لیا۔

''کول ڈاؤن یار...... کول ڈاؤن...... ریلیکس......!'' مانی نے اب کہ اس کا گال تھپتھپایا۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا...... تم لوگ مجھے چھوڑ کر اس کا فیور......؟''

''اسٹاپ اٹ قمر......!'' مانی نے بری طرح سے ٹوکا تھا۔

''فیور اس کا صرف اس لیے کر رہے ہیں کہ یہاں تم غلط ہو، وہ نہیں...... وہ ہوتی تو تمہارا فیور کرتے...... کام چاہیے ناں ہمیں...... تو وہ جیسے مرضی کرے، ہمیں کیا...... نہیں آنا چاہتی ہمارے ساتھ تو تمہیں اعتراض کیا ہے؟'' یہ ان کے گروپ کا تھا قاسم تھا۔

''تم اسے ٹیز کرنا چاہتے تھے ناں قمر؟'' مانی کے یوں براہِ راست کہہ دینے پر قمر کا منہ مزید لال ہوا تھا۔

''جبکہ تم جانتے بھی تھے کہ وہ راحیلہ، سلمیٰ کی طرح نہیں ہے۔ ایک مہذب انسان ہونے کے ناتے تمہیں اس چیز کا احترام کرنا چاہیے......''

''بھاڑ میں جاؤ تم لوگ...... رکھو اسے ہی پھر۔'' طیش سے کہتے ہوئے...... وہ کرسی کو لات مارتے ہوئے بولا تھا۔

''تمہارا مطلب کیا ہے اس بات سے؟'' راحیلہ نے تنک کر قمر سے پوچھا۔

''مطلب صاف ہے اور پھر بھی تم پوچھتی ہو راحیلہ......!'' مانی نے طنز کیا تھا۔

''غزل کہیں نہیں جائے گی اور وہ جیسے چاہے گی کام کرے گی۔ تمہیں اعتراض ہے تو بتا دو......'' یہ گروپ کی تیسری لڑکی منال تھی۔

''تم لوگوں کو عبدالحمید کے فنڈز نظر آ رہے ہیں دوست نہیں۔''

اور قمر کے اس گھٹیا الزام پر وہ سب ساکت کے ساکت رہ گئے تھے۔

''گیٹ آؤٹ!'' وہ مانی تھا جس نے یک دم شاؤٹ کیا تھا۔

''ہاں......! آ رہے ہیں نظر ہمیں فنڈز......'' اور جب قمر تن فن کرتا ہوا باہر نکلا تو مانی پیچھے سے آواز دے رہا تھا۔

''I can't believe this'' منال صدمے نما حیرت سے بولی تھی۔

ماڈرن ازم کے سینے پر جب تک چیریٹی کا تمغہ نہیں سجتا تو انسان انسانیت کا علمبردار نہیں بنتا ناں...... اور حال یہ کہ ذہن کے دیسی پن سے نجات تک نہیں پا سکتے۔ چیریٹی ورک کسی تمغے، کسی ستائش کے لیے نہیں کیا جاتا...... اور جو کیا جاتا ہے وہ کم از کم چیریٹی ورک نہیں ہوتا...... اس کے علاوہ سب کچھ ہوتا ہے...... یہ احسان نہیں...... فرض ہے اور یہ سب کے بس کی بات کہاں......

☆☆☆

''غزل......!'' اس نے چونک کر سر اٹھایا تھا اور سر اٹھاتے ہی حیرت اس کی آنکھوں سے آن چمٹی تھی۔ وہ سب باجماعت حاضر تھے۔ اس نے سوالیہ نظروں سے منال کو دیکھا۔

''وہ...... ہم سوری بولنے آئے تھے۔'' راحیلہ ایک قدم آگے بڑھی تھی۔

''کس بات کے لیے؟'' غزل مزید حیران ہوئی اور وہ سب مزید شرمندہ......

''قمر کے مس بی ہیویر کی وجہ سے۔''

''تو وہ اس نے کیا تھا...... آپ سب نے تو نہیں ناں، اِٹس اوکے......''

''ہمیں لگا آپ ہرٹ ہوئی ہوں گی۔'' وہ راحیلہ تھی۔

''عادت ہے مجھے ایسے رویوں کی...... ہرٹ نہیں ہوتی میں۔'' جواباً وہ نرمی سے بولی تھی۔ ''اینی ہاؤ......آپ لوگوں کا شکریہ......''

''آپ جیسے چاہیں کام کرسکتی ہیں، قمر تو ویسے بھی اب جاچکا ہے۔''

''اس کے ہونے سے مجھے فرق بھی نہیں پڑنا تھا۔''

''وہ تو ہمیں معلوم ہی ہے۔'' سلمیٰ مسکرا کر کہتے ہوئے اس کے پاس بینچ پر ہی بیٹھ گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مناہل اور راحیلہ بھی بیٹھی تھیں۔ لڑکے سارے دوسری بینچ پر بیٹھے تھے سوائے مانی کے۔ وہ سیٹ پر پاؤں رکھ کر بینچ کے ٹیک لگانے والے حصے کے اوپر بیٹھا تھا۔ غزل ایک بار پھر حیران ہوئی تھی۔ وہ سب تو جم کر بیٹھنا شروع ہوگئے تھے۔

''ہم نے سوچا یہیں پہ میٹنگ کرلیتے ہیں۔ کام تو سب ہو چکا بس اب اوپن کرنا ہے......'' پھر وہ اوپننگ کے حوالے سے سب کچھ طے کرنے میں مشغول ہوگئے تھے۔ اسی چکر میں غزل کا ایک پیریڈ بھی گیا تھا...... نہ صرف غزل وہاں موجود دوسرے طالب علموں کا بھی...... مگر انہیں آج ہی سب کچھ مکمل کرنا تھا......اور وہ ایک، ایک کرکے وہاں سے اٹھنے لگے۔ آخر میں مناہل، غزل اور مانی رہ گئے تھے۔ مناہل کو اس کا عبایا بے حد پسند آیا تھا اور وہ شاپ کا نام پوچھ رہی تھی۔

''تمہیں لینا ہو تو بتانا...... میں لے چلوں گی۔'' غزل اٹھتے ہوئے بولی تھی۔

''ہاؤ سویٹ......!'' مناہل تشکر کے جذبات سے دُہری ہوئی تھی اور یہ تو اس کی عادت تھی کہ کوئی بات سویٹ ہو یا نہیں ہو اس نے ''ہاؤ سویٹ'' ضروری کہنا ہوتا تھا...... وہ ویسے بھی لڑکی کم اور بچی زیادہ دکھتی تھی۔ اس ادا پر غزل نے پیار سے اس کا گال تھپتھپایا تھا۔ اپنے جرنلز اٹھائے بیگ کندھے پر ڈالا اور جوں ہی واپس مڑنے لگی تھی۔

''ایکسکیوزمی غزل!'' کی آواز پر غزل تو غزل، مناہل نے بھی حیرت سے مانی کو دیکھا تھا۔ غزل کے یوں دیکھنے پر وہ جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے سر جھکائے تھوڑا آگے بڑھا تھا۔

''آئم سوری......!'' پھر اسی جھکے سر کے ساتھ کہا گیا تھا۔

اب یہ کون سا والا سوری تھا......غزل نا سمجھ نظر آئی اور پھر نا سمجھی سوال بن کر آنکھوں میں ابھری تھی اور اس سوال پر مانی نے مناہل کو دیکھا......اس کے سامنے ''اعتراف'' تو مشکل تھا۔ لیکن جی کڑا کر کے مانی نے کہہ ہی دیا تھا۔

''میں اپنی حرکت پر شرمندہ ہوں......'' وہ پوچھنا چاہتی تھی ''کون سی؟'' مگر یک دم اِک کلک ہوا اور اسے وہ دن یاد آگیا تھا۔ بے اختیار اس نے گہری سانس بھری تھی۔ وہ مانی کو بھی یہی کہنا چاہتی تھی کہ مجھے فرق نہیں پڑتا......لیکن نہیں کہہ سکی......اس کی شرمندگی نے اسے کہنے سے روک دیا تھا۔ کسی کا سوری قبول کرلینا بھی اخلاق ہی ہوتا ہے۔

''عبایا والی ہو......دوپٹے والی یا بنا دوپٹے والی...... وہ حرکت ہر کسی کے لیے برابر بری تھی بہرحال میں سمجھ سکتی ہوں۔'' اس نے آخری جملہ کہتے ہوئے لاشعوری طور پر مانی کو دیکھا تھا۔ مانی کو کرنٹ لگا......تو اس نے سن لیا تھا...... اس نے بھی لاشعوری طور پر غزل کو دیکھا اور......

''اِٹس او کے......'' وہ کہہ کر رکی نہیں تھی۔ تیز، تیز قدم اٹھاتی وہاں سے چلی گئی۔

''اوئے مانی کے بچے......'' مناہل اسے تاڑتے ہوئے اٹھی اور اپنا فولڈر اس کے کندھے پر دے مارا تھا۔

''کیا، کیا تھا تم نے غزل کے ساتھ...... بولو...... بتاؤ......'' مناہل اور جان چھوڑ دے......یہ بھلا کب ہوا تھا......مانی کے چہرے پر بے ساختہ اُف والے تاثرات نمودار ہوئے تھے......اس وجہ سے وہ اس کے سامنے کہنا نہیں چاہتا تھا مگر اب کیا ہوسکتا تھا......وہ مناہل نہیں نقارہ تھی نقارہ......

☆☆☆

میں سوچتی ہوں کہ کیا محبت......عجب کام ہے، عجب احساس ہے......اور جب یہ کام، یہ احساس ہوتا ہے تو کیا اس کا ہونا بھی عجب ہے گر عجب نہیں تو اتنے قصے، اتنی کہانیاں کیوں......؟ اگر کوئی پوچھے کہ محبت کیا ہے تو میں کہوں......معلوم نہیں کیا ہے؟ سائنس نہیں...... کلیہ نہیں، کوئی کائنات کا مخفی اسرار بھی نہیں مگر پھر بھی...... پھر بھی سمجھ میں نہیں آتی...... ہے تو بس ہے......نہیں ہے تو نہیں، مجبور

نہیں کیا جاسکتا کہ محبت آ! اور دل میں سما جا...... اپنا آپ کھول دے، من کو بھگو دے، سرشار کردے...... اور جب ہوجائے تو دل سے نکالنا مشکل...... ہاتھ جوڑو، ناک کی لکیریں نکال لو...... منتیں کرلو یا فریاد...... ہے تو بس ہے...... یہ نہیں جاتی پھر کہیں جم کر بیٹھ جاتی ہے...... آسیب کی طرح حاوی رہتی ہے...... کسی چیز سے، کسی بات سے نہیں ٹلتی...... اور جب یہ نہیں ٹلتی تو میں سوچتی ہوں کہ کیا محبت عجب کام ہے؟ عجب احساس ہے......؟ نہیں...... یہ عجب نہیں ہے...... یہ انسان کے خمیر کا حصہ ہے...... جذبات کی ملکہ ہے، فطرت ہے، کب، کہاں کیسے...... کس طرح سے جاگ اٹھے، کس کے اختیار میں ہے کہ یہ بے اختیاری شے ہے۔ تو یہ طے ہوا، یہ عجیب نہیں ہے، انسانی فطرت کا حصہ ہے ایک دل کش احساس ہے...... وہ چیز ہے کہ جس کا سبب تلاش نہیں کیا جاسکتا...... سرا ڈھونڈا نہیں جاسکتا...... یہ ایسی ہی شے ہے کہ جیسے کسی چیز کو قفل لگا کر چابی سمندر میں پھینک دی جائے...... تو یہ طے ہوا محبت کا ہوجانا عجب نہیں لیکن یہ محبت، عجب ہوتی ہے مگر کب......؟ تو محبت تب عجب ہوتی ہے جب یہ......

☆☆☆

آج دیوار کی اوپننگ تھی۔ سب چاہتے تھے کہ... عبدالحمید صاحب فیتہ کاٹیں مگر انہوں نے انکار کردیا...... یہ فیتہ کاٹنے والی چیز تو نہیں تھی...... یہ لوگوں کے لیے ہی تھی۔ آئندہ لوگوں نے ہی اسے چلانا تھا، وہ تو موبلائزر (چلانے والے) تھے اور بس...... تو پھر وہ دیوار اوپن کردی گئی...... نہ فیتہ کاٹا گیا نہ ہی کچھ اور...... بس اس طرح سے کہ جب ایک صبح شہر کے باسی اٹھے اور جیسے جیسے وہ اس دیوار کے پاس سے گزر کر جانے لگے تو دیوار نے انہیں گزرنے نہیں دیا، پکڑ لیا...... اور کہا کہ وہ اِک نظر...... ذرا سی توجہ کی مستحق تو ہے ہی...... وہ دیوار خود اپنی تشہیر تھی...... نیکی، اچھائی، بھلائی ایک خوشبو ہے۔ بھلا خوشبو کو پھیلنے سے کوئی روک سکا ہے آج تک......؟ خوشبو کو قید کیا جاسکتا ہے؟ بھلا ایسا کب ہوا ہے۔ تو وہ دیوار...... دیوار نہ تھی۔ خوشبو تھی خوشبو جو ہر گزرنے والے کو پکڑ لیتی تھی۔ کچھ نے کپڑے لیے، کچھ نے جوتے اور دعا دی ان کو...... کہ جن کے دم سے وہ اینٹ اور سیمنٹ کی تعمیر خوشبو کہلائی تھی...... غزل بذاتِ خود وہاں اسے دیکھنے آئی تھی...... وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ جب کوئی پھٹے پرانے کپڑوں والا وہاں سے مکمل لباس اٹھائے گا...... جب کوئی ننگے پیر والا کوئی جوتا، چپل اٹھائے گا تو اس کے چہرے، اس کی آنکھوں میں کیا احساس ہوگا...... اور وہ نہیں جانتی تھی کہ اس احساس کو جب وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے گی تو کیا محسوس کرے گی...... اس نے اپنے دل میں اتنی ٹھنڈک، اتنی راحت محسوس کی تھی کہ ہر تپش، ہر آگ ٹھنڈی ہوگئی تھی...... چاہے اِک پل کو ہی سہی...... اس نے راحت کے اصل مفہوم کو جانا تھا اور وہیں کھڑے، کھڑے اس نے یہ بھی طے کرلیا تھا کہ اسے زندگی کا دوسرا کام گر کوئی کرنا تھا تو وہ لوگوں کی فلاح کا کام تھا...... کیونکہ پہلا کام تو phd کی ڈگری حاصل کرنے کا تھا۔

☆☆☆

''اوئے قاسم! تو جٹ ہے ناں......؟''

''ہاں......'' قاسم نے سینہ پھلا کر کہا تھا...... وہ الگ بات کہ سینہ پھلانے پر بھی 16 کا 16 انچ ہی رہا تھا۔

''تو پھر شرٹ کا اوپری بٹن بند کیوں رکھتا ہے؟ میری طرح کھول کر پھرا کرناں......'' وہ انصر تھا...... عاصم نے کچھ نہ کہا تھا، وہ چہرے پر اِک تمسخرانہ مسکراہٹ لیے کسی پھنے خان کی طرح انصر کے سامنے کھڑا ہوا۔ دونوں ٹانگیں ذرا را سا پھیلا کر پھر اِک تمسخر اڑاتی نظروں سے انصر کو دیکھا اور ہاتھ .... گریبان کے پہلے بٹن تک گیا تھا۔ اس نے پہلا بٹن کھولا...... پھر دوسرا...... پھر تیسرا...... اور انصر کا منہ بھی ہر کھلنے والے بٹن کے ساتھ، ساتھ مزید سے مزید کھلتا گیا...... بالآخر وہ سارے...... کے سارے بٹن کھولے اپنا سولہ (16) انچ کا سینہ اس کے سامنے پھلا کر کھڑا تھا۔ ''تو جٹ نہ ہو کر ایک بٹن کھول کر پھرتا ہے تو پھر میرا اتنا تو بنتا ہی ہے۔'' اِک لمحے کی خاموشی اور دوسرے ہی لمحے وہاں سب کا مشترکہ قہقہہ گونجا تھا۔ وہ الگ بات کہ لڑکیوں کی ہی، ہی لڑکوں کی ہاہا میں کہیں دب گئی تھی۔ وہاں اِک عجب بے ترتیبی کا سا منظر تھا...... مناہل اپنے ٹیب کے ساتھ مصروف تھی۔ راحیلہ اور سلمٰی کسی مووی پر تبصرہ کررہی تھیں۔ مانی کرسی پر نیم دراز تھا جبکہ ٹانگیں میز پر استراحت فرمارہی تھیں۔ انگوٹھے الگ سیل

کے ساتھ مصروف تھے۔ علی ٹیبل کے اوپر چوکڑی مارے بیٹھا تھا اور انصر اور قاسم اس وقت آمنے سامنے کھڑے قدرے بہتر حالت میں تھے۔

''اوئے غزل!'' ان میں سے یک دم کوئی بولا تھا۔ اور وہاں جیسے یک دم اِک ہڑبونگ نے حملہ کر دیا تھا۔ مانی نے ٹانگیں جلدی سے نیچے کرنا چاہیں مگر اس کی جلدی اتنی جلدی وقوع پزیر... نہ ہو سکی تھی... نتیجتاً اس کے گھٹنے میز کے کنارے سے ٹکرائے تھے۔ علی چھلانگ مار کر ٹیبل سے اترا اور قاسم...... یوں لگتا تھا ہڑبونگ کا سب سے شدید حملہ اس پر ہوا تھا۔ وہ کبھی سامنے سے آتی غزل کو دیکھتا اور کبھی اپنے ہاتھوں کو...... جو کہ حتی الامکان تیزی سے شرٹ کے کھلے بٹنوں کو بند کرنے میں مصروف تھے۔ انصر نے بھی جلدی سے شرٹ کے واحد کھلے بٹن کو بند کیا تھا۔ وہاں جیسے یک دم اِک ایمرجنسی نافذ ہوئی تھی اور غزل کے اندر آنے تک وہ سب تمیز دار بچے بن چکے تھے۔ قاسم اِک گہری سانس لے کر پلٹا اور مانی کی کرسی کے آگے کھڑا ہوا...... تو وہ بھی کامیاب ٹھہرا تھا۔

''السلام علیکم......!'' غزل نے سب کو سلام کیا تھا۔

''وعلیکم السلام......!'' مشترکہ جواب آیا تھا۔

''مجھے ایک کام تھا آپ لوگوں سے......'' حسبِ عادت دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے کہا تھا۔

''جی کہیے......'' وہ راحیلہ تھی۔

''میں اندر آسکتی ہوں؟''

''ہیں......؟'' حیرت ایک جست میں ان کے چہروں پر نمودار ہوئی تھی۔

''وائے ناٹ...... شیور......'' منائل کہتے ہوئے اٹھی اور جیسے ہی وہ قاسم کے پاس سے گزرنے لگی تو... بےاختیار اس نے منہ ہاتھ رکھ کر اپنی ہنسی کو روکا تھا...... علی نے اسے آنکھیں نکالیں...... جواباً اس نے آنکھوں سے ہی قاسم کی طرف اشارہ کیا تھا...... اشارہ کرنے کی دیر تھی کہ علی بے اختیار جھک کر کھانسا تھا اور اسی نیم رکوع کی سی حالت میں اس نے اپنے ہونٹوں کو حتی الامکان پھیلنے سے روکا تھا...... علی کی یک دم کھانسی نے راحیلہ کو مجبور کیا کہ وہ اسے پانی کا گلاس پکڑائے...... آخر کو وہ اسے پسند جو کرتی تھی اور پانی کا گلاس پکڑتے ہوئے علی نے راحیلہ کو بھی اشارے سے متوجہ کیا تھا...... راحیلہ کے پیٹ میں بل پڑا اور وہ ہنسی کو دبانے کی کوشش میں محض کراہ کر رہ گئی تھی۔

''کیا ہوا......؟'' سلمٰی نے اس کے بیٹھتے ہی پوچھا تھا۔

''قاسم کو دیکھو......!'' اور راحیلہ کا حلق بات کی اجازت نہ دیتا تھا وہ اِک فلک شگاف قہقہہ لگا کر اپنا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا مگر آہ...... یہ نہیں ہوسکتا تھا، فی الحال تو نہیں...... اور غزل کہہ رہی تھی۔

''میں کچھ بچوں کو پڑھاتی ہوں...... وہ سب بچے ایسے ہیں کہ اسکول جانا افورڈ نہیں کر سکتے یا پھر کسی بھی طریقے سے اپنا تعلیمی سلسلہ جاری نہیں رکھ سکتے...... میں پچھلے ایک سال سے ان بچوں کو پڑھا رہی ہوں اور......'' اور مانی کو یک دم کسی غیر معمولی صورتِ حال کی بُو آئی تھی...... وہ سب سر جھکائے غزل کو سن رہے تھے۔ چلو سننے کی حد تک تو ٹھیک تھا...... لیکن اتنے ادب کا مظاہرہ......؟ اس نے سامنے بیٹھے علی کو دیکھا...... وہ دونوں بازو... پیٹ پہ کس کر باندھے تقریباً نیم رکوع کی حالت میں تھا...... منائل ہونٹ کا کونہ دانتوں میں دبائے ہوئے تھی...... راحیلہ ناخن چبا رہی تھی اور سلمٰی...... وہ مانی کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ مانی نے اشارے سے پوچھا کہ کیا ہے۔

اشارے کا جواب پھر سے آیا...... ''قاسم......!'' اور جب مانی نے جواب یعنی قاسم کو دیکھا تو...... تو وہ بیچارہ بھی محض کھانس کر رہ گیا تھا۔ اب قاسم واحد تھا جو بڑے اطمینان سے غزل کو سن رہا تھا جو کہہ رہی تھی۔

''میں اپنی تعلیمی مصروفیات کی وجہ سے اس سلسلے کو جاری نہیں رکھ پا رہی...... تعطل کا شکار رہنے لگا ہے یہ کام...... میں چاہ رہی تھی کہ اگر آپ لوگوں میں سے کوئی میری اس کام میں مدد کرنا چاہے تو میرے لیے ان بچوں کو بنیادی تعلیم سے روشناس کروانا آسان ہو جائے گا۔''

''کل کتنے بچے ہیں؟'' صرف قاسم ہی پوچھنے کی حالت میں تھا۔

''زیادہ نہیں ہیں...... فی الحال تو دس ہی ہیں۔''

''آپ ہم سے کیا چاہ رہی ہیں؟'' اور اس سوال پر غزل نے بے اختیار سر اٹھا کر قاسم کو دیکھا اور...... اور ترنت اس نے سر دوبارہ جھکایا تھا...... اِک لمحے کا توقف......

”میں یہ چاہ رہی تھی کہ آپ لوگ ایک، ایک کر کے باری، باری ان بچوں کو وقت دے سکیں تو یہ کام بہت آسان ہو جائے گا۔“

”ٹھیک ہے میں تو ولنگ ہوں...... آپ باقیوں سے پوچھ لیں۔“ قاسم نے کہتے ہوئے جب دیگر احباب کو دیکھا تو...... تو اسے یہ کیوں محسوس ہوتا تھا کہ کچھ تھا جو کہ ٹھیک نہ تھا...... کچھ تھا جو کہ غلط تھا...... صحیح نہ تھا...... اور ٹھیک عین اسی پل اس پر یہ بھی انکشاف ہوا تھا کہ تب سے اب تک وہ ہی بول رہا تھا اور غزل کے سوالوں کا جواب دے رہا تھا۔

”کیوں مانی......؟“ اس نے رخ موڑ کر اپنے احساس کو دباتے ہوئے مانی سے پوچھا۔

”جی، کیوں......“ اور مانی قابو نہ رکھ سکا تھا۔ بے اختیار وہ قہقہے کا گلا گھونٹ کر ہنسا تھا اور مانی کا ہنسنا، ہنسنا نہ تھا...... سگنل تھا کہ لو بھئی...... اب اجازت ہے سب شروع ہو جاؤ...... تو وہ سب سگنل کو گرین پاتے ہی شروع ہو گئے تھے۔ وہاں پر ایسا ہنسی کا دورہ پڑا تھا کہ جو قابو سے باہر نظر آئی تھی۔

”آئی ایم سوری غزل......!“ اس کے ساتھ بیٹھی سلمٰی نے بہ مشکل کہا اور پھر سے لوٹ پوٹ......

اور غزل...... وہ بھی یوں ہنسنے کی وجہ سے واقف تھی مگر یہ کہ وہ ان سب سے زیادہ ضبط کرنا جانتی تھی۔

”اٹس او کے......! آپ لوگ فیصلہ کر کے بتا دیجیے گا......“ وہ اٹھی اور راحیلہ سے کہتے ہوئے باہر نکل آئی تھی اور غزل کے جاتے ہی اِک اور فلک شگاف قہقہہ گونجا تھا یوں جیسے سب کو کھل کر ہنسنے کا موقع اب ملا تھا اور قاسم...... وہ ہکا بکا ان سب کے چہروں کو باری، باری تکتا تھا۔ حیرت اتنی شدید تھی کہ وہ پوچھ بھی نہ پایا کہ کیا ہوا...... وہ بس ہونق بنا ایک، ایک کا چہرہ دیکھتا تھا۔

”مجھے ہنسی کیوں نہیں آرہی؟“ اس نے اسی حیرت کے ساتھ سوال کیا۔

”اس لیے......“ مناہل نے اپنا میک اپ مرر عین اس کی شرٹ کے سامنے رکھا تھا اور......

اِک لمحے کو اس کا منہ کھلا اور دوسرے ہی لمحے وہ قہقہہ لگا کر ہنسا اور تیسرے ہی لمحے...... اس کے قہقہے کا گلا گھٹ کر رہ گیا تھا۔

”غزل بھی یہاں تھی...... او مائے گاڈ اس نے بھی دیکھا ہوگا......“ وہ بڑبڑایا تھا۔

”ہاں...... اس نے بھی دیکھ لیا تھا بچے......“ سلمٰی نے پچکار کر کہا تھا۔ اور قاسم عمر بھر شرمندگی میں غرق ہو کر رہ گیا تھا۔ غزل کی آمد کی وجہ سے جو ہڑبونگ مچی تھی اور جس کا شدید حملہ قاسم پر ہوا تھا اور اس شدید حملے میں اس کے ہاتھ سب سے زیادہ متاثر ہوئے تھے جو کہ شرٹ کے بٹنوں کو صحیح طرح سے بند کرنے سے قاصر رہے تھے اور اب وہ یوں بند تھے کہ شرٹ خواہ مخواہ میں ہر کسی کا منہ چڑاتی ہوئی دکھتی تھی...... سو اب سر پکڑ کر وہاں بیٹھا قاسم تھا اور ان ساتوں کی پھبتیاں تھیں اور قہقہے تھے۔

☆☆☆

”غزل!“

”جی اماں......!“ ان کے پکارنے پر وہ یک دم سیدھی ہو کر بیٹھی تھی۔

”کیا بات ہے، کچھ سست سی لگتی ہو۔“ وہ اس کے پاس آکر بیٹھی تھیں۔

”نہیں بس تھک گئی ہوں۔“ اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

”تھکتی تو تم روز ہی ہو...... مگر یوں اداس نہیں ہوتیں۔“ انہوں نے نرمی سے کہتے ہوئے اس کے بالوں کی لٹ کو کان کے پیچھے اڑسا تھا۔

”تو سمجھیں آج تھکاوٹ نے مجھے اداس کر دیا......“ وہ ہلکی سی شگفتگی سے بولی تھی۔

”نہیں، تھکاوٹ بس تھکاتی ہے غزل...... اداس نہیں کرتی۔“ اماں کا لہجہ نرم مگر جتاتا ہوا تھا۔

”یونیورسٹی کے لوگ عجیب سے ہیں اماں...... ان کے رویے تکلیف دہ ہیں، میرے نہ ہونے پر وہ کن سوئیاں لیتے ہیں اور ہونے پر انگلیاں اٹھاتے ہیں...... میں دہشت گرد، انتہا پسند لگتی ہوں انہیں......“ اس کا لہجہ آنچ دیتا تھا۔

”تم تو ایسی باتوں سے ہرٹ نہیں ہوتی تھیں بچے؟“

”انسان ہوں اماں...... تھک سکتی ہوں اور تھک کر اداس بھی ہو سکتی ہوں......“ اس نے جیسے جتایا تھا۔ اماں یوں مسکرائیں جیسے اعتراف کرتی ہوں ہاں بھئی جان لیا کہ

تھکاوٹ، اداس بھی کرتی ہے۔

"تم نے خود کو خود ہی اتنا الگ رکھا ہے۔ لوگوں میں گھلو ملو گی تو وہ تمہارے بارے میں جاننے یا جانچنے کی تگ و دو چھوڑ دیں گے۔ تم نے سنا نہیں کیا...... the less you reveal the more people can wonder"

"میری نیچر ایسی نہیں...... آپ جانتی ہیں کہ میں بہت ان سوشل ہوں۔ دوسرے میری جس طرح کی اسٹڈی کی عادت ہے اور جو میرا سوشل ورک ہے، وہ مجھے اجازت نہیں دیتا کہ میں دوستیاں پالوں...... میں ایک وقت میں ایک کام ہی کر سکتی ہوں اماں...... dynamic پرسنالٹی نہیں ہوں میں......" وہ صرف کورس کی کتابوں پر اکتفا نہیں کرتی تھی۔ وہ مختلف دینی ویب سائٹس اور یوٹیوب کے دینی چینلز سے مدد لیتی تھی۔ اس نے کئی چینلز پر sabscription لے رکھی تھی۔ اس نے بیچارگی ظاہر کی......

"اچھا چلو......! کبھی کبھی کا تھکنا بھی اچھا ہوتا ہے۔ انسان کو بریک مل جاتا ہے اسی بہانے کچھ آرام تو کروں گی ناں......" اماں کہتے ہوئے اٹھی تھیں...... وہ جواباً مسکرائی۔

پھر اس نے اماں کے کمرے سے باہر جانے کا انتظار کیا...... جیسے ہی وہ نظروں سے اوجھل ہوئیں...... ایک گہری سانس بھر کر اس نے سامنے کھلی کتابوں کو بے دلی سے دیکھا...... اور انہیں بند کر دیا تھا۔ اٹھ کر اس نے کمرے کا دروازہ بند کیا...... لائٹ آف کی اور گھپ اندھیرے میں بستر پر چت لیٹ گئی...... دونوں ہاتھ سینے پر اور نظریں اور اندھیرے میں ہی نہ جانے کسی چیز کو دیکھ رہی تھیں۔

"اداس......" اس نے زیرِ لب اس لفظ کو دُہرایا اور حلق میں یک دم کچھ چبھا تھا...... وہ اس اِک لفظ سے پچھلے کتنے دنوں سے بچ رہی تھی چھپ رہی تھی اور اماں نے اِک پل میں اسے عیاں کر دیا تھا تو وہ اداس تھی...... تو کیا میں اداس ہوں؟ ہاں......! میں اداس ہوں...... اور اس نے عیاں ہو جانا منظور کر لیا تھا۔ اس اداسی کا اعتراف جیسے کاٹ کر رکھ دینے جیسا تھا...... وہ بار، بار حلق کو تر کرنے لگی...... ہونٹوں پر زبان پھیر پھیر کر خود پہ قابو پانے کی کوشش کرنے لگی تھی لیکن...... کوشش رائگاں گئی...... اور آنکھ نے اپنا پہلا آنسو گال کی نذر کیا تھا۔

کوششیں یوں بھی رائگاں جاتی ہیں...... غزل مراد نے جان لیا تھا۔

☆☆☆

"اوئے مانی......! where the hell are you" اور گن کر پورے پانچ جھانپڑ مانی کے منہ پر پڑے تھے کیونکہ کہنے والی زارا تھی اور ذرا غصے میں دکھتی تھی۔

"ہائے، پھر سے کہو ناں زارا...... میں فدا تمہاری انگریزی پہ۔" مانی صدقے واری ہوتے ہوئے بولا تھا۔

"بکومت......!" وہ زارا ہی کیا جو ذرا سی بھی شرمندہ ہو جائے۔

"تھے کہاں تم...... اتنے دنوں سے نظر ہی نہیں آئے ہو...... کل تمہاری approxy لگواتے ہوئے یاور پکڑا گیا تھا بھلا بتاؤ عثمان شاہد کلاس میں نہ ہو اور پتا بھی نہ لگے' بری ہوئی اس کی اور اب وہ خونخوار ہو رہا ہے اور تمہیں ڈھونڈتا ہوا پایا گیا ہے۔ بچ کر رہنا مانی پاجی......" زارا نے ایک سانس میں اسے پچھلے دو ہفتوں کی رپورٹ سنائی تھی۔

"پر مانی پاجی...... تم تھے کہاں؟ نہ کوئی خیر نہ خبر......" اور آخر میں زارا کی سوئی پھر وہیں آ کر اٹکی تھی۔

"امید" کے کاموں کے سلسلے میں مصروف تھا۔" مانی نے اس کی پلیٹ میں سے سموسہ اڑاتے ہوئے کہا تھا اور حسب عادت کرسی پر نیم دراز ہو کر بیٹھا تھا۔

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ غزل کے ساتھ بزی تھا۔ امید کا نام تو بس بہانہ ہے۔" ٹینا کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولی تھی۔ مانی اِک جھٹکے سے سیدھا ہوا۔

"شٹ اپ ٹینا......!" وہ بے حد برے انداز میں بولا تھا۔

"اتنے پوزیسیو کیوں ہو رہے ہو...... اِک بات ہی کہی ہے۔"

"اور جو کہی ہے وہ بے حد غلط کہی ہے۔" مانی نے ترنت جواب دیا۔

"اوہ کم آن مانی......! کس کے حق میں بول رہے ہو...... وہ ایک دوغلی شخصیت ہے، ویسے تو خود کو یوں چھپا کر رکھتی ہے اور کام کرتی ہے مردوں کے ساتھ واؤ......" ٹینا پر

ذرا جو اثر ہوا ہو۔

مانی اس کے الفاظ پر حیران سے زیادہ بے یقین تھا۔

"وہ صحیح کہتی ہے...... انتہا پسند وہ نہیں، تم ہو...... اس نے تو کبھی کسی کے لباس، کسی کے کام، کسی کے ملنے جلنے پر بات کی نہ اعتراض کیا...... یہ تم ہی ہو۔"

"now see how you are portraiting her" وہ بولی۔

"مائے گاڈ...... چار دن نہیں ہوئے اس کے ساتھ کام کرتے ہوئے اور تمہیں میں، میں غلط نظر آنے لگی۔" غصے اور دکھ نے مل کر ٹینا کا منہ سرخ کر دیا تھا۔

"ٹینا تم غزل کا نام ہی کیوں لیتی ہو، میں نے تو راحیلہ، سلمیٰ اور مناہل کے ساتھ بھی کام کیا ہے۔"

"ان کے ساتھ تو تم پہلے بھی کام کرتے ہی تھے لیکن یوں غائب نہیں ہوا کرتے تھے۔" اور اس بات پر زارا نے تف کے سے انداز میں ٹینا کو دیکھا تھا۔ یہ ٹینا بھی ناں......

"تمہاری بات کا سیدھا سا مطلب یہ ہی نکلتا ہے کہ یا تو میں غزل کے ساتھ افیئر چلا رہا ہوں یا پھر غزل میرے ساتھ اور ساری یونی جانتی ہے کہ وہ لڑکیوں تک کو گھاس نہیں ڈالتی...... لڑکے تو دور کی بات...... پھر بھی اگر تم ایسی بات کہو تو تمہاری عقل کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے میرے پاس تالیوں کے سوا کچھ نہیں۔" وہ خاصا چڑ کر بولا تھا۔

"ہائے داوے ٹینا، تم کیوں اتنی پوزیسیو ہو رہی ہو وہ بھی مانی کے لیے؟" وہ زارا تھی جس نے سیدھا سوال اس کے منہ پر مارا تھا۔

"کوئی کسی کے لیے کیوں پوزیسیو ہوتا ہے زارا......؟" ٹینا نے الٹا سوال داغ دیا تھا۔

"ہا...... ہائے......" زارا ہاتھ کی انگلیاں منہ پر رکھ کر پکی لاہورن بن گئی تھی۔

"تو کیا......؟" وہ ایک نظر مانی کو دیکھتی اور دوسری نظر سے ٹینا کو...... مانی نے تیز نظروں سے ٹینا کو دیکھا۔

"دوستی ہے...... تو اسے دوستی تک ہی رکھو ٹینا...... خواہ مخواہ کے جذبات پالنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" سرد اور کھردرے لہجے میں کہہ کر وہ وہاں رکا نہیں تھا، چلا گیا تھا اور ٹینا...... اس کا منہ اتنا سرخ ہو گیا تھا لگتا تھا کہ ابھی پھٹ پڑے گی۔

"مائے فٹ......" تنتنا کر وہ اٹھی اور کرسی کو ایک ٹھوکر رسید کرتے ہوئے وہ بھی چلی گئی تھی۔ باقی رہ گئی زارا تو اس نے پھر سے ایک نظر ٹینا کو دیکھا۔ دوسری نظر سے مانی کو...... جواب ایک دوسرے کی طرف پشت کیے دو مخالف راستوں پر آگے بڑھتے جا رہے تھے پھر اس نے کندھے اچکائے اور اطمینان سے سموسے کھانے لگی۔

☆☆☆

"تو پھر تم لوگوں نے کیا سوچا ہے؟ جوائن کرو گے غزل کے منی اسکول کو؟" وہ مناہل تھی جس نے سوال اٹھایا تھا۔ اس وقت گو کہ کورم پورا نہیں تھا مگر جو حاضر تھے وہ ان کی رائے جاننا چاہتی تھی۔

"میں تو جوائن کروں گا۔" مانی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"مانی اس سوسائٹی کے بھی کام ہوتے ہیں پھر اسٹڈی بھی ہے، مشکل ہو جائے گا۔" سلمیٰ متامل تھی۔

"بھئی وہ بھی تو کرتی ہے، جیسے وہ مینج کرے گی، ہم بھی کر لیں گے۔ جتنا دماغ جتنی انرجی اس کے پاس اتنا دماغ اور اس سے کہیں زیادہ انرجی میرے پاس ہے...... جب وہ کر سکتی ہے تو وائے ناٹ می۔" مانی نے جواب دیا تھا۔

"ٹھیک ہے لیکن میں اِک دو دن جا کر دیکھوں گی اگر ٹھیک سے کر سکی تو صحیح ورنہ نہیں کروں گی۔" سلمیٰ مشروط طور پر راضی ہوئی تھی۔

"راحیلہ تم کیا سوچ رہی ہو؟" خاموش بیٹھی راحیلہ، علی کو کچھ بھائی نہیں تھی۔

"میں سوچ رہی تھی کہ غزل کیا ہے؟ کیا وہ جو ہم اسے سمجھتے تھے یا وہ جو اب ظاہر ہے۔"

"ہاں، واقعی وہ ویسی نہیں ہے جیسا اس کے بارے میں سنا گیا تھا۔" مانی نے بھی اعتراف کیا۔

"میں بتاؤں وہ کیا ہے؟" منامل کے کہنے پر وہ سب اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"غزل آئینہ ہے...... اس میں سے آپ کو اپنا عکس ہی نظر آئے گا...... reflection ہے۔ جیسا بن کر آپ اسے ملیں گے اچھا برا، نارمل جیسا بھی وہ ویسے ہی reflect کرے گی۔"

"ٹھیک کہتی ہو تم مناہل......غزل واقعی میں آئینہ ہے۔" اور تائید کرنے والا مانی تھا۔

☆☆☆

جب کبھی میں یہ سوچنے بیٹھوں کہ وہ مجھے کب اچھا لگا تھا یا پھر کب سے اچھا لگنا شروع ہوا تھا۔ کیا تب، جب اس نے مجھے دیکھا یا پھر تب کہ جب میں نے اسے دیکھا یا پھر شاید تب ہی جب ہم دونوں نے اِک دوسرے کو دیکھا......نہیں......شاید تب جب وہ مسکرایا تھا۔ یا پھر شاید تب جب اس نے پہلی بار مجھے مخاطب کیا تھا۔ اور یہ کب...... کا جو سراغ ہے ناں یہ مجھے ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا......ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شروع سے ہی یہ احساس میرے ساتھ ہے ہمیشہ سے اور شاید ہمیشہ سے بھی پہلے کا......اور یہ جو تعلق ہوتے ہیں ناں جو ہمیشہ سے بھی پہلے کے محسوس ہوتے ہیں......یہ تعلق کم اور روگ زیادہ ہوتے ہیں۔ میں......میں ہی کیوں......؟ میرے ساتھ ہی کیوں؟ کیوں آخر......کیا محبت کو اس بھرے عالم میں، میں ہی ملی تھی......؟ یہ سانحہ میرے لیے ہی کیوں؟ میرے لیے زندگی بڑی آسان سی شے تھی۔ مانو سیدھی سڑک جیسی......سُبک رفتار سے چلتی ہوئی، بنا کسی روک، رکاوٹ کے......مجھے لگتا تھا......جیسے میں زندگی کو گزارنا چاہتی ہوں، سو میں ایسے ہی گزاروں گی جو میں چاہوں گی، وہ ہی ہوگا تو مجھ کو بھی عام لڑکیوں کی طرح اِک دن گھر بسانا تھا، فیملی ہونی تھی اور اِک پُرسکون زندگی، بس......لیکن، لیکن ہوا کیا؟ انہونی عجب طرح سے مجھ پر ڈھے پڑی......اور اس انہونی نے مجھے بتلایا......نہ بی بی نہ......زندگی اس شے کا نام نہیں جسے تم سیدھی سڑک سمجھ کر گزارتی آئی ہو......زندگی تو یہ ہے جو کہ اب تم پر ٹوٹی ہے اب اسے بسر کر کے دکھاؤ ذرا......ہاں، محبت کا ہو جانا عجب امر نہیں ہے......مگر محبت کا مجھے ہو جانا عجب امر ہے، میں نے تو یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں بھی کسی کو چاہ نہیں سکتی ہوں......کوئی شخص ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ جب نظر اسے دیکھے تو پھر اسے ہی دیکھنا چاہے......میں نے کبھی ایسا نہیں سوچا تھا کہ میں......میں بھی کسی کو چاہ سکتی ہوں، یہ حادثہ مجھ پر بھی ٹوٹ سکتا ہے اور اس طرح سے بھی ٹوٹ سکتا ہے......تو تب محبت عجیب سے بھی زیادہ عجیب محسوس ہوتی ہے کہ جب یہ حادثہ بن کر میرے وجود پر ٹوٹتی ہے، میری حیرانی نہیں جاتی......بے یقینی کو یقین راس نہیں آتا......ہزار دفعہ سوال دُہرا، دُہرا کر بھی جواب سے دل ٹھہرتا نہیں، شکست مجھے منظور نہیں تھی اور ہار کبھی محبت نے نہیں مانی! تو پھر......پھر کیا؟ کسی کو تو گھٹنے ٹیکنے ہی تھے ناں......مجھ کو یا محبت کو......کسی ایک تو ضرور ہی......اور یہ بات لڑنے کے باوجود مجھے پہلے دن سے معلوم تھی کہ وہ کوئی ایک "میں" ہی ہوں۔

ہاں! وہ میں ہی ہوں لیکن یہ کہ میں اپنی طاقت آزمالینا چاہتی ہوں......سارا حوصلہ، سارا ضبط دیکھ لینا چاہتی ہوں......جاننا چاہتی ہوں کہ میری قوت مجھے کہاں تک پیروں پر کھڑا رکھتی ہے۔ اور یہ بھی کہ عزتِ نفس کہاں تک سالم رہتی ہے......کہاں تک میری گردن تن کر سیدھی کھڑی رہتی ہے اور کہاں اور کتنی دور تک میرے پیر سیدھی ہموار چال چلیں گے......کہاں تک......؟ آخر کہاں تک......؟ ہاں میں یہ سب کچھ دیکھ لینا چاہتی ہوں، آزمالینا چاہتی ہوں......محبت ہوگی کوئی بڑی بلا لیکن جان لو کہ "میں" تم سے بھی زیادہ بڑی بلا ہوں......ہوسکتا ہے گر جاؤں۔ ہوسکتا ہے کہ ہار مان لوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ تمہارا ہونا مجھے ڈھا دے لیکن اس کے باوجود......اس سب کے باوجود میں تم کو خود پر قابو نہ پانے دوں گی......چاہے تم مجھ میں حلول کر جاؤ......اور چاہے تم مجھے دیمک بن کر چاٹ جاؤ......سال خوردہ کر دو......مگر یہ طے ہے کہ میں تم سے بھی بڑی بلا ہوں......میرے اشرف المخلوقات ہونے کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔ تم بھی نہیں......تو چلو آزما کر دیکھتے ہیں......تو تمہارا جبر ٹھہرا اور میرا صبر......تو چلو آزما کر دیکھتے ہیں......کہ کب تک اور کہاں تک......

☆☆☆

ان آٹھ میں سے چھ غزل کا ساتھ دینے پر راضی ہوئے تھے......باقی انصر پارٹ ٹائم جاب کرتا تھا سو چاہ کر بھی وہ اس کام کا حصہ نہیں بن سکا تھا اور سلمٰی اتنا لوڈ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ باقی رہ گئی راحیلہ تو علی تھا ناں......جہاں علی ہو وہاں راحیلہ کیسے نہ ہو اور چاہے اس "کیسے" کو ممکن بنانے کے لیے اسے سر کے بل چل کر ہی کیوں نہ آنا پڑے......سو یہ طے ٹھہرا تھا کہ جہاں علی، وہاں راحیلہ......ان کی شفقتں

میں ڈیوٹی لگی تھی۔ اس طرح سے ایک ہفتے میں سب کی ایک بار ہی باری آئی تھی...... باقی غزل سنبھالے ہوئے تھی۔ اس نے یہ اسکول گھر کے صحن میں کھول رکھا تھا اور وہ لوگ یہ دیکھ کر حیران ہوئے تھے جس طرح وہ یونی میں حجاب میں ہوتی تھی بالکل اسی طرح سے حجاب میں لپٹی وہ گھر کے صحن میں بھی کھڑی تھی۔ مناہل کے پوچھنے پر اس نے کہا تھا کہ اکثر کسی نہ کسی مسئلے یا معاملے کے سلسلے میں بچوں کے باپ آتے جاتے رہتے تھے گو کہ دادا زیادہ انہیں ہینڈل کرتے تھے مگر پھر بھی... بحیثیت استاد اسے بھی ان کے سامنے جانا ہی پڑ جاتا تھا۔ سو اب یہ تو نہیں ہوسکتا تھا ناں کہ وہ یونی میں اور طرح کا پردہ کرے اور گھر میں کوئی نامحرم مرد آئے تو اس کے سامنے کسی اور طرح سے جائے......

مناہل نے عجب نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

تو اس کا اسکول، جو ذرا لڑکھڑا کر...... غیر متوازن طریقے سے ہچکولے کھا، کھا کر چل رہا تھا۔ اب ذرا متوازن اور سیدھی چال چلنا شروع ہو ہی گیا تھا۔ جتنے ان کے پاس وسائل تھے وہ بس اتنا ہی کرسکتے تھے کہ بچوں کو بنیادی تعلیم سے روشناس کروائیں۔ وہ بنیادی جمع تفریق کرنا سیکھ لیں...... ABC، ا، ب اور جنرل نالج کو تھوڑا بہت جان لیں...... اپنا نام لکھ سکیں اور اردو میں لکھا ہوا پڑھ سکیں...... وہ ان پر لگا ناخواندہ کا ٹیگ ہٹا کر انہیں خواندہ افراد کی فہرست میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ وہ انہیں ''سیکھنا'' سکھا دینا چاہتے تھے کہ مہذب دنیا میں خواندہ وہ نہیں تھا جو کہ لکھ، پڑھ سکتا ہے بلکہ خواندہ وہ تھا جو کہ یہ تین کام سرانجام دے سکتا تھا۔ learn, unlearn and relearn وہ گھر کے صحن میں انتہائی نامساعد حالات میں، نامکمل وسائل کے ساتھ اساتذہ کی کمی اور سیکنڈ چھوڑ تھرڈ ہینڈ کتابوں کے ساتھ شروع کیے جانے والا اسکول ضرور تھا مگر وہ عام اسکول نہیں تھا۔ اور نہ ہی وہاں ڈیلیور کی جانے والی تعلیم عام تھی...... اور نہ ہی وہ طریقہ کہ جس کے تحت وہاں تعلیم دی جارہی تھی۔ اس ضمن میں غزل نے ان کی کچھ ٹریننگ کلاسز لیں تھیں اور جب انہوں نے حیرت بھری آنکھوں سے سوال کیا

''تم نے ٹیچرز ٹریننگ کورس کر رکھا ہے کیا؟'' تو اس سوال کا جواب ایک لفظی تھا۔

''نہیں......''

''تو پھر......؟''

''انٹرنیٹ ٹیوٹوریلز......'' جواب کندھے اچکا کر آرہا تھا...... اور وہ سب اسے دیکھتے رہ گئے تھے...... آخر وہ کیوں اس طرح سے نہیں سوچتے تھے یا پھر کیوں اس طرح سے سوچ نہیں پاتے تھے۔ مانا کہ تصویر کا دوسرا رخ دیکھنے کی صلاحیت سب لوگوں کے پاس نہیں ہوتی ہے مگر پھر بھی ایسے افراد کی قلت نہیں مگر تصویر کا تیسرا رخ...... تیسرا زاویہ دیکھ لینا، بوجھ لینا...... یہ صلاحیت انہی افراد کے پاس ہوتی ہے کہ جن کی اس معاشرے میں قلت تھی...... غزل ''عام'' نہ تھی وہ کیا تھی؟ گر اک پرت کھلتی تو دوسری پرت پر پھر سے یہ ہی سوال درج نظر آتا...... آخر وہ کیا تھی؟

اس نے بچوں کو زبانی میتھس کی کیلکولیشن کرنا سکھا دیا تھا۔ یہ دراصل ایک قسم کا abalus تھا اور بچے اس کے پوچھے جانے والے ریاضی کے سوالات کا جواب، ہاتھوں کی چند مخصوص حرکات سے ادا کرنے کے بعد زبانی دیتے تھے اور بالکل درست دیتے تھے۔ اس نے یوٹیوب پر ایک اسکول کے بچوں کو ایسے کرتے دیکھا تھا اور پھر بے حد مغز ماری، محنت اور ریسرچ کے بعد وہ اپنے بچوں کو ویسے ہی clculation کرنا سکھا پائی تھی اور جو بچوں پر محنت کرنا پڑی...... وہ الگ داستان تھی تو وہ اِک عام اسکول ضرور تھا مگر عام تعلیم تھی، نہ طریقہ وہ غزل مراد کا اسکول تھا۔

☆☆☆

حالیہ سمسٹر کا رزلٹ بھی حسب توقع تھا۔ ٹینا، زارا اوسط درجے کی اسٹوڈنٹس سو اب بھی رزلٹ یہ ہی بتایا تھا۔ یاور اور حسن اوسط سے ذرا اعلیٰ درجے میں تھے، وہ اسی اعلیٰ درجے پر اب بھی فائز تھے...... راحیلہ، سلمیٰ، مناہل، انصر، قاسم اور جامعہ کے دوسرے بہت سے طالب علم بھی اپنی ذہانت کے مطابق ہی نتیجہ لائے تھے۔ رہ گیا مانی تو اس کی ٹاپ پوزیشن کو چیلنج کرنے والی بس ایک ہی تھی اور یہ ٹاپ پوزیشن یوں چیلنج نہ ہوسکتی تھی کہ اس ایک کا تعلق اسلامیات ڈیپارٹمنٹ سے تھا...... اور اس کا...... غزل مراد کا نتیجہ ہاں...... وہ حیران کن تھا...... ہمیشہ کی طرح وہ حیران کُن ہی تھا لیکن اب... حیرانی کی نوعیت ذرا سی بدلی ہوئی تھی۔

''یہ...... یہ غزل مراد کا رزلٹ تھا؟ واقعی......؟

سیریسلی''۔ سب حیران، حیران ہو کر نوٹس بورڈ کو تکتے تھے اور تک کر پھر سے حیران ہوتے تھے۔ وہ ٹاپ پر نہ تھی۔ ٹاپ سے ذرا نیچے تھی...... دیکھنے والوں کو اس کو پہلے نمبر پر دیکھنے کی اتنی عادت ہو چکی تھی کہ کوئی دوسرا نام آنکھوں کو بے حد عجب محسوس ہو رہا تھا۔ وہ چار میں سے چار جی پی اے اسکور کیا کرتی تھی ہر بار......جی ...... ہر بار مگر اب......تو دیکھنے والوں کا حیران ہونا بنتا تھا اور حیران ہو کر پھر سے تکنا بھی بنتا تھا۔ کچھ کے دلوں کو بڑی راحت پہنچی تھی ٹھنڈک کا اِک فرحت بخش احساس، کچھ بس حیران ہوئے اور کچھ وجہ پوچھنے اس کے پاس چلے آئے تھے۔

''آپ کا کیا......رزلٹ رہا اس دفعہ......؟'' پوچھنے والوں کو جواب کے بجائے اِک سوال کا سامنا کرنا پڑا...

بہر حال اس کو جواب دے دیا گیا۔

''اچھا تو لاسٹ سمسٹر میں کیا رزلٹ تھا؟'' اِک اور سوال......

''جی اتنا، اتنا تھا......'' پھر سے جواب دے دیا گیا تھا۔

''تو جب آپ کا رزلٹ ایک سا نہیں رہا......تو میں بھی ایک اسٹوڈنٹ ہوں اور ضروری نہیں ہر دفعہ اِک سا نتیجہ سامنے لاؤں اونچ، نیچ تو چلتی رہتی ہے ناں...... ہے ناں؟'' جواب کے بعد......اِک اور سوال تھا پوچھنے والوں کے لیے......

''جی، جی بالکل......'' تائیدی انداز میں سر ہلا کر وہ عجب نظروں سے غزل مراد کو دیکھتے ہوئے وہاں سے چلے گئے تھے......نک چڑی، بدمزاج، مغرور، بدتمیز، فضول عورت جیسے القابات سے من ہی من میں نوازتے ہوئے اور جب وہ اس کی پہنچ سے دور ہو گئے تو پھر زبانی بھی بولتے تھے......وہ تھک چکی تھی اس حیرانی کو سہہ، سہہ کر...... ہر پیریڈ میں، ہر استاد کو جواب دے، دے کر......اس نے اب عام بننا چاہا تو اندازہ ہوا......عمومیت اس کے لیے نہ تھی اور جب وہ خاص تھی لوگ ہونہہ کر کے اسے ''عام'' گردانتے تھے اور اب جبکہ وہ عام سی ہو گئی تھی تو لوگ اس کے پاس پہنچ، پہنچ کر اسے بتاتے تھے کہ نہ بھئی...... آپ کیسے ایسی ہو گئیں......؟ ارے آپ تو یہ تھیں، آپ تو وہ تھیں...... آپ کی ذہانت کے چرچے سے تو جامعہ بھری ہوئی ہے اور VC صاحب آپ کا تذکرہ ہر اسٹوڈنٹ میٹنگ میں کرتے رہتے ہیں۔ ارے آپ کیوں



خوش خیالی

لوگ مجھ کو کتنا جلاتے رہے
بے سبب مجھ کو کتنا ستاتے رہے
میرے اندر قیامت سی برپا رہی
ہونٹ پھر بھی میرے مسکراتے رہے
(ان اللہ مع الصابرین)

کلام: افتخار شوق، میاں چنوں

ایسے ہو گئیں......نہیں، نہیں آپ ایسے ''عام'' تو ہرگز نہیں ہو سکتیں......آپ نمبر ون پر ہی جچتی ہیں۔ وغیرہ، وغیرہ......

''یہ لوگ بھی ناں......'' اس نے سر جھٹکا اور خود کو اِک نئے مرحلے کے لیے تیار کیا جو کہ اسے گھر جا کر پیش آنا تھا کہ جن کے لیے ہمیشہ سے وہ خاص ہی رہی تھی۔

☆☆☆

کئی دن تو اس نے گھر میں ذکر ہی نہیں کیا تھا اور...

عبدالحمید صاحب کو ہی خیال آیا تھا جب انہوں نے اسے لیپ ٹاپ پر ہیڈ فون لگائے ایک دینی مسئلے کے بارے میں ویڈیو سنتے دیکھا تھا۔

''غزل......'' انہوں نے اس کا کندھا ہلا کر پکارا۔

''جی دادا......'' اس نے ہیڈ فون اتار کر جواب دیا۔

''اس سمسٹر کا رزلٹ ابھی تک نہیں آیا کیا؟'' اور اس سوال پر بے اختیار اس نے اِک گہری سانس بھری تھی۔ اس نے ہاتھ پکڑ کر پاس کھڑے دادا کو صوفے پر بٹھایا پھر ویڈیو بند کی، لیپ ٹاپ شٹ ڈاؤن کیا، لیپ ٹاپ کو سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہ ان کی طرف متوجہ ہوئی تھی اور دادا الگ اس کی اس قسم کی کارروائیوں سے حیران ہو رہے تھے۔ سیدھا سا سوال تھا، جواب بھی سیدھا ہی ہونا چاہیے تھا ناں...... پر وہ کر کیا رہی تھی، یہ بات تو خواب میں بھی سوچ نہیں جاسکتی تھی کہ وہ انہیں اپنے رزلٹ سے آگاہ کرنے کی تیاری کر رہی تھی کیونکہ ''غزل مراد'' کو کبھی ایسی تیاریوں یا تمہیدوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

''دادا! رزلٹ اس دفعہ اچھا نہیں آیا......'' ہموار اور متوازن لہجے میں اس نے سیدھی بات کی تھی۔

''فیل کیسے ہوسکتی ہو تم؟'' دادا حیران ہوئے۔

''فیل نہیں ہوئی۔'' وہ ہنس دی۔

''تو......؟''

''تو یہ کہ اس دفعہ ٹاپ نہیں کر سکی۔''

''جی پی اے کتنا ہے؟''

''3.62......''

''غزل......!'' اور دادا کے غزل کہنے میں اِک حیرت نما تنبیہ تھی۔

''کوئی مسئلہ ہے، پریشانی ہے کوئی یا پھر اس دفعہ پیپر مشکل تھے؟'' اس کا جھکا سر دیکھ کر انہوں نے پوچھا تھا۔

''نہیں......کوئی مسئلہ نہیں، پریشانی نہیں پیپر بھی ٹھیک تھے۔''

''تو پھر تمہاری دلچسپی کم ہوگئی ہے کیا؟''

''ہاں...... یہ بات ہے۔'' اس نے سر اٹھا کر اعتراف کیا۔

''کیوں؟ تمہارے تو بڑے خواب ہوا کرتے تھے...... اعلیٰ سے اعلیٰ تر تعلیم کے۔''

''خواب اب بھی اپنی جگہ پر ہی ہیں دادا......''

''تو پھر دلچسپی کیوں کم ہوگئی؟''

''میرا اسکول......'' اور عبدالحمید اِک لمحے کو بالکل چپ سے ہوگئے تھے۔

''میں یہ نہیں کہتا کہ اسکول اہم نہیں...... مگر تمہاری تعلیم بھی غیر اہم شے نہیں ہے جسے تم یوں نظر انداز کرو......''

''اچھا تو جو لوگ تعلیم کو نظر انداز کرتے ہیں وہ چوتھی پوزیشن لیتے ہیں کیا؟'' وہ برا مانتے ہوئے بولی۔ دادا ہنس دیے۔

''چوتھی پوزیشن والے یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ پہلی پوزیشن بھی لایا کرتے تھے۔'' انہوں نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

''ہوسکتا ہے کہ اب میں دوبارہ کبھی یہ پوزیشن حاصل نہ کرسکوں دادا...... مجھے اسکول کو کامیاب بنانا ہے۔ اس کے لیے کوئی ایک چیز تو پس پشت جائے گی ہی ناں......''

''اور وہ کون کہتا تھا مجھے اسلامیات ایک الگ انداز سے پڑھانی ہے۔ اس طرح سے کہ میں طالب علموں کو معاشرے کا فعال فرد بنا سکوں؟'' دادا کے لہجے میں ناراضی تھی......طنز تھا۔

''دادا اس میں تو ابھی بہت وقت پڑا ہے۔ آنرز میں چار سال لگتے ہیں...... میں تعلیم کو چھوڑنے کا تو نہیں کہہ رہی......ہاں......میری پوزیشن پہ ضرور اثر ہوا ہے اور آگے بھی ہوگا مگر میں فیل بھی تو نہیں ہوئی حتیٰ کہ اوسط درجے میں بھی نہیں......ذرا سا فرق ہی پڑا ہے ناں دادا...... یہ بھی تو دیکھیں صرف نمبر ون پوزیشن لانا زیادہ ضروری ہے یا ان بچوں کا خواندہ ہونا......؟'' دادا نے عجیب سے احساسات کا شکار ہو کر اپنی پوتی کو دیکھا تھا۔ وہ اپنا کیریئر، اپنا مستقبل داؤ پر لگا رہی تھی...... محض ان بچوں کے لیے......

''مگر تمہارا مستقبل......؟'' وہ اتنا ہی کہہ سکے تھے۔

''میں چوتھے نمبر پر آکر بھی اپنا مستقبل محفوظ کر سکتی ہوں دادا...... مجھے ہر اِک یونیورسٹی میں داخلہ بھی مل جائے گا لیکن ان بچوں کو کوئی غزل مراد نہیں ملے گی دادا......کوئی نہیں...... ان کے ہاتھ گریس سے لتھڑے رہیں گے، کسی ڈھابے کی میزیں صاف کرتے رہیں گے۔ کوڑا، چنتے رہیں گے یا پھر کسی بھٹے پر اینٹیں معصوم ہاتھوں پر زخم لگاتی رہیں گی۔ مجھے نہ روکیں...... پلیز مجھے کرنے دیں، میں بتا نہیں سکتی دادا مجھے کیسا سکون ملتا ہے......کیسی راحت ہوتی ہے جو اندر تک اترتی ہے۔ یہ میرا صدقۂ جاریہ ہے۔ اسے روکیں تو مت......'' لہجہ نم سا ہوگیا تھا۔ کیسی بے قراری تھی جو اس کے لہجے

سے چھلکتی تھی۔ دادا حیران تھے۔ اس نے ان کے خون سے کیا شے لے لی تھی کیا......؟

''تم کیا ہو غزل......؟''سوال ہوا۔

''آپ کی پوتی......جواب ترنت حاضر تھا۔

بے اختیار انہوں نے اس کا ماتھا چوما تھا۔

''یقین جانیں چوتھی پوزیشن والوں کو بھی جاب مل جاتی ہے۔''ذرا شرارت سے وہ بولی تھی۔

''میرا بچہ......''انہوں نے ہنس کر اسے گلے سے لگایا تھا۔

یہ جو سوشل ورکر ہوتے ہیں ناں......خدائی خدمتگار......ان کے اندر اللہ نے عام انسانوں جیسی کوئی بھی چیز فٹ نہیں کر رکھی ہوتی......دل نہ دماغ......یہ ہم عام انسانوں جیسے نہیں ہوتے......اگر یہ عام انسانوں جیسے ہوتے تو نہ عبد الستار ایدھی ہوتے اور نہ مدر ٹریسا......یہ انسانیت کی قطار میں کھڑے سب سے آگے لوگ......

☆☆☆

اور پھر یوں ہوا کہ اس کی پوزیشن پھر کبھی دوبارہ نمبر 1 پر نہ جا سکی......وہ دوسری، تیسری، چوتھی، پانچویں کے مابین ہی رہی مگر دوبارہ پھر کبھی نمبر 1 پر جا نہ سکی......اس کے ذہن سے جیسے یہ نکل گیا تھا۔ جیسے اسے اب اپنی پوزیشن سے فرق نہیں پڑتا تھا نہ ہی اس بات سے کہ وہ گولڈ میڈل نہ لے سکی تھی۔ اسکول اس کا جنون بنتا گیا......وہ روز بروز ہر نئے طلوع ہونے والے دن کے ساتھ اس میں کھپتی چلی گئی......ناک تک......بعض اوقات وہ اپنے کھانے پینے کو بھی گول کر جاتی، اس کی ... زندگی کے معمولات متاثر ہو رہے تھے......تو ہوتے رہیں۔ وہاں پروا کسے تھی......اماں اور ... عبدالحمید صاحب یہ سب نوٹ کر رہے تھے مگر وہ چاہتے تھے کہ غزل خود ہی خیال کرے تو اچھا ہے......انہیں ٹوکنا نہ پڑے تو یہ ہی بہتر ہے کہ وہ بچی تو نہیں تھی مگر وہ......معلوم نہیں کون سی چیز......اس میں سما گئی تھی جو وہ خود کو ہلکان کیے جا رہی تھی۔

وہ اپنی تعلیم کے حوالے سے بھی بے حد کانشس اور پُرجوش ہوا کرتی مگر ایسا حال تو تب بھی نہیں ہوا تھا۔ اب کہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ گویا وہ خود کو ختم ہی کر ڈالے گی اور یہ مثبت نہ تھا......حد سے بڑھی چیز مثبت کیسے کہلائی جا سکتی ہے۔ وہ خود کو مار رہی تھی، ختم کر رہی تھی......اپنی پوری جان

مقام افسوس

☆ پہلے خون کے رشتے ہوتے تھے، افسوس اب رشتوں کے خون ہوتے ہیں۔

وجہ......

خود غرضی

انا پرستی

بے اعتمادی

تنگ نظری

اور بے حسی

مرسلہ: حسینہ ممتاز خان، اسلام آباد

سے بھی زیادہ کی طاقت لگا رہی تھی اس اسکول کو کامیاب بنانے کے لیے......امید کے کچھ ورکرز اب بھی اس کے ساتھ موجود تھے۔ جن میں مناہل، راحیلہ اور مانی سرِفہرست تھے۔ باقیوں کی حالت آن اور آف جیسی تھی۔ جب وقت ہوتا آ جاتے اور جب مصروف ہوتے تو غائب......دادا کو اعتراض نہیں تھا......وہ اعتراض کر بھی کیسے سکتے تھے کہ وہ خود ایک سوشل ورکر تھے لیکن غزل کی حالت پریشان کن ہوتی جا رہی تھی ابھی کھانے کے دوران بھی وہ بچوں کی کاپیاں دیکھ رہی تھی۔

''غزل......''عبدالحمید نے پکارا تھا......وہ اتنی مگن تھی کہ سیدھے ہاتھ میں نوالہ جوں کا توں پکڑ رکھا تھا۔ اور خود وہ اپنے سامنے موجود کاپی کے صفحات پلٹتی جا رہی تھی۔

''غزل......''اب کہ اماں نے ناگوار سے لہجے میں سختی سے پکارا تھا۔

''جی......''وہ ہڑبڑائی۔

''دادا بلا رہے ہیں اور تمہیں ہوش ہی نہیں......''انہیں رہ کر تاؤ تھا۔

''سوری دادا......جی کہیے......''وہ شرمندہ نظر آئی۔

''یہ کاپیاں اٹھاؤ......''حکم صادر ہوا۔

''دادا وہ میں......''

''سنا نہیں......؟ کاپیاں اٹھاؤ یہاں سے......''

عبدالحمید کے بے لچک لہجے نے اسے مجبور کیا تھا اس نے کاپیاں اٹھا کر سائڈ پر رکھ دیں۔

"اوراب توجہ سے کھانا کھاؤ، تمہیں معلوم ہے کہ تم کیا کھارہی ہو؟" ان کے کہنے پر وہ چونکی...... ہاں، وہ کچھ کھارہی تھی۔ ذائقہ بھی شناسا سا تھا مگر وہ تھا کیا؟ اس نے نظروں کا رخ فوراً پلیٹ کی طرف کیا تھا اور اسے تب احساس ہوا کہ اچھا وہ آلو قیمہ کھارہی تھی۔ ایک گہری سانس بھر کر وہ اپنے کھانے کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

"ہر چیز توجہ کی طالب ہوتی ہے غزل...... ہر چیز حتیٰ کہ آپ کا کھانا بھی...... تم اسے توجہ نہیں دوگی، یہ تمہیں اپنے ذائقے سے محروم کردے گا۔ تمہارا پیٹ تو بھر جائے گا مگر لذت نہ رہے گی۔ سو توجہ سے کھایا کرو...... آئندہ میں تمہیں ڈائننگ ٹیبل پر کاپیوں کے ساتھ نہ دیکھوں......"

"جی......" جھکے سر کے ساتھ ڈانٹ نما لیکچر سن کر اس نے کہا تھا۔

"دادا آپ نہیں سمجھ سکتے یہ کام میرے لیے کیا بن چکا ہے...... یہ اتنا اہم ہو چکا ہے کہ ہر چیز ہر دوسری شے پسِ پشت چلی گئی ہے۔ اب تو یہ حال ہے کہ یہ بند کروں تو کسی کام کے لائق نہیں رہوں گی اور میں سوچتی ہوں گر میں یہ نہیں کروں گی تو کروں گی کیا......؟ آخر کیا؟"

وہ کھانا کھارہی تھی مگر اِک بار پھر سے ذائقے سے محروم ہوگئی تھی۔ تو پھر سے بھٹک چکی اور اب کہ وہ خود کو سوچوں کے بحر میں پاتی تھی۔

☆☆☆

اور خواہش، پیاس کا تخم ہے۔

اور پیاس...... یہ جینے نہیں دیتی...... مار ڈالتی ہے۔

میں، میں نہیں ہوں اب تو، اِک مشت بھری خاک ہوں، ریت ہوں، صحرا ہوں، ہاں، محبت نے مجھے ڈھادیا، مار ڈالا...... میں تو سال خوردہ ہو چکی اب تو...... لیکن یہ کہ میں اس سے بڑی بلا ہوں...... اس محبت نے مجھے ختم تو کر ڈالا مگر یہ کبھی میرے پیروں کو سیدھی چال چلنے سے روک نہیں پائے گی۔ میری گردن تنی ہے اور میری انا سالم ہے۔ ہاں...... میں سال خوردہ ہو چکی، میں مٹ چکی، خاک ہو کر رہ گئی...... مگر یہ کہ میں محبت کو اتنی اجازت تو نہیں دوں گی کہ وہ میری راہ کھوٹی کرسکے اور چاہے یہ میرے وجود کو اٹھا، اٹھا کر زمین پر پٹختی ہی کیوں نہ رہے اور چاہے خواہش میرے اندر پیاس کا شجر ہی کیوں نہیں اگادے...... مگر یہ تو طے ہے محبت بڑی بلا نہیں ہے، وہ میں ہوں...... ہاں...... وہ میں ہوں...... میری جنگ ہے یہ اور ہارنے کے باوجود مجھے یہ لڑنی ہے تو جب یہ لڑائی کی حالت شدت پکڑتی ہے اور یہ شدت جب مجھے ادھ موا کرتی ہے تو تب ہاں تب میرا دل چاہتا ہے کہ میں اِک گناہ کروں...... محبت خواہش کو جنم دیتی ہے اور خواہش اس گناہ پر اکساتی ہے اور اکسا، اکسا کر بے حال کر چھوڑتی ہے۔ نوچتی ہے، کوڑے مارتی ہے، ریزہ ، ریزہ کرتی ہے اور میرا جسم بھڑ کنے لگتا ہے، بے چینی کسی اژدھے کے مانند میرے وجود کے گرد کستی چلی جاتی ہے اور میری ہڈیاں چٹخنے لگتی ہیں، کہا جاتا ہے، کیا جاتا ہے گر میں اِک گناہ کرلوں تو...... روز اتنے لوگ...... اتنے سارے لوگ گناہ کرتے ہیں تو کیا ہے جو میں بھی اِک گناہ کرلوں تو...... پھر ساری عمر پڑی ہے معافی مانگنے کو...... سجدے کر کے داغِ ندامت کو مٹانے کو...... آنسو سے خود کو پاک کرلینے کو...... ساری عمر پڑی تو ہے...... تو کیا جاتا ہے گر میں اِک گناہ کرلوں تو...... مگر...... ہوتا کیا ہے...... ہر دفعہ جب میرے قدم اس گناہ کی سمت بڑھنے کے واسطے ہمکتے ہیں تو کوئی چیز...... کوئی ان دیکھی چیز...... کوئی احساس، کوئی نامعلوم سا احساس میرے پیروں کو باندھ چھوڑتا ہے...... روک دیتا ہے۔ اس سمت جانے نہیں دیتا...... مجھے روک لیتا ہے...... بے قابو نہیں ہونے دیتا...... تمام تر بے قراریوں، تڑپنے اور جلنے کے باوجود کچھ ہے جو میرے قدموں کو باندھ دیتا ہے۔ اور چاہ کر بھی میں خود کو اس گناہ کے لیے مائل نہیں کر پاتی اور...... اور اب میں ہوں...... میرا چٹختا وجود اور خواہش کا لق ودق صحرا...... جہاں ابدی پیاس میرا مقدر ہے، میرے نصیب میں تو کوئی سراب بھی نہیں...... سراب جو جھوٹا ہی سہی، ہوتا تو تسلی بخش ہے...... تو میں وہ ہوں کہ جس کے نصیب میں سراب کی خوش فہمی بھی نہیں......

☆☆☆

"سنو مناہل......!"

"ہاں، کیا ہے؟"

"یہ غزل نے تم لوگوں کے سامنے بھی کبھی حجاب نہیں اتارا؟" وہ اس سوال پر حیران ہوئی اور حیران ہو کر قاسم کو دیکھا۔

''کیوں......؟ تم کیوں پوچھتے ہو؟''
''ویسے ہی...... پتا تو چلے آخر ہے کیسی وہ......؟''
''جیسی بھی ہے...... ہمیں کیا؟'' مناہل نے کندھے اچکائے۔
''تو، واقعی ہی اس نے کبھی تم لوگوں کے سامنے بھی حجاب نہیں اتارا......؟'' اور اب یہ پوچھنے والا مانی تھا، لہجے میں تجسس زور مارتا تھا۔
''نہیں مانی...... کبھی دھیان ہی نہیں گیا...... بس اپنی کلاس لی اور واپس...... اتنا وقت ہی نہیں ہوتا۔'' مناہل نے کہا۔
''کبھی ہاتھ بھی نہیں دیکھے کیا؟'' مانی کو معلوم نہیں کس بات کا تجسس تھا۔
''نہیں......'' جواب یک لفظی تھا۔
''ویسے وہ خود کو کیوں اس طرح سے چھپا کر رکھتی ہے۔ سمجھ سے بالاتر ہے، اگر خوب صورت ہوتی تو یوں خود کو چھپا کر نہ رکھتی کہ خوب صورت لوگوں کو خود کو نمایاں کرنے کا شوق ہوتا ہے، یقیناً وہ خوب صورت نہیں ہے بلکہ بدصورت ہوگی جبھی تو......'' اور یہ مانی کا تجزیہ تھا۔
''ہوسکتا ہے وہ اس اسکول آف تھاٹ سے ہو جو کہ عورت کو ہاتھ، پیر کھولنے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔'' مناہل نے جیسے مانی کے تجزیے سے انکار کیا تھا۔
''یہ بھی ممکن ہے لیکن پھر بھی، کبھی کسی کو یوں تو نہیں دیکھا۔'' مانی نے تائید کرنے کے باوجود انکار کیا تھا۔
''ویل...... وہ جو بھی ہے ہمیں اس سے مطلب نہیں ہونا چاہیے۔'' مناہل کے کہنے پر مانی نے مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔
''مطلب تو ہوتا ہے ناں پھر...... کیوں مانی......؟'' اتنا کہہ کر قاسم اور مانی ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسے تھے۔
''وہ بہت اچھی لڑکی ہے اور تم لوگوں کو زیب نہیں دیتا کہ اس کے بارے میں یوں بات کرو......'' مناہل کو برا لگا۔
''ہاں...... اچھی تو وہ ہے۔'' مانی نے اعتراف کیا۔
''تمہیں کیا ہوگیا ہے مانی......؟ تم تو ایسے نہیں تھے، قاسم یا کوئی اور ایسی بات کہے تو بات سمجھ میں آتی ہے لیکن تم......'' مناہل کے چہرے پر افسوس کے سے تاثرات تھے۔
''کیوں، مانی میں ایسا کیا ہے جو مجھ میں نہیں۔'' قاسم کو رہ کر غصہ آیا تھا۔
''بچے تم میں تو کچھ بھی مانی جیسا نہیں۔'' سلمٰی اندر آتے ہوئے بولی تھی۔ اس نے مناہل کی بات سنی تھی اور چڑانے کے واسطے بولی تھی۔
''تم بھی......'' قاسم کو شاک لگا۔
اور وہاں اِک قہقہہ گونجا تھا...... اور اس سارے میں غزل کا ذکر دب کر رہ گیا تھا...... تو جب وہ سارے قہقہے لگاتے تھے اور قاسم کو تنگ کرتے تھے تو مانی سوچتا تھا کہ غزل کیسی ہوگی...... بدصورت، خوب صورت، عام، معمولی سی کیسی؟ اور وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ ایسے کیوں سوچتا تھا۔ تجسس، انسانی فطرت، شاید مانی اسی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر سوچتا تھا۔

☆☆☆

چار سال...... چار سال گزر بھی گئے...... ہیں گزر بھی گئے......؟ ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ وقت یوں اسے بنا بتائے گزر بھی گیا تھا۔ وہ حیران تھی اور حیران سے زیادہ پریشان دکھتی تھی۔ اسے وقت کے یوں چپ چاپ، کچھ کہے بنا گزر جانے پر شکایت تھی...... اور شکایت بڑی سخت تھی' آج آخری دن تھا جامعہ میں...... اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ فوکل گلاسز کے پیچھے موجود آنکھوں اور نقاب میں چھپے چہرے پر آنسو روانی سے بہتے تھے اور وہ کسی بھٹکی ہوئی روح کے مانند پوری جامعہ میں پھرتی تھی۔ لائبریری، لان، کلاس رومز کہاں، کہاں نہیں گئی تھی وہ۔ ہر چیز کو ہاتھوں سے چھو کر محسوس کرتی یوں جیسے اس کالمس انگلیوں کی پوروں پر محفوظ کر لینا چاہتی ہو...... بھولنا نہ چاہتی ہو...... وہ اس روم میں بھی گئی کہ جہاں دروازے میں مانی کھڑے ہو کر منہ کھول کر اسے دیکھتا تھا، وہ اسی کرسی پر بیٹھی تھی اور کوئی دھڑام سے گرنے کی آواز نہ تھی اور نہ ہی اب کوئی منہ کھول کر اسے دیکھتا تھا، کوئی قہقہہ بھی نہ تھا آنسوؤں میں شدت آئی اور وہ حیران ہوئی...... اتنی جذباتی تو وہ کبھی نہیں رہی تھی۔ اب...... اب کیا ہوا تھا؟ اسے تو جامعہ آنا اچھا نہیں لگتا تھا کہ یہاں لوگ اسے عجیب، عجیب نظروں سے دیکھتے تھے یوں جیسے اس کے عبایا کو اتار دینا چاہتے ہوں تو اب...... اب کیا ہوگیا تھا اور یہ جو ''کیا'' تھا ناں اس کا سراغ نہ ملتا تھا۔

اسے سمجھ ہی نہیں آرہا تھا کہ اسے ''کیا'' ہوگیا تھا۔ انسانی فطرت میں ہے مانوس ہوجانا اور انس میں تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں...... چاہے انسان ہو، جانور ہو یا پھر اینٹ سیمنٹ سے بنی کوئی جامعہ ہی کیوں نہ ہو۔ تو چار سال سے جسے وہ اپنی نہیں سمجھتی تھی وہ آج...... یوں اچانک، اپنی ہوگئی تھی اور اپنی اس اپنی کے پرائے ہونے کے غم سے آنکھ خشک نہ ہوتی...... جب دل کا بوجھ ہلکا ہوگیا تو اس نے واپس جانا چاہا اور جب واپس جانا چاہا تو یک دم امید کا خیال آیا تھا۔ ان لوگوں نے کتنا ساتھ دیا تھا اس کا...... دیوارِ مہربانی سے لے کر اس کے اسکول تک...... وہ کیسے اللہ حافظ کہے بنا چلی جائے...... اتنی بے مروت تو وہ نہیں تھی۔

تو جب وہ ''امید'' کے آفس پہنچی تو وہاں صرف لڑکیاں ہی موجود تھیں۔ لڑکے سب غائب تھے...... مناہل آج خاص طور پر سفید دوپٹا اوڑھ کر آئی تھی جواب رنگین ہو چکا تھا...... وہ دوپٹے کے پلوؤں پر سب سے آٹوگراف لے رہی تھی...... اس نے پلو غزل کے آگے بھی کیا تھا۔ غزل نے اپنا نام لکھ دیا۔ وہ جانے لگی تو انہوں نے اسے روک لیا۔

''ایسے کیسے جانے دیں...... ابھی سب آتے ہیں تو پارٹی ہوگی کچھ کھا پی کر ہی جانا......'' راحیلہ نے اسے کندھوں سے پکڑ کر زبردستی بٹھایا تھا۔

''آپ کا شکریہ مگر آپ جانتے تو ہیں میں ایسی کسی گیدرنگ کا حصہ نہیں بنتی......'' اس نے شائستگی سے معذرت کی تھی۔

''اچھا بھئی نہ حصہ بنا ہماری گیدرنگ کا کم از کم مانی لوگوں کو گڈ بائے ہی کہتی جاؤ......'' سلمٰی نے جیسے اس کا راستہ روکا تھا۔ اور وہ رک بھی گئی تھی۔ اتنا تو بنتا ہی تھا کہ وہ ان لوگوں کو گڈ بائے کہہ دے...... وہ مناہل کی طرف منہ کیے اس سے باتیں کر رہی تھی کہ جب اسے اپنے پیچھے اِک بے ہنگم شور سنائی دیا۔ ساتھ ہی اوئے غزل...... اِک سرگوشی کی سی آواز اور اس کے ساتھ ہی جیسے کسی نے شور کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اور پھر چند قدموں کی آواز سنائی دی تھی۔

وہ ایک، ایک کر کے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔

''السلام علیکم!'' اور ایک، ایک کر کے سب تمیز سے اسے سلام کرتے نشستیں سنبھال چکے تھے۔

''غزل ہم کو لوگوں کو اللہ حافظ کہنے آئی تھی......'' مناہل نے اعلان کیا تھا۔ اِک لمحے کو وہاں ایسی خاموشی چھائی جیسے کوئی بھی نہ سمجھ پایا ہو کہ اب کیا کہے، غزل نے اپنی جگہ چھوڑی اور کھڑے ہوتے ہوئے ان سب پر اِک نظر ڈالی تھی۔ مانی بھی آج سفید شرٹ پہن کر آیا تھا اور اب اس شرٹ کی سفیدی بھی رنگین ہو چکی تھی۔ کہیں پر رنگ برنگ ہاتھ کے پنجوں کے نشان تھے، کہیں پر quotes اور کہیں پر کوئی شعر اور کہیں سکیچز......

''آپ سب لوگوں کا بہت، بہت شکریہ اس ساتھ کے لیے کہ اس مدد کے لیے جو آپ نے out of the way جا کر میرے لیے کی...... میں بدلہ نہیں دے سکتی کہ یہ بدلہ دینے والی شے تھی ہی نہیں...... میں دعا کر سکتی ہوں آپ کی خوشیوں کی اور کامیابیوں کی اور آپ لوگ ہمیشہ میری دعاؤں کا حصہ رہیں گے۔ زندگی میں کبھی، کسی بھی طرح سے میں آپ لوگوں کے کام آسکوں تو میرے لیے اس سے بڑھ کر چیز اور کوئی نہ ہوگی...... بہت شکریہ...... اللہ حافظ......'' ہموار آواز میں کہہ کر وہ رکی نہیں تھی...... باہر نکلنے کے واسطے مڑی ہی تھی کہ......

''تم نے تو رُلا ہی دیا......'' مناہل سوں، سوں کرتے یک دم اس کے گلے آلگی تھی۔ اس طرح سے کہ وہ سنبھل بھی نہ پائی تھی۔ اس نے غزل کے نقاب والے چہرے پر ہی چٹاخ پٹاخ بوسے لیے تھے...... اور مناہل پہلا قطرہ ثابت ہوئی۔ اس کے بعد راحیلہ اور سلمٰی نے بھی اسے یوں ہی ملی تھیں۔

''غزل......'' مانی نے پکارا تھا۔ وہ اِک لمحے کو ٹھٹکی اور پھر مانی کی طرف مڑی۔

''جی......''

''آپ مجھے آٹوگراف دیں گی پلیز......'' وہ اپنی ہی کیپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا تھا۔ وہ اِک لمحے کو تذبذب کا شکار ہوئی اور پھر پی کیپ اس کے ہاتھ سے پکڑ کر لکھنے لگی تھی۔

"thank you Usaman shahid"

اس نے تیزی سے لکھا اور پی کیپ اسے واپس کی تھی۔

''شکریہ کیوں کہہ رہی ہیں بار، بار......'' اسے اعتراض ہوا۔

"اس لیے کہ یہ بار، بار کہے جانے کے لائق چیز ہے۔" اعتراض چٹکیوں میں اڑا دیا گیا۔

"میں نے اپنی مرضی سے ہی کیا...... جو بھی کیا......"

"اور آپ کی مرضی میرے کہے جانے کے تابع تھی......" اور اب کہ وہ لاجواب ہوا تھا اور وہ یوں لاجواب کیے جانے پر مسکرایا۔

"ایک اچھی اور کامیاب زندگی آپ کا نصیب ہو اور میں آؤں گا دوبارہ...... اسی یونی میں یہ دیکھنے کہ اسلامیات کیسے پڑھائی جا رہی ہے......" غزل کی آنکھوں میں ایک دم استعجاب بِنا اجازت اترا اور اس نے مانی کو دیکھا...... بلا ارادہ ہی...... وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔ غزل نے سیکنڈ سے بھی پہلے نظریں جھکائی تھیں۔ تو اب بھی اسے یاد رہا تھا۔

"خدا کرے کہ ایسا ہی ہو......" اس نے مدھم لہجے میں کہا اور اللہ حافظ کہتی وہاں سے نکل آئی تھی۔

"چار سال ہو گئے مگر اس لڑکی کا چہرہ نہ دیکھ سکے......" قاسم نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"چہرہ......؟ اس نے تو پیر تک کو اجازت نہیں دی کہ کسی کی نگاہ کی زینت بنے......" یہ مانی تھا۔

"راحیلہ کے بعد میں جس کو ساری عمر یاد رکھنے والا ہوں...... وہ غزل ہے......" اور اب یہ علی تھا۔ اور سب نے علی کے کہے جانے والے جملے کو عام جملہ سمجھا تھا۔

سمجھ تو تب آیا جب "ہائے اللہ" کہہ کر راحیلہ نے شرماتے ہوئے دوپٹے کا پلو سر پر ڈالا تھا اور پھر اس پر بس نہ کیا تھا۔ پلو کو ماتھے تک کھینچ بھی لیا تھا۔ وہ شرم سے سرخ ہو جانا چاہ رہی تھی مگر سرخی نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی کہ چہرے پر جھلک دکھاتی ہی نہیں تھی۔ یہ علی کا برملا اعتراف تھا جو آج سے پہلے تک نہیں ہوا تھا۔ اور اب وہاں ہنگامہ تھا، شور تھا، کولڈ ڈرنک کی بوتلوں کو اچھی طرح سے شیک کرنے کے بعد ڈھکن کھولے جا رہے تھے...... مشروب ابل رہا تھا اور وہ ایک دوسرے پر ابلتا مشروب پھینک رہے تھے...... راحیلہ شرمائے ہی چلی جا رہی تھی۔ اور منا ہل کو اس کی شرماہٹ تلملانے پر مجبور کرتی تھی اور وہ کہنیاں مار، مار کر اسے پزاسرو کرنے کا کہتی تھی کہ وہ اور سلمیٰ ہی اس کام میں مدد دیتیں اور راحیلہ سنتی نہ تھی اور بس شرم کو خود پر طاری کیے بیٹھی رہی...... وہاں قہقہے تھے، شور تھا اور زندگی اپنے جوبن پر تھی۔

☆☆☆

میرا دل چاہتا ہے کہ میں ساری دنیا بن جاؤں...... فقط میں ساری دنیا بن جاؤں...... میرے سوا اسے کچھ دکھائی نہیں دے...... سننے پہ آئے تو میرے علاوہ کچھ سنائی نہ دے...... بولے تو فقط میرا نام بولے...... میں یوں، اس پر عیاں ہو جاؤں کہ اسے باقی ہر شے دکھائی دینا بند ہو جائے اور وہ جان لے کہ میں ہی تو اس کی ساری دنیا تھی۔ فقط میں ہی تو...... جب وہ کسی لڑکی کے پاس کھڑا ہوتا ہے، ہنس کر بات کرتا ہے، اسے اپنی نظروں سے دیکھتا ہے تو اس پل، ٹھیک اسی پل میرا دل کہتا ہے کہ جاؤ اور جا کر پوری دنیا بن کر اس کی آنکھوں میں اتر جاؤ...... اس پر حاوی ہو جاؤ، اسے کسی اور کا نہ چھوڑو...... اتنا تو مجھے یقین ہے کہ گر میں اس کے سامنے اعتراض کروں، ڈٹ کر کھڑی ہو جاؤں تو کسی اور عورت کا وہاں کیا کام؟ وہ اس قابل کب رہے گا کہ کسی اور طرف نگاہ کر سکے، دیکھ سکے...... وہ میری طرف دیکھنا چاہے گا اور بار، بار دیکھنا چاہے گا...... ہاں میں ایسا ہی حسن ہوں...... چاند کا غرور کیا ہے؟ کیا یہ کہ وہ بہت حسین ہے؟ نہیں غرور تو یہ ہے کہ اتنے وسیع آسمان پر وہ اکیلا ایسا حسین ہے کہ جسے ساری دنیا گردنیں اٹھا، اٹھا کر دیکھتی ہے...... تو میں بھی ایسا ہی حسن ہوں...... جو لبِ بام پر آؤں تو دنیا کی گردنوں کو جھکا نہ رہنے دوں...... آنکھوں میں تحیر بھر دوں اور لبوں کو گونگا کر چھوڑوں...... چکور تب چاند کی طرف نہ اڑیں، وہ میری طرف اڑان بھریں اور پھر بے مراد ہو کر گر پڑیں...... ہاں میں ایسا ہی حسن ہوں...... تو تب...... تب وہ کیسے نہ مائل ہو گا...... کیسے نہ......؟ حسن سے آگاہی فتنہ ہے اور میرا دل چاہتا ہے کہ یہ فتنہ اس پر ٹوٹ پڑے۔ حسن سب سے بڑا عامل...... کوئی پُراثر تعویز...... اس سا کوئی دوجا نہیں باندھ کر رکھ چھوڑے اور کہیں جانے نہ دیوے...... کسی کام کا نہ چھوڑے...... بس اِک جھلک اور کام تمام...... تو محبت خواہش جگاتی ہے اور خواہشیں قوموں کو بہکاتی ہے۔ زور لگاتی ہے اور منہ کے بل گرا دینے کو بے تاب ہے لیکن...... میرا وقار سلامت ہے اور میں پورے قد سے کھڑی ہوں۔

دل کا کیا ہے اس کا تو کام ہی خواہش کو سینچنا ہے اور

سب خواہشیں حلال تو نہیں ہوتیں کچھ گناہ بھی کہلاتی ہیں۔ ان کی کوئی دوسری ترجیح پیش کی جا سکتی ہے نہ ہی کوئی دلیل گناہ، گناہ ہوتا ہے اور بس......بس...... یہ میرا عذاب ہے اور اسے مجھے ہی جھیلنا ہے۔

☆☆☆

”مراد فاؤنڈیشن......“ عمارت کے اوپر جلی حروف میں لکھا تھا۔ اور یہ غزل جانتی تھی کہ وہ گھر کے صحن سے عمارت اور عمارت کے ماتھے پر لکھے گئے ان جلی حروف تک کیسے پہنچی تھی۔ وہ پی ایچ ڈی نہیں کر سکی تھی۔ وہ اپنی تعلیم کا کوئی بھی سلسلہ برقرار نہیں رکھ سکی تھی۔ اس کے سب خواب جیسے ”مراد فاؤنڈیشن“ کے قیام میں مدغم ہو چکے تھے۔ کامیابی بس یہ ہی تھی کہ اسے ایک منفرد، اعلیٰ بین الاقوامی معیار کا ایسا اسکول بنانا تھا کہ جہاں امرا کی اولادیں نہیں، غربا کے بچے معیاری تعلیم حاصل کر سکیں......اور اس کے جنون نے یہ کر دکھایا تھا۔ چھ سال لگے تھے...... چھ سال مگر یہ ہو گیا تھا۔ اس نے کر دکھایا تھا۔ امید کے ورکر کچھ عرصے تک ساتھ رہے اور پھر آہستہ آہستہ سب چھوڑتے چلے گئے۔ کسی کی شادی ہو گئی، کوئی جاب کی مصروفیات میں گم ہو گیا اور مانی وہ تو تھا ہی پردیسی...... تعلیم مکمل کر کے اسلام آباد لوٹ گیا تھا جو کہیں نہیں گئی تھی تو وہ غزل تھی۔ اچھا خاصا اسکالر شپ پہ ایڈمیشن ملا تھا اسے اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی میں......اس کے لیے اسے ہاسٹلائزڈ ہونا پڑتا اور گر ایسا ہوتا تو آج مراد فاؤنڈیشن ہوتا، نہ اس کی عمارت ہوتی اور نہ ہی عمارت کے اوپر لکھے گئے وہ جلی حروف ہوتے۔ تو بس اس نے فیصلہ کیا اور ڈٹ گئی اور آج اس کا انٹرویو ہو رہا تھا۔ ملک کے معروف انگریزی اخبار کے سنڈے میگزین میں اس کا انٹرویو چھپا تھا۔ ساتھ میں تصاویر بھی تھیں۔ ویسی ہی سیاہ عبایا میں...... ڈھکے ہاتھ اور پیروں کے ساتھ......اس کی جدوجہد کی داستان تھی۔ سر توڑ کوشش کی کہانی...... جیسے چھ سال کے بعد کسی اخبار کا ورق نصیب ہوا تھا۔ فنڈز کی اب بھی قلت تھی۔ بین الاقوامی معیار کا حصول آسان تو نہیں تھا ایسے میں جبکہ اسکول میں غربا کے بچے پڑھتے ہوں تو اس نے فنڈ کے لیے اپیل بھی کی تھی اپنے اسی انٹرویو میں گو کہ عبدالحمید کا حوالہ بھی تھا۔ اس کے لیے مگر عبدالحمید کوئی نامی گرامی شخصیت نہیں تھے۔ ان کی شہرت بس اپنے علاقے تک تھی۔ غزل کو وسیع پیمانے پر مدد چاہیے تھی۔ اس نے بطورِ خاص سرکار سے مدد کی اپیل کی تھی اور اتفاق دیکھیے کہ سرکار کا ہی ایک بندہ اس وقت اس کا انٹرویو پڑھ رہا تھا۔ اور آج بھی...... آج بھی غزل مراد نے اسے اسی طرح سے حیران کیا تھا کہ جس طرح سے وہ جامعہ میں کرتی رہی تھی......وہ مسکرائے بنا نہیں رہ سکا تھا۔

”تو آج بھی تم کسی اسرار کے مانند ہی ہو غزل مراد......سیاہ ریشم میں لپٹی......تم کیا ہو......؟ کیا کوئی متبرک شے ہو؟ بھلا بتاؤ تو سہی تم کیا ہو؟ کیا؟“ وہ غزل کی سیاہ لباس میں موجود تصویر کو دیکھتا کم اور سوچتا زیادہ تھا۔

☆☆☆

اس کے سامنے ایک وزیٹنگ کارڈ لا کر رکھا گیا تھا...... غزل نے ٹیبل کی سطح سے دو انگلیوں کی مدد سے کارڈ اٹھایا اور نام پڑھا۔

”قاسم محمد......!“ اور پھر دماغ پر بہت زور دینے کے باوجود اسے یاد نہیں آیا تھا۔

”میں تو ان صاحب کو نہیں جانتی سر کے کمرے میں بھجوانا تھا ان کو......“ اس نے ملازمہ سے کہا تھا۔

”جی وہیں پر بھیجا تھا......سر نے یہ کارڈ آپ کو دینے کا کہا ہے۔“ ملازمہ کے جواب پر وہ الجھی تھی۔ اس نے انٹرکام اٹھا کر دادا کے کمرے کا نمبر ملایا تھا۔

”آپ نے یہ کارڈ مجھے کیوں بھیجا؟ کیا پھر سے کسی امیر آدمی کی سفارش آئی ہے؟“

”ہاں...... آدمی تو امیر ہی ہے۔“ دادا نے سامنے بیٹھے شخص کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ غزل کے پاس آئے روز ایڈمیشنز کے حوالے سے سفارشات آتی رہتی تھیں۔

”اور آپ نے پھر بھی میرے پاس یہ کارڈ بھیجا......“ وہ ناراضی بھرے لہجے میں بولی تھی۔

”تو تم نے بالکل نہیں پہچانا......“ اب کہ دادا نے کہا۔

”نہیں......“ وہ الجھی اور ایک بار پھر سے کارڈ کو دیکھا تھا۔

”قاسم......قاسم...... ارے یہ امید والا قاسم تو نہیں دادا......؟“ اسے جیسے اِک جھماکے کے ساتھ یاد آیا تھا۔ دادا ہنس دیے۔

”ہاں......وہ ہی ہے...... تمہارا انٹرویو پڑھ کر ملنے چلا

آیا ہے۔اسی شہر میں پوسٹڈ ہے...... بندہ کام کا ہے غزل...... planning and budget ڈیپارٹمنٹ میں ہوتا ہے۔'' دادا کے یوں کہنے پر وہ ہنس دی تھی۔

''آتی ہوں......'' ہنستے ہوئے کہہ کر اس نے ریسیور کریڈل پر ڈالا تھا اور قاسم سے ملنے کے لیے اٹھی تھی...... باہر سے اسکول کو دیکھیں تو اِک عمارت ہی نظر آتا تھا لیکن اندر سے اسکول کے دو حصے تھے ایک بیرونی حصہ جو کہ اسکول کا ایڈمن ڈیپارٹمنٹ تھا اور وہیں کے معاملات کو عبدالحمید ہینڈل کیا کرتے تھے اور ایک اندرونی حصہ جس کے مین گیٹ کے پار پرائمری اسکول کی عمارت تھی۔غزل کا رخ اب اسی بیرونی حصے کی جانب تھا۔

☆☆☆

''تمہیں اب شادی کر لینی چاہیے غزل......!'' دن میں اگر یہ ذکر نہ ہو تو غزل کو بڑا عجیب سا محسوس ہوتا تھا۔اب بھی رات کے کھانے پر ہزار دفعہ کہی جانے والی بات دُہرائی گئی تھی۔

''میں نے کب انکار کیا ہے دادا......'' وہ زچ نظر آئی۔

''اقرار بھی تو نہیں کرتی ہو......'' دادا ناراض نظر آئے۔

''اتنی محنت کر کے اتنی جان مار کر عمر کے بہترین سال اسے عنایت کر کے اب میں اسکول کو محض گھر بسانے کے لیے چھوڑ دوں...... آپ سمجھتے کیوں نہیں؟'' اب کے وہ بے بس نظر آئی۔

''تو کہاں سے لاؤں ایسا آدمی ڈھونڈ کر جو تمہارے اسکول کو بھی سپورٹ کرے......'' دادا اس سے زیادہ مجبور دکھتے تھے۔

''ہوگا...... کہیں نہ کہیں تو ہوگا ہی......'' وہ بے پروا ہوئی۔

''کیسے ہوگا......؟ ڈھونڈیں گے تو ہوگا ناں...... ایسے بیٹھے بٹھائے تو ہونے سے رہا......'' اب یہ اس کی اماں تھیں جو بے حد تپے ہوئے انداز میں بولی تھیں۔

''میں نے ڈھونڈنے سے منع تو نہیں کر رکھا۔'' ان کے غصے سے خائف ہوتے ہوئے وہ بولی تھی۔اماں منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا کر رہ گئی تھیں۔

''قاسم کا پروپوزل آیا ہے تمہارے لیے۔'' یہ اطلاع یوں دی گئی تھی جیسے کہتے ہوں...... آج بھنڈی پکی ہے۔اور وہ اتنی حیران کہ مارے حیرت کے اِک پُراثر سا ''کیا'' بھی نہ کہہ پائی تھی۔وہ بس ٹکر ٹکر دادا کی شکل دیکھ رہی تھی۔یوں گھورے جانے پر دادا بدمزہ ہوئے تھے اور تڑپ کر اسے دیکھا۔

''شرم تو نہیں آتی دادا کو یوں آنکھیں پھاڑ کر گھورتے ہوئے۔''

''اور آپ کو بھی نہیں آتی یوں اپنے......''

''غزل......'' وہ تنک کر بول رہی تھی کہ اماں کی تنبیہی پکار نے منہ بند کروا دیا تھا۔

''اب قاسم میں کیا برائی ہے؟''

''کوئی بھی تو نہیں......''

''تو پھر ارادے تو تمہارے نیک نظر نہیں آ رہے......'' دادا خفگی سے بولے۔

''دادا...... وہ سرکار کا ملازم ہے۔آج اِدھر پوسٹڈ ہے تو کل کہیں اور...... اور میں اپنے اسکول کو پیک کر کے اس کے ساتھ شہر شہر نہیں گھوم سکتی۔کچھ تو خیال کریں۔'' وہ رونے والی ہوگئی تھی۔اس کے یوں کہنے پر سسر اور بہو نے ایک دوسرے کو دیکھا۔کہتی تو غلط نہیں تھی لیکن پروپوزل بے حد ...اچھا تھا۔

☆☆☆

وہ آج ہی اِدھر تعینات ہوا تھا اور تعیناتی کے تھوڑی دیر بعد ہی اس کا رخ اسلامیات ڈیپارٹمنٹ کی طرف تھا۔

اسے ہنسی آئی...... بے وقوفی سے کچھ بڑھ کر اسے یہ حرکت محسوس ہوئی۔وہ ایک لڑکی کو دیکھنے آیا تھا۔وہ بھی کس قدر اشتیاق سے......اس کا جی چاہا کہ دل کھول کر قہقہہ لگائے، وہ زیرِلب مسکراتا ہوا دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈالتا ہوا اسی کاریڈور سے گزرا تھا...... لیکن اب، اب وہاں کوئی ایسی نقاب پوش لڑکی نہ تھی جو عام سادہ سی نگاہوں سے اسے دیکھتی اور اس کے پہلو سے ہو کر گزر جاتی وہاں اس کمرے میں کوئی کلاس ہو رہی تھی۔وہ چند لمحے ٹھہرا رہا یوں جیسے کچھ سمجھ نہ پایا ہو۔

''سنو بیٹا......'' اس نے پاس سے گزرتی لڑکی کو روکا۔

''جی......؟''

''مس......'' وہ ایک دم رکا...... معلوم نہیں ابھی تک وہ مس تھی یا مسز......

''جی سر......!'' لڑکی نے اس کے رکنے پر کہا تھا۔
''مس غزل مراد پڑھاتی ہیں آپ کو......؟'' اس سوال پر لڑکی نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔
''نو سر......ہمیں تو کوئی غزل مراد نہیں پڑھاتیں......'' اور وہ یہ انکار سن کر حیران ہوا، ایسا کیسے ہو سکتا تھا بھلا؟ اس کو تو یہ ہی کرنا تھا......یہیں آنا تھا تو پھر......؟
اسے توقع نہ تھی کہ غزل مراد اسے ڈیپارٹمنٹ میں نہیں ملے گی۔ یہ عجب بات تو نہیں تھی لیکن مانی کو بے حد عجیب محسوس ہوئی تھی۔ غزل کو یہیں ہونا چاہیے تھا۔
اور اب جب وہ یہاں نہیں تھی تو وہ کہاں ہوگی؟ کیا کرتی ہوگی؟ کسی گھر میں اپنے بچے سنبھالتی ہوگی؟ کسی مرد کی خدمت کرتی ہوگی؟ کیا اب بھی وہ ویسے ہی نقاب کرتی ہوگی......ویسے ہی کیا؟ مانی سوچتا تھا۔ وہ کسی جذبے سے مغلوب ہو کر نہ آیا تھا۔ وہ تو بس یادیں دُہرانے آیا تھا۔ یہ دیکھنے آیا تھا کہ اب اسلامیات کیسے پڑھائی جا رہی ہوگی۔ اور بس......؟ اسے وہاں موجود نہ پا کر اسے حیرت ہوئی تھی۔

☆☆☆

''میں غزل سے شادی کر رہا ہوں۔'' وہ اولڈ اسٹوڈنٹس کی ایک گیٹ ٹو گیدر تھی......مناہل، انصر، قاسم اور مانی یعنی عثمان شاہد تھے۔ بس یہی آسکے تھے اور لوگ نہ آسکے تھے اکثر شہر سے باہر تھے۔ اس ملاقات کا انتظام قاسم نے کیا تھا اپنی سرکاری رہائش گاہ پر......جبھی اس نے بم پھوڑا تھا......دھماکا کیا تھا......وہ سب چائے پی رہے تھے۔ کسی کو کھانسی آئی، کسی کے گھونٹ بھرتے ہونٹ ساکت ہوئے......کوئی پرچ میں پیالی رکھتے رکھتے منجمد ہو گیا......اور مانی کا گھونٹ اس کا منہ جلا گیا تھا......وہ ٹھٹھر کر رہ گیا تھا۔
''کیا؟'' ان سب نے بیک وقت حرکت کی اور بیک وقت بولے تھے۔
''ہاں......'' قاسم کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا۔
"She is not your type yaar"
مناہل کو اعتراض ہوا۔
''سو واٹ......؟'' قاسم اب بھی بے پروا سا تھا۔
''تم کیا کرنے جا رہے ہو قاسم......'' مانی حیران تھا۔

صرف شدید حیران نہیں بلکہ شدید ترین حیران اور حیرت اس کی زبان کو جکڑتی تھی۔
''کہاں......تم سالبرل اور کہاں وہ......کیسے ایڈجسٹ کرو گے؟''
''لڑکیاں ساری ایڈجسٹ ہو ہی جاتی ہیں انہیں کمپرومائز کرنا پڑتا ہے۔''
''غزل ایسی لڑکی نہیں......'' مناہل نے شدت سے انکار کیا۔
''تم پچھتاؤ گے......'' انصر بولا۔
''یوں اتنے سال بعد تمہیں کیا سوجھا اس سے شادی کرنے کا۔'' مانی نے وجہ جاننی چاہی۔
''میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کیسی ہے......'' قاسم نے وجہ بتلائی۔
''بس......؟''
''ہاں......بس......''
''اور اگر وہ پسند نہ آئی تو......؟''
''تو کیا......شادی نہیں کروں گا......'' قاسم کا بے پروا انداز اب بھی یوں ہی قائم تھا۔ اس جواب پر وہ سب ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے تھے۔
''یعنی تم اسے شادی سے پہلے......شادی کو بنیاد بنا کر دیکھنا چاہو گے؟'' مناہل نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
''آف کورس......'' وہ مسکرایا۔
''کتنے گھٹیا ہو تم قاسم......'' مناہل نے اس کے منہ پر کہا تھا۔
''نہیں، تم غلط سمجھ رہی ہو......ٹھیک ہے میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں، شادی جیسا اہم فیصلہ محض دیکھنے کی چاہ میں نہیں کر سکتا تھا میں......وہ پسند آ گئی تو ٹھیک......نہ آئی تو اب میں لحاظ کے مارے اس سے شادی کرنے سے تو رہا......'' قاسم نے تردید کی۔
''بہر حال یہ کوئی اچھا فیصلہ نہیں ہے......غزل اور تم......دو الگ لوگ ہو......یہ حرکت غلط ہے۔'' مناہل کو اب بھی اعتراض تھا۔
''میں نے کہا ناں کہ لڑکیاں کمپرومائز کر لیتی ہیں۔ وہ بھی کر لے گی۔''

"اور یہ ہی تمہاری سب سے بڑی بھول ہے قاسم......! غزل کو کمپرومائز کرنا ہوتا تو وہ ان چار سالوں میں بہت سی چیزوں پر کمپرومائز کر لیتی...... وہ کتنی straight forward ہے۔ تمہیں اندازہ نہیں، تم کمپرومائز کے دھوکے میں نہ رہنا۔ مائنڈ اٹ......" مانی بے حد سنجیدہ انداز میں کہہ رہا تھا اور ماسوائے قاسم کے باقی سب کے چہروں پر تائید نظر آئی تھی۔

☆☆☆

"تمہارا کیا خیال ہے، قاسم سیریس ہے؟" وہ مناہل کو ڈراپ کرنے جا رہا تھا جبھی مناہل نے سوال کیا تھا۔

"کسی حد تک سیریس لگتا ہے لیکن غزل سے شادی کے فیصلے کے پیچھے جو وجہ کارفرما ہے وہ بے حد نان سیریس ہے، وہ جلد بیزار ہو جائے گا۔" احتیاط سے موڑ کاٹتے ہوئے مانی نے جواب دیا تھا۔

"ہاں...... یہ اس طرح کیے جانے والے فیصلے تھوڑی ہوتے ہیں۔" مناہل نے گہری سانس بھر کر کہا تھا۔

"تم ملی نہیں کبھی غزل سے؟ ایک ہی شہر میں ہوتی ہو تم دونوں۔"

"ملی ہوں مگر زیادہ نہیں، یونی کے بعد بس ایک دو دفعہ...... وہ بہت مصروف آدمی ہے بھئی اور وہ آج بھی امید کے ورکرز کو نہیں بھولتی۔ میں جب بھی ملی اس نے ہر ملاقات میں یہ بات بہت خلوص سے دُہرائی۔ وہ کہتی ہے کہ یہ ہمارے ہاتھوں کا بویا ہوا بیج ہے۔ اس کا اسکول واقعی بہت اچھا ہے تم جاؤ گے ملنے؟"

"ہاں...... کیوں نہیں...... میں تو اسے اسلامیات ڈیپارٹمنٹ میں بھی ڈھونڈنے گیا تھا۔ بڑے خواب تھے اس کے یونی کے پروفیسر بننے کے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ مناہل بھی ہنس دی۔

"وہ اس سے بھی بڑا کام کر رہی ہے مانی...... یونو اس کے اسکول میں محض غربا کے بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ امیروں کے لیے چند مخصوص نشستیں ہیں بس اور ہر کوئی مرا جاتا ہے۔ ان نشستوں پہ اپنے بچوں کو داخلہ دلوانے کو......" مناہل کے لہجے میں ستائش تھی۔

"یہ غزل مراد ہی کر سکتی تھی۔" مانی نے متاثر ہوتے ہوئے اعتراف کیا تھا۔

☆☆☆

"غزل......!" وہ نماز پڑھنے کے بعد دعا مانگ رہی تھی جب دادا نے اسے پکارا تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی ان کے پاس سے اٹھ کر آئی تھی۔

"اب کون سا کام آن پڑا......؟" بڑبڑاتے ہوئے، وہ جائے نماز سمیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"غزل......" اسی دوران اِک اور پکار آئی تھی۔

"آرہی ہوں دادا......" اس نے وہیں سے پورا زور لگا کر جواب دیا۔

"دادا ابھی تک ڈرائنگ روم میں کیا کر رہے ہیں...... مہمان تو جا چکے......" سوچتے ہوئے اس نے پیروں میں چپل اڑسی، نماز کے لیے باندھے جانے والے دوپٹے کو کھول کر شانوں پر برابر کیا۔ اس کے لمبے بال چٹیا میں بندھے ہوئے تھے لیکن کچھ لٹیں اس وقت کانوں کے پیچھے اڑسی ہوئی تھیں۔ وہ اس وقت لائٹ گرین پلین کاٹن کی شرٹ اور سفید شلوار میں ملبوس تھی۔ قمیص کے ہم رنگ شیفون کا دوپٹا جس کا ایک پلو اس نے سر پر ڈالا تھا مگر وہ بار، بار پھسل، پھسل جاتا تھا۔

"جی دادا......!" بولتے ہوئے اس نے ڈرائنگ روم کے بھڑے ہوئے پٹوں کو دونوں ہاتھوں سے دھکیلا تھا اور...... اور......

اِک دھماکا تو وہ تھا ناں جسے سائنس بگ بینگ کہتی ہے مگر یہ جو ابھی، ابھی غزل کے عین سر پر ہوا تھا۔ یہ دھماکا بھی کسی طرح سے کسی طور سے بگ بینگ سے کم نہیں تھا کہ اس دھماکے کے نتیجے میں اس کی روح نے جیسے جسم کا ساتھ چھوڑا تھا۔

☆☆☆

اک عرصے بعد وہ آواز سنی تھی مگر ایسا لہجہ پہلی بار سماعتوں کی نذر ہوا تھا۔ وہ تو اس کا فارمل لہجہ سننے کا عادی تھا۔ یوں بے فکری بھرا انداز؟ اس لہجے کو کب سنا تھا اس نے اور وہ سن کر مسکرایا۔ یعنی کہ وہ نہیں جانتی تھی کہ دادا نے اسے آواز کیوں دی تھی۔ عبدالحمید اسے پکارتے ہوئے ڈرائنگ روم سے نکلے تھے۔ وہ اتنے عرصے بعد اسے سامنے دیکھ کر کیسا......

ردِعمل ظاہر کرے گی؟ کیا وہ خوش ہوگی؟ اسے فطری تجسس ہوا۔اس نے نظریں دروازے پر مرکوز کردیں۔ چند لمحوں بعد اس کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور عثمان شاہد نے تصور کیا سیاہ عبایا......سیاہ لباس،فوکل گلاسز، دستانوں اور جرابوں میں مقید ہاتھ اور پیر...... یہ غزل مراد تھی اس کے لیے اور پھر......

''جی دادا......'' اب کہ آواز بے حد قریب سے آئی تھی اور......اور......عثمان شاہد کو دل اپنی جگہ سے ہلتا ہوا محسوس ہوا تھا یہ کسی بھی طرح سے اس کے لیے بھی اِک بگ بینگ سے کم نہیں تھا۔اس کا دل اس کا ساتھ چھوڑ رہا تھا۔وہ یک دم بیٹھے سے کھڑا ہوا تھا۔ بے اختیاری حرکت، لاشعوری طور پر......مرضی کے بنا ہی......حسن اس کے سامنے تھا اور حسن بھی وہ کہ اس جیسا دوجا کوئی نہیں......کہیں نہیں......وہ وسیع آسمان پر چمکنے والا اکیلا چاند تھا، وہ حسن کہ جس نے عثمان شاہد کو حیران نہیں پریشان بلکہ مبہوت کردیا تھا۔اِک پل کو وہ دونوں ہی ٹھٹھر کر رہ گئے تھے اور پھر غزل نے بے ساختہ منہ پر ہاتھ رکھا اور بے اختیار تیزی سے پیچھے کو پلٹی تھی اور مانی......وہ ابھی تک ابھی تک بے یقین ہوکر دروازے کو تکتا رہا تھا۔ یہ، یہ کیا تھا۔ کیا تھا آخر......کیا ان آنکھوں نے کوئی خواب دیکھا؟ نہیں تو......ان آنکھوں نے تو بس اِک پری پیکر دیکھا اور وہ آنکھیں یوں دیکھے جانے پر بے یقین تھیں......تحیر سے پُر تھیں اور یقین کرنے کے واسطے اِک بار پھر سے دیکھنا چاہتی تھیں اور بار، بار سوال اٹھاتی تھیں......وہ کیا تھا......کیا تھا وہ......؟ جارے جھلے......وہ حسنِ باکمال تھا اور کیا تھا۔

☆☆☆

کتنی ہی دیر وہ عجب سن کر کے رکھ دینے والے احساس کا شکار رہی تھی۔ ہاتھ گود میں رکھے، بے جان جسم کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی اور یقین کرنے میں متامل تھی کہ اس کا عثمان شاہد سے یوں سامنا ہوا تھا۔ یوں......؟ عبدالحمید اسے آوازیں دیتے ہوئے باہر نکلے اور ساتھ ہی کچن کی طرف چلے گئے تاکہ وہ مہمان کی خاطر مدارات کا کہہ سکیں۔ ان کے گمان میں نہیں تھا کہ غزل کو مہمان کی آمد کا علم نہیں ہوگا اور غزل......عثمان کے آنے سے قبل چند لوگ اسکول کے کسی تعمیراتی کام کے سلسلے میں ملنے آئے تھے۔ چائے کا دور چل رہا تھا جب وہ نماز کا کہہ کر وہاں سے آئی تھی۔ اس کے بعد ان لوگوں کو چلے جانا تھا۔ وہاں کمرے میں آکر اس نے عبایا اتار دیا تھا کہ اب اس کا دوبارہ وہاں اندر جانے کا ارادہ نہیں تھا......وہ جیسے ہی وضو کر کے آئی تو آوازوں سے محسوس ہوا کہ مہمان جارہے ہیں۔ مانی کب آیا......؟ اسے معلوم نہیں تھا، وہ نماز پڑھنے میں مصروف ہوگئی تھی اور اس......اس کے بعد سارے واقعے کو سوچتے ہوئے اِک بار پھر سے اس کے پورے بدن میں جھنجھناہٹ سی اٹھی تھی۔ اس نے سر کو دونوں ہاتھوں میں بے بسی سے گرایا تھا۔ کس نے سوچا تھا کہ ایسا بھی ہوگا......یوں بھی لکھا تھا......یہ بھی طے تھا کہ اِک دن اس کا عثمان شاہد سے یوں سامنا ہوگا......یوں؟ اماں اور دادا سمجھا، سمجھا کر تھک گئے کہ وہ محض اتفاق تھا اور بس......مگر اس کی چپ نہ ٹوٹی تھی۔ آنکھیں جلتی تھیں مگر بہتی نہیں تھیں......عجب تکلیف دہ حالت تھی۔ دل بیٹھا جارہا تھا۔

''غزل......'' اماں نے پیار سے پکارا۔

''پلیز اماں مجھے اکیلا چھوڑ دیں پلیز......'' ہاتھوں پہ سر اٹھا کر اس نے اس لہجے میں کہا جسے اماں سننے کی عادی نہیں تھیں، وہ یک دم چپ ہوئیں اور پھر اس کا سر تھپتھپا کر باہر نکل آئیں اور وہ......وہ کیا بتاتی اماں کو......کیا......؟ کہ اس کے دل نے ایسا ہی چاہا تھا۔ ہاں اس نے چاہا تھا کہ وہ عثمان شاہد پر بھی عیاں ہوجائے......اسے مائل کرلے اپنے حسن سے......اور یہ خواہش کسی گناہ کی طرح اس کے دل میں پلتی تھی......اور آج......آج......کیا ہوا......؟ وہ اٹھی اور بے دم ہوتے قدموں کے ساتھ کمرے کی کھڑکی تک آئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے کھڑکی کے پٹوں کو وا کیا اور چند لمحے وہ سر جھکائے کھڑی رہی......یوں جیسے ہمت نہ ہو اس طرف دیکھنے کی اس کے حلق سے کچھ ابھرا، ابھر کر ڈوبتا رہا اور پھر اس نے آہستگی سے نظریں آسمان کی طرف اٹھائی تھیں۔ وہ آسمان کو دیکھتی رہی......عجب نظروں سے......وہ......وہ اللہ تھا ناں......اور اس کی وہ ہی جانتے......اس کے اپنے انداز، اپنے فیصلے اور اپنے کام اس نے اِک بار پھر سے ایک عورت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



کے۔ ں کو اِک مرد کی محبت سے آزمایا تھا اور یہ محبت...... اس کی کہانی تو ازل سے چلتی آرہی ہے ہابیل اور قابیل سے لے کر...... بی بی ہاجرہؑ کے ناک، کان چھدوانے تک۔ جناب یوسفؑ کے الزام سے لے کر...... رہتی دنیا تک...... اسے چلتے ہی رہنا...... کبھی آزمائش بن کر اور کبھی انعام بن کر...... اسے چلتے ہی رہنا ہے۔

☆☆☆

''مناہل......'' رات کے اس پہر فون کے دوسری طرف ابھرنے والی آواز کسی سرگوشی سے زیادہ نہیں تھی اور سرگوشی بھی ایسی جو اندھیری کالی رات میں کسی اسرار کا پتا دیتی ہو جیسے کسی اسرار کا بھید کھولنے والی ہو......

''مانی......؟'' مناہل نے حیران ہو کر فون کان سے ہٹایا...... اور اسکرین کو دیکھا اور جب وہ اسکرین کو دیکھتی تھی تو اس کی آنکھوں کو دھندلا سا نظر آتا تھا کہ وہ نیند میں تھی۔ اس نے اِک نظر سوئے ہوئے شوہر پر ڈالی اور اٹھ کر باہر نکل آئی تھی کہ اس کا شوہر اس وقت مانی کی کال پر ڈسٹرب نہ ہوتا، ہاں البتہ مناہل کی آواز سے ضرور ہو جاتا۔

''کیا بات ہے؟ اس وقت کال کی، خیریت؟'' وہ پریشانی سے پوچھتی تھی۔

''وہ...... وہ بہت خوب صورت ہے مناہل، بے حد خوب صورت......'' عجب بے قرار سا لہجہ تھا۔

''کون...... کس کی بات کر رہے ہو تم؟ پاگل تو نہیں ہو گئے؟'' پریشانی، حیرانی میں بدلی تھی اور دوسری طرف مانی...... وہ سنتا کب تھا وہ تو بس اپنی کہتا تھا۔

''وہ ٹھیک کرتی تھی جو یوں خود کو چھپا کر رکھتی تھی۔ وہ اسی طرح چھپائے جانے کے لائق تھی۔ وہ عیاں کرنے کے لائق نہیں تھی۔ عورت اتنی پاکیزہ بھی ہو سکتی ہے مناہل؟'' اور مناہل جھنجلا اٹھی۔

''مانی کیا ہو گیا ہے، کس کی بات کر رہے ہو تم؟'' اور اس وقت مناہل مر کر بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ وہ غزل کی بات کر رہا تھا۔ مانی نے اِک لمبی سانس اندر کھینچی یوں جیسے کسی خوشبو کو اندر اتار رہا ہو اور پھر بے دم ہو کر بیڈ پر پشت کے بل گرا تھا۔

''غزل...... غزل مراد......'' اس کے لبوں سے...... سرسراتا سا نام آزاد ہوا۔ اور قبل اس کے وہ فضا میں گم ہو کر معدوم ہو جاتا، برقی آلے نے اسے کیچ کیا تھا اور مناہل کے کانوں تک پہنچا دیا تھا۔

''کیا......؟'' اور مناہل نے اس زور سے کیا کہا تھا کہ اندر کمرے میں سویا ہوا اس کا شوہر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔

''تم نے کہاں دیکھ لیا اسے؟'' اور اب وہ اسی طرح بلند آواز میں، بے حد جوش کے ساتھ مانی سے پوچھ رہی تھی۔

☆☆☆

محبت کو ''ہونہہ'' کہا جا سکتا ہوتا اور ''ہونہہ'' کہہ کر گردن موڑی جا سکتی ہوتی تو غزل مراد سب سے پہلے ایسا کرتی...... محبت کو ٹھڈا مار کر پرے گرایا جا سکتا ہوتا تو غزل مراد ٹھڈے مار، مار کر محبت کو گہری، اندھی کھائیوں میں لے جا کر پھینکتی، محبت کو غرق کیا جا سکتا ہوتا تو غزل مراد اسے بحرِ احمر میں جا ڈبوتی...... اس کا کوئی تریاق ہوتا تو وہ بھی سب سے پہلے غزل مراد ہی ایجاد کرتی۔ تو یقیناً محبت کو ''ہونہہ'' نہیں کہا جا سکتا...... ٹھڈے مارنے پر بھی یہ کہیں نہیں جاتی بلکہ اور ڈھیٹ بن کر اکڑ جاتی ہے۔ دریا برد کر دینے کا شوق بھی آپ خود کی جان سے پورا کر سکتے ہیں، محبت سے نہیں۔ اور رہ گیا تریاق تو جائیں صاحب...... محبت کو جھیلیے، احمقانہ بات مت کیجیے...... اس کا کوئی تریاق نہیں...... کوئی علاج بھی نہیں...... گر ہوتا تو غزل مراد کو کسی سے بھی اس جہان کے کسی بھی دوسرے مرد سے محبت ہو جاتی...... عثمان شاہد سے نہیں...... محبت کو ہونا ہوتا ہے اور یہ ہو جاتی ہے۔ بنا حسب نسب دیکھے، بنا جانچے، بنا پرکھے، یہ بس ہو جاتی ہے۔ اسے بھی ہو گئی تھی۔ کب، کیسے، کیوں جیسے سوال فضول تھے، بکواس سے زیادہ کچھ نہیں تھے۔

اسے ٹینا بری لگتی تھی، اسے زارا سے چڑ تھی، اسے مناہل بھی اچھی نہیں لگتی تھی۔ سلمٰی اور راحیلہ بھی نہیں کہ جب وہ یوں ہنستے، مسکراتے، بے تکلفی سے مانی سے بات کیا کرتی تھیں۔ اور تب، تب اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ نقاب گرا دے...... اور ہاتھ، پیر کھول دے اور تن کر اس کے سامنے کھڑی ہو جائے اور کھڑی ہو کر اس سے پوچھے...... بھلا بتاؤ تو سہی عثمان شاہد...... کیا میں دیکھے جانے کے لائق نہیں؟ کیا میرے سوا اب بھی کہیں اور تم دیکھنا چاہو گے؟ بھلا بتاؤ تو سہی عثمان شاہد...... مانی کبھی اسے reachable نہیں لگا...... اس نے ہمیشہ یہ ہی سوچا تھا یہی سمجھا تھا کہ مانی کی ترجیحات میں بھی غزل جیسی لڑکی شامل

نہیں ہوگی۔ وہ اور مزاج کا تھا اور غزل نے ہمیشہ خود کو اس کے لیے مس فٹ سمجھا...... اس نے تو کبھی عثمان شاہد کو دعا میں بھی نہیں مانگا...... مانگتی تو تب ناں کہ جب وہ خود کو عثمان کے قابل سمجھتی...... اس نے بس طے کر رکھا تھا کہ وہ اس کے لیے نہیں تھا۔ کبھی ہو بھی نہیں سکتا تھا تو تب ہاں تب اس کے دل میں عجب خواہش نے جنم لیا، اگر وہ عثمان کے سامنے آجائے تو کیا تماشا ہو؟ حسن بہت بڑی آفت ہے اور اس سے انکار ممکن نہیں تو کیا ہو، گر وہ اِک بار...... اِک بار کسی طرح سے عثمان شاہد پر آشکار ہو جائے...... اِک بار محض اِک بار ”نہیں......“ اس نے خود کو روکے رکھا...... اس گناہ جیسی خواہش کے ہاتھوں بے بس ہونے کے باوجود خود کو لاچار ہونے نہ دیا۔ اس نے اپنے قدموں کو سالم رکھا اور کبھی عثمان کو کیا، کسی دوسرے تیسرے کو بھی یہ بھنک بھی پڑنے دی تھی کہ وہ مانی کو پسند کرتی ہے۔ وہ جلتی رہی، سلگتی رہی، چٹختی رہی، مرتی رہی لیکن خود کو خاک بننے نہ دیا، گرنے نہ دیا...... اس حال تک جانے نہ دیا کہ جہاں وہ خود کو خود ہی نہ دیکھنا چاہے...... تو اس نے بند باندھے رکھے گو کہ اس کے بازو اس کے متحمل نہ تھے۔ ہر نیا آنے والا دن اسے کمزور کرتا...... ہر نئے چڑھنے والے دن میں وہ خود کو مضبوط کرتی...... ہر روز اس کے قدم بہکنے لگتے، ہر روز وہ سیدھی ہموار چال چلنے میں بے حال ہوتی...... ہر اِک یوم میں محبت نے اس کے چہرے پر چابک مارے تھے۔ ہر اِک یوم میں اس نے اپنے زخموں کو پاتا تھا کہ مرہم نہیں ہوتا ایسے زخموں کا...... جو محبت بڑی محبت سے لگاتی ہے۔ تو یہ ہوا اور بے حد شدت سے ہوا ہر روز ہوا اور جب، جب ہوا غزل مراد کو بے مراد کر کے رکھ گیا لیکن وہ...... وہ محبت سے بڑی بلا تھی پاک دامن وہ نہیں ہوتا جسے گناہ کرنے کا موقع نہ ملے...... پاکیزہ تو وہ ہوتا ہے جو موقع ملنے پر بھی اپنے دامن کی سفیدی کو داغ دار نہ ہونے دے...... چاہے اس کے لیے اسے سر کے بل ساری عمر ہی کیوں نہ کھڑا ہونا پڑے۔ وہ عورت تھی...... انسان تھی اور محبت اِک فطری جذبہ، وہ اسی جذبے کے ساتھ پیدا کی گئی تھی جیسے بہت سارے دوسرے انسان...... جیسے کہ بہت سارے مرد...... تو وہ اِک فطری جذبے کا شکار ہوئی تھی لیکن اس نے حدیں نہ پھلانگیں، وہ تو ان کے قریب تک نہیں پھٹکی تھی۔ اس نے صبر کیا اور رہ گئی خواہش...... تو یہ اسی طرح سے بے اختیار ہے جس طرح کہ محبت...... گمان، خیال اور سوچ پر بند نہیں باندھے جاسکتے...... سوچیں...... خواہشیں، بے اختیار، لاشعوری طور پر ذہن میں آجایا کرتی ہیں اور ہر سوچ، پُرخیال، ہر گمان اور ہر خواہش ٹھیک نہیں ہوتی...... بعض گمان گناہ بھی ہوتے ہیں تو غزل مراد کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس کا گمان، خواہش تھی مگر آفرین کہ خواہش کے گھوڑے کو اس نے بے دلی کی لگامیں نہیں باندھی تھیں۔ اس نے خواہش کے بدن پر ضبط کے چابک برسائے تھے۔ صبر کی ضرب لگائی تھی اور اب جبکہ خواہش زور نہ مارتی تو یہ...... یہ ہوگیا تھا وہ عثمان شاہد پر عیاں ہوگئی تھی...... کیوں؟ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ حل کرنے پر بھی وہ معما حل نہیں ہوا تھا۔ کیوں؟ آخر کیوں؟ وہ اتنے سال بعد کیوں آیا تھا اس کے شہر میں......؟ اب کیوں......؟

☆☆☆

”غزل سے شادی کی صورت تمہیں اسی شہر میں سیٹل ہونا پڑے گا...... ہو سکتے ہو؟“

”جی...... میری جاب اسی شہر میں ہے اور مجھے یہاں سیٹل ہونے میں کوئی مسئلہ نہیں۔“

”کل کو کہیں اور پوسٹنگ ہوئی تو؟“

”تو میرے ریسورسز اتنے ہیں کہ اپنی پوسٹنگ رکوا سکتا ہوں......“

”تمہاری فیملی کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟ یہ نہ ہو کہ کل کو وہ کہیں کہ ہم نے ان کا لڑکا ہتھیا لیا ہے۔“

”نہیں ہوگا سر......! دو بڑے بھائی ہیں وہ میرڈ ہیں...... ایک ہمارے آبائی شہر میں ہیں اور ایک کی مری میں رہائش ہے...... باقی رہ گئے امی اور ابو تو انہیں میں اپنے ساتھ ہی لے آؤں گا۔ اور میری امی اپنی دونوں بہوؤں سے اس قدر نالاں ہیں کہ وہ میرے ساتھ آنے میں ذرا سی تاخیر بھی گوارا نہیں کریں گی...... اور جب امی، راضی تو ابو کی کیا مجال کہ وہ انکار کر سکیں۔“ اب کہ تفصیل سے جواب آیا تھا...... عبدالحمید نے مسکراہٹ روکی تھی۔

”اور اگر کل کلاں تمہاری امی تیسری بہو سے بھی بیزار ہوگئیں تو......؟ ایسی کوئی اچھی گھر گرہستن نہیں ہے میری پوتی...... اسے بس سوشل ورک کرنا آتا ہے۔“

”کیا کر سکتی ہیں تب وہ، چوتھے بیٹے کا آپشن نہیں ہے ان کے پاس...... اور ان کی ناک انہیں بڑی بہوؤں کے

پاس جانے نہ دے گی۔'' وہ مزہ لیتے ہوئے بولا تھا۔
''یہ تم پھنسا کسے رہے ہو؟'' عبدالحمید مشکوک ہوئے۔
''آپ کو......'' اس نے آنکھ مار کر جواب دیا تھا اور ڈرائنگ روم مردانہ قہقہوں سے گونج اٹھا تھا۔ عبدالحمید اس کے والدین سے مل لیے تھے اور کچھ بھی فائنل کرنے سے قبل سارے معاملات کلیئر کرنا چاہتے تھے۔ جبکہ اِک دوسرے فریق سے بھی کم و بیش ایسا ہی مکالمہ کر چکے تھے۔ دیکھیے کہ قرعۂ فال کس کے نام نکلتا ہے...... عثمان شاہد، مانی یا قاسم محمد......

☆☆☆

''کیا تم واقعی ہی میں وہ ہو جو کہ عبایا میں ملبوس ہوا کرتی تھیں۔'' یہ سوال اس سے اتنی بار پوچھا جا چکا تھا کہ اب اسے خندہ پیشانی سے برداشت کرنا مشکل تھا۔ اس نے اِک برہم نظر اس پر ڈالی تھی۔
''میرے خدایا......!'' بے ساختہ اس نے دل پر ہاتھ رکھا تھا۔
''تم یوں بھی دیکھ سکتی ہو کیا؟'' شادی سے لے کر اب تک وہ حیران ہی تو ہو رہا تھا۔ اب اِک بار پھر ہوا اور اس کے حیران ہونے پر غزل نے اِک اور پہلے سے زیادہ برہم اور تیز نظر اس پر ڈالی تھی۔ ''غزل...... تم مجھ پر غصہ ہو رہی ہو کیا؟'' اور وہ گدھا...... اور شدت سے حیران ہوا یہ جانے بغیر کہ اس کی یہ ہی حیرانی تو غزل مراد کو چڑا رہی تھی۔
''میں اِک نارمل انسان ہوں...... اور غصہ آنے والی بات پر غصہ ہی کر سکتی ہوں ناں......'' نظروں کے برعکس اب کہ شدید برہم لہجے میں جواب آیا تھا۔ اور وہ ہنس دیا۔
''مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ میں اور تم...... یار کب کسی نے سوچا تھا ایسا......'' اور غزل اس بات پہ بل کھا کر رہ گئی تھی۔
''تو آپ جناب کو یقین دلوانے کے لیے میں کیا کروں......؟ سوئی چبھوں میں انگلی دے دوں......؟ زور سے چٹکی کاٹوں؟ یا پھر ہاتھوں کا استعمال کروں؟'' وہ واقعی میں دوبارہ آستین چڑھاتے ہوئے تنگ کر بولی تھی۔
''اوہ مائی گاڈ......'' اور اب کہ حیرت نے اسے دُہرا کر کے رکھ دیا تھا۔
''یہ تم ہو...... کیا واقعی ہی میں تم...... وہ ہی غزل مراد ہو...... ریئلی...... وہ یونی والی......؟'' حیران ہونے سے وہ پھر بھی باز نہیں آیا تھا۔ غزل زچ ہوئی۔ ناراضی سے اسے دیکھا اور اسے یہ یقین دلانے کے واسطے وہ نہ صرف غصہ ہو سکتی ہے بلکہ ناراض بھی ہو سکتی ہے۔ وہ واک آؤٹ کر گئی تھی اور جیسے ہی بالکونی کا دروازہ کھول کر وہ باہر نکلی اسے اِک قہقہہ سنائی دیا تھا۔ اچھا وہ اسے تنگ کر رہا تھا اور وہ واقعی تنگ ہوئے جا رہی تھی۔
''ایڈیٹ......'' وہ زیرلب مسکرائی۔
بالکونی میں ملگجا سا اندھیرا تھا۔ گھروں کی بیرونی آن لائٹس یہ بتانے کو کافی تھیں کہ مکین سو رہے تھے۔ ہوا بڑی مدھم سی، نرمی سے مورنی کی سی چال سے چلتی اس کے وجود سے ٹکرائی تھی۔ وہ اپنی پشت پر کمرے میں کھٹر پٹر کی آوازیں سن سکتی تھی۔ اپنے سامنے موجود مکانات کے سلسلے کو دیکھتے ہوئے اس نے ایک گہری طمانیت بھری سانس لی تھی۔
''تمہیں معلوم ہے لیکچرار، تعینات ہونے کے بعد میں نے پہلا کام کیا کیا تھا؟'' وہ گرل سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا تھا۔
''کیا، کیا تھا؟'' اِک نظر اسے دیکھنے کے بعد غزل نے گرل پر انگلی پھیرتے ہوئے پوچھا۔
''میں اسلامیات ڈیپارٹمنٹ تمہیں دیکھنے گیا تھا......'' چند لمحوں بعد جواب آیا اور وہ چونکی۔
''کیوں......؟''
''یہ دیکھنے کے لیے کہ اب اسلامیات کیسے پڑھائی جاتی ہے......'' اور وہ ہنس دی۔
''تو دیکھ لیا......؟'' چھیڑتے ہوئے لہجے میں پوچھا گیا۔
''تم نے کیوں آگے تعلیم نہ حاصل کی غزل؟ بڑے خواب تھے تمہارے۔''
غزل مدھم سا مسکرائی۔ اور اس کی انگلی گرل پر نادیدہ سی لکیریں کھینچی چلی گئی۔
''میری زندگی میں بے سکونی ہو گئی تھی...... مجھے سکون بس اسکول میں ملتا تھا۔ دیوارِ مہربانی پر کپڑے ٹانگنے میں ملتا تھا تو بس میں نے خود کو اسکول میں، فلاحی کلاسوں میں ضم کر دیا کہ چارہ اس کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔'' اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، انگلی کی حرکت رکی اور وہ مسکرائی۔
''اسی لیے تمہارے گریڈز بھی لو ہو گئے تھے؟'' مانی

ایک ہاتھ گرل کے اوپر رکھتے ہوئے حیرت سے بولا تھا۔
غزل کی انگلیوں کے درمیان بل پڑا اور......

"اُف......مانی......ایک تو......" اور اس کی بات ادھوری رہ گئی۔اس نے حیرانی سے درحقیقت شاک سے مانی کے ہاتھ میں موجود اس کیپ کو دیکھا تھا۔"تو یہ تمہارے پاس اب بھی موجود ہے مانی؟" اس نے عثمان کے ہاتھ سے کیپ لی اور مڑ کر دروازے کے قریب جا کر کمرے میں جلتی لائٹ کی روشنی میں اسے دیکھا......مانی نے مسکراتے ہوئے اس کے شاکڈ چہرے کو دیکھا۔وہ اب "thank you" کے الفاظ پر انگلی پھیر رہی تھی اور اس کے چہرے پر ناقابلِ فہم تاثرات تھے۔

"تم جانتے ہو میں نے یہ تھینک یو کیوں لکھا تھا؟" اس نے اچانک چہرہ اس کی طرف موڑتے ہوئے پوچھا۔

"اسکول کے لیے کی گئی مدد...... کے لیے۔" اور وہ زور کا قہقہہ لگا کر ہنس دی۔اس کی ہنسی بتاتی تھی کہ جواب غلط تھا۔مانی نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"تو پھر کیوں لکھا؟" وہ پوچھتے ہوئے اس کے قریب آیا۔غزل نے ہونٹ کا کونہ دانتوں میں دبایا اور شرارت سے پر آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھا۔

"کیا اسے بتا دوں؟" دل دھک،دھک کر کے پوچھتا تھا۔

"کیوں لکھا تھا؟" اس کے کندھے کو ٹھوکا دیتے ہوئے پوچھا گیا۔اس نے لبوں پر پھیلتی مسکراہٹ کو قابو کیا......سر جھکائے ایک بار پھر وہ اپنے لکھے گئے الفاظ پر انگلی پھیر رہی تھی۔

"you made me feel like a woman" اور پھر بے حد آہستگی سے اس نے کہا تھا۔

"واٹ......؟" مانی یوں بولا جیسے اس کا پورے کا پورا ہاتھ سوئچ میں دے دیا گیا ہو۔

"تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟" وہ سب سے زیادہ حیران اب دکھتا تھا۔

"بیڑا غرق......" غزل کوفت سے آنکھیں بند کرتے ہوئے بڑبڑائی تھی۔وہ ہر دفعہ ہی کیوں اتنا حیران ہو جایا کرتا تھا۔

"تم کہنا چاہتی ہو،میں نے تمہیں اٹریکٹ کیا؟"

پہلے وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر جھکا۔پھر اس نے دونوں بازو پھیلا کر کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ پایا اور اب......اب منوں،ٹنوں حیرت سے پوچھتا تھا۔

"I can,t believe this... can,t believe this میں نے......میں نے تمہیں اٹریکٹ کیا غزل......؟" وہ سب سے زیادہ والی حیرت کے ساتھ پوچھتا تھا اور غزل نے بے اختیار اپنا ماتھا دے مارنے والے انداز میں دروازے کی چوکھٹ سے ٹکرایا تھا۔

"یہ آدمی......" اس نے ایک تیز برہم نظر اس کے چہرے پر ڈالی تھی۔معلوم نہیں اعتراف سن کر اس شخص کی حالت کیا ہوگی؟ بے ساختہ اس نے سوچا تھا۔

☆☆☆

اس نے مانی سے کہا تھا اسے کچھ شاپنگ کرنی ہے۔جب وہ دونوں ہاتھ شاپنگ بیگ سے بھرے،لدی پھندی اور مانی کی جیب کا بیڑا غرق کر کے گاڑی میں بیٹھی تو اس نے مانی کو دیوارِ مہربانی کی طرف چلنے کو کہا تھا۔

"تو یہ ساری شاپنگ اس لیے تھی؟" مانی نے پوچھا اور اس نے جواب نہ دیا تھا۔وہ بس سر جھکائے بیگز کو چیک کر رہی تھی۔جون کی گرمی عروج پر تھی۔چلچلاتی دھوپ نے ہر طرف اِک غبار سا قائم کر رکھا تھا اور وہ اس دیوار کو بھر دینا چاہتی تھی۔عید سے پہلے،پہلے......گاڑی دیوار کے پاس جا کر رکی......گاڑی کے خنک ماحول سے نکلتے ہی لو کا اک بھرپور تھپڑ اس کے چہرے پر پڑا تھا۔اور وہ ساکت ہوئی......اس تھپڑ سے نہیں اس دیوار کو دیکھ کر اور یک دم اس پر انکشاف ہوا کہ محبت یہیں سے تو شروع ہوئی تھی۔وہ مانی کی اسی عادت سے تو متاثر ہوئی تھی......جیسے آج اس نے اتنے روپوں کی خریداری پہ کوئی سوال نہیں کیا تھا۔اور ان روپوں کو دیوار پر ٹانگنے پر بھی کوئی اِک سوالیہ نشان نہیں اٹھایا تھا۔ایسے ہی وہ تب،تب بھی کیا کرتا تھا،وہ پیدائشی سوشل ورکر تھا......اس کے پاس وہ دل تھا جو کہ کسی بھی مخلص سوشل ورکر کے پاس ہوتا ہے۔اس نے حیرت سے شاک سے مڑ کر گاڑی سے شاپنگ بیگز باہر نکالتے ہوئے مانی کو دیکھا۔

"مجھے اس شخص کے سوا اور کون سپورٹ کر سکتا تھا۔اور کون؟" اور اس کے ساتھ ہی غزل نے آنکھوں میں کسی چیز

کو ابھرتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ وہ اس کی طرف مڑی تھی۔ اس نے جھک کر گاڑی میں پڑے چند شاپنگ بیگز اپنے ہاتھ میں لیے تھے۔

''تمہیں معلوم ہے عثمان شاہد...... میں اسلامیات کیوں نہیں پڑھا سکی۔'' مصروف سے انداز میں شاپنگ بیگز اٹھاتے ہوئے سوال کیا گیا مانی نے حیرت سے اسے دیکھا۔ یہ کون سا موقع تھا...... یہ سوال پوچھنے کا؟ یا پھر اس بات کی وجہ بتانے کا؟

''کیوں نہ پڑھا پائیں؟'' وہ اس کی برہم نظر کا شکار اک بار پھر سے... نہیں ہونا چاہتا تھا سو حیرت دبا کر پوچھا...... غزل سیدھی ہوئی...... اک نظر آسمان پر ڈالی، سورج بڑی ہی تیز، تیز شعاعیں پھینک رہا تھا...... ہوا بھی گرم، گرم سی چل رہی تھی۔ اور پھر اس نے دوسری نظر اطراف میں ڈالی...... گاڑیوں کے پاں، پاں کا شور، گرمی سے بے حال ہوتے لوگوں کا ہجوم، ٹریفک کا سیاہ دھواں...... لوگوں کا شور...... ٹھیلے والوں کی آوازیں...... بھیک مانگتے ہوئے فقیر اور...... اور بے ساختہ اس نے اِک ٹھنڈی سی سانس بھری...... یہ کوئی آئیڈیل سچویشن تو نہیں تھی...... اعتراف کے لیے مگر کیا، کیا جائے کہ زندگی آئیڈیل سچویشن پیش نہیں کرتی اور کہانی کو وہیں پر ختم ہونا تھا کہ جہاں سے شروع ہوئی۔

''بول بھی دو اب......'' مانی نے ماتھے پر آیا پسینہ صاف کرتے ہوئے بیزاری سے کہا۔

''مجھے، مجھے......'' اس نے مانی کی آنکھوں میں دیکھنا چاہا اور نظر اس کی شرٹ کے بٹن گنتی تھی اور اس سے اوپر تلک جانے پر راضی نہیں ہوئی۔

''مجھے محبت ہوگئی تھی......'' اب کہ اس نے مانی کی فولڈ آستینوں کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''تم سے......'' اور جملے کا اگلا حصہ بے حد سرسراتا ہوا اس کے منہ سے نکلا اور نظر نے بالآخر کالر تک کا فاصلہ طے کر ہی لیا تھا۔

''کیا؟'' پہلے اس کا منہ کھلا اور اب...... اب کہ صحیح معنوں میں وہ سب سے زیادہ والی حیرت سے اپنے سامنے کھڑی عورت کو تکتا تھا۔

یہ ''کیا'' تو بڑی دیر بعد اس کے منہ سے ادا ہو رہا تھا...... وہ دو قدم آگے کو آیا۔ انکشاف ایسا زبردست کہ مانی کو ٹریفک کا شور، لوگوں کا ہجوم، گرمی، ٹھیلے والوں کی آوازیں سب کچھ پس منظر میں جاتا ہوا محسوس ہوا...... وہاں وہ تھا اور اس کے سامنے کھڑی، سیاہ عبایا میں ملبوس وہ عورت......

''تو کیا تم ساری عمر مجھے حیران کرتی رہوگی غزل مراد......؟'' اس کا لہجہ آنچ دیتا تھا۔ غزل جھکے سر کے ساتھ مسکرائی۔ اس نے شاپنگ بیگز کا وزن ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا اور نظر نے اِک بار پھر سے اس کی شرٹ کے بٹن گنے تھے۔ اب کہ ذرا قریب سے......

''ہاں......'' اس نے کہا اور مڑ گئی...... اور مڑ کر دیوار کی جانب بڑھنے لگی۔ وہ اپنی پشت پر تپش محسوس کرسکتی تھی۔ اور وہ دعوے سے کہہ سکتی تھی کہ یہ تپش سورج کی نہ تھی دو آنکھوں کی تھی۔

''تم کیا ہو غزل مراد......؟'' مانی نے شاؤٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

''as usual...... سمجھ سے باہر۔'' اس نے کندھے اچکا کر جواب دیا اور دیوار کی قریب جا کر شاپنگ بیگز زمین پر رکھ دیے...... وہ اب ان میں سے نئے کپڑے نکال کر وہاں ٹانگ رہی تھی۔ اور جبھی اس کے دائیں کندھے کے برابر اِک اور وجود آ کر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے بھی شاپنگ بیگز کو زمین پر رکھا اور ان میں سے کپڑے نکال کر دیوار پر ٹانگنے شروع کردیے۔ غزل نے ہاتھ روک کر اسے دیکھا...... عین اسی لمحے اس نے بھی ہاتھ روک کر اسے دیکھا تھا اور نظر نے اب کہ جرأت کر ہی لی تھی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا...... مسکرائی اور ہاتھ ایک بار پھر سے دیوار کو آراستہ کرنے لگے تھے۔ وہ خوش قسمت عورت تھی...... وہ پاک دامن تھی کہ اس نے دل کو اپنا عنان گیر بننے نہیں دیا تھا۔ اس نے اپنی سب لگامیں، سب ڈوریں، اس ایک کے سپرد کردی تھیں جو سب سے زیادہ حق رکھتا ہے کہ وجود اس کے حوالے کیے جائیں وہ ہی جو کہ حقیقی ''عنان گیر'' ہے۔'' وہ کہ جو ''رب'' ہے...... اور وہ ہی کہ جو ہماری زندگیوں کی تمام ڈوریں ہلاتا ہے۔

شمع ہدایت

اختر شجاعت

حُسنِ اخلاق...... وصفِ الٰہی

تمام تر تعریف اور تمام تر حمد و ثنا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جو اس کائنات کا مالک اور خالق ہے...... ایسی حمد جو ہمیشہ ہمیشہ رہے اور جس کا سلسلہ قطع نہ ہو اور جس کی گنتی شمار نہ کی جا سکے۔ اے میرے رب! تو نے ہمیں پیدا کیا اور ہر لحاظ سے درست پیدا کیا...... پیار ڈالا اور شفا بھی بخشی سب سے زیادہ رحم کرنے والے مالک ہماری حاجتیں پوری فرما دے...... آمین...... درود و سلام ہو ہمارے پیارے آقا سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور انؐ کی آلؓ پر......

آج ہمارا موضوع ''اخلاق'' ہے۔ اَخلاق خُلق کی جمع ہے جس کے لغوی معنی عادتیں، ملنساری، آؤ بھگت کرنا ہے۔

اخلاق، خُلق سے ہے جس کے معنی پختہ عادت کے ہیں۔ اصطلاحاً خلق سے مراد وہ اوصاف ہیں جو کسی کی فطرت و طبیعت کا اس طرح لازمی جزو بن جائیں کہ زیادہ غور و فکر کے بغیر روزمرہ کی زندگی میں ان کی زندگی کا ظہور ہوتا ہو۔

اللہ رب العزت نے اپنے رسول سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہت سے فضائل خاص طور پر عطا کیے لیکن ان اوصاف میں کسی کی ایسی تعریف نہیں کی جیسی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق کی فرمائی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''بے شک آپؐ اعلیٰ اخلاق پر فائز ہیں۔'' چونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب سے زیادہ پاکیزہ نفس تھے اس لیے خُلق میں بھی آپ ان سب سے احسن و اعلیٰ تھے۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ آپؐ کے اخلاق کیسے تھے؟ تو آپؓ نے فرمایا...... ''آپؐ کا اخلاق قرآن حکیم ہے۔'' حضرت قتادہؓ نے فرمایا اس کے یہ معنی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن حکیم کے احکام پر عمل فرماتے تھے اور جن کاموں سے قرآن روکتا ہے، وہ آپ نہیں کرتے تھے۔

حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں۔ ''حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا۔ اے میرے فرزند......! اگر تم سے ہو سکے تو تم صبح شام ایسی زندگی بسر کرو کہ تمہارے دل میں کسی کے خلاف میل نہ ہو۔'' اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ''یہی میری سنت ہے اور جس نے میری سنت کو زندہ کیا در حقیقت اس نے مجھے زندہ کیا اور وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا۔''

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اخلاقِ عالیہ کا وہ پیکرِ اُتم تھی جس کی نظیر پورے عالم میں نہیں مل سکتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب سے زیادہ سخی تھے آپؐ کے پاس کوئی درہم و دینار باقی نہیں رہتا تھا اگر کوئی رقم بچ جاتی اور کوئی آدمی ایسا نہ ملتا جسے وہ رقم دے سکیں اور رات ہو جاتی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت تک گھر جا کر آرام نہیں فرماتے تھے جب تک اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہ کر لیتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عام غذا خرما (چھوارے) اور جو تھی اس کے علاوہ جو کچھ ہوتا۔ اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتے جوتے گانٹھ لیتے، کپڑوں پر پیوند لگا لیتے، گھر والوں کے کام کاج میں ہاتھ بٹاتے۔

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ خُلقِ عظیم میں سخاوت الفت، نصیحت اور شفقت یہ چار اوصاف جمع ہوتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ شریفانہ اخلاق دس ہیں (1) سچ بولنا۔ (2) دنیا سے قطعی ناامیدی۔ (3)

سائل پر بخشش کرنا۔(4) پڑوسی یا دوست بھوکے ہوں تو خود پیٹ بھر کر نہ کھایا جائے۔(5) احسانات کا بدلہ دینا۔(6) امانت داری۔(7) صلۂ رحمی۔(8) دوست کے حقوق ادا کرنا۔(9) مہمان نوازی۔(10) حیا کرنا۔

☆☆☆

حُسنِ اخلاق، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفت ہے اور صدیقین کا افضل ترین عمل ہے۔ یہ حقیقت میں نصف دین ہے۔ اخلاقِ حسنہ جنت کے کھلے دریچے اور تقربِ الٰہی کے وسائل ہیں۔ اخلاقِ خبیثہ دلوں کے امراض ہیں اور روحوں کی بیماریاں ہیں...... بدن کے امراض دنیا کی زندگی سے محروم کر دیتے ہیں اور دل و روح کے امراض سے آخرت کی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا......

''میں اچھے اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں۔''

ایک شخص سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور پوچھا۔''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دِین کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔''حُسنِ خلق۔'' وہ شخص چلا گیا اور دوبارہ دائیں طرف سے آیا اور وہی سوال آیا آپ نے پھر فرمایا۔''حُسنِ خلق'' وہ شخص تیسری مرتبہ بائیں طرف سے آیا اور کہنے لگا۔''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دین کیا ہے؟'' آپ نے فرمایا''حُسنِ خلق'' اس شخص نے چوتھی بار بھی یہی سوال کیا اور پیچھے کی طرف سے آیا...... آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔''کیا تو سمجھتا نہیں ہے دین یہ ہے کہ تو غصہ نہ کرے۔''

ایک شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا......''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نحوست کیا ہے؟'' فرمایا۔''بد خلقی۔''

آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ''جہاں بھی رہو اللہ سے ڈرتے رہو۔ گناہ کے بعد نیک کام ضرور کر لیا کرو، نیکی گناہ کو مٹا دیتی ہے۔ اور لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق کا معاملہ کرو۔''

ایک بار پوچھا گیا کہ سب سے اچھا عمل کون سا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔''خوش اخلاقی۔''

ایک شخص نے ایک بار آقا کی بارگاہ میں عرض کیا کہ فلاں عورت دن میں روزے رکھتی ہے راتوں کو نماز پڑھتی ہے مگر بد اخلاق بھی ہے، اپنے پڑوسیوں کو زبان سے تکلیف پہنچاتی ہے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔''اس عورت میں کوئی خیر نہیں ہے یہ دوزخی ہے۔''

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''میزان میں سب سے پہلے حُسنِ اخلاق اور سخاوت رکھی جائے گی۔ جب اللہ تعالیٰ نے ایمان کی تخلیق فرمائی تو اس نے عرض کیا......اے اللہ......! مجھے قوت عطا کر۔ اللہ نے اسے حسن خلق اور سخاوت سے تقویت بخشی اور جب کفر پیدا کیا تو اس نے عرض کیا۔ اے اللہ! مجھے طاقت دے...... اللہ نے اسے بخل اور بد خلقی کی طاقت عطا کی۔

صحابہؓ نے عرض کیا...... یا رسول اللہ صلی علیہ وآلہ وسلم ایمان کے اعتبار سے کون سا مومن افضل ہے؟ فرمایا۔'' جو اخلاق کے اعتبار سے سب سے بہتر ہو۔'' آپ نے یہ بھی فرمایا۔''بد اخلاقی عمل کو اس طرح فاسد کر دیتی ہے جس طرح سرکہ شہد کو خراب کر دیتا ہے۔''

اور یہ کہ'' خوش اخلاقی گناہ کو اس طرح گلا دیتی ہے جس طرح سورج برف کو پگھلا دیتا ہے۔''

حضرت ام حبیبہؓ نے حضور کی خدمت میں عرض کیا......''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر دنیا میں کسی عورت کے دو شوہر تھے اور دونوں مر گئے تو وہ عورت جنت میں کس کو ملے گی؟'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔''اس کو ملے گی جو دنیا میں اس کے ساتھ خوش خلقی سے رہا ہوگا...... اے ام حبیبہؓ! خوش خلق دنیا و آخرت کا خیر لے کر گیا ہے۔''

''جس مسلمان کو خدا توفیق دیتا ہے وہ اپنی خوش اخلاقی اور طبیعت کے کرم سے روزے دار اور شبِ زندہ دار عابد کا درجہ پالیتا ہے۔''

''بندہ اپنی خوش اخلاقی سے بڑے، بڑے درجات اور منازل کا شرف حاصل کرے گا حالانکہ وہ عبادت میں کمزور ہوگا۔''

''بد خلقی ایک ناقابلِ معافی گناہ ہے اور بدگمانی ایک ایسا گناہ ہے جس سے دوسرے گناہ پیدا ہوتے ہیں۔''

☆☆☆

ایک یہودی نے حضرت مالک بن دینارؒ کے

پڑوس میں مکان کرایے پر لیا...... جہاں آپ کا عبادت خانہ بالکل دیوار کے ساتھ تھا۔ یہودی نے بغض کے سبب اپنے مکان کی چھت پر ایک پرنالہ بنایا جو عین عبادت خانے میں جا کر گرتا تھا۔ پھر اس نے پرنالہ میں سے اپنے گھر کی نجاست اور گندگی بہانی شروع کر دی...... جس کے باعث آپ کی عبادت گاہ ناپاک اور خراب ہو جاتی...... ایک مدت تک یہودی ایسا کرتا رہا...... مگر حضرت مالکؒ نے کسی کے سامنے اس کا شکوہ کیا نہ شکایت...... آخر کار ایک روز وہ یہودی آپ کے پاس آیا...... اور کہا...... ”اے ابنِ دینار...... آپ کو میرے پرنالے سے کسی طرح کی تکلیف نہیں پہنچی......؟ آپؒ نے فرمایا...... ”وہ نجاست جو نالے سے گرتی ہے اسے دھو ڈالتا ہوں اور بس......“ یہودی آپ کے جواب پر سخت حیران ہوا اور کہا۔ ”حضرت آپ روزانہ اس تکلیف کو کیونکر گوارا کرتے ہیں اور اس غم و غصے کو کس طرح ضبط کرتے ہیں......“ آپؒ نے فرمایا۔ ”میرے رب کا یہ ارشاد ہے کہ جو لوگ غصے کو روکتے ہیں اور لوگوں کے قصور معاف کر دیتے ہیں خدا ان سے دوستی فرماتا ہے۔ پس ہم لوگ دنیا میں اپنے اللہ سے دوستی پیدا کرنے کے لیے آئے ہیں۔ دشمنی پیدا کرنے کے لیے۔“

تب بے ساختہ یہودی بول اٹھا ”واقعی آپؒ اللہ کے پیارے ہیں جس مذہب میں غصہ حرام ہو وہ کتنا بہترین ہے۔“ آپؒ کی خوش اخلاقی کے باعث وہ یہودی مسلمان ہو گیا۔

☆☆☆

ایک دفعہ ایک شخص حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو قتل کرنے کے ارادے سے آیا۔ حضرت نے اس کے تیور بھانپ لیے۔ جب وہ آپ کے قریب آیا تو آپ نہایت خندہ پیشانی سے پیش آئے اور بڑی نرمی سے فرمایا۔ ”بھائی تم جس ارادے سے آئے ہو اس کو پورا کرو میں تمہارے سامنے موجود ہوں۔“ یہ بات سن کر اس شخص کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا اور وہ آپؒ کے قدموں میں گر گیا اور کہنے لگا کہ ”مجھ کو لالچ دے کر آپؒ کو قتل کرنے پر مامور کیا گیا تھا اسی مقصد کے لیے میں یہ چھری اپنی بغل میں چھپا کر لایا تھا اب آپ اسی چھری سے میرا کام تمام کر دیں۔“ آپؒ نے فرمایا۔ ”مومنوں کا شیوہ تو یہ ہے کہ جو اُن سے بدی کرتا ہے وہ اس کے ساتھ بھی نیکی کرتے ہیں۔“ یہ کہہ کر آپ نے اس کو گلے لگا لیا پھر اس کے حق میں دعائے خیر کی...... اس شخص پر آپ کے بلند اخلاق کا اس قدر اثر ہوا کہ وہ دن رات آپ کی خدمت میں رہنے لگا اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی...... آپؒ کی صحبت نے اسے پتھر سے ہیرا بنا دیا۔

☆☆☆

ایک بار ایک عورت نے حضرت شیخ مالک بن دینارؒ کو پکار کر کہا...... اے ریاکار......! آپؒ نے فرمایا۔ ”اے خاتون! بصرہ کے لوگ میرا نام بھول گئے تھے تو نے اس نام کو تلاش کر لیا۔“ یہ تھا ہمارے اسلاف کا اخلاق اور بردباری......

ایک فقیر مدینہ منورہ کی گلی میں بیٹھا ہوا تھا...... اتفاقاً حضرت سیدنا عمر فاروقؓ اس طرف سے گزرے اور بے دھیانی میں فقیر کے پاؤں پر پاؤں پڑ گیا...... فقیر نے ناراض ہو کر چلا کر کچھ نازیبا کلمات کہے...... حضرت عمر فاروقؓ نے کمالِ مہربانی سے جواب دیا۔ ”بھائی...... اندھا تو نہیں ہوں لیکن مجھ سے قصور سرزد ہوا ہے برائے مہربانی مجھے معاف کر دو۔“

حضرت شیخ عبداللہ خیاطؒ ایک بزرگ شخص تھے...... آپؒ درزی کا کام کرتے تھے ایک آتش پرست ان سے کپڑے سلواتا تھا اور ہر بار اجرت میں کھوٹے درہم ان کو دے جاتا اور آپ اس کو لے لیتے...... ایک بار آپؒ کہیں گئے ہوئے تھے۔ شاگرد نے آتش پرست سے کھوٹے درہم نہیں لیے جب شیخ واپس آئے اور ان کو یہ معلوم ہوا تو آپ نے مسکرا کر شاگرد سے کہا تو نے درہم کیوں نہ لیا۔ جبکہ کئی سال سے وہ مجھے کھوٹے درہم ہی دیتا ہے اور میں جان بوجھ کر خاموشی سے لے لیتا ہوں تا کہ وہ یہ کھوٹے درہم کسی دوسرے مسلمان کو نہ دے۔

سبحان اللہ...... کیا حسن اخلاق ہے کہ دوسرے مسلمان کو بچانے کی خاطر اپنا مالی نقصان کر لیتے ہیں۔

حضرت مولا علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں۔ ”تم لوگ اچھے اخلاق کو لازم پکڑ لو کیونکہ یہ یقیناً جنت میں لے جائے گا۔“

کوفہ میں حضرت امام ابو حنیفہؒ کے پڑوس میں ایک موچی رہتا تھا جو تمام دن تو محنت مزدوری کرتا اور رات گئے

گھر میں گوشت یا مچھلی لے کر آتا پھر اسے بھون کر کھاتا اور اس کے بعد شراب پیتا اور پھر شراب کے نشے میں خوب اودھم مچاتا...... اور شور کرتا...... رات گئے تک یہ سلسلہ جاری رہتا...... حضرت امام ابو حنیفہؒ کو اس کے شور و غل سے بہت تکلیف ہوتی لیکن آپ تمام رات نماز میں مشغول رہتے...... ایک رات اس ہمسایہ موچی کی آواز نہ سنی...... صبح اس کے بارے میں دریافت کیا تو پتا لگا یا کہ رات کو اسے سپاہی پکڑ کر لے گئے ہیں۔ موچی کی گرفتاری کی خبر سن کر آپؒ بے قرار ہو گئے۔ اس وقت خلیفہ منصور کا بھتیجا عیسیٰ بن موسیٰ کوفے کا گورنر تھا۔ آپ اس کے دربار میں پہنچے تو وہ فوراً اپنی نشست سے اٹھا اور نہایت ادب سے آپؒ کو اپنے قریب بٹھایا اور پھر عرض کیا...... آپؒ نے کیوں زحمت کی...... مجھے بلا بھیجتے میں خود حاضر ہو جاتا۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ نے جواباً فرمایا۔ ”ہمارے محلے کے ایک موچی کو آپؒ کے کوتوال نے گرفتار کر لیا ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ لے جانے آیا ہوں۔“ عیسیٰ نے اسی وقت داروغہ کو موچی کی رہائی کا حکم دیا...... کچھ دیر بعد امام صاحب اپنے ہمسائے کو لے کر گھر کی جانب روانہ ہو گئے۔

موچی اکثر شور و غل کے دوران ایک شعر پڑھتا تھا۔ ”لوگوں نے مجھے ہاتھ سے کھو دیا اور کیسے بڑے شخص کو کھو دیا جو لڑائی کے دن کام آتا۔“ جب امام صاحب اسے لے کر راستے میں گھر کی طرف جا رہے تھے تو آپؒ نے موچی سے پوچھا۔ ”کیوں ہم نے تمہیں کھویا تو نہیں !“ یہ اسی شعر کی طرف اشارہ تھا جسے موچی شراب پی کر پڑھا کرتا تھا۔

”نہیں...... آپؒ نے ہمسائیگی کا حق ادا کر دیا۔“

یہ کہتے ہوئے موچی رو پڑا اور اس نے عیش پرستی سے توبہ کر لی...... اور امام کے اخلاق کی بدولت تائب ہو کر وہ آپؒ کے حلقہ درس میں بیٹھنے لگا۔

☆☆☆

حضرت بایزید بسطامیؒ کے پڑوس میں ایک آتش پرست رہتا تھا۔ اس کا ایک شیر خوار بچہ تھا۔ بچہ رات کی تاریکی میں روتا رہتا تھا۔ اس لیے کہ وہ آتش پرست شخص غریب تھا اور چراغ جلانے کے لیے اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ ایک رات بچہ بہت رویا...... حضرت بایزیدؒ اٹھے اور اپنا چراغ اس کے گھر چھوڑ آئے...... بچہ چپ ہو گیا...... دوسری رات بھی حضرت نے ایسا ہی کیا۔ اور پھر تیسری رات بھی...... آپ کے حُسنِ اخلاق سے وہ اس قدر متاثر ہوا کہ اگلے دن دونوں میاں بیوی حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئے۔

☆☆☆

سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعلیٰ ترین حُسنِ اخلاق اور کردار کی برکت سے پوری دنیا میں اسلام پھیلا...... آپؐ نے ہمیشہ حُسنِ اخلاق کو پیشِ نظر رکھا...... حُسنِ اخلاق کی نعمت صرف سعادت مندوں کا حصہ ہے اور اللہ تعالیٰ کا خاص الخاص انعام ہے۔ حسن اخلاق میں حُسن ہی حسن ہے اور بد اخلاقی میں کراہیت ہی کراہیت ہے۔

تصوف نام ہی اخلاق کا ہے جو جتنا زیادہ با اخلاق ہو گا وہ تصوف میں اتنا ہی بلند مقام رکھتا ہو گا۔

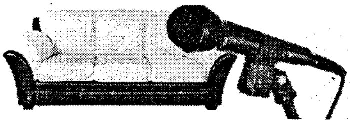
تو اللہ والوں کے اخلاق نہایت بلند ہوتے ہیں۔ ان کے دل اللہ کی مخلوق کی ہمدردی سے معمور ہوتے ہیں۔ کبھی اتباعِ سنت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ اپنی ذات کے لیے کبھی غصہ نہیں کرتے...... مگر آج ہم اپنے معاشرے پر نظر ڈالیں تو ہم کس قدر اخلاقی پستی کی طرف جا رہے ہیں...... اخلاقی طور پر ہم اس قدر دیوالیہ ہو چکے ہیں کہ حسن خلق، سخاوت، سچائی، خوش اخلاقی کو تو ہم بھول ہی چکے ہیں اور ان سے محروم ہو رہے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ حسن اخلاق کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”خندہ پیشانی سے پیش آنا...... اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اور کسی کو تکلیف نہ دینے کا نام حُسنِ اخلاق ہے۔“

تو اللہ تعالیٰ ہمیں بھی حسن اخلاق کی نعمت سے نوازے...... اور ہم بھی حسن اخلاق سے اپنے مسلمان بہن، بھائیوں کے ساتھ پیش آ سکیں...... آمین۔

آخر میں ان تمام عظیم ہستیوں کی تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ جن کی کتب سے میں نے مضامین منتخب کیے۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی خاص رحمتوں کا نزول فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کے پڑھنے والوں کو بھی علمی و عملی منافع عطا فرمائے، آمین۔

☆☆☆



پاکیزہ کے مہمان

شائستہ زریں

سلجھی ہوئی طبیعت کی مالک ایک باشعور

حقیقت پسند، محنتی اور باصلاحیت

ٹی وی آرٹسٹ

مدیحہ رضوی





پاکستان فلم نگری کی مونا لیزا دیبا خانم نے اپنی مسحور کُن مسکراہٹ اور دلربا اداکاری سے برسوں فلمی صنعت اور فلم بینوں کے دلوں پر راج کیا ہے۔ بڑی اسکرین سے چھوٹی اسکرین تک کے سفر میں بے پناہ مقبولیت، شہرت اور شاندار کامیابی حاصل کی۔ ہماری آج کی پاکیزہ کی مہمان، ممتاز اداکارہ دیبا خانم اور مشہور فلمی کیمرا مین نعیم رضوی کی صاحبزادی مدیحہ رضوی ہیں۔ مدیحہ کا ایک بھائی عمران رضوی معروف

ٹی وی آرٹسٹ ہے۔ شادی ممتاز اور منجھے ہوئے ٹی وی آرٹسٹ رشید ناز کے صاحبزادے حسن نعمان سے ہوئی جو خود بھی ٹی وی آرٹسٹ ہیں اور اپنی متنوع اداکاری کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ اپنی ماں دیبا خانم کی طرح محنتی، دل لبھانے والی مسکراہٹ اور بہترین اداکاری مدیحہ رضوی کا امتیاز ہے۔ ایک نہیں کئی ایک ڈراموں میں مدیحہ نے عمدہ فن کا مظاہرہ کیا۔ شکل اور مسکراہٹ میں اپنی ماں سے مشابہت رکھنے والی، شوخ و چنچل، ہنس مکھ، ملنسار، خوش اخلاق، حد درجہ صاف گو، اپنے ہنر میں طاق، سلجھی ہوئی اور میٹھی طبیعت کی حامل مدیحہ رضوی کا انٹرویو کر کے بہت لطف آیا۔ مسلسل شوٹنگو، عیدِ قرباں کی تیاریاں، بے پناہ مصروفیات کے باوجود گاہے بہ گاہے پاکیزہ کے لیے وقت نکال کر بالآخر مدیحہ، پاکیزہ کی مہمان بن ہی گئیں۔

مدیحہ سے انٹرویو کے دوران اس شعر نے اپنے حصار میں لیے رکھا......

گلابوں کی طرح دل اپنا شبنم میں بھگوتے ہیں
محبت کرنے والے خوب صورت لوگ ہوتے ہیں

آئیں ملاقات کرتے ہیں من موہنی صورت اور دلنواز شخصیت کی مالک مدیحہ رضوی سے۔

پاکیزہ ✧......بچپن ہی میں سوچ لیا تھا کہ امی کی طرح اداکاری کرنی ہے؟

مدیحہ رضوی ❖......سوچ تو بچپن ہی میں لیا تھا لیکن اس معاملے میں زیادہ سنجیدہ نہیں تھی۔ کچھ مجھے یقین بھی نہیں تھا کہ میں کر بھی پاؤں گی یا مجھے اس کی اجازت بھی ملے گی۔ لیکن چاہتی ضرور تھی کام کرنا۔

پاکیزہ ✧......زمانۂ طالب علمی کی غیر نصابی سرگرمیوں میں کبھی ڈراموں میں حصہ لیا؟

مدیحہ رضوی ❖...... ڈراموں میں تو کبھی نہیں، ہاں اسپورٹس میں بہت پیش پیش رہتی تھی۔

پاکیزہ ✧......پہلا ٹی وی ڈراما کون سا تھا؟ پزیرائی کیسے ہوئی اور آپ کے احساسات کیا تھے؟

مدیحہ رضوی ❖......" زندگی دھوپ تم گھنا سایہ" جو بہت ہٹ پروجیکٹ تھا اور اسی سے مجھے بہت پزیرائی ملی۔ پہچان بننا شروع ہوئی، لوگ جاننا شروع ہوئے اور یہ سب مجھے بہت اچھا لگتا تھا لیکن اس وقت کام کی اتنی سمجھ نہیں تھی، اتنا پتہ نہیں تھا کہ ہٹ کیا ہوتا ہے؟ فلاپ کیا ہوتا ہے؟ احساسات خوشگوار تھے اور میرا رویہ بالکل نارمل تھا لیکن وہ میرا پہلا ڈراما تھا اس لیے ہمیشہ یہی لگتا ہے کہ میں نے بہت خراب کام کیا اس سے زیادہ بہتر کرنا چاہیے تھا۔

پاکیزہ ✧......آپ کے خیال میں حسن و خوب صورتی کی بنیاد پر اداکاری کے شعبے میں کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے؟

مدیحہ رضوی ❖......اس بنیاد پر ملنے والا کام وقتی ہوتا ہے اور اگر جلد ہی کام سیکھ لیا جائے تو پھر حسن و خوب صورتی اضافی خوبی بن جاتی ہے۔ کامیابیاں حاصل کرنے کے لیے خوب صورتی کافی نہیں، محنت



اداکارہ دیبا اور ان کی فنکارہ بیٹی مدیحہ رضوی

اور لگن سے کام کر کے اپنا مقام بنایا جاتا ہے۔

پاکیزہ ✧......ڈرامے کے لیے ہامی بھرتے ہوئے اہمیت کردار کو دیتی ہیں، اسکرپٹ کو یا ڈائریکٹر کو؟



مدیحہ رضوی ❖......سب سے پہلے میں اسکرپٹ دیکھتی ہوں۔کہانی سنتی ہوں اور پھر اس کے بعد ظاہر ہے ڈائریکٹر اور اسکرپٹ رائٹر...... بنیادی طور پر دونوں ہی بہت ضروری ہیں لیکن ہر چیز کا بنانا اور بگاڑنا ڈائریکٹر کے ہاتھ میں ہوتا ہے اگر اسکرپٹ بہت اچھا ہو اور ڈائریکٹر اچھا نہ ہو تو وہ اسکرپٹ بیکار ہو جاتا ہے۔اور ایک اچھا ڈائریکٹر اسی اسکرپٹ کو کہیں سے کہیں لے جاتا ہے اپنے ہنر سے پروجیکٹ ہٹ کروا دیتا ہے۔کہانی اور کردار پہلے دیکھ لیتی ہوں لیکن زیادہ فوکس ڈائریکٹر پر کرتی ہوں۔

پاکیزہ ✧......سوپ اور سیریل میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو آپ کسے چنیں گی؟

مدیحہ رضوی ❖...... لازمی سی بات ہے کہ سیریل کو چنوں گی اس کی وجہ بظاہر جو سب کو پتا ہے وہ یہی ہے کہ سیریل کا دورانیہ کم ہوتا ہے،شوٹنگ ڈیز کم ہوتے ہیں حد سے حد ستائیس، اٹھائیس دنوں میں تیار ہو جاتی ہے۔اسی لیے میں سیریل ہی کو ترجیح دوں گی۔

پاکیزہ ✧......اب تک کیا جانے والا سب سے مشکل کردار کون سا تھا؟ اور وہ کردار آپ کو مشکل کیوں لگا؟

مدیحہ رضوی ❖......ایک نہیں تین ایسے کردار تھے اور تینوں ہی اپنے، اپنے حساب سے مشکل تھے۔ ایک ''میری ماں'' میں نمرہ کا کردار جو میری فطرت کے خلاف تھا اور پھر یہ بھی کہ پہلی مرتبہ میں نے بہت زیادہ منفی کردار کیا تھا ورنہ اس سے قبل تو میں نے سارے ہی کردار رونے دھونے والے کیے تھے۔دوسرا ''میرے مہرباں'' میں ثنا کا کردار اس لیے چیلنجنگ تھا کہ اس کردار کی کئی باؤنڈریز تھیں وہ ایک گھٹی ہوئی لیکن بہت اچھی لڑکی کا کردار تھا۔اس کردار میں، میں بہت زیادہ ایکسپریسو نہیں ہو سکتی تھی۔ایکسپریشن کے حساب سے بھی اور باتوں کے حساب سے بھی جہاں لفظ بول نہ پائیں وہاں ایکسپریشن کنٹرول کرنا پڑتا ہے اور تیسرا ''سمی'' میں چودھرائن کا کردار وہ تو بالکل مختلف تھا بہت رعب اور دبدبے والا کردار جو میرے لیے بہت مشکل تھا۔

پاکیزہ ✧......اپنے بچپن میں امی کو فلموں میں کام کرتے یا امی کی فلمیں دیکھ کر کبھی فلم میں کام کرنے کو جی چاہا؟

مدیحہ رضوی ❖......بہت دل چاہتا تھا لیکن صرف فلم میں کام کرنے کا شوق نہیں تھا۔اگر ایسا ہوتا تو میں فلم ہی سے شروع کرتی۔یوں بھی جب میں نے

کام شروع کیا اس دور میں فلمیں بھی کچھ ایسی تھیں کہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ فلم میں کام کرنا ہے۔ اس لیے میں نے ٹی وی سے شروع کیا۔

پاکیزہ ✧......اگر اب فلم میں کام کرنے کا موقع ملا تو کام کریں گی؟

مدیحہ رضوی ❖......پہلے سبجیکٹ اور کہانی دیکھوں گی کہانی اچھی ہوگی تو ضرور کروں گی۔

پاکیزہ ✧......میکے اور سسرال میں آپ کے فن کا بہترین قدردان اور نقاد کون ہے؟

مدیحہ رضوی ❖......میکے میں امی ......چونکہ وہ خود بہت بڑی اداکارہ ہیں، کام اچھا لگتا ہے تعریف کرتی ہیں، جو چیزیں سمجھ میں نہیں آتیں وہ سمجھاتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ کس طرح کرنا ہے۔ میرا بھائی عمران رضوی جو خود بہت اچھا اداکار ہے۔ فیلڈ میں اس کا بڑا نام ہے ضرور بتاتا ہے۔ بابا میرے سسر جو ایک نامور فنکار ہیں بہت سراہتے ہیں۔ ہم میاں بیوی بھی ایک دوسرے کے کام پر رائے ضرور دیتے ہیں اور اس کے اچھے برے پہلوؤں پر بات کرتے ہیں۔

پاکیزہ ✧......ٹی وی ڈرامے کی دلہن اور حقیقی زندگی کی دلہن کی تیاری میں کیا فرق ہے؟

مدیحہ رضوی ❖......زمین آسمان کا فرق ہے ڈرامے کی دلہن بنتے ہوئے ہم بہت اوازار (بیزار) ہوتے ہیں کیونکہ ایسے سین بہت وقت لیتے ہیں تو دل چاہتا ہے کہ جلدی سے ختم ہو جائے۔ اس میں کپڑے اور جیولری بھی پروڈکشن ارینج کرتی ہے اور ہم پہن لیتے ہیں، اس کے برعکس حقیقی زندگی کی دلہن کی تیاری بڑے دل سے ہوتی ہے۔ اس میں ہمارے جذبات و احساسات ہوتے ہیں، گھبراہٹ بھی ہوتی ہے، ماں باپ سے بچھڑنے کا دکھ بھی ہوتا ہے۔ کپڑے، زیورات، میک اپ وغیرہ ہر چیز کے انتخاب میں دلہن کی پسند، مرضی اور دلی خوشی کو اہمیت دی جاتی ہے۔ اور ظاہر ہے اس کا اندازہ مجھے اپنی شادی کے موقع پر ہی ہوا۔

پاکیزہ ✧...... اور اب کچھ باتیں آپ کی ازدواجی اور نجی زندگی کے حوالے سے ہو جائیں یہ بتائیں حسن سے پہلا تعارف کب اور کس عمر میں ہوا؟

مدیحہ رضوی ❖......عمر؟ بھئی یہ تو بہت غلط بات پوچھ لی آپ نے۔ (شرارتی ہنسی) میری شادی کو تین سال ہو گئے اس سے پہلے ہم آٹھ سال تک دوست رہے ہمارے دوستوں کا ایک گروپ تھا اس میں میرا بھائی عمران بھی شامل تھا۔ اس وقت تک میرے اور حسن کے درمیان صرف دوستی تھی پیار محبت والا کوئی تعلق نہیں تھا۔

مدیحہ رضوی کی کل کائنات ان کی پیاری، پیاری بیٹیاں



پاکیزہ ✧......کبھی سوچا تھا کہ یہ دوستی اور ہی رنگ میں ڈھل جائے گی؟ یا حسن نے اشارتاً بھی کبھی اپنی دلی کیفیت بیان کرنے کی کوشش کی؟

مدیحہ رضوی ❖......میں نے بھی ایسا نہیں سوچا تھا، ہاں گزرتے وقت کے ساتھ یہ ضرور ہوا حسن نے کئی بار اشارتاً دل کی بات کہنے کی کوشش کی بلکہ کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

پاکیزہ ✧......جب حسن نے آپ کو اپنی شریکِ حیات بنانے کی خواہش کا اظہار کیا تب آپ کا فوری... ردِعمل کیا تھا؟

مدیحہ رضوی ❖......میں نے انکار کر دیا تھا۔

پاکیزہ ✧......آپ کی کون سی خوبی سے متاثر ہو کر حسن نے یہ قدم اٹھایا؟

مدیحہ رضوی ❖......میرے اندر جدو جہد کا جذبہ بہت ہے، روایتی لڑکیوں والی چیزیں مجھ میں نہیں ٹام بوائے قسم کی چیز ہوں۔ اوہ گاڈ اور آوچ والی نہیں ہوں میرے اندر نزاکت نہیں ہے رف اینڈ ٹف ہوں اور بحیثیت دوست، حسن یہ سب جانتے تھے لیکن میرا خیال ہے کہ حسن کو میرا independent ہونا اچھا لگتا تھا۔

پاکیزہ ✧......آپ کی شادی کی انوکھی بات کون سی تھی؟

مدیحہ رضوی ❖......میری شادی بہت ہی عجیب طریقے سے ہوئی تھی منگنی کراچی میں ہوئی۔ پھر اس کے بعد ہم لاہور گئے، میری مہندی اور بارات وہاں ہوئی اسی دن میں اسلام آباد پہنچ گئی۔ میرا ولیمہ اسلام آباد میں ہوا۔ یہ ہے ہماری شادی کی انوکھی بات۔

پاکیزہ ✧......اپنی شادی کی رسومات میں میکے اور سسرال کی کون سی رسم بہت اچھی لگی؟ اور کون سی بری؟

مدیحہ رضوی ❖......چور مہندی میں مجھے بہت لطف آیا۔ یہ پشاور میں منائی جانے والی میری سسرالی رسم ''چور مہندی'' اس میں دولھا والے کسی بھی وقت اچانک دھاوا بول دیتے ہیں اور پھر ڈانس ڈھول گانا بجانا ہلا گلا کھانا پینا ہوتا ہے۔ میں رات کے وقت اپنی دوستوں سے بیٹھی گپ شپ کر رہی تھی کہ ایک دم ڈھول بجنے کی آواز آئی میں پریشان ہوگئی کہ یہ کیا ہوگیا جب دس منٹ تک مستقل ڈھول بجتا رہا تو احساس ہوا کہ یہ تو چور مہندی ہے۔ بس پھر میں نے بھی ایک شرارت کی، اپنی دوست کو اپنے کپڑے پہنا دیے اور گھونگٹ اوڑھا کر اس کو بٹھا دیا اور خود چھپ گئی لیکن کچھ ہی دیر بعد ان کو احساس ہوگیا کہ یہ میں نہیں ہوں۔

پاکیزہ ✧...... بیاہ کر دوسرے شہر جانے کے خیال سے رخصتی کے وقت کیا احساسات تھے؟

مدیحہ رضوی ❖......دو تین شہروں میں شادی کی تقریبات نمٹانے میں بہت بھاگ دوڑ اور تیاریاں کرنی تھیں اس لیے رخصتی کے وقت کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ماں باپ سے الگ ہونے کا دکھ تھا مگر خوشی تھی کہ گھر والے بہت خوش تھے۔ ہاں شادی کے دو چار روز گزرنے کے بعد سمجھ آئی کہ بہت کچھ بدل گیا ہے اب میں یہیں رہوں گی۔ شادی سے پہلے بھی چار سال تک کراچی میں اکیلی رہ چکی ہوں، میں ایموشنل نہیں ہوں بہت پریکٹیکل ہوں میرے گھر والے بھی ایسے ہی ہیں۔

پاکیزہ ✧......بیاہ کر دوسرے شہر گئیں تو گھر میں کوئی دوسری عورت نہیں تھی تب ماں کی کمی کیسے محسوس ہوئی؟

مدیحہ رضوی ❖......ہاں بہت کم لوگ سمجھتے ہیں اس بات کو، آپ پہلی ہیں جس نے مجھ سے یہ سوال کیا بہت اچھا سوال ہے، امی، میری دو بھابیاں اور میں سسرال گئی تو وہاں کوئی عورت نہیں تھی۔

بابا (میرے سسر) اور حسن مل کر گھر چلا رہے تھے۔ ظاہر ہے گھر کی جو سمجھ عورت کو ہوتی ہے وہ مرد کو نہیں ہوتی۔ حالات کے تحت مرد کو مجبوری میں سنبھالنا پڑتا ہے جب میں یہاں آئی تو حسن نے اپنی امی کی جگہ لی ہوئی تھی۔ ہر چیز سنبھالی ہوئی تھی۔ کچھ چیزوں میں مجھے دشواری بھی ہوئی۔ چیزوں کو دیکھتی تھی تو مجھے احساس ہوتا تھا کہ یہ عورت کے سنبھالنے کی چیزیں



ممتا کا مان لیے مدیحہ رضوی

ہیں۔اپنے ہاتھ میں باگ ڈور لے لی، آہستہ، آہستہ مجھے سب چیزوں کی سمجھ آئی تقریباً ڈھائی تین سال لگے مجھے چیزوں کو سمجھنے اور سمجھانے میں اور ٹیک اوور کرنے میں، گھر عورت ہی کو سنبھالنا ہوتا ہے۔

پاکیزہ ✧......کہتے ہیں جس گھر میں ساس نہیں ہوتی وہاں سسر سخت گیر ساس کا کردار ادا کرتے ہیں؟ آپ کا کیا تجربہ ہے؟

مدیحہ رضوی ❖......میرا تجربہ بالکل مختلف، نہایت خوشگوار اور مثالی اور بہت سے لوگوں کے لیے فلمی سا بھی ہے۔ بابا سخت گیر سسر نہیں تو سخت گیر ساس کا کردار کیسے ادا کر سکتے ہیں۔ بابا بہت اچھے کردار کے بے انتہا سمجھدار انسان ہیں۔ رشتوں کے تقدس کا احترام کرنے والے چھوٹے بڑے کا لحاظ اور خیال رکھنے والے خاندانی انسان ہیں۔ جیسی میرے ابا کے ساتھ میری دوستی تھی ایسا ہی تعلق میں نے بابا سے رکھا۔ بابا اور میری ایسی دوستی ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے اپنی باتیں شیئر کرتے ہیں۔ ہیں تو وہ پرانے زمانے کے لیکن ان کی سوچ نئی ہے۔ آج تک انہوں نے مجھے کسی چیز کے لیے نہیں روکا ٹوکا۔ میری ساس بہت شاندار اور زندہ دل خاتون تھیں، ہر عمر کے لوگوں میں گھل مل جاتی تھیں میری شادی سے چار سال پہلے ہی وہ چلی گئیں' اللہ ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور میرے بابا کو تندرستی کے ساتھ لمبی عمر دے، آمین کہ بابا میرے لیے ایک شفیق باپ ہیں۔

پاکیزہ ✧......جب دلہن بن کر سسرال گئیں تو کون سے سسرالی رشتے نے سب سے زیادہ محبت دی اور تعاون کیا؟

مدیحہ رضوی ❖......اس وقت مجھے سب سے زیادہ پیار میری نند سے ملا۔ کیونکہ وہ آسٹریلیا میں رہتی ہیں اس لیے کچھ ہی دن بعد وہ واپس چلی گئی تھیں۔ سال میں ایک دفعہ آتی ہیں تو بہت رونق آجاتی ہے گھر میں۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں۔ اپنی ماں کی طرح بہت اچھی خاتون ہیں۔

پاکیزہ ✧......نئی نویلی دلہن کو سسرال میں اپنی جگہ بنانے کے لیے کیا حکمتِ عملی اختیار کرنی چاہیے؟ آپ کا تجربہ کیا بتاتا ہے؟

مدیحہ رضوی ❖......جگہ بنانی پڑتی ہے بالکل اور بنانی بھی چاہیے۔ میں جب یہاں آئی تھی تو گھر میں کل دو لوگ تھے۔ اصل میں مشکل ان سسرالوں میں آتی ہے جو بڑی ہوتی ہیں۔ میرا تجربہ تو بہت نرالا ہے۔ میرے لیے سسرال میں پہلے ہی سے اتنی جگہ تھی کہ سمجھیں میں چھلانگیں مار، مار کر ہر جگہ بیٹھ رہی تھی لیکن یہ بھی ہے کہ اگر آپ خود اچھے ہیں اور اچھا تعلق بنانا چاہتے ہیں تو اس کے لیے سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔ ایک صحت مند خوشگوار گھریلو ماحول کے لیے لچک بہت

ضروری ہے۔ ذرا سا صبر کر کے وہ وقت گزار دینا چاہیے لیکن اپنی جگہ سسرال میں بنانے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے۔

پاکیزہ ✧...... گویا کامیاب ازدواجی زندگی میں سمجھوتے کی بہت اہمیت ہے؟

مدیحہ رضوی ❖...... یقیناً ہے بلکہ بنیادی چیز ہی یہی ہے لیکن سمجھوتے کا مطلب لوگ ہمیشہ کمزور پہلو ہی لیتے ہیں۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی جب دو لوگ ایک دوسرے کو چلانا چاہتے ہیں، اندر سے نباہنا چاہتے ہیں تو پھر ایک دوسرے کے لیے خود کو بدلنے میں کوئی برائی نہیں۔ جب تک خود کو اندر سے نہیں بدلیں گے تو یہ ساتھ نہیں چل پائے گا، کہیں نہ کہیں سمجھوتا کرنا ہی پڑتا ہے، اکیلے زندگی نہیں گزار سکتے۔ شادی شدہ زندگی میں کیے جانے والے سمجھوتے صحت مند سمجھوتے ہوتے ہیں۔

پاکیزہ ✧...... کامیاب شادی کا راز کیا ہے؟ اور کامیاب شادی کی سب سے بڑی رکاوٹ کیا ہے؟

مدیحہ رضوی ❖...... یہ سوال مجھ سے دس بارہ سال بعد کیجیے گا ابھی تو میری شادی کو صرف ساڑھے تین سال ہوئے ہیں۔ کامیاب شادی کے لیے کوئی ایک راز نہیں ہوتا بہت سی چیزیں ہوتی ہیں...... صبر، تحمل، برداشت، بھروسا، ذہنی ہم آہنگی اور دوستی بہت ضروری ہے۔ رکاوٹ...... انا ہوتی ہے خواہ یہ کسی رشتے میں ہو، فیصلے میں یا کسی بات میں جہاں انا ہو وہاں بات بگڑتی ہے۔

پاکیزہ ✧...... مثل مشہور ہے ”پیا جسے چاہے وہی سہاگن“، دلہن کے لیے پیا کا چاہنا ہی کافی ہے یا گھر والوں کا بھانا اور چاہنا بھی اہم ہے؟ آپ کا تجربہ کیا ہے؟

مدیحہ رضوی ❖...... سچ تو یہی ہے لیکن اگر اس کے ساتھ، ساتھ سسرال والے بھی آپ کو پسند کرتے ہیں اور چاہتے ہیں تو سونے پر سہاگا ہوتا ہے اور یہ بہت ضروری ہے۔

پاکیزہ ✧...... کیا مشترکہ خاندانی نظام شادی شدہ زندگی کے استحکام کے لیے بہترین نظام ہے؟

مدیحہ رضوی ❖...... اس کے بہت سے فائدے ہیں۔ ایک دوسرے کے کام بٹ جاتے ہیں۔ اکیلے ہوں تو ہر چیز خود ہی کرنی پڑتی ہے، مل کر رہنے اور ایک دسترخوان پر بیٹھنے سے برکت ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کے لیے قربانی دینے سے محبت بڑھتی ہے۔ بے شک یہ سسٹم ایک نعمت ہے۔ چونکہ میں کام کرتی ہوں تو یہ میرے لیے بہت ضروری ہے۔ میری سسرال میں کوئی دوسری عورت نہیں لیکن اب میری امی میرے ساتھ رہتی ہیں تو مجھے ذرا بھی اس بات کی ٹینشن نہیں ہے کہ میری غیر موجودگی میں گھر اور بچوں کا کیا حال ہے۔

پاکیزہ ✧...... دوسرے شہر میں میکا ہونے کا سب سے بڑا نقصان کیا ہوا؟

مدیحہ رضوی ❖...... سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ اپنے ابا کے ساتھ زیادہ وقت نہ گزار سکی وہ بیمار تھے اگر ہم ایک ہی شہر میں ہوتے تو بات ہی کچھ اور ہوتی روز ان سے ملنے چلی جاتی یا ہفتے میں ایک بار چلی جاتی، ایک تو ہمارا کام اتنا ہوتا ہے کہ وقت نہیں نکال پاتے پھر میری بچیوں کی عمروں میں فرق کم، ایک تو میں اکلوتی بیٹی ظاہر ہے وہ ترس جاتے تھے میری شکل دیکھنے کو، بچیوں سے ملنے کو، حالانکہ امی ابو میرے پاس آجاتے تھے لیکن ان کے آنے اور میرے جانے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اگر میکا اسی شہر میں ہو، کوئی مسئلہ ہو تو چلے گئے۔ گھر پر اکیلی ہوئی تو امی کے گھر چلی گئی۔

پاکیزہ ✧...... کیا یہ درست ہے کہ اکلوتی بیٹی کی تربیت لاڈ پیار کی نذر ہو جاتی ہے، آپ کا تجربہ کیا ہے؟

مدیحہ رضوی ❖...... میرے بھی بہت لاڈ، ناز نخرے تھے جو میرے والدین نے اٹھائے لیکن مجھے خراب اور تباہ ہونے نہیں دیا۔ سب کچھ کیا لیکن کبھی میری ناجائز خواہش پوری نہیں کی۔ یہ نہیں کہ اسکول جانے کا دل نہیں چاہ رہا تو نہ جاؤ، ڈنڈے جوتے پڑتے تھے کہ چلو اٹھو اسکول جاؤ۔ جو سختی بھائیوں کے لیے تھی وہی میرے لیے تھی۔ امی نے ہر چیز سکھائی

گلاس پینٹنگ، کھانا پکانا، روٹی پراٹھا، صفائیاں ۔ امی نے کہا یہی ایک بیٹی ہے پکڑلو اسے جو میرے ساتھ ہوا وہ اس کے ساتھ کروں گی ۔ خیر یہ تو ایک مذاق ہے لیکن اکلوتی بیٹی ہونے کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ ماں باپ کی ہر خواہش اسی ایک بیٹی سے وابستہ ہوتی ہے اس لیے سارے تجربے بھی اسی پر ہوتے ہیں۔ سیکھنا بھی اسے ہی پڑتا ہے۔

پاکیزہ ✧...... اکلوتی بیٹی ہی نہیں آپ اکلوتی بہو بھی ہیں اس کے فائدے اور نقصان کیا ہیں؟

مدیحہ رضوی ❖...... کیوں نہیں ، فائدے ہی فائدے ہیں۔ سب کی توجہ کا مرکز وہی اکلوتی بہو ہوتی ہے، سسرال کا فوکس بھی اسی پر ہوتا ہے۔ بہت سے تحائف، بہت ساری چیزیں اور عیدیاں ملتی ہیں۔ (بے اختیار ہنستے ہوئے) نقصان بھی یہی ہوتا ہے کہ سب کا فوکس بھی اسی پر ہوتا ہے۔

پاکیزہ ✧...... کبھی ایسا موقع آیا جب بہن کی کمی شدت سے محسوس ہوئی؟

مدیحہ رضوی ❖...... اگر میری زندگی میں کوئی کمی ہے تو وہ بہن کا رشتہ ہے میں اس رشتے کو بہت مس کرتی ہوں۔ میری دو بیٹیاں ہیں، بڑی بیٹی جو بہت چھوٹی ہے کہتی ہے کہ میں آپ کی فرینڈ ہوں۔ میری دو بہت کلوز فرینڈز ہیں ندیا نقوی اور ناجیہ بیگ میں نے ان کو اور انہوں نے مجھے بہن بنایا ہوا ہے۔ انہوں نے میری بہن کی کمی پوری کرنے کی بہت کوشش کی ہے۔

پاکیزہ ✧...... شادی شدہ بیٹیوں کی زندگی میں ماں کا کتنا عمل دخل ہوتا ہے؟ اس ضمن میں ماں کا کردار کیا ہونا چاہیے؟

مدیحہ رضوی ❖...... بیٹی ماں کی جھلک ہوتی ہے اس لیے ماں کا کردار ہی ہوتا ہے۔ فون پر کھانے کی ریسپی پوچھنے سے لے کر بچوں کی پرورش تک، کسی بڑے مسئلے کے بارے میں پوچھنا ہے، بچیوں کو کوئی بیماری ہو، تکلیف ہو ہر معاملے میں ماں کی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن ماں کو بیٹی کے گھریلو معاملے میں غیر ضروری مداخلت کر کے بنتی بات بگاڑنی نہیں چاہیے۔

پاکیزہ ✧...... شادی کے بعد جب اپنا گھر



اداکاری بھی ضروری مگر بچوں کے ساتھ وقت گزاری زیادہ اہمیت کی حامل ہے، ہے نا، قارئین!

سنبھالا تو امی کی تربیت اور نصیحتیں کتنی یاد آئیں؟

مدیحہ رضوی ❖...... یاد تو بڑی آئیں۔ امی کہتی تھیں کھانا پکانا سیکھ لو اپنے گھر جاؤ گی تو پتا چلے گا۔ سیکھنے کے دوران میں کبھی ڈنڈی مار دیا کرتی تھی۔ کبھی، کبھی مجھے غصہ بھی آجاتا تھا۔ لیکن اب جبکہ میں اپنے گھر میں کام کرتی ہوں، سب میری تعریف کرتے ہیں کہ بہت اچھا پکایا ہے تب مجھے امی کی قدر ہوتی ہے کہ امی نے بڑے اچھے وقت میں ہمیں سکھا دیا۔ اگر امی نے گھر کے کام نہیں کرائے ہوتے تو ہم بھی پھوہڑ بنے بیٹھے ہوتے۔ روٹی پکانی آتی نہ ہانڈی۔ ماں تو ماں ہوتی ہے اسے سب پتا ہوتا ہے بیٹی کی خوشی و عزت کس میں ہے۔

پاکیزہ ✧...... شوہر کے دل میں راج کرنے کے لیے فرماں برداری ہی کافی ہے یا اور کوئی ہنر بھی اختیار کیا جاسکتا ہے؟

مدیحہ رضوی ❖...... میں جھوٹ کیوں بولوں، مجھے نہیں لگتا کہ میں بہت فرماں بردار ہوں۔ ہمارے درمیان دوستی بہت تھی وہی تعلق آج بھی ہے۔ میاں بیوی والا جی حضوری والا تعلق نہیں ہے حسن نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ آپ جناب بالکل نہیں کرنا۔ جو ہو جیسی ہو میرے ساتھ ویسی ہی رہنا۔ اسے اچھا کھانے کا شوق ہے مجھے اچھا کھانا پکانا آتا ہے۔ وہ خود بہت اچھا کک ہے لیکن اسے میرے ہاتھ کا پکایا پسند ہے۔ دو چیزیں بہت ضروری ہیں ایک تو کوکنگ اچھی آنی چاہیے دوسرے میاں کو خوش رکھنا چاہیے۔

پاکیزہ ✧...... پہلی ڈش شادی کے بعد کون سی بنائی؟ حسن کا پہلا تاثر کیا تھا؟

مدیحہ رضوی ❖...... میں نے بریانی بنائی تھی۔ بلکہ اس سے بھی پہلے میں نے ناشتا بنایا تھا، پراٹھا اور آملیٹ۔ حسن بہت خوش تھا۔ مجھے یاد ہے میں ناشتا بنا رہی تھی اور وہ میری تصویریں اتار رہا تھا کہ مدیحہ رضوی میرے لیے ناشتا بنا رہی ہے۔

پاکیزہ ✧...... کچن میں کام کے دوران آپ کا ہاتھ بٹاتے ہیں؟

مدیحہ رضوی ❖...... حسن بہت سگھڑ شوہر ہے مجھ سے بھی زیادہ۔ گھر پر ہو تو میرا ہاتھ بٹاتا ہے۔ میرے ساتھ مل کر بہت اچھی کوکنگ کرتا ہے۔

پاکیزہ ✧...... حسن آپ کی تعریف کھل کر کرتے ہیں یا سرسری؟

مدیحہ رضوی ❖...... بہت کھلے دل کے ساتھ میری تعریف کرتا ہے۔ سرسری تعریف کبھی نہیں کی اور اگر کوئی لباس مجھ پر اسے اچھا نہیں لگتا تو لگی لپٹی رکھنے کے بجائے صاف کہہ دیتا ہے کہ یہ تم پر اچھا نہیں لگتا۔

پاکیزہ ✧...... آپ کے مابین عموماً کن باتوں پر اختلاف ہوتا ہے؟ اور اسے کیسے دور کیا جاسکتا ہے؟

مدیحہ رضوی ❖...... ہمارا اختلاف عموماً کچن سے شروع ہوتا ہے میں کچھ بنا رہی ہوں وہ بھی کچھ بنانے آجاتا ہے یہ پکڑاؤ وہ پکڑاؤ لیکن یہ وقتی اور دلچسپ اختلاف ہوتا ہے۔

پاکیزہ ✧...... غصہ کسے زیادہ آتا ہے؟

مدیحہ رضوی ❖...... عموماً ہم دونوں کو ہی غصہ نہیں آتا۔ صبح کے گئے رات کو گھر آتے ہیں تو کئی دفعہ بہت الجھے ہوئے ہوتے ہیں۔ جب کبھی کام کا پریشر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ وہ شوٹ پر ہو میں بھی شوٹ پر ہوں اور اسے کال نہیں کر پاتی تو کہتا ہے کہ تم نے مجھے فون تک نہیں کیا لیکن اگلے ہی لمحے سب نارمل ہو جاتا ہے۔

پاکیزہ ✧...... مگر روٹھے سیاں کو مناتی کیسے ہیں؟

مدیحہ رضوی ❖...... روٹھنے منانے والا چکر ہمارے درمیان نہیں کہ پلیز مان جاؤ (ہنستے ہوئے) ہم ایک دوسرے سے نارمل بات کرنے لگتے ہیں کیا ہو رہا ہے؟ کیا کھانا ہے؟ وغیرہ دوسری بات یہ کہ ہم میچورڈ ہیں پریکٹیکل لائف سے نکل کر شادی کر کے آئے ہیں۔

پاکیزہ ✧...... آپ کی زندگی میں بہار کس کے دم سے ہے؟

مدیحہ رضوی ❖...... میرے اور حسن دونوں ہی کی

زندگی میں ساری بہاریں ہمارے بچوں کے دم سے ہیں۔

پاکیزہ ✧......شادی کے بعد لاشعوری طور پر ایک دوسرے کی کون، کون سی عادتیں اپنائیں؟ اور کون سی عادتیں تبدیل ہوگئیں؟

مدیحہ رضوی ✥......یہ ہمارے درمیان پہلے ہی سے طے تھا کہ نہ ہم ایک دوسرے کی عادات اپنائیں گے اور نہ ہی کوئی عادت تبدیل کریں گے۔ نیچر بدل کر تعلق نبھایا تو کیا نبھایا۔ اصل تعلق تو یہ ہے کہ آپ کسی کو بدلے بغیر اس کے ساتھ خوشگوار زندگی بسر کریں۔ ہم نے ایک دوسرے کو ایسے ہی قبول کیا۔ اور الحمدللہ بہت خوش ہیں۔

پاکیزہ ✧......آپ کے خیال میں زوجین کی عمروں میں کتنا فرق ہونا چاہیے؟

مدیحہ رضوی ✥......میرے حساب سے شادی میں عمر کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا کسی چھوٹی عمر کے مرد سے بھی شادی ہوسکتی ہے، بوڑھے سے بھی ہوسکتی ہے۔ شادی کے لیے دوستی اور دل میں ایک دوسرے کے لیے گنجائش بہت ضروری ہے چھوٹی بڑی یا ایک جیسی عمر سے کوئی فرق نہیں پڑتا بس ذہنی ہم آہنگی ہونی چاہیے۔

پاکیزہ ✧......مثل مشہور ہے کہ شادی بور کے لڈو جو کھائے پچھتائے جو نہ کھائے وہ بھی پچھتائے۔ آپ کیا کہتی ہیں؟

مدیحہ رضوی ✥......جب نہیں ہو رہی تھی شادی تو یہ تھا کہ شادی ہوجانی چاہیے، جب ہوگئی تو یار شادی کیوں کرلی۔ انسانی فطرت ہے کہ انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا۔ یہ ہماری جنریشن کا بہت ہی بڑا مسئلہ اور المیہ ہے کہ کسی بھی چیز سے مطمئن نہیں ہوتی لیکن ایسی سوچ نہ ہی آئے تو اچھا ہے جو ہوچکا ہے، جو ہو رہا ہے سب اچھا ہے۔ میں بہت خوش اور مطمئن ہوں۔ (ماشاءاللہ)

پاکیزہ ✧......اپنی والدہ سے وراثت میں اداکاری کے علاوہ اور کون سا ہنر پایا جس پر آپ نازاں ہیں؟

مدیحہ رضوی ✥......کوکنگ جو وہ خود بہت اچھی کرتی ہیں اور امی کی اس وراثت کی بدولت میں نے بہت سی تعریفیں اور خوشیاں سمیٹی ہیں۔

پاکیزہ ✧......کھانا پکانے کے علاوہ امورِ خانہ داری کے کون سے کام میں سب سے زیادہ مہارت ہے؟

مدیحہ رضوی ✥......مجھے لگتا ہے کہ کپڑے دھونے میں مجھے بہت مہارت ہے۔ میں ماسی سے زیادہ اچھے کپڑے دھو لیتی ہوں۔

پاکیزہ ✧......محبت کا سب سے خوب صورت رنگ آپ کی نظر میں کون سا ہے؟

مدیحہ رضوی ✥......ماں کی ممتا اور محبت کا رنگ، اور اس کا احساس، ماں بننے سے پہلے مجھے بالکل بھی نہیں تھا کہ ماں اور اولاد کا تعلق کیا ہوتا ہے۔ محبتیں تو زندگی میں بہت سی ہیں لیکن اولاد کے بعد پتا چلتا ہے کہ پہلی اور آخری محبت کیا ہوتی ہے ایک ماں محبت کا سب سے زیادہ دلکش رنگ اور بہترین پہلو ہے۔

پاکیزہ ✧......ایک قول ہے ”محبت اور جنگ میں سب جائز ہے“ جبکہ دوسرا قول ہے ”محبت اور جنگ میں جو ہو جائز ہو“ آپ کا نظریہ کیا ہے؟

مدیحہ رضوی ✥......پیار اور جنگ میں جب جو ہوتا ہے وہ جائز ہے میرا تو یہی ماننا ہے۔ جو چیز جیسی ہے ویسی ہی قبول کرنی چاہیے۔ زندگی میں چیلنجز کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ زندگی میں اللہ نے ہر چیز میں سرپرائز رکھا ہے، کچھ بھی کبھی سامنے آسکتا ہے۔ زندگی میں چیلنجز اٹھانے پڑتے ہیں اور انہیں اپنے طریقے سے ہینڈل کرنا پڑتا ہے۔

پاکیزہ ✧......آپ کو کسی بھی مارننگ شو کی میزبانی کی پیشکش کی جائے تو آپ کا فیصلہ کیا ہوگا؟

مدیحہ رضوی ✥......میں بالکل بھی مارننگ شو کرنے کے نہ موڈ میں ہوں اور نہ ہی کبھی کروں گی۔ مجھے بڑے، بڑے چینلو سے تین مرتبہ پیشکش ہوچکی ہے لیکن میرے نہ کرنے کی سب سے بڑی وجہ

یہ ہے کہ ایک تو میں اپنا کام کمپرومائز نہیں کر سکتی۔ جو میرا کام ہے جس کے لیے میں آئی ہوں وہی کروں گی۔ جو ایکٹر ہے وہ ایکٹر ہی رہے تو اچھا ہے عجب کھچڑی سی بن گئی ہے۔ میرا نہیں خیال کہ یہ صحیح بات ہے اور اس وقت جس طرح کے مارننگ شوز ہو رہے ہیں، جس طرح کا ایک رجحان چلا ہوا ہے۔ میں تو بحیثیت مہمان نہیں جاتی، بھلا ہوسٹنگ کروں گی۔ اللہ معاف کرے۔

پاکیزہ ✧......میاں بیوی کے ایک ہی پیشے سے منسلک ہونے میں کیا آسانیاں ہیں؟

مدیحہ رضوی ✧......آسانی یہ ہے کہ دونوں کو اپنی فیلڈ کے بارے میں معلوم ہوتا ہے۔ اگر مجھے شوٹ میں دیر ہو جائے تو حسن جانتا ہے کہ اس کام میں دیر سویر ہو جاتی ہے۔ تو وہ اس طرح ری ایکٹ نہیں کرتا جس طرح کوئی دوسرا کرتا کہ جس کو اس فیلڈ کا آئیڈیا نہیں ہوا کرتا۔ ہماری فیلڈ میں ہر ایک سے بہت اچھی دوستی ہوتی ہے کوئی باہر والا ہو تو اس دوستی پر شک بھی کر سکتا ہے لیکن ہم پیشہ بولنے سے پہلے یہ سوچتا ہے ایسے تو اس کی بھی دوستی ہے۔ بعض لوگوں سے وہ تعلق محض شوٹ تک ہی محدود رہتا ہے..... ایک دوسرے کی مصروفیت اور وقت کا پتا ہے اس لیے وضاحتیں نہیں دینی پڑتیں۔

پاکیزہ ✧......اپنی بچیوں کی پرورش میں کن باتوں کا خاص خیال رکھتی ہیں؟

مدیحہ رضوی ✧......انسان بہت حقیر ہے جو کرتا ہے اللہ کرتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ زیادہ مشکل کام ہے ابھی تو وہ بہت چھوٹی ہیں پھر بھی میں اس بات کا زیادہ خیال رکھتی ہوں کہ کسی چیز کی کمی نہ ہو اور کوئی چیز حد سے زیادہ بھی نہ ملے۔ توازن برقرار رکھنے میں ذرا سی دشواری ہوتی ہے کہ بچہ جب کوئی چیز مانگتا ہے تو ماں باپ کا دل کرتا ہے کہ اپنا کلیجا بھی نکال کر دے دیں لیکن بچوں کی ہر خواہش پوری نہیں کی جا سکتی۔

پاکیزہ ✧......بحیثیت آرٹسٹ سوشل میڈیا آپ کی نظر میں؟

مدیحہ رضوی ✧......وقت کی اہم ضرورت کیونکہ یہ واحد ایسی چیز ہے جو آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ کے سامنے ہے۔ آپ کی پہنچ میں ہے۔ پبلک پلیٹ فارم ہے۔ جس کو آپ بہت اچھی طرح استعمال کر سکتے ہیں۔ آپ کوئی نئی چیز پہنچانا چاہتے ہیں۔ اپنے ڈراموں کے متعلق معلومات دینا چاہتے ہیں۔ اپنے کام کے بارے میں رائے لینا چاہتے ہیں تو یہ بہت کارآمد ہے۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ مہینے میں ایک دفعہ لوگوں سے لائیو سیشن اس کے توسط سے ضرور کروں، خاص طور سے اس وقت جب میرا کوئی پروجیکٹ آن ائر ہوتا ہے۔ میں فیڈ بیک لیتی ہوں اور پھر یہ کہ دوست احباب کیا کر رہے ہیں، وہ ہمیں دیکھ لیتے ہیں، ہم ان کو۔

پاکیزہ ✧......آپ کا پسندیدہ رشتہ، رنگ، خوشبو، موسم، وقت، کتاب، ڈش، تہوار، تفریحی مقام، کھیل کون سے ہیں؟

مدیحہ رضوی ✧......پسندیدہ رشتہ ماں، کالا گلاب اور گیلی مٹی کی خوشبو، سردی، رات، کتابیں بہت سی کسی ایک کا نام نہیں لے سکتی، چائنیز، بسنت، تہوار عید کا اور پسندیدہ مقام کافی سارے ہیں۔

پاکیزہ ✧......حسن کے لیے کوئی پیغام؟

مدیحہ رضوی ✧......انٹرویو کے ذریعے حسن کو کیا پیغام دوں گی۔ بہت عجیب سی بات ہے۔ اسے میں ڈائریکٹ پیغام دے دوں گی۔ ہاں حسن جیسے ہے بہت اچھا ہے اسے ایسا ہی رہنا چاہیے۔ جو ہے جب ہے پرفیکٹ ہے۔

☆☆☆

قارئینِ کرام اپنی رائے سے ضرور نوازیے گا۔ ہماری مہمان مدیحہ رضوی سے بات چیت کیسی لگی۔ انشاء اللہ جلد ہی کسی اور آرٹسٹ کو مہمان بنائیں گے۔ جب تک کے لیے اللہ نگہبان......!

☆☆☆

فکاہیہ کالم

گوشۂ ظرافت

ادارہ

مزاح نگاری، کمال کی صنفِ ادب ہے کہ جس میں وہ بات بھی بہ آسانی کہہ دی جاتی ہے کہ جسے سوچنے میں زمانے لگیں...... مگر ایسی نشتر زنی بخاطرِ اصلاح کا فن بھی کسی، کسی کو آتا ہے۔ ورنہ مزاح نگاری کو عامیانہ طرزِ تحریر بننے میں دیر نہیں لگتی۔

ممتاز مزاح نگار شفیق الرحمن جن کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے کے بارے میں ممتاز ادیبہ حجاب امتیاز علی کچھ یوں کہتی ہیں...... ''وہ اپنی روانی میں بلا تکلف ننھی منی پھلجھڑیاں چھوڑتے چلے جاتے ہیں وہ ان کم یاب لوگوں میں سے ہیں جن کی خوش طبعی اپنے اوپر بلا تکلف ہنس سکتی ہے۔''

اس ماہ فکاہیہ ادب کی ایک نابغۂ روزگار شخصیت شفیق الرحمن کی کتاب ''پرواز'' سے چند اقتباسات آپ جیسے باذوق قارئین کی نذر کیے جا رہے ہیں۔

خط کتابت

آفیشل خط کتابت بھی نہایت دلچسپ چیز ہے۔ اس میں خط کتابت کے مقررہ آداب اور کاغذی کارروائی زیادہ ہوتی ہے۔ دماغی کام بہت کم ہوتا ہے۔ بعض اوقات عجیب و غریب خطوط دیکھنے میں آتے ہیں، جو کاروباری لحاظ سے بالکل مکمل ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک فرم نے دوسری فرم کو لکھا کہ ہمارا فلاں، فلاں آرڈر منسوخ کردو...... جواب آیا کہ آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔ جب آپ کی باری آئے گی تب آرڈر منسوخ ہوگا۔

ایک بوڑھے پنشنر کی پنشن دفعتاً بند ہوگئی۔ جنوری سے جون تک کچھ نہ ملا۔ آخر تنگ آکر اس نے اوپر خط لکھا، وہاں سے جواب آیا کہ کاغذات کے مطابق آپ کا کئی ماہ سے انتقال ہوچکا ہے اس لیے پنشن بند کردی گئی ہے۔ اس نے لکھا کہ جنابِ من میں تو باقاعدہ زندہ ہوں، جواب آیا کہ آپ سرٹیفکیٹ بھیجیں۔ یہ ضلع کے کمشنر کے پاس گیا۔ کمشنر بڑا ہنسا اور سرٹیفکیٹ لکھ دیا کہ میں فلاں صاحب کو اپریل سے دیکھ رہا ہوں اور تصدیق کرتا ہوں کہ یہ زندہ ہیں۔ نیچے جون کی تاریخ لکھ دی۔ پنشنر نے وہ سرٹیفکیٹ اور ایک خط اوپر بھیج دیا۔

اگلے ہفتے تین ماہ کی پنشن آگئی ساتھ ہی ایک خط جس میں لکھا تھا...... جنابِ من! آپ کے سرٹیفکیٹ کے مطابق اپریل مئی اور جون کی پنشن ارسال ہے۔ براہِ کرم ایک اور سرٹیفکیٹ ارسال فرمائیں کہ آپ اسی سال جنوری، فروری اور مارچ میں بھی زندہ تھے۔ تاکہ آپ کی بقیہ پنشن بھی بھیج دی جائے۔

جاؤ آرام کرو

ہمارے کالج میں ایک ماہرِ اقتصادیات تھے۔ ایک دن ہم نے ان کا اشتہار اخبار میں پڑھا جو انہوں نے نوکر کے لیے دیا تھا۔ اشتہار کا ایک، ایک لفظ چلّا، چلّا کر اقتصادیات پنے کی شکایت کررہا تھا، لکھا تھا۔

''ضرورت ہے ایک نوجوان صالح و خوش خصال و نیک اطوار کی، جس پر پورا، پورا بھروسا کیا جاسکے۔ اعلیٰ درجے کے اخلاق کا مالک ہو، نہایت تندرست اور توانا ہو۔ سگریٹ پینے والے ہرگز درخواست نہ دیں۔ اچھے خاندان والے کو ترجیح دی جائے گی۔ خوشخط ہو، پرندوں سے محبت کرتا ہو، زندہ دل ہو، مصیبت میں ہرگز نہ گھبرائے، کفایت شعار ہو، موٹر بھی چلاسکتا ہو، جوتوں کی مرمت بھی بخوبی کرسکتا ہو، بندوق چلاسکتا ہو، چارپائیاں بن سکتا ہو، حساب کا ماہر ہو، ضرورت پر حجام کا کام بھی بخوبی کرسکتا ہو، کپڑے دھوسکتا ہو، تنخواہ پندرہ روپے ماہوار

دی جائے گی، پہلے چھ ماہ ملازمت عارضی ہوگی، اس کے بعد ڈیڑھ روپیہ ماہوار الاؤنس ملے گا۔

کچھ عرصے کے بعد انہوں نے ہمیں چائے پر بلایا۔ وہاں ہم نے ان کا نوکر دیکھا۔ عجیب ست الوجود نوکر تھا۔ اشتہار میں جتنی خوبیاں لکھی گئی تھیں غالباً ان میں سے ایک بھی اس میں نہیں تھی۔ اسے جو حکم دیے جا رہے تھے وہ بھی اقتصادیات سے تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً یہ کہ ”سارے پلنگ چھت پر لے جاؤ، ان پر بستر کردو، صحن میں چھڑکاؤ کردو اور کرسیاں نکال دو، بس اس کے بعد آرام کرو۔“ پندرہ منٹ کے بعد پھر اسے بلایا جاتا اور حکم ملتا۔ ”شام کا کھانا چھت پر کھائیں گے، باورچی خانے سے سارے لوازمات اوپر لے جاؤ، میلے کپڑے دھوبی کو دے آؤ، بازار سے دوڑ کر پھل لے آؤ، بجلی والے سے پنکھا لے آؤ غالباً مرمت ہو چکی ہوگی، یہ خط بڑے ڈاکخانے میں فوراً ڈال دو کہیں ڈاک نہ نکل جائے۔ اس کے بعد تمہاری چھٹی ہے۔“

ذرا سی دیر کے بعد پھر ایک تازہ ارشاد ہوتا ہے۔ ”ذرا دوڑ کر دیکھ آؤ سینما میں کون سی پکچر لگی ہوئی ہے۔ بشیر صاحب سے پوچھنا کہ وہ آپ نے سینما کے پاس کا وعدہ کیا تھا کب تک انتظار کیا جائے اور ہاں پٹرول کے کوپن لے جاؤ اور پٹرول لے آؤ۔ بک اسٹال سے دوڑ کر ویکلی کا نیا پرچہ لے آؤ۔ گیراج والے سے موٹر کے بارے میں پوچھنا۔ واپسی میں برف لیتے آنا..... بس فقط اتنا سا ہی کام ہے۔ اس کے بعد مزے سے آرام کرنا۔“

تکیہ کلام

تکیہ کلام نہایت مفید چیز ہے۔ اور سچ مچ گفتگو کا تکیہ ہے۔ یعنی باتیں کرنے والا جب چاہے اس کا سہارا لے سکتا ہے۔

ہمیں وہ تکیہ کلام پسند نہیں جس کی عادت پڑ جائے اور جس پر قابو نہ رہے۔ کیونکہ جو چیز بے قابو ہو جائے اس میں آرٹ نہیں رہتا۔ ہمارے خیال میں قابلِ تعریف وہی تکیہ کلام ہے جو ضرورت کے مطابق اختیار کیا گیا ہو۔ وہ ہمیشہ آڑے آتا ہے۔

یہ ہماری انتہائی ناتجربہ کاری ہے کہ گفتگو کی ابتدا میں ہم ان دونوں میں بالکل تمیز نہیں کر سکتے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات تو ہم گفتگو میں کسی تکیہ کلام کی موجودگی تک نہیں پہچان سکتے اور اس قسم کے حادثے اکثر ہوتے رہتے ہیں۔

ایک صاحب کشمیر کا ذکر کر رہے ہیں......

جب میں کیا نام وہاں گیا، تو تقریباً سب قابلِ دید مقامات کی کیا نام سیر کی۔ اور وہ جھیل کیا نام بھی دیکھی، وہ جو مشہور کیا نام جھیل ہے ناں......!“

”ڈل ہے اس کا نام......“ ہم لقمہ دیتے ہیں۔

”ہاں کیا نام ڈل جھیل بھی دیکھی۔ سرینگر میں نشاط اور شالامار باغ بھی کیا نام دیکھے۔

اور وہ کیا نام چشمہ بھی دیکھا۔ خوب ہے وہ چشمہ کیا نام......“

”جی شاہی چشمہ ہے اس کا نام۔“

”تو کیا نام شاہی چشمہ بھی دیکھا۔“

اسی طرح گفتگو ہوتی رہتی ہے۔ اور بہت دیر میں ہمیں پتا چلتا ہے کہ ”کیا نام“ تو ان کا تکیہ کلام ہے۔ اپنی کم فہمی پر افسوس ہوتا ہے۔

ایک اور صاحب ہمیں اپنے گھر کی پالیٹکس سنا رہے تھے۔

”میں نے کہا عجب مصیبت میں گرفتار ہوں۔ نہ صرف آدمی بیمار ہیں بلکہ میں نے کہا جانور تک علیل ہیں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں...... آج صبح جب حکیم صاحب آئے میں نے کہا۔

”کیا کہا آپ نے...... حکیم صاحب سے؟“ ہم انتہائی معصومیت سے پوچھتے ہیں۔

”میں نے کہا حکیم صاحب سے یہ کہا کہ آپ بھی ہمارے ہاں کی بیگار سے تنگ آگئے ہوں گے۔ وہ بولے یوں مت کہیے، میں تو آپ کا غلام ہوں میں نے کہا۔“

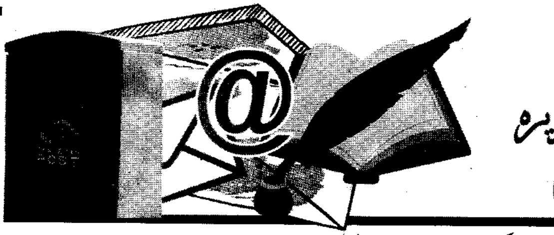
”کس نے کہا؟“ حکیم صاحب نے یا آپ نے؟“

”حکیم صاحب نے میں نے کہا۔ اس کے بعد وہ پوچھنے لگے کہ دوائیوں پر کس قدر خرچ آچکا ہے، میں نے کہا؟“

”آپ نے کیا کہا؟“

بعض اوقات تو گھنٹوں باتیں ہوتی رہتی ہیں اور ہمیں تکیہ کلام کا پتا نہیں چلتا۔ کئی حضرات ہم سے محض اسی وجہ سے خفا ہو گئے ہیں، ان کا خیال تھا کہ ہم ان کے تکیہ کلام کا مذاق اڑا رہے ہیں۔

☆☆☆



بہنوں کی محفل مدیرہ

خط کتابت کے لیے پی او باکس 662 جی پی او کراچی 74200 ای میل: jdpgroup@hotmail.com

پیاری پاکیزہ بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ!

تمام تعریفیں اس رب العزت جل شانہ کو زیبا ہیں جو ہمارا اور کل عالمین کا پروردگار ہے۔ اور کروڑہا درود و سلام رحمتہ اللعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر کہ جن کی آمد سے جہالت و ظلمت کے اندھیرے چھٹے اور دنیا میں حق کا بول بالا ہوا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ ہم سب کو ایمان کی قوت و پختگی کے ساتھ دونوں جہاں میں سرخروئی نصیب فرمائے اور ہمارے وطنِ عزیز کو اپنی امان میں رکھے۔ (الٰہی آمین)

☆☆☆

کچھ باتیں اپنی بہنوں سے

پیاری بہنو! سلام اور پُر خلوص دعائیں لیے آپ کی محفل میں حاضر ہوں۔ کیسے آپ کے کیا حال ہیں؟ امید ہے بقر عید خوب اچھی گزری ہوگی اور اب عید اور دعوتوں سے متعلق مصروفیات ختم ہو چکی ہوں گی۔ آپ تمام بہنیں پاکیزہ پڑھ کر اپنی رائے سے ضرور مطلع کریں...... ہماری مستقل تبصرہ نگار اور شاعرہ فریدہ جاوید فری سے آج ہی فون پر بات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ ان کی طبیعت کافی خراب رہی تین چار دن اسپتال میں بھی داخل رہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت کلی عطا فرمائے۔ ساری بہنوں سے دعا کی درخواست ہے اور انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ان کے بیٹے کا ایکسی ڈنٹ ہو گیا تھا اللہ تعالیٰ نے رحم کیا اور کسی بڑے نقصان سے بچ گیا اللہ اسے ہمیشہ اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ (آمین)

بہنو، بارہ ستمبر کو پاکیزہ کی طرف سے عید ملن پارٹی کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں تمام رائٹرز اور ریڈرز نے بھرپور شرکت کی اور یہ بہت خوشگوار محفل رہی جس کا تفصیلی احوال انشاء اللہ آپ اگلے شمارے میں پڑھ سکیں گی۔ بس یہ افسوس رہا کہ انجم انصار جو اپنی بھتیجی کی شادی کے سلسلے میں اسلام آباد گئی ہوئی تھیں شرکت نہ کر سکیں، انشاء اللہ کسی اور موقع پر وہ ضرور شریک ہوں گی۔ وہ ساری قاری بہنیں اور رائٹرز جو میری بہت حوصلہ افزائی کرتی ہیں ان سب کی میں تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ ممتاز ضیا تمہارا خصوصی شکریہ کہ تم نے شرکت کی، باوجود اس کے کہ ایک لمبی بیماری کے بعد تم کافی کمزور بھی ہو گئی ہو پھر بھی پاکیزہ کے بلاوے پر چلی آئیں۔ عید ملن میں بہت سی بہنوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ایسی محفلیں جلدی، جلدی منعقد کیا کروں کیونکہ سب کو ہی مل بیٹھنے کا موقع مل جاتا ہے۔ کوشش کروں گی کہ سال میں دو تین بار تم سب کو ملوانے کا انتظام کر لیا کروں مگر پھر تم ہی لوگوں کی مصروفیات کی وجہ سے بہ مشکل ایک تقریب ہو پاتی ہے۔

اچھا بہنو! انشاء اللہ زندگی بخیر تو اگلے ماہ پھر یہ محفل سجائیں گے آپ سب کی دعاؤں کے طفیل معراج صاحب کی طبیعت اب کافی بہتر چل رہی ہے بس آپ سب لوگ انہیں اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں۔

اللہ حافظ!

دعا گو، عذرا رسول

☆☆☆

آپ سب کے خطوط و ٹیلی فون کالز مسلسل موصول ہو رہی ہیں جن سے بہت توانائی ملتی ہے، جب آپ لوگ حوصلہ افزائی کرتے ہیں، تبصرے کرتے ہیں، مشورے دیتے ہیں اور بڑی اپنائیت سے اپنی، اپنی فرمائشیں بھی نوٹ کرواتے ہیں اور پھر محفل

کے صفحات بڑھانے کی درخواست بھی کرتے ہیں۔ ارے تو بہنوں پھر کہانیوں اور دیگر سلسلوں کے لیے صفحات کم پڑ سکتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ سب کی شرکت ہو پھر بھی یقین جانیں بیشتر خطوط رہ جاتے ہیں۔ ماہِ گزشتہ نرگس تسیم، صابرہ موہڑہ کا بہت پیارا تبصرہ رہ گیا تھا مگر ان کی اپنی شادی کا احوال اتنا انوکھا تھا کہ بہت فون کالز آئیں اور سب نے نرگس کی بے ساختگی کو بہت پسند کیا۔ اس کے علاوہ ذکیہ آپا سے ملاقات کو بھی بہت سراہا گیا۔ بہنوں ہم نے دراصل آپ سب کے جذبات کی ترجمانی کی تھی اور جہاں تک سینئر رائٹرز کی بات ہے تو جلد ہی آپ کو اور بھی بہت اچھی، اچھی تحریریں پڑھنے کو ملیں گی۔ اپنی ان بہنوں کی تسلی کے لیے بتادیں کہ جن کی تحریریں قابلِ اشاعت ہیں، انشاء اللہ وقتاً فوقتاً باری آنے پر شائع ہوتی رہیں گی۔ مایوسی ویسے بھی کفر ہے۔ اب جب آپ لوگ بہنوں کی محفل کے صفحات بڑھانے کی فرمائش کریں گی تو کہانیاں کیسے پوری آئیں گی......اس کے علاوہ آپ لوگوں کی رائے لینی ہے کہ بزمِ پاکیزہ کا سلسلہ اگر بند کردیا جائے اور اس کی جگہ سوال ہمارا اور جواب آپ کے شروع کیا جائے اور پھر سب سے زیادہ دلچسپ جواب پر انعام دیا جائے تو کیسا ہے؟ ضرور بتایئے گا۔ انشاء اللہ نت نئی دلچسپ تبدیلیاں آپ کے مشوروں اور آپ کی شمولیت سے پاکیزہ میں آتی رہیں گی۔ یہ آپ سب کا تعاون ہی ہے جو پاکیزہ کو بہتر سے بہترین بنا رہا ہے۔ آپ کو ہر آن خوش آمدید کہنے کے لیے ہمارے رابطہ نمبر درج ہیں۔ نزہت اصغر، 03316266612 آفس لینڈ لائن 021.35802552..35895313..35386783 ......Ext......122,107

اب مختلف خبروں اور سرگرمیوں پر ایک نظر ڈالنے سے قبل ایک بار خلوص دل سے درودِ ابراہیمؑ اور اس کے بعد تین بار آیتِ کریمہ ضرور پڑھ لیں اور اپنی دعاؤں میں اپنے پیاروں کے ساتھ، ساتھ تمام اہلِ وطن کو بھی ضرور یاد رکھیں۔

☆☆☆

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ انجم انصار کی پیاری بھتیجی صفیہ سہیل کی شادی گزشتہ دنوں اسلام آباد میں بخیر وخوبی انجام پائی جس میں باجی انجم انصار اور ان کے اہلِ خانہ نے خصوصی شرکت کی۔

☆ پاکیزہ کی پرستار ڈاکٹر آرزو عظیم کے بہن، بہنوئی کی فیملی جو سعودی عرب میں ہی رہائش پزیر ہیں نے امسال فریضۂ حج ادا کیا (مبارک باد) ان دنوں وہ لوگ اپنے عزیز و اقارب سے ملنے پاکستان آئے ہوئے ہیں۔

☆ مستقل قاری امبر صادق، واہ کینٹ کے والدین امسال فریضۂ حج کی ادائیگی سے سرفراز ہوئے۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری حدیثہ اختر، حاصل پور کے سب سے چھوٹے بیٹے منیب نے ڈپلوما ایسوسی ایٹ انجینئرنگ کے امتحان میں 88 فیصد نمبروں کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔ (ماشاءاللہ اور بہت، بہت مبارک باد)

☆ مستقل قاری رابعہ خان، جھنگ ایک پیاری سی بیٹی کی امی جان بن گئی ہیں۔ (مبارک باد)

☆ مسز یٰسین، لیہ کے کزن مبشر کے ہاں بیٹا تولد ہوا ہے جس کا نام محمد وجدان رکھا گیا ہے۔ (مبارک ہو)

دعائے صحت

☆ رائٹر شبینہ گل اپنی بیٹی کی پیدائش کے بعد سے صحت کے کئی مسائل کا شکار رہیں اب الحمدللہ کچھ بہتر ہیں۔

☆ شاعرہ و مستقل تبصرہ نگار فریدہ جاوید فری، لاہور کی صحت کے لیے بہنیں خصوصی دعا کریں اور فریدہ کے چھوٹے بھائی کو بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں انہیں کینسر تشخیص ہوا ہے۔ اور فریدہ کو پچھلے دنوں ایک اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑا کہ جب ان کے بیٹے کا ایکسی ڈینٹ ہوگیا تھا الحمدللہ اب وہ بہتر ہے۔

☆ مصنفہ عطیہ عمر کی تائی جو اُن کی خالہ بھی ہیں کی صحت کے لیے خصوصی دعا کی درخواست ہے۔ عطیہ عمر اُن کی عیادت کے لیے پچھلے دنوں لاہور گئی ہوئی تھیں۔ اور آج کل عطیہ عمر کو ہائی بلڈ پریشر کی شکایت بھی ہوگئی ہے۔

انتقالِ پُرملال

☆ پاکیزہ کی بے حد پُرخلوص مستقل قاری، مسرت بانو سوھل کلاں، شیخوپورہ برضائے ربی گزشتہ دنوں انتقال کرگئیں۔

☆ پاکیزہ سے وابستہ شائستہ زریں کی خالہ محترمہ مختصر علالت کے بعد انتقال کرگئیں۔

☆ محترمہ عذرا رسول کی عزیز دوست اور پاکیزہ کی دیرینہ ساتھی شائستہ اعجاز کے والد ماجد برضائے ربی انتقال کرگئے۔

☆ مصنفہ شمع نفیسر، کراچی کے والد ماجد سید ذیشان علی زیدی انتقال کر گئے ابھی چند ماہ قبل شمع نفیسر نے اپنی والدہ کی جدائی کا صدمہ بھی برداشت کیا تھا۔ (شمع اللہ آپ کو اور آپ کے اہلِ خانہ کو یہ عظیم صدمے برداشت کرنے کی ہمت دے، الٰہی آمین)

تمام مرحومین کے ایصالِ ثواب کے لیے ایک بار سورۂ فاتحہ اور تین بار سورۂ اخلاص پڑھ کر اول و آخر درود پاک پڑھ کر بخش دیں۔

☆☆☆

بہنوں اب آتے ہیں آپ کے کھٹے میٹھے خطوط کی جانب

ڈاکٹر ممتاز ضیا، کراچی سے۔ ”خرابیٔ صحت کی بنا پر کافی عرصہ بعد محفل میں شامل ہو رہی ہوں بفضلِ خدا اب طبیعت کافی بہتر ہے (شکر الحمدللہ) مگر اب بھی مجھے آپ لوگوں کی دعاؤں کی شدید ضرورت ہے۔ (آپ سب بہنوں کی دعاؤں میں شامل ہیں ممتاز صاحبہ) پاکیزہ کا ایڈیٹر ہونا مبارک ہو۔ انجم کی نجی مصروفیات کی بنا پر سبکدوشی کے بعد تم نے پاکیزہ کا معیار قائم رکھا۔ (بہت شکریہ، یہ آپ سب کا تعاون ہے ڈاکٹر صاحبہ) عید ملن پارٹی کو اور تمہارے اور عذرا پیاری کے خلوص و محبت کو میں نے بہت انجوائے کیا اور اپنی بہنوں سے مل کر بھی بہت خوشی ہوئی انجم، عطیہ عمر، رفعت سراج اور کچھ اور بہنوں کی کمی محسوس ہوئی۔ (انجم باجی اپنی بھتیجی کی شادی کے سلسلے میں اسلام آباد گئی ہوئی تھیں، رفعت سراج کے شوہر صاحب کی طبیعت ناساز تھی اور عطیہ عمر کی اپنی طبیعت بی پی کے باعث ناساز تھی ورنہ ضرور آتیں)۔ اب تبصرہ ہو جائے اللہ اور رسول کی باتیں...... تبصرے سے بالاتر ہیں۔ مجھے کچھ کہنا ہے میں تم نے اچھا لکھا حج کے بارے میں، ذکیہ کا مضمون جو میری کلاس فیلو، دوست ہیں بہت معلوماتی اور ایمان افروز ہوتا ہے ان سے آپ لوگوں کی ملاقات اچھی لگی۔ رفعت سراج کا ناول روز بروز دلچسپ ہوتا جا رہا ہے۔ لیڈی صوفیہ کا کردار دلچسپ ہے اب دیکھیں زارا صاحبہ کیا گل کھلاتی ہیں۔ نگہت اعظمی نے اچھی تحریر دی۔ ہالہ احمد کا ہم بتلائیں کیا مختصر مگر دلچسپ تحریر تھی۔ سحرش فاطمہ کی تحریر خاص نہ لگی۔ حاصلِ زندگی میں اچھا پیغام دیا گیا۔ تو میرا نصیب ہے، ننھی خواہش، بیٹی اور بیٹی سو، سو تھیں۔ شیریں حیدر اچھا لکھ رہی ہیں مگر رشتوں کی اتنی بھرمار ہے کہ سبق کی طرح یاد کرنا پڑتا ہے مگر ان کی پیاری کی گردان کے باوجود یہ دلچسپ ہے اور قاری کو اسیر کر لیتا ہے۔ ہم کو عبث بدنام کیا کو بھی سبق کی طرح یاد کرنا پڑتا ہے مگر قاری کو پڑھنے پر مجبور ضرور کرتی ہے۔ متاعِ عمر گوارا جھلمل دلچسپ تحریر ہے۔ اختر شجاعت کا مضمون بہت معلوماتی اور حج کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ صبیحہ شاہ سے مل کر اچھا لگا۔ دیگر سلسلے بھی اچھے رہے۔ بہنوں کی محفل کا تو جواب ہی نہیں عذرا کی باتیں بہت اچھی لگیں۔ (عذرا شکریہ کہہ رہی ہیں) تم نے محبت سے یاد کیا بہت خوشی ہوئی دل تو چاہتا ہے کہ روز تم سے ملا جائے مگر دل تو پاگل ہے، رفاقت بہن کے لیے دلی دعائیں۔“ (ڈاکٹر صاحبہ آپ کو اپنے مریضوں کے لیے جلد صحت یاب ہونا ہے۔ تبصرے کا شکریہ)

مسرت رانی خلیل، کراچی سے۔ ”پاکیزہ ماشاءاللہ سے بہت اچھا جا رہا ہے۔ اس ماہ تو صبیحہ شاہ کے انٹرویو نے دل جیت لیا۔ ایک تو نزہت آپ بہت اچھے سوالات تیار کرتی ہیں (بہت شکریہ) اور پھر صبیحہ شاہ کے کھرے، کھرے اور مزیدار جواب پڑھ کر بہت لطف آیا۔ رفعت سراج کے ناول میں بہترین کردار نگاری اور منظر نگاری ہے۔ شیریں حیدر کا ناول اگرچہ کردار بہت زیادہ ہیں مگر پھر بھی بہت اچھا ہے بس آپ لوگ تھوڑا سا خلاصہ ضرور دیا کریں تا کہ آپس کے رشتے سمجھ آسکیں۔ (جی آئندہ خیال رکھیں گے اصل میں ایک ڈیڑھ صفحہ خلاصے میں چلا جاتا ہے پھر بھی آپ کی رائے کا احترام کیا جائے گا) اور ایک بات یہ بھی کہنی ہے کہ سلسلے وار کہانیاں کم ہوں تو اچھا ہے۔ چھوٹے، چھوٹے افسانے اچھے لگتے ہیں۔ (مسرت بہن سب کی پسند کا خیال رکھنا پڑتا ہے کچھ قاری سلسلوں کو پسند کرتے ہیں) مجموعی طور پر پاکیزہ کی تمام تحریریں بہت پسند آئیں۔ اللہ آپ کو اور ہمت دے اور پاکیزہ مزید ترقی کرے۔ (دعاؤں کے لیے بہت شکریہ بس آپ اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیں)

شاہینہ مبارک، ہالہ سے۔ ”باجی آپ نے بہت اچھی طرح پاکیزہ سنبھالا ہے۔ کئی خطوط کے جواب بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔ بہرحال آپ یہ اچھا کام کر رہی ہیں (ہاں شاہینہ، بہنوں کی محفل کی انفرادیت یہی ہے) اس ماہ کے پاکیزہ میں بھی تمام تحریریں اے ون تھیں۔ سحر ساجد کا ناولٹ تو بہت اچھا تھا ان سے اور بھی لکھوائیں (جی اس ماہ ان کی تحریر شامل ہے) میں تو بچپن سے ہی

پاکیزہ پڑھ رہی ہوں انجم باجی بھی بہت اچھا کرتی تھیں (جی بالکل) اور آپی آپ کے انٹرویوز بھی بہت اچھے ہوتے ہیں اس دفعہ دلہن نمبر میں شائستہ زریں کا سروے کمال کا تھا۔ ذکیہ آپا سے ملاقات مزہ دے گئی بہت اچھا لگا...... اللہ پاکیزہ کو بہت ترقی دے۔'' (الٰہی آمین، شاہینہ پیاری سی دعاؤں کا شکریہ...... اللہ ہمارے باشعور و باذوق قارئین کو سلامت رکھے، آمین)

ﷲ حدیث اختر، حاصل پور سے۔ ''ہمارا پاکیزہ بہت اچھا جا رہا ہے۔ اس میں شامل تمام سلسلے بہت ہی اچھے ہیں۔ آپ سے ایک بات کہنی ہے کہ آئندہ ذکیہ آپا سے ملاقات ہو تو انہیں بتائیے گا کہ میں ششم کلاس میں تھی جب سے ان کی لکھی کہانی حضرت غوث پاک کے بارے میں جاسوسی یا شاید سسپنس میں لگی تھی اور میرے ابوجی نے خاص کر کے مجھے پڑھوائی تھی اب تو ابو کے انتقال کو اکتیس سال ہونے والے ہیں (ذکیہ آپا اپنے تمام مداحوں کو یاد رکھتی ہیں) اس دفعہ تو دین کی باتیں مجھے کچھ کہنا ہے پڑھ کر آگے بڑھے تو آپ کو اور عذرا آپی کو ذکیہ آپا کے پاس پایا بڑی خوشی ہوئی۔ اس دفعہ اکمیس جبار کے افسانے چھٹی جو دھند نے خاص الخاص میلا لوٹ لیا (جی ہاں) نزہت آپ کے سوال اور صبیحہ شاہ کے برجستہ اور کھرے جوابات ماشاء اللہ بعض جواب یوں لگے کہ یہی مجھے بھی کہنا تھا۔'' (ارے واہ تعریف کا شکریہ)

ﷲ ثمر کاظمی، ڈیرا اسماعیل خان سے۔ ''ستمبر کا پاکیزہ دس تاریخ کو ملا، ٹائٹل پر ماڈل بہت پیاری تھی۔ نزہت آپی اللہ آپ کو خوش رکھے۔ بہت محنت کر رہی ہیں۔'' (یہ آپ سب کے تعاون کی وجہ سے ہے) رفعت سراج بہت اچھا لکھ رہی ہیں میرا خیال ہے پرنس اور سفینہ اور زارا اور ساحل ساتھ ہوں گے۔ سحرش فاطمہ کا ناولٹ وہی روایتی کہانی لیکن اچھی تھی۔ باقی آئندہ دیکھ کر موڈ خراب ہوا۔ (اس دفعہ موڈ صحیح ہو جائے گا) سیمارضا کا ناول پورے پاکیزہ کی جان ہے۔ عالیہ حرا کافی عرصے بعد آئیں اور چھا گئیں...... سعدیہ رئیس میری فیورٹ، متاع عمر زبردست تھا افسانوں میں ام ثمامہ کا بیٹی اور پیٹی، ہالہ احمد کا ہم بتلائیں کیا اچھی لگیں۔'' (تبصرے کا شکریہ)

ﷲ فریدہ جاوید فری، لاہور سے۔ ''تبصرہ لیٹ لکھ رہی ہوں بہت زیادہ بیمار تھی...... ذکیہ بلگرامی صاحبہ سے کہہ کر میرے لیے دعا کروائیں...... (جی ضرور) میرا چھوٹا بھائی بھی بیمار ہے۔ سب بہن بھائی رائٹرز قارئین ہمارے لیے دعا کریں۔ اللہ تعالیٰ معراج صاحب کو بھی صحت دے آمین، ابھی تین چار افسانے پڑھے ہیں کمزوری کی وجہ سے لکھا بھی نہیں جا رہا پرنس بھائی اور پروین بھابی بھی دعا کریں۔ شکریہ آپ پتا نہیں میرا یہ خط شائع بھی کریں گی یا نہیں...... اس میں تو دکھوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ (فریدہ پاکیزہ آپ کے دکھ سکھ کا ساتھی ہے جبھی تو ہر خبر شائع کرتا ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں)

ﷲ فریدہ ہاشمی، کراچی سے۔ ''آپ نے ماشاء اللہ بہت اچھی طرح رسالے کو سنبھالا ہے۔ کچھ نیا پن بھی ہے۔ امید ہے آئندہ ہمارا رسالہ بہتری کی طرف گامزن ہوگا، انشاء اللہ (جی حوصلہ افزائی کا شکریہ) اگست کا پاکیزہ میرے ہاتھ میں ہے۔ سارے مضامین اور افسانے بہترین ہیں۔ خاص کر ناولوں کا ذکر کرنا چاہتی ہوں۔ رفعت سراج بہت ہی عمدہ لکھ رہی ہیں (جی بالکل) پرنس کے کردار اور اس کی تربیت میں جو ان کی دادی کا حصہ ہے۔ بے حد نفیس اور پُرتاثر ہے۔ پوتے، دادی کا کردار بھی بے حد اچھا دکھایا ہے ورنہ دولت تو انسان کو بے حد مغرور اور بے اعتدال بنا دیتی ہے۔ شیریں حیدر کا امرت بھی بہت پسند آرہا ہے۔ سحر ساجد کا ناول بھی بہت عمدگی سے اختتام پزیر ہوا۔ ذکیہ بلگرامی اور اختر شجاعت کے مضامین کی تو تعریف ہی ممکن نہیں (جی بے شک) دونوں بہنیں ہم سب کو بے حد معلومات دے رہی ہیں۔ آخرت کا سیدھا راستہ دکھا رہی ہیں۔ بہت شکریہ اور سلام کہہ دیں۔ (ان کی طرف سے وعلیکم السلام اور دعائیں) میں عورت ہوں اور کوہ گراں، بہت پسند آئے۔ گولڈن اسٹار نے تو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ پاکیزہ ڈائری میں نادر جاجوی کی حمد بہت اچھی لگی رابعہ سرفراز اور ارم کمال کی نگارشات عمدہ تھیں۔ ظل شاہین کی معلومات نے حیرت زدہ کر دیا۔ خدا سب بہنوں کو سلامت رکھے، آمین۔ (تبصرے کا شکریہ) فریدہ اشفاق اور عذرا آفتاب کے انٹرویو اچھے لگے...... خاص کر عذرا رسول کو سلام......'' (عذرا صاحبہ کی طرف سے بھی سلام و دعا)

ﷲ نازنین آفریدی، پشاور سے۔ ''آپ کو ایڈیٹرشپ بہت، بہت مبارک ہو اور اللہ پاک مزید کامیابیاں و کامرانیاں عطا کرے۔ جب انجم آنٹی کے پاکیزہ کے چھوڑنے کا سنا تھا تو لگتا تھا پاکیزہ اب شاید ویسا نہ رہے لیکن یہ میری خام خیالی ثابت ہوئی۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اس کا معیار پہلے سے بہت بڑھ گیا ہے۔ تبدیلیاں بھی جو کچھ اس میں ہوئیں وہ مثبت ہیں اور آپ کے کری ایٹو ہونے کی عکاس ہیں۔ (حوصلہ افزائی کا شکریہ) آنٹی شیریں حیدر میری فیورٹ رائٹر ہیں۔ ان

سوشل میڈیا قارئین کے لیے اہم اطلاع

سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ وغیرہ پر ادارے کی کوئی OFFICIAL WEBSITE نہیں ہے۔ جو ایڈمن اپنی WEBSITES پر آفیشل کا لفظ استعمال کر رہے ہیں، اسے فوری ترک کر دیں تا کہ قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ بصورت دیگر ادارہ سائبر کرائمز ایکٹ کے تحت کارروائی کرے گا۔

کے لیے اسپیشل دعائیں، شمع ہدایت سے ہمیشہ کی طرح ہدایت ملی۔ اللہ اور اس کا نور اور آپ کی اور آنٹی عذرا رسول کی آنٹی ذکیہ بلگرامی سے ملاقات بھی بہت پسند آئی۔ وہ آئے بزم میں، صبیحہ شاہ سے ملاقات اچھی لگی۔ شادی مبارک پسند آیا۔ ناولوں اور افسانوں میں رفعت سراج کا ناول بہت ہی زبردست ہے۔ نگہت اعظمی کی سوال پسند آئی۔ ہم بتلائیں کیا اور میری دھوپ کی تم ہی چھاؤں عام سی لگیں۔ حاصلِ زندگی کے لیے میں یہی کہوں گی کہ مصنفین خدارا یہ موضوع اب چھوڑ دیں۔ بہت ہی پرانا ہو چکا ہے۔ عالیہ حرا کا مکمل ناول ٹھیک لگا۔ ویسے بھی وہ میری فیورٹ رائٹر ہیں اور مجھے ان کا لکھنے کا انداز پسند ہے ان سے کبھی طویل ناول بھی لکھوایئے گا۔ (جی ضرور) امرت اور شیریں حیدر دونوں ہی بہت زبردست ہیں۔ لیکن اس بار کرداروں کی بہتات ہے، ہر دفعہ پچھلی قسط اور کردار بھولے ہوتے ہیں۔ ویسے ناول تو اچھا لگ رہا ہے، ہم کو عبث بدنام کیا بہت کمزور پلاٹ لیکن اب کھل رہا ہے، تو میرا نصیب ہے۔ بہت عام سی کہانی رہی۔ کافی دفعہ ایسی کہانیاں لکھی جا چکی ہیں۔ ننھی خواہش، بیٹی اور بیٹی اچھی رہیں دھواں، دھواں زندگی اور گنگنا دی زندگی بھی ٹھیک رہی۔'' (نازنین آپ ہماری پکار پر چلی آئیں اب آتی رہیے گا۔ طویل تبصرے کا شکریہ)

✍ حافظہ ست البنات، تونسہ شریف سے۔ ''اداریہ دل کو چھو گیا حج پر جانے کی تڑپ کو مزید بڑھا گیا۔ رفعت سراج صاحبہ کا ناول تعریف کا محتاج نہیں بہت ہی دل نشیں اندازِ تحریر ہے زارا کا اپنی بہن سے جلنا ہم کو کچھ عجیب نہیں لگا کیونکہ ایسی ہی حاسد بہن ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ سوال، بہت دکھی افسانہ تھا۔ سائرہ کی جھوٹ بولنے کی عادت پر بہت افسوس ہوا۔ ہالہ احمد نے سچ ہی تو کہا ہے نہی کچھ تو لوگ کرتے ہیں ادب کرو تو بھی گلے پڑ جاتے ہیں۔ برابر کا کہو تب بھی بات نہیں بنتی۔ ہلکا پھلکا افسانہ تھا مزہ دے گیا۔ میری دھوپ کی تم ہی چھاؤں پر تبصرہ انشاء اللہ مکمل ہونے پر کریں گے۔ حاصلِ زندگی میں تعلیم کی اہمیت اچھے طریقے سے بتائی گئی ہے۔ صاعقہ نے تعلیم سے شعور لیا ہے۔ تو میرا نصیب ہے اچھی تحریر تھی والدین کا کہا ماننا ہی بھلائی ہے۔ فرح طاہر صاحبہ نے بہت اچھے انداز میں اللہ سے مانگنا سکھایا ہے اور ساتھ، ساتھ لوگوں کو جھنجوڑا بھی ہے۔ (رائٹر کی تحریر کا مقصد اصلاح ہی ہوتا ہے) ام ثمامہ نے بھی خوب لکھا ہے۔ آمنہ اور آمنہ کی اماں دونوں ہی اپنی، اپنی جگہ ٹھیک تھیں۔ دونوں نے اپنی، اپنی ماؤں سے سیکھا تھا۔ امرت کچھ، کچھ اندازہ ہمیں تھا کہ زین سے امرت کی شادی ہوگی امرت گل بہت سیانی لڑکی ہے اور سمجھدار لوگوں پر ہی تکالیف اور آزمائشیں آتی ہیں۔ گنگنا دی زندگی...... حنین کو دو، دو خوشیاں اللہ نے اکٹھے عطا کیں۔ نگہت غفار صاحبہ نے بہت اچھا سمجھایا کہ کسی کی بیٹیوں پر خواہ مخواہ الزام اور بڑے بول اپنا ہی نقصان ہے۔ سیمار ضار داجی آپ تو بہت ہی زبردست لکھ رہی ہیں۔ ریبال اور ثمیرہ کو ملایئے گا ضرور۔ جہان نور کو اللہ ریبال سے بہتر بندہ دے گا۔ کنگن پڑھ کر ہمارا بھی کنگن بنوانے کو دل کرنے لگا۔ (فوراً بنوالو) چھٹی جو دھند تمام افسانوں کا سردار کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا۔ جزاک اللہ، (انیس جبار مبارک ہو) متاع عمر وہی گھر کا بہترین رشتہ ٹھکرانے اور والدین کا دل دکھانے پر شہزانہ کو ایسا شوہر ملا...... گھر وندا میں آج کل کے حالات کی بہترین منظر کشی کی گئی ہے۔ اشک، جگنو اور ستارے بہت مزیدار اور معلوماتی تحریر تھی۔ محترمہ صبیحہ شاہ بہت ہی سادہ خاتون ہیں۔ (جی بالکل) ان کی گفتگو کا انداز دل کو بھا گیا۔ آپ نئی نئی لکھنے والیوں کی بہت حوصلہ افزائی کر رہی ہیں۔'' (بھئی یہ نئی ہی تو پرانی اور منجھی ہوئی رائٹر بنتی ہیں)

✍ تسنیم کوثر، کراچی سے۔ ''ستمبر کا پاکیزہ پڑھا ہمیشہ کی طرح انجوائے کیا۔ سب سے پہلے وہ آئے بزم میں مصنفہ صبیحہ شاہ کا دلکش انٹرویو پڑھا بہت مزہ آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اتنا جاندار واضح اور بھرپور جامع خوب صورت انٹرویو شاید میری نظر سے

نہیں گزرا۔ خاص طور پر صبیحہ شاہ کے یہ الفاظ ''دل چاہا تو تیار ہو لیے نہیں تو یونہی سہی اپر لپ، آئی بروز بنوائیں تو بنوائیں نہ تو یونہی سہی کوئی نظر بھر کے دیکھنا چاہے تو بیٹا کہہ 'لو' واہ، واہ کیا خوب صورت بے حد لطف آیا (جی ہاں) اس کے علاوہ شمع ہدایت میں اختر شجاعت کا حج پر مضمون دل کو چھو گیا 2014ء میں الحمدللہ میں بھی حج اکبر ادا کر چکی ہوں چونکہ جمعہ کے دن حج ہوا تھا اس لیے حج اکبر ہوا تھا لیکن دل بار، بار جانے کو چاہتا ہے۔ اللہ ہم سب کو حج مبرور عطا فرمائے، آمین۔ (تسنیم آپ کی معلومات میں اضافے کے لیے عرض ہے کہ ہر عمرہ حج اصغر اور ہر حج، حج اکبر ہے چاہے تو کسی عالم دین سے تصدیق بھی کروالیں۔) اختر شجاعت صاحبہ کو اتنا بہترین لکھنے پر اللہ جزائے خیر دے۔ اور جناب شادی مبارک میں انوکھی شادی کا احوال نرگس تسیم نے کیا مزیدار لکھا ہے واللہ جواب نہیں، بہت، بہت پسند آیا۔ شیریں حیدر کے ناول امرت کے بارے میں کیا عرض کریں۔ ان کے ناول کے (میں) نے سارا مزہ کرکرا کر دیا، یہ میں کیا ہے؟ ناول کے تمام کرداروں نے خود کو میں سے اظہار کیا ہے۔ مطلب یہ کہ ناول میں سب میں نے یہ کیا، میں نے وہ کیا وغیرہ، وغیرہ سے مخاطب ہوتے ہیں جو کہ بالکل پسند نہیں اور اسی وجہ سے یہ ناول اچھا نہیں لگ رہا۔ (تسنیم صرف امرت، ''میں'' ہے جو داستان سنا رہی ہے) ناولٹ میں متاع عمر وہی سعدیہ رئیس نے زبردست لکھا ہے۔ اسٹوری بہت اچھی تھی۔ افسانوں میں چھٹی جو دھند المیس جبار نے بھی لاجواب کہانی بلکہ نصیحت آمیز شاندار تحریر رقم کی دل سے پسند آئی۔ ام ثمامہ نے بیٹی اور بیٹی بہت اچھا لکھا ہے۔ گھر گھروندا فوزیہ احسان رانا کا افسانہ تو گویا دل میں بس گیا تعریف کے لیے الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔ باقی تمام افسانے بھی بہترین تھے۔ ماشاءاللہ پاکیزہ نکھرتا جا رہا ہے اور بہنوں کی محفل تو پاکیزہ کی شان ہے۔ پیاری نزہت پلیز آپ اپنا بھی ایک پیارا سا انٹرویو دیجیے ہم آپ سے ملنا چاہتے ہیں آپ کو جاننا چاہتے ہیں ضرور سوچیے گا۔'' (میں آپ کے سامنے ہوں، جب چاہیں جو سوال پوچھ لیں۔ تفصیلی تبصرے کا شکریہ)

* پروین افضل شاہین، بہاول نگر سے۔ ''اس بار ستمبر کا شمارہ دلہن نمبر ماہم کے دلکش سرورق سے سجا میرے ہاتھوں میں ہے۔ آپ کا اداریہ حجاج کرام کے بارے میں تھا۔ دین کی باتیں اللہ اور اس کا نور پڑھ کر اپنے ایمان کو تازہ کیا۔ ذکیہ آپا سے پُرعقیدت ملاقات پسند آئی۔ یہ ملاقات مختصر کیوں تھی۔ (ارے لکھنے بیٹھتے تو صفحات اسی سے بھر جاتے تھوڑے کو بہت جانیں) ناولز افسانوں میں میری دھوپ کی تم ہی چھاؤں...... ہم بتلائیں کیا، دھواں، دھواں ہے زندگی، گھر گھروندا، پسند آئے۔ مستقل ناولز کے تو کیا ہی کہنے...... خصوصی مضامین میں شمع ہدایت، وہ آئے بزم میں، آیا ہے بلاوا، شادی مبارک پسند آئے۔ ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ میری نند فریدہ جاوید فری اور میرے دیور یعنی ان کے بھائی کو اور اپنی عندلیب کو صحت و تندرستی عطا فرمائے، آمین، ثم آمین...... سعدیہ ہما شیخ کو ایوارڈ کی دلی مبارک باد قبول ہو۔'' (تبصرے کا شکریہ)

* شمع تفسیر، کراچی سے۔ ''پاکیزہ سے رشتہ بہت پرانا اور اپنائیت والا ہے۔ اور میرے ابو کا شمار سسپنس، جاسوسی اور پھر سرگزشت ڈائجسٹ کے پرستاروں میں ہوتا ہے۔ جب میں اسکول سے واپس آتی تو ابو کے لائے ہوئے سسپنس اور جاسوسی کے تازہ شمارے میری نگاہوں کی زد پر ہوتے۔ پہلے تو صرف کترنیں اور لطائف وغیرہ سمجھ میں آتے تھے پھر جیسے، جیسے وقت گزرا تک ویلوٹ کی چوریاں اور پھر سسپنس کی دیوتا جاسوسی کی سرکش اور شکاری، مرزا امجد بیگ کی ڈائری کا بھی انتظار رہنے لگا۔ ناہید سلطانہ اختر کی وہ پہلی تحریر تھی جو میں نے بطورِ خاص اپنے ابو جی کے کہنے پر پڑھی۔ جاسوسی ڈائجسٹ کی چینی نکتہ چینی بڑی پرلطف لگتی تھی۔ بس نزہت جی پھر ہم پاکیزہ کی طرف آئے سولہ سال تو ہو گئے ہیں پاکیزہ کے باقاعدہ مطالعے کو... ماشاءاللہ... صائمہ اکرم کے ڈھول تاشے اور سعدیہ ہما شیخ کے ناز بھرے خطوط کی کمی محسوس ہوتی ہے بہنوں کی محفل میں (جی سب یاد کرتے ہیں، اب وہ دونوں کافی مصروف ہو گئی ہیں) اس بار مختصر کہانیوں میں سوال نگہت اعظمی کی تحریر اور حاصل زندگی بہت اچھی لگیں، گھر گھروندا بھی بہت سبق آموز اور متاثر کن تحریر تھی۔ یہ کہاں بچیں کہ دل ہے، رفعت سراج کا قلم تو سحر زدہ کرتا جا رہا ہے۔ شیریں حیدر کے تو ہم ہیں ہی پرستار...... میری دھوپ کی تم ہی چھاؤں سحرش فاطمہ کی بہت اچھی تحریر تھی اب اگلے ماہ مکمل پڑھ کر اور مزہ آئے گا۔ ذکیہ بلگرامی سے پُرعقیدت ملاقات دل خوش کر گئی نزہت جی اور عذرا جی آپ کا بہت، بہت شکریہ اس خوب صورت اور زبردست ملاقات کا اور پھر اس کو ہم تک پہنچانے کے لیے (جی یہ آپ لوگوں کے لیے ہی تھی) آخر میں نزہت جی آپ کا بہت شکریہ کہ میری تحریر کو پاکیزہ ڈائجسٹ کے قیمتی صفحات کا حصہ بنا دیا...... بس ایک افسوس ہے کہ میری اس خوشی کو شیئر کرنے کے لیے...... آج میرے ابو موجود نہیں ہیں۔ (اللہ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، الٰہی آمین) وہ

مطالعے کے اتنے شوقین تھے نزہت جی کہ ورثے میں مال و دولت نہیں بے شمار مذہبی، سماجی، معلوماتی کتب چھوڑ کر گئے ہیں ان کا کمرا جیسے ایک لائبریری کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ پروردگار عالم اپنے پیاروں کے صدقے سب کے سروں پر ان کے والدین کا سایہ تا دیر قائم رکھے، آمین۔" (شمع آپ کے تبصرے کا شکریہ..... آپ کے والدین کی وفات پر نہایت افسوس ہے مگر کیا کریں یہی حقیقت ہے ایک نہ ایک دن سب کو ہی اس جہانِ فانی سے کوچ کرنا ہے)

☒ انوشہ، ڈی جی خان۔ رسالے کی پسندیدگی کا شکریہ آپ نے اپنے کسی پروگرام کا حوالہ دیا تھا اس کی بابت کچھ مختصر احوال و تصویر بھیج سکتی ہیں۔

☒ قیصر سدرہ، سرگودھا۔ آپ لکھنے کی مشق جاری رکھیں۔ کہانیوں پر بھی تبصرہ بھیجیں۔

☒ صباحت، گوجرانوالہ۔ پاکیزہ پسند کرنے کا شکریہ آپ کہانیوں پر بھی تبصرہ بھیجیں۔

☒ خدیجہ میر۔ آپ رسالے کا باقاعدگی سے مطالعہ کریں..... کہانیاں بھی لگ جائیں گی مشق جاری رکھیں۔

☒ لبنیٰ قدیر، لاہور۔ آپ ضرور کہانی لکھیں مگر مصنفین کی کاوشوں کا مطالعہ بھی جاری رکھیں ہمارے ادارے کے پرچے پسند کرنے کا بہت شکریہ۔

☒ تمثیلہ لطیف، لاہور آپ کی تمام غزلیں موصول ہو چکی ہیں جو ہم وقتاً فوقتاً لگاتے رہیں گے۔ ظاہر ہے ایک ماہ میں زیادہ سے زیادہ ایک یا دو ہی لگ سکتی ہیں۔ پاکیزہ کی پسندیدگی کا شکریہ.....

☒ صفیہ بیگم، لالہ موسیٰ..... آپ کی دعاؤں اور رسالے کی تعریف پر ڈھیروں شکریہ..... ہم اپنے قارئین کے ذوق کا خیال رکھتے ہوئے ہی سب سلسلے ترتیب دیتے ہیں۔

☒ عائشہ یوسف، اسلام آباد، بس اک ذرا انتظار آپ کی کہانی جلد ہی شائع ہوگی..... رسالے کی پسندیدگی کا شکریہ۔

✉ مسٹر اینڈ مسز ناصر المعروف کپل آف فیصل آباد۔ فیصل آباد سے کچھ یوں مخاطب ہیں۔ "ماہ ستمبر کا پاکیزہ بہت اچھا رہا۔ تمام سلسلے وار ناول، افسانے اور دیگر سلسلے سب ہی بہت اچھے تھے..... انٹرویو کا سلسلہ بہت اچھا ہے۔ اس سے ہمیں تمام رائٹرز کے بارے میں بہت معلومات ملتی ہیں (جی شکریہ) اگرچہ میرا دل بہت چاہتا ہے کہ شادی کا احوال لکھوں..... ابھی میرے بیٹے کی شادی کو ایک سال ہوا ہے (مبارک ہو) بس لکھنے میں سستی آڑے آجاتی ہے۔ (بھئی مسز ناصر تبصرہ تو فون پر لیا جا سکتا ہے شادی کا احوال نہیں..... یہ تو لکھنا ہی پڑے گا جناب) تمام رائٹرز کو سلام اور قاری بہنوں کو دعائیں..... یہ محفل ایک دوسرے کے حال احوال سے خوب آگاہ کرتی ہے۔" (جی یہ تو ہے)

☒ ماہم اوزین، کراچی۔ آپ کو پاکیزہ میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ تبصرہ بھی بھیجیں کہانی بھی شائع ہو ہی جائے گی۔

✉ شمائلہ دلعباد، صلالہ عمان سے۔ "آپی اپنا تبصرہ ستمبر کے شمارے میں پڑھ کر دل خوشی سے اچھل پڑا..... میں اپنے میاں کو بار بار پڑھاتی رہی آپ نے بہت مان اور خلوص سے میرا ٹیلی فونک تبصرہ لگایا۔ پاکیزہ تو ہماری جان ہے، اس مرتبہ نگہت اعظمی کا افسانہ سوال بہت بہترین تھا اس پر مصنفہ کی لاکھوں تعریف بنتی ہے۔ ہالہ احمد کے ہم بتلائیں کیا نے مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ ذکیہ آپا سے آپ کی اور عذرا آپی کی ملاقات بہت اچھی لگی۔ میں نے تو بچپن سے سسپنس ڈائجسٹ سے مطالعے کا آغاز کیا تھا۔ آپ کے ادارے کے تمام رسالے بہت ہی اچھے ہوتے ہیں۔ یہاں صلالہ میں خوب پڑھے جاتے ہیں، امی، ابو بھی رسائل باقاعدگی سے پڑھتے تھے۔ افسانوں کے ساتھ، ساتھ دیگر سلسلے بھی سب اچھے تھے حج کا سفر بھی خوب تھا۔ اشعار اور دیگر چیزیں بھی مزہ دے گئیں میری ڈھیروں دعائیں آپ لوگوں کے لیے۔" (شمائلہ دعاؤں کا شکریہ پاکیزہ مصنفات بھی شکریہ ادا کرتی ہیں)

✉ حنا ابرار، کراچی سے۔ "میں آئندہ اپنا تبصرہ پابندی سے بھیجوں گی۔ جوابی ای میل کا شکریہ..... جس رسالے کو میں اور میری امی ایک لمبے عرصے سے پڑھ رہے ہیں میں اسی سے اپنے تحریری سفر کا آغاز کرنا چاہتی ہوں۔" (جی ضرور کریں، اچھی تحریریں ہی پاکیزہ کی پہچان ہیں)

✉ نیر فہیم خان، کراچی سے۔ "گئے زمانے میں ہم بھی پاکیزہ کے ساتھیوں میں شامل تھے۔ جو انعام یافتہ اور ایوارڈ یافتہ بھی تھے۔ (ارے بھئی آپ اب بھی شامل ہی ہیں) مگر ماہ و سال کی بے رحم موجوں نے کچھ ایسا بے حال رکھا کہ پاکیزہ

سے اپنا حال کہنے سے بھی گئے۔ (اب تو حال بھی کہہ دیا ناں) اب شادی، بچوں کی ابتدائی پرورش اور دیگر جھمیلوں سے فراغت ملی ہے تو پھر سے ہمیں اِک ساتھی کوئی بھولا یاد آیا۔ (شکریہ) سو حاضرِ خدمت ہیں، آپ سے دوبارہ رشتہ استوار کرنا چاہتی ہوں آپ کی توجہ درکار ہے۔ محبت کی ضرورت ہے حوصلہ افزائی کی خواہش ہے۔ کیونکہ امید پر دنیا قائم ہے۔'' (امید پر قائم ہی رہنی چاہیے آپ کو ایک مرتبہ پھر خوش آمدید کہتے ہیں۔)

✍ قرۃ العین خرم، کراچی سے۔ ''میرے لکھنے میں کچھ وقت کے لیے گیپ آگیا تھا۔ اب انشاءاللہ دوبارہ قلم تھاما ہے اور پاکیزہ کے لیے اچھی اور نئی تحریر بھیجوں گی۔ اس لیے کہ آپ کا ادارہ بہت اچھا ہے۔ رائٹرز کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ بہت شکریہ، سلامت رہیں۔'' (آپ بھی سلامت رہیں، رائٹر کی عزت ہی ہماری عزت ہے ڈیئر)

✍ شازیہ رباب، نند پور کامونکی سے۔ ''میں ایک لمبے عرصے سے پاکیزہ سے منسلک ہوں۔ (جی ہمیں معلوم ہے، ہم اپنے نئے، پرانے سب قارئین کی دل سے قدر کرتے ہیں) آپی عذرا کا ہر ماہ ہم سے بات کرنا اچھا لگا۔ (آپی شکریہ کہتی ہیں) پاکیزہ میں بہت سے سلسلے آئے اور گئے مگر بہنوں کی محفل آج بھی پاکیزہ میں چھائی ہوئی ہے۔ بہت ساری بہنیں آتی رہیں اور جلوے دکھا کر جاتی رہیں کچھ ہمارے دور کی اب بھی ہیں۔ پاکیزہ میں جو آج کل سلسلے وار ناول چل رہے ہیں وہ بہت اچھے ہیں امرت اور...... یہ کہاں بچیں کہ دل بہت زبردست جا رہے ہیں اس ماہ سحر ساجد کے ناول کا اختتام ہوا ہے۔ من جاں بازم، انتا زبردست اور خوب صورت ناول لکھنے پر سحر ساجد کو بہت مبارک باد...... آرمی سے متعلقہ تحریریں بہت اٹریکٹ کرتی ہیں مگر اس ناول میں جس طرح حقیقت کی عکاسی کی گئی اس کی مثال نہیں ملتی (جی سحر شکریہ کہتی ہیں) باقی افسانوں میں ہاجرہ ریحان کی بیٹی اور بیٹی بھی ٹھیک تھا۔ محبت میں رتجگے تو صرف لو اسٹوری تھی عید محبت اور تم بھی بس سو سو تھی۔ فرحین اظفر کی خدا جانے پسند آئی دردانہ نوشین کی میں عورت ہوں۔ بہت پسند آئی۔ دردانہ نے بہت اچھا لکھا۔ مرد جس طرح اپنی حاکمیت جتاتے ہیں اور گالم گلوچ اور اذیت دینے کو وہ اپنا حق سمجھتے ہیں درردانہ نے اس کو بہت اچھے طریقے سے اجاگر کیا۔ اب تو کوئی خضر ملے... منشا محسن علی کی تحریر آزادی کے مہینے کے حوالے سے پُراثر تحریر تھی۔'' (شازیہ بہن، آپ کی آمد سر آنکھوں پر اپنی تحریر سے بزم کو رونق بخشتی رہیں، دعاؤں کا بے حد شکریہ)

✍ کوثر خالد، جڑانوالہ سے۔ ''آپ نے واقعی پاکیزہ کی کمان بہت بہتر انداز میں سنبھال لی ہے۔ (بہت شکریہ) جناب تبصرہ ہر کہانی پر انفرادی کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔ لہٰذا گزارش اتنی کرنا ہے کہ ایک سے بڑھ کر ایک لکھاری ہے اور ایک سے بڑھ کر ایک بامقصد ہدایت یافتہ کہانی ہے پرانے تو پرانے آپ نئے لکھاریوں کو بھی یوں سنوار کر لائی ہیں کہ دل اُش اُش کر اٹھا ہے۔ زندگی تنویر تمہیں اپنا پہلا شاہکار افسانہ مبارک ہو۔ فرح بھٹو، ہاجرہ ریحان کے تو ہم پہلے ہی دیوانے ہیں۔ بڑی تمام رائٹرز کو سلام محبت، ہما بیگ کی اطلاعات زبردست۔ شیریں حیدر تو زبردست خفیہ سچ لکھنے میں ماہر ہیں مگر ان کی کہانیوں سے زیادہ ہمیں ان کا انٹرویو اچھا لگا تھا۔ آپ تو بس باتیں کیا کریں اپنے گھر کی۔ من جاں بازم کی پہلی قسط پڑھی تھی بس اور اب آخری...... تو ساری سمجھ آگئی کہنے کا مطلب کہ ناول ایک ہی یا دو قسطوں کا اچھا ہوتا ہے۔ (تو پھر اتنے ڈھیر سارے قارئین کی فرمائش کیسے پوری ہوگی کوثر جو طویل ناول پڑھنا چاہتے ہیں) منشا محسن علی نے ہمارے دل کو رلا، رلا دیا۔ اب چلوں اپنی سب سے پسندیدہ لکھاری کی طرف، جی ہاں...... رفعت سراج کی تصویر جو پچھلے دنوں دیکھی تو سوچا...... جیسا نور چہرے پہ ہے ویسا ہی حسن تحریر میں ہے۔ چراغ خانہ کے بعد میں نے انہیں پڑھا دوسری بار پاکیزہ میں یہ کہاں بچیں تو بلاشبہ میں کہوں گی کہ دورِ حاضر کی سب سے لاجواب لکھاری ہیں۔ اس کی وجہ...... کہانی میں کردار کم، گفتگو دلچسپ اور طوالت کم...... ان کے قلم کا یہ جادو کہ ایک ہی بات لیڈی صوفیہ کی بار، بار دُہراتی ہوئی ذرا بھی بری نہیں لگتی...... ورنہ میں ایک ہی بات بار، بار سن کر عاجز آجاتی ہوں...... کاش ہمیں بھی یہ خوب صورت اندازِ گفتگو نصیب ہو جائے۔ (رفعت دعائیں دے رہی ہیں) اب ذکر کرنا چاہوں گی صبا آصف کی سوگواری کا...... پہلے تو سن لو کہ صبا میری وہ بیٹی تھی جو پندرہ سال نہ صرف معذور بلکہ شدید بیمار رہ کر اگلے جہان گئی...... اور جس سے ہمیں باقی سب سے زیادہ پیار تھا مگر اس کی موت پر ایک آنسو بھی نہ بہایا...... البتہ یہ ہوا کہ مرنے کے بعد ہم چنگیر میں روٹی رکھے کمرے میں دوڑے کہ صبا کو کھلائیں تو پتا چلا کہ بھول ہوگئی۔ (ہاں کوثر ایک دوسرے کے درد ہی دل کو تسلی دیتے ہیں) اب ہم یہ کہیں گے کہ عذرا آفتاب کے ہاں چلتے ہیں آپ فطرت کے

حوالے سے مجھ سے متضاد ہیں۔ میرے پاس بھی اتنا وقت نہیں بچا کہ میں قدرتی مناظر میں گم ہو جاؤں یا شاید زندگی میں چند بار ہی آسمان یا پرندے دیکھے ہوں گے۔ آواز تو روز سنتی ہوں قدرت کے حسین ساز کائنات کی...... میں تو سدا لڑائیاں نمٹانے میں لگی رہتی ہوں کہ ارد گرد وجود رکھتی ہیں۔ (یہ بھی نیکی کا کام ہے) عذرا آفتاب آپ نے دادیوں کا انٹرویو مانگا تو آؤ ہم سناتے ہیں...... ہماری ساس 84 کے لگ بھگ ہماری 78 سالہ اماں کی خالہ ہیں۔ ہم اماں سمیت ان سے بھی جنگ کرتے رہتے ہیں لوگوں کے حق میں جو میرے گھر آتے ہیں، مثلاً میں دروازہ کھلا رکھتی ہوں تاکہ کوئی آئے تو کام چھوڑ نا نہ پڑے اور باہر والے کو انتظار کی زحمت بھی نہ ہو۔ (واہ کوثر اور تفصیل نہیں لکھ سکتے آپ نے تو کہانیاں لکھ ڈالیں مگر بہت دلچسپ ہیں) ارے ہاں یونس بٹ کی دل ستانیاں مزیدار تھیں۔ ہماری نظم کے لیے شکریہ......" (آپ کا بھی شکریہ)

✿ شبانہ نواز، لیہ سے۔ "میں کافی عرصے سے ادب سے وابستہ ہوں میں نے ایک مشہور رسالے کے ایڈیٹر کے پاس اپنی تحریریں بھیجی تھیں۔ تب مجھے اتنا کوئی نہیں جانتا تھا مگر افسوس کہ میری تحریریں تو چھپ گئیں...... مگر کسی اور کے نام سے اس بات کا مجھے اب تک بہت افسوس ہے۔ (ہونا بھی چاہیے یہ تو بہت غلط بات ہے) آپ کے رسالے کا معیار بہت اچھا ہے اور بہت سی لکھنے والی بہنوں نے اس رسالے کی پوری ٹیم کی تعریف کی اور مجھے بھی اس میں لکھنے کا مشورہ دیا...... میں اس رسالے کی مستقل لکھاری بننا چاہتی ہوں۔" (جی ضرور بنیں شبانہ آپ کے مراسلے تو ملتے رہتے ہیں کہانی کے لیے کچھ عرصہ انتظار کریں۔ اپنی کوشش جاری رکھیں)

✿ فرحت انصاری، ملتان سے۔ "سب سے پہلے تو شکریہ کہ میرے افسانے کو جگہ دی۔ ستمبر کے شمارے میں ذکیہ آپا سے ملاقات بہت شاندار رہی...... ایسا لگا کہ ہم بھی ان سے مل لیے۔ میں بھی کئی باتیں جاننا چاہ رہی تھی جس کے جواب مجھے مل گئے۔ ذکیہ آپا نے دعا کے متعلق بہت اچھا بتایا...... اور ایک جمعرات سے دوسری جمعرات قرآن پاک ختم کرنے کا کیا مطلب ہے؟" (فرحت، ذکیہ آپا کا مطلب ہے ایک جمعرات قرآن پاک شروع کیا جائے تو آٹھویں دن اگلی جمعرات کو مکمل کیا جائے۔ اب جیسے بھی آپ اپنے وقت کو ترتیب دے لیں یہ آپ کے اوپر ہے۔ اپنی حاجت کو ذہن میں رکھیے اسی طرح... مرحومین کے لیے قرآن پاک ختم کر سکتے ہیں اپنے دیگر واجبات کی ادائیگی اور بچوں اور شوہر کے ضروری امور نمٹانے کے ساتھ قرآن پاک پڑھنے کا بھی وقت تعین کر لیں)

✿ رومانہ انور، اسلام آباد سے۔ "اس دفعہ کا پاکیزہ بھی بہترین رہا...... میں پھر کہوں گی کہ آپ لوگ بہت بڑا کام کر رہے ہیں آج کی خواتین اور بچیوں کو انہی رسالوں سے کافی شعور مل رہا ہے۔ اس دفعہ دلہن نمبر بہت خوب تھا۔ شائستہ زریں نے بہت محنت سے سروے تیار کیا۔ شرکا کے جوابات بھی بہت عمدہ تھے۔ جن بہن نے بھتیجے کی آنکھوں میں پانی کی شکایت کا لکھا ہے میں چونکہ ایک ہومیو پیتھک ڈاکٹر ہوں اس لیے ایک آئی ڈراپس Euphereisia بتا رہی ہوں صبح دوپہر شام دو، دو قطرے ڈالیں اور جو بیماریاں ہیں ان کا علاج بھی تجویز کرنا چاہیے۔" (بہت شکریہ آپ رضا کارانہ خدمت انجام دے رہی ہیں)

✿ ساجدہ ظفر، کمالیہ سے۔ "ستمبر کا شمارہ گرچہ عید کے بعد ملا...... مگر پھر بھی عید کی مسرتوں کو دوبالا کر گیا۔ سرورق پر شرمیلی سی دلہن بہت جچی...... عیدالضحیٰ اور حج کی مناسبت سے اداریہ متاثر کن تھا عید کے حوالے سے بہنوں کے خیالات پڑھ کر عید کی ساری تھکن جاتی رہی اور دلہن نمبر کے حوالے سے شادی مبارک میں تمام شادیوں کے احوال خوب صورت تھے۔ مگر نرگس نسیم صاحبہ کی انوکھی شادی کا حال واقعی انوکھا تھا۔ انہیں آئیڈیل سرتاج ملنے پر مبارک باد ہو...... بزم پاکیزہ کے سوالات دلچسپ تو تھے مگر عید کے حوالے سے کم سوالات شائع کیے گئے۔ اس سلسلے میں عرض کرنا چاہوں گی کہ خاص مواقع پر سوالات بھی خاص ہی ہوں (آئندہ خیال رکھیں گے)۔ اشعار اے ون تھے۔ فکاہیہ کالم گوشۂ ظرافت کو مزید دلچسپ بنانے کی ضرورت ہے۔ آپی ان دنوں برما کے مسلمانوں پر ترس آتا ہے۔ کاش مسلمان متحد ہو کر ان مظلوموں کو ظالموں کے پنجوں سے آزاد کرانے کے لیے کارروائی عمل میں لائیں۔" (جی ہاں ہر حساس مسلمان کا دل دکھی ہوتا ہے)

✿ عقیلہ حق، کراچی سے۔ "جگمگاتا سا پاکیزہ میرے ہاتھوں میں ہے۔ محترمہ ذکیہ بلگرامی ہمارا سرمایہ ہیں، اللہ پاک ان کو صحت اور تندرستی عطا فرمائے آمین۔ اور مائی ڈیئر عذرا میرے بغیر آپ ذکیہ صاحبہ سے ملنے گئیں...... میرے دل کے

چھوٹے، چھوٹے سے ٹکڑے ہو گئے۔ (عقیلہ آپ کے اس جملے پر یہ مصرعہ یاد آ گیا۔ دل کے ٹکڑے، ٹکڑے کر کے مسکرا کے چل دیے جونہی ذکیہ آپا کی طبیعت کچھ بہتر ہو گی ہم خود انہیں بلوائیں گے اور آپ سب سے ملوائیں گے انشاء اللہ) سلسلے وار ناول خوب صورتی سے آگے بڑھ رہے ہیں...... کبھی دوڑنے لگتے ہیں اور کبھی بس کے انتظار میں بے بس ایک ہی جگہ ٹھہر سے جاتے ہیں۔ نگہت اعظمی کا سوال ذہن میں کئی سوال چھوڑ گیا؟ سیما رضا ماشاءاللہ دوڑ رہی ہیں۔ حنا دیہ احمد نے اچھا لکھا، دراصل ڈگری تو ہمارے تعلیمی خرچوں کی رسید ہوتی ہے۔ قابلیت اور علم دوسری چیز ہوا کرتی ہے...... میرے والد کبھی اسکول نہیں گئے تھے لیکن میری زندگی میں آج تک ان جیسا باعلم اور قابل انسان دوبارہ نہیں آیا اور ویسے بھی بیٹیوں کی شادیاں کرتے وقت بہت ساری باتیں دیکھی جاتی ہیں صرف تعلیم یا دولت نہیں، ننھی خواہش ایک پُراثر تحریر رہی، ام ثمامہ کی بیٹی اور پیٹی ایک خوب صورت ترین تحریر رہی...... ہماری ماؤں کے یہی طریقے رہے ہم چھ بہنیں ہیں...... ہماری امی نے بھی ایک ٹرنک بنا رکھا تھا ان کا انتقال ہوا تو تین بیٹیوں کی شادی ہو گئی تھی اور تین رہ گئی تھیں اور ہماری شادیوں پر بھی وہ ٹرنک کھلا، مشورہ اچھا ہے کہ سامان کے بجائے پیسے جمع کیے جائیں۔ اصولاً تو جہیز دینا ہی نہیں چاہیے لیکن پیسے بعض اوقات کسی نہ کسی ضرورت کے وقت یاد آ ہی جاتے ہیں۔ بہنوں میری بھی ایک بیٹی ہے اور میرے گھر میں بھی ایک پیٹی ہے لیکن اس میں، میں وہ سامان ڈالتی ہوں جن کا فیشن سدا بہار ہوتا ہے، میں زیور بنواتی ہوں یا بیڈ شیٹ اور دوسری قسم کی چیزیں، کیونکہ بعض اوقات دنیا دسترس میں ہوتی ہے اور بعض اوقات ہر چیز دسترس سے باہر...... نگہت غفار صاحبہ کا افسانہ قابل ستائش تھا...... ان کی نرم، نرم شخصیت کی طرح کنگن خوب صورت تحریر رہی۔ بالکل صحیح، لوگوں کو نہیں پتا ہوتا کہ کسی کے کیا حالات اور مجبوریاں ہیں یا کوئی اپنے شوق کس طرح پورے کر رہا ہے یہ حسد کی ماری، خواتین اپنے اندر تو کوئی صلاحیت پاتی نہیں دوسرے کی محنت اور تکلیف کو اپنی بدزبانی سے آلودہ کرتی ہیں۔ ایسی تمام خواتین جو آج کل سارا وقت دوسروں کے عیب تلاش کرتی پھرتی ہیں، کبھی گھبرا، گھبرا کر فیس بک پر کچھ ڈھونڈتی ہیں اور کبھی whats app پر تلاش کرتی ہیں۔ ان سب سے میری مؤدبانہ گزارش ہے برائے مہربانی اس وقت میں قضا نماز پڑھیں قرآن پڑھیں اور صرف ایک حدیث پر عمل کر لیں کہ اگر آپ کسی کی وہ برائی بیان کر رہی ہیں جو اس میں ہے وہ غیبت ہے اور اگر اس میں نہیں ہے تو بہتان اور بہتان تراشی کتنا بڑا گناہ ہے یہ کون نہیں جانتا، پیاری عذرا، آپ کی طرف سے دی گئی ہائی ٹی بہت زبردست رہی قارئین گو کہ یہ لکھنے کی بات نہیں لیکن کچھ باتیں لکھنا اچھا لگتا ہے...... بہت دوستی اور پیار و محبت کے باوجود میں عذرا کو بہت کم فون کرتی ہوں، گھر، دفتر کی ذمے داریوں کے ساتھ، ساتھ ماشاءاللہ ان کی نمازیں ان کے ذکر، تسبیحات اور نوافل...... مجھے اندازہ ہے وہ بہت بااخلاق ہیں لیکن ایک دوست ہونے کے ناتے میں کوشش کرتی ہوں کہ ان کی عبادات کے وقت انہیں ڈسٹرب نہ کروں...... یہی وجہ ہے ہم جب ملتے ہیں، ہمارے پاس ایک دوسرے سے کرنے کے لیے بہت ساری باتیں ہوتی ہیں...... محبتیں ہوتی ہیں ہماری آنکھوں میں ایک دوسرے کے لیے بہت عزت ہوتی ہے اور یہ تو حقیقت ہے کہ ہم شاید محبت تو بہت سارے لوگوں سے کرتے ہیں لیکن عزت ہر ایک کی نہیں کر سکتے اور میں عذرا کی بہت محبت کے ساتھ عزت کرتی ہوں، عذرا آپ ہمیشہ خوش رہیں آپ کے سر پر معراج صاحب کا سایہ سلامت رہے اور آپ ذیشان کی زندگی کی بہاریں دیکھیں۔ (آمین) عذرا کا ذکر میں مختصر کر نہیں سکتی لہٰذا تبصرہ مختصر کرتے ہوئے یہی کہوں گی ماشاءاللہ سارا رسالہ بہترین رہا زہت اور ان کے معاونین کی محنت نظر آ رہی ہے' (بہت شکریہ عقیلہ اور عذرا صاحبہ بھی دعاؤں کا شکریہ کہہ رہی ہیں)

ﷲ نرگس نسیم، صابہ موہڑہ چکوال سے۔ ''سب سے پہلے بہنوں کی محفل میں چھلانگ لگائی، کھٹے میٹھے تیکھے خطوط ہمراہ آپ کی دلچسپ نوک جھونک جواب کی صورت پڑھے...... پھر قسط وار ناول پڑھے من جاں بازم کی آخری قسط بہت زبردست رہی سحر ساجد نے ایسا دلچسپ اینڈ کیا کہ پہلی قسط سے اب تک جو انتہائی المیہ داستان پڑھتے رہے آخری قسط پڑھ کر تشنگی دور ہو گئی...... (جی بالکل)...... اس دفعہ پاکیزہ مصنفین میں کافی زیادہ نئے نام تھے مع اچھی تحریروں کے...... میں عورت ہوں...... دردانہ نوشین نے بھی اچھے ٹاپک پر لکھا...... بے شک ہر دور میں عورت چاہے پڑھی لکھی ہو یا ناخواندہ، عورت کا استحصال ہوتا رہا ہے۔ ویلڈن دردانہ بہت حساس موضوع پر لکھا۔ ناہید سلطانہ جب بھی آتی ہیں چاہے ناول ہو ناولٹ ہو یا افسانہ صرف اپنے نام کی بدولت ہی چھا جاتی ہے۔ (یہ بات تو ہے) صبح آرزو بھی اچھی تحریر تھی۔ منشا محسن علی نے بھی بہت اچھا لکھا حقیقت کے

قریہ ... زہ خوشی و جذبہ جو اگست کا مہینہ شروع ہوتے ہی ہر انسان میں بھر جاتا تھا اب اس کا نام و نشان نہیں...... شاید لوگوں میں جذبۂ حب الوطنی ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اے کاش اس تحریر پر نئی نسل کی نظر پڑ جائے جو جذبہ حب الوطنی کو خرافات قرار دیتے ہیں۔ خدا جانے بھی اچھی تحریر تھی...... ویسے نزہت جی ہمیں ہر، ہر شمارے میں آپی انجم کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ وہ اب کیسی ہیں......؟ (الحمدللہ... بخیریت ہیں آج کل اپنی بھتیجی کی شادی میں مصروف ہیں) نزہت میں پاکیزہ کی پرانی قاری ہوں سب کو بزم پاکیزہ میں دھڑا دھڑ انعام مل رہے ہیں تو کیا میں نے ادارے والوں کی بھینس (بھینس) چرائی ہے جو مجھ بیچاری پر بین ہے کہ نہیں جی نرگس کو انعام نہیں دینا...... تنگ آ کر میں نے بزم پاکیزہ میں شرکت کرنی ہی چھوڑ دی اب تب شرکت کروں گی جب کسی طوطا فال والوں سے فال نکلوا کر دیکھوں گی کہ کس ماہ میرا انعام نکلتا ہے تب کھٹ سے سوال بھیج دوں گی ورنہ (ارے نرگس اتنی برہم نہ ہوں...... انعام کی کیا بات ہے آپ کے لیے بلا مقابلہ انعام حاضر ہے۔ مگر چپکے سے! آپ جلد ہی سوال بھیج دیں)

✉ صائمہ سید، کراچی سے۔ ''سب سے پہلے تو شکریہ کہ آپ نے میرے مسائل سے متعلق بہنوں کی محفل میں دعا کروائی...... جزاک اللہ (آپ لوگوں کا حق ہے اس محفل پر) فریدہ اشفاق کا انٹرویو بے حد شاندار تھا، خیال و افکار اپنی جگہ لیکن تصاویر کی اہمیت اپنی جگہ تصویر کے بغیر انٹرویو کچھ پھیکا سا لگتا ہے۔ گوشۂ ظرافت ایک بہترین اضافہ ہے۔ رضوانہ پرنس ایک محبت بھری شخصیت ہیں اسی لیے ان کی ہر تحریر محبت سے گندھی ہوتی ہے۔ عقیلہ حق کی مہر دل کو چھو گئی۔ خدا ایسے مردوں کو عقلِ سلیم عطا کرے۔ سسرال میں عید بالکل درست عکاسی کی ہے کرن نے، میری بہن کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا لیکن دوسری طرف یہ بات بھی ہوتی ہے کہ ہر کسی کو چاہنے اور سراہنے والا سسرال نہیں ملتا۔ ڈاکٹر ذکیہ کے مضمون کی تعریف کرنے کا میں خود کو اہل نہیں پاتی ہر بار ایمان تازہ کر دیتی ہیں۔ ایک بات کہنی تھی آپ سے اگر ذکیہ بلگرامی اور انجم انصار کو خط لکھنا ہو تو آپ کے ادارے کے توسط سے ان تک پہنچا سکتے ہیں؟'' (جی بالکل، تبصرے کا شکریہ...... آپ کے مراسلات اچھے ہیں)

✉ نسیم سکینہ صدف، ڈسکہ۔ پاکیزہ کی پسندیدگی کا شکریہ، آپ باقاعدگی سے تبصرہ بھی بھیجا کریں، کہانی بھی جلد لگے گی۔

✉ نگہت غفار، کراچی سے۔ ''دیے پہ نظریں جماتی ہوئی دوشیزہ اچھی لگی۔ مجھے کچھ کہنا ہے۔ نزہت کی دعا کا ایک، ایک، حرف شرفِ قبولیت کی نعمت سے مالا مال ہو، آمین۔ دین کی باتیں...... اگر ہم توجہ اور سنجیدگی سے اس تحریر کا مطالعہ کریں تو فلاح اور نجات کے دروازے وا ہوتے چلے جائیں گے۔ اللہ اور اس کا نور اس روحانی تحریر کے بارے میں ہم جیسے لوگ کیا تحریر کر سکتے ہیں؟ اتنی بڑی ہستی جس کے رحم و کرم پر یہ دنیا یہ کائنات اس کا ذرہ ذرہ ہے۔ کہانیاں میں طیبہ عنصر کا گولڈن اسٹار بہت اچھا لگا۔ قرۃ العین سکندر کی کہانی محبت میں رت جگے خوب صورت عنوان کے ساتھ کہانی بھی بہت خوب صورت تھی۔ کوہِ گراں ناہید فاطمہ حسنین کا ناولٹ بہت اچھا تھا۔ پاکیزہ ڈائری، میں میری نظم کی اشاعت پر بہت، بہت شکریہ...... (نگہت باجی آپ کے خلوص بھرے الفاظ بہت توانائی دیتے ہیں مختصر خط کا شکریہ...... ستمبر میں تو آپ نے اپنی کہانی پڑھ لی ہوگی)

پیاری بہنو! آپ سب کی صحت و سلامتی کی دعاؤں کے ساتھ اب اجازت طلب کرتے ہیں۔ سانس کی ڈور یونہی بندھی رہی تو اگلے ماہ مزید آب و تاب سے محفل سجائیں گے۔

آخر میں رب کائنات اللہ جل شانہ کے حضور سب مل کر دعا کریں کہ اے ہمارے رب! ہمیں بخش دے۔ اے معبودِ برحق! ہمیں اپنی اس نظرِ کرم سے بہرہ مند فرما جس سے سبھی سختیاں مصائب و آلام ٹل جائیں۔ یا ارحم الرحمین ہم پر موت کے وقت رحم فرما اور موت کے بعد عذابِ قبر، فشارِ قبر سے محفوظ رکھنا اور قیامت کے روز ہمارا نامۂ اعمال ہمارے داہنے ہاتھ میں دینا، بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

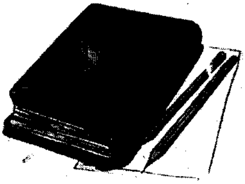
آپ کی خیریت کی طالب

نزہت اصغر

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63.c فیز III ایکسٹینشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500

فون نمبر 021-35804200 , 021-35386783,021-35802552 EXT 107,118



پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید

حمد باری تعالیٰ

سبھی کے دل میں سبھی کی نظر میں رہتا ہے
وہ سب کے ساتھ مسلسل سفر میں رہتا ہے
وہ ایک حسن جسے حسنِ لازوال کہیں
اسی کا عکس شعورِ بشر میں رہتا ہے
اسے تلاش کرو روشنی کے متوالو
وہ اک چراغ ہے جو سب کے گھر میں رہتا ہے
کوئی بتائے اندھیرے میں روشنی کی طرح
وہ کون ہے جو دلوں کے نگر میں رہتا ہے
نہ اس کا رنگ ہے کوئی نہ روپ ہے ساقی
جو اس کا حسن ہماری نظر میں رہتا ہے

کلام: ساقی امروہوی

انتخاب: ممتاز خانم، کراچی

نعت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

مرکزِ دیدارِ کل اے دلبر ربِ کریم
تو احسن الخالقین شان ہے تیری عظیم
چاند سورج اور تارے سبزہ و گل، بدلیاں
خلق تیرے واسطے کیں اور ساتھ میں ہی کہکشاں
ذرے، ذرے میں دھڑکتا ہے ترا دل یا نبیؐ
کس قدر احسان ہے تیرا، مہرِ کامل نبیؐ
تیری سیرت پاک ہے، تو نور ہے، انوار ہے
خوبیوں کا نام ہے معروف کا شہ کار ہے
درد کا تو ہے مداوا بے کسوں کا آسرا
ہوتی ہے مقبول تیرے نام سے ہر اک دعا
مشکلیں ہوتی ہیں آساں نام تیرا گر لیا
تو وسیلہ ہے قبولیت کا تو ہی آسرا
مخفی عاصی پہ بھی نظرِ عنایت ہو ذرا
دید کا امکاں میسر پھر سے ہو بہرِ خدا

کلام: فریدہ ہاشمی مخفی، کراچی

اسی کی چاہت

چاہ میں اس کی ہی رہنا
چاہے جو بھی ہو چاہ تیری
بندے ہیں ہم وہ آقا ہمارا
چاہے گا وہ جو ہو چاہ میری
گر میں نے چاہی جو چاہ اپنی
پوری نہ ہوگی وہ چاہ میری
گر میں نے چاہی جو چاہ رب کی
مقبول ہوگی وہ چاہ میری
مالک ہے وہ دنیا ہے اس کی
چاہی ہے اس نے ہو چاہ اس کی
لازم ہے ہم پر آقا کی چاہ
پوری کرے گا وہ چاہ میری
حارث کی بھی تمنا ہو پوری
صدقے میں اپنے پیارے نبیؐ کے
چاہی ہے میں نے جو چاہ تیری
منظور کر لے وہ چاہ میری
سبحان اللہ...... سبحان اللہ

کلام: حسان حارث...... پسند: ثمینہ، اوکاڑہ

بہترین نصیحت

”اور نصیحت کی لقمان نے اپنے بیٹے کو...... اے میرے بیٹے تو نماز پڑھ اور حکم کر نیکی کا اور منع کر برائی سے اور صبر کر ہر اس تکلیف پر جو تجھ پر آئے اور لوگوں سے بات کرتے وقت تکبر سے اپنے گال مت پھیلا اور زمین پر اکڑ کر پاؤں مار کے نہ چل بے شک اللہ کسی شیخی خورے اور متکبر کو پسند نہیں کرتا۔“

سورۂ لقمان

انتخاب: صبا نور، لیہ

تین گمراہ کُن عمل

خلیفۂ دوئم حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ مسلمان کی گمراہی کے لیے تین عمل کافی ہیں۔

1۔ جو فعل خود کرتا ہو...... اسی سے دوسروں پر عیب لگاتا ہو۔

2۔ لوگوں کے عیوب دیکھتا ہو اور اپنے عیوب سے اندھا ہو۔

3۔ ہم نشین کو بلاوجہ اذیت و تکلیف دے (تنبیہ الغافلین)

مرسلہ: ہمشیرہ محمد لطیف، فوجیوں والا

پیغامِ کربلا

حیات و موت کے معنی بدل ڈالے جو اِک دن میں
بجز شبیرؓ، حق نے کب کیا ایسا بشر پیدا
دوبارہ ہو سکا حق سے نہ یوں الحاد صف آرا
ہوا شبیرؓ کی قربانیوں کا وہ اثر پیدا
حسینؓ ابنِ علیؓ کا عزم پیدا ہو اگر ہم میں
پرستارانِ ایماں کو نہ ہو باطل سے ڈر پیدا

کلام: سید علی حسنین نقوی شیدا

پسند: فاطمہ حسن، اسلام آباد

دعا کیا ہے

"دعا انسان اور اس کے پروردگار میں ایک خوب صورت رابطہ ہے جو ازل سے ابد تک رہے گا۔ دعا انرجی کی ایک بہت طاقتور قسم ہے جو ایک عام شخص آسانی سے خود میں پیدا کرسکتا ہے۔ دعا کا انسانی ذہن اور انسانی جسم پر ایسا ہی اثر ہوتا ہے جیسے غددوں کے عمل کا ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مسلسل دعا کے بعد بدن میں ایک طرح کی لہر پیدا ہوجاتی ہے۔ ذہنی قوت عود کر آتی ہے۔ سکون پیدا ہوجاتا ہے اور انسانی رشتوں کے گہرے اور دور رس عوامل سمجھ میں آنے لگتے ہیں۔ سچی عبادت، دلی دعا اصل میں زندگی کا چلنا ہے۔ سچی اور راست باز زندگی دعا سے معرضِ وجود میں آتی ہے۔

دعا انسان اور اللہ تعالیٰ کے درمیان عاجزی پر مبنی سرگوشیوں کا نام ہے۔ ایک انسان جو دکھ اور کرب میں یا خوشی میں آسمان کی طرف دیکھ کر دعا کرتا ہے، اس خوب صورت روحانی سرگوشی کو ماپنے یا جاننے کے لیے کوئی آلہ ایجاد ہوا نہ ہوسکتا ہے۔ انسان اور اللہ تعالیٰ کے مابین ایک خفیہ معاملہ ہوتا ہے۔ روح کی اس سرگوشی کا نام دعا ہے۔ جس میں ایک معمولی سا بندہ اپنے خالق سے ہم کلام ہوجاتا ہے۔"

اقتباس از: زاویہ، تحریر: اشفاق احمد

مرسلہ: فریدہ ہاشمی، کراچی

چار اندھیرے، چار اجالے

1۔ دنیا کی محبت اندھیرا ہے اور اس کا چراغ تقویٰ ہے۔

2۔ گناہ اندھیرا ہے اور اس کا اجالا استغفار ہے۔

3۔ قبر اندھیرا ہے اور اس کا چراغ عملِ صالح ہے۔

4۔ پل صراط اندھیرا ہے اور اس کا چراغ یقین ہے۔

مرسلہ: ثمینہ کوکب، جہلم

اعتماد

اعتماد ایک چھوٹا سا لفظ ہے، جسے پڑھنے میں سیکنڈ سوچنے میں منٹ اور سمجھنے میں دن مگر ثابت کرنے میں ساری زندگی لگتی ہے۔

از: فرح طاہر، ملتان

گُر کی بات

دنیا کی تمام الجھنیں ختم ہوسکتی ہیں اگر جاہل خاموش رہے اور عالم حق بولنے لگے۔

از: فصیحہ آصف خان، ملتان

محبت

تیرے نام سے منسوب ہوئے جس دن
وہ دن زندگی کا یادگار دن تھا
وہ پیار کی پہلی بارش
اور اس بارش میں تیرا ساتھ
کاش ہم ان لمحوں کو قید کرلیتے
تیری بانہوں میں رہتے اور امر ہوجاتے

سمندر کی گیلی ریت پر تیرے سنگ چلنا
اور تیری آنکھوں کے سمندر میں ڈوب جانا
ہمیں اچھا لگتا ہے تیرے ساتھ، ساتھ چلنا
محبت کے ان لمحوں کو مٹھی میں دبایا
کٹھن راستوں نے ہی محبت میں امر ہونا سکھایا

کاوش: صدف نورین، لاہور کینٹ

ایک سے بڑھ کر ایک

زبان اور دانت آپس میں لڑ پڑے...... دانت بولے۔ "ذرا سنبھل کے رہنا ورنہ تم ایک اور ہم بتیس ہیں ابھی کے ابھی تیرا قیمہ بنا دیں گے۔"

زبان مسکراتے ہوئے بولی۔

"زیادہ دھمکیاں نہ لگاؤ ورنہ ابھی میں نے کسی سے بس اِک فقرہ کہنا ہے اور آپ بتیس کے بتیس منہ سے باہر پڑے ہو گے۔"

مرسلہ: حدیث اختر، حاصل پور

وچھوڑا

تم سے بچھڑ کر ایسے ہوں
جیسے کوئی تنہا ہرنی
بن میں رستہ بھول چکی ہو
وحشت سی آنکھوں میں بھر کر
بولائی سی پھرتی ہو
یا پھر......
شام ڈھلے کوئی طائر
کونج سے بھٹکا پھرتا ہو
کچھ نہ اس کو دِکھتا ہو
بس ایسا مجھ کو لگتا ہے

شاعرہ: ظل شاہین، رحیم یار خان

سنہری باتیں

☆ عورتوں میں سب سے اچھی عورت وہ ہے جسے دیکھ کر اس کا خاوند خوش ہو جائے۔

☆ مکر، دھوکا اور خیانت کرنے والا دوزخ میں جائے گا۔

☆ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں عزت والا وہ ہے جو نیکوکار ہو۔

☆ کسی سے ملو تو اس طرح ملو کہ دوبارہ وہ تم سے ملنے کی خواہش کرے مگر خوش دلی سے۔

☆ کسی کا دل نہیں دکھاؤ ہو سکتا ہے اس کے آنسو تمہارے لیے سزا بن جائیں۔

☆ اچھا دوست پانے کے لیے خود اچھے بنو۔

☆ راز کو پوشیدہ رکھنا عزت کو بچانا ہے۔

☆ کسی کو نفرت کی نگاہ سے مت دیکھو کیا پتا کبھی یہ وقت تم پر بھی آجائے۔

از: فریدہ جاوید فری، لاہور

مجھ سے ملیے

پاکیزہ بہنوں میں ہوں پاکیزہ کی ریڈر نام ہے میرا شازیہ ہاشم میوانی جو رکھا ہے میرے پیارے بابا نے لکھا تعلق میرا ضلع قصور سے ہے، کوالیفکیشن ہے میری ایم اے ان اردو۔ عربی، بی ایڈ، الشہادۃ العالمیہ، عربی فاضل، جلد ہی ایم فل کا ارادہ ہے، تھوڑی سی عمر میں بہت کچھ حاصل کیا ہے یہ کرم عظیم ہے رب پاک کا۔ معلمہ ہوں طبیعت ہے میری بہت سادہ اور عاجزانہ سی۔ شیوہ ہے میرا مسکراہٹ، ناپسند ہیں مجھ کو قہقہے، پسند ہے مجھ کو گرمی کا موسم...... سنجیدہ سی ہوں مگر دل میں سب کے لیے محبت کے جذبات ٹھاٹھیں مارتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ عشق ہے مجھے اللہ رب العزت سے اور خاتم النبین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے۔ دیوانی ہوں ماں حضرت عائشہؓ کی۔ تڑپتی ہوں نسوانیت کا جنازہ اٹھتے دیکھ کر طیش میں آجاتی ہوں ظالموں کے ظلم دیکھ کر۔ پسند ہے مجھے مشروب میں باداموں والا دودھ، کھانے میں چکن، سویٹ ڈش میں کھیر۔ آئیڈیل ہیں میرے لیے سیرت طیبہ آقائے دو عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ پنک اور وائٹ کلر پسند ہے۔ دل چاہتا ہے اڑ کر پہنچ جاؤں بیت اللہ اور روضۂ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر۔ دعا گو ہوں اللہ سے جلد از جلد مجھے اور میرے والدین کو حج بیت

اللہ اور زیارت روضۂ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نصیب فرمائے، آمین۔ نمازوں کی اور تلاوت قرآن پاک کی پابندی کرتی ہوں۔ دین سے گہری وابستگی ہے ...... گفٹ میں مجھے کتابیں ملتی ہیں کیونکہ شیدائی ہوں مطالعے کی۔ آخر میں ایک بات کہوں گی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پاک سیرت کو دیکھتے ہوئے اپنی زندگی کو گزارنے کی کوشش کریں۔ انشاء اللہ فلاح دارین ملے گی۔

غزل

بدل چکی ہے ہر اِک یاد اپنی صورت بھی
وہ عہدِ رفتہ کا ہر خواب ہر حقیقت بھی
کچھ ان کے کام نکلتے ہیں دشمنی میں مری
میں دشمنوں کی ہمیشہ ہوں کچھ ضرورت بھی
یہ جس نے روک لیا مجھ کو آگے بڑھنے سے
وہ مری بے غرضی تھی مری ضرورت بھی
میں اپنی بات کسی سے بھی کر نہ پاؤں گی
مجھے تباہ کرے گی یہ میری عادت بھی
یہ میرا عجز کہ دل میں اسے اترنے دیا
یہ اس کا مان کہ مانگی نہیں اجازت بھی

شاعرہ: شبنم شکیل

انتخاب: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

عزیز از جان پرنسپل شاہینہ شیخ کے نام

زندگی کتنی بھی معروف کیوں نہ ہو جائے کچھ لوگوں سے ہمارے دھیان کا ایسا پکا رشتہ ہوتا ہے کہ وہ ہماری یادوں اور دعاؤں سے کبھی دور نہیں ہوتے...... جیسے آپ، اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیشہ آپ کو اپنے حفظ وامان میں رکھے اور کبھی کسی کا محتاج نہ کرے، آمین۔

دعا گو: نگینہ ضیا بنگش، کراچی

ادبی لطائف

جارج برنارڈ شا سے ایک صحافی نے پوچھا۔ آپ کی لمبی عمر کا راز کیا ہے؟

شا نے جواب دیا۔ میں پاؤں گرم اور سر ٹھنڈا رکھتا ہوں۔

صحافی نے ان کی یہ بات اخبار میں شائع کردی۔ پھر کیا تھا لوگوں نے سر پر برف کے گولے رکھنے شروع کردیے اور پاؤں کو آگ سے گرم کرنا شروع کردیا۔ جس سے لوگ نمونیا اور بخار میں مبتلا ہوگئے۔

کچھ ہی دنوں بعد ایک ہجوم برنارڈ شا کے محل کے سامنے جمع ہوگیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ شا لوگوں کو دیکھ کر خوفزدہ ہوتے لیکن وہ بولے ”بے وقوفو! سر ٹھنڈا رکھنے سے میری مراد ہے کہ میں غصہ نہیں کرتا۔ اور پاؤں گرم رکھنے سے میری مراد میں ہمیشہ پیدل چلتا ہوں۔“ ان کی اس تشریح پر لوگ بہت شرمندہ ہوئے۔

مرسلہ: نازنین آفریدی، پشاور

قابل غور

☆ جو خوشبو انسان کے کردار، عمل اور اخلاق کی ہے وہ دنیا کے کسی بھی عطر میں نہیں اور یہ خوشبو تب ختم ہوجاتی ہے جب اس میں تکبر آجاتا ہے۔

☆ انسان اپنے اوصاف سے ہی عظیم بنتا ہے عہدے سے نہیں کیونکہ محل کے سب سے اونچے مینار پر بیٹھا ہوا کوّا، عقاب نہیں بن جاتا۔

از: سنبل ملک اعوان، لاہور

عقل مندی

ایک چیل نے ایک مچھلی کا شکار کیا پھر اس کو نگلنے کی کوشش کی۔ مچھلی نے کہا اگر تو نے مجھے کھالیا تو میں تیرا پیٹ نہیں بھر سکتی لیکن تو مجھ سے جس چیز کی چاہے قسم لے، لے میں تیرے پاس روزانہ ایک مچھلی لاتی رہوں گی۔ چیل نے اس سے قسم دلانے کے لیے منہ کھولا تو وہ منہ سے نکل کر تیرتی ہوئی چلی گئی۔ چیل نے کہا واپس آ، مچھلی بولی۔

”میں نے پہلے تیرے پاس آکر کون سی خیر دیکھی تھی کہ اب لوٹ آؤں۔“

انتخاب: ست البنات، تونسہ شریف

☆☆☆



☆فرح طاہر......ملتان
اس سے کہنا کہ آج بھی اک شخص
اس کے ہوتے ہوئے اکیلا ہے

☆شائلہ انجم......سرگودھا
تمہارا کیا بگاڑا تھا جو تم نے توڑ ڈالا ہے
یہ ٹکڑے میں نہیں لوں گا مجھے تو دل بنا کے دو

☆نازیہ نزی......نوشہرہ کینٹ
اس سے پہلے کہ اندھیروں کا بسیرا ہو یہاں
ہم نزی ڈھونڈ کے لاتے ہیں کسی جگنو کو

☆رومانہ انور......اسلام آباد
مجھ کو نقصان کا ہے اندیشہ
اپنا عادی بنا دیا تو نے

☆ماہ زیب......چونیاں
بہت عجیب ہیں یہ بندشیں محبت کی
نہ اس نے قید میں رکھا نہ ہم فرار ہوئے

☆زرینہ خان......بہارہ کہو
یہ راوی اور کچھ کہتا نہیں ہے
تمہاری داستاں تک ہی رہے گا
نہ جب تک سامنے آئے گا باقی
یقیں اپنا گماں تک ہی رہے گا

☆امینہ عندلیب......سلانوالی
واجد یہ کہہ رہے ہیں اب آثار فنا کے
صدیوں کی توڑ پھوڑ کا حاصل یہ مال ہے

☆شبنم سلطانہ......شورکوٹ
کسی آنکھ میں نہیں اشکِ غم، تیرے بعد کچھ بھی نہیں ہے کم
تجھے زندگی نے بھلا دیا تو بھی مسکرا اسے بھول جا
جو بساطِ جاں ہی الٹ گیا، وہ جو راستے میں پلٹ گیا
اسے روکنے سے حصول کیا، اسے مت بلا اسے بھول جا

☆فریدہ جاوید فری......لاہور
روئی کہاں ہوں میں ابھی دل کھول کر فری
دو آنسوؤں میں ہی میرے طوفان آ گیا

☆شہلا محمود......واہ کینٹ
اداس رُت کو بہاروں سے آشنا کر کے
چلا گیا ہے کوئی شخص پھر وفا کر کے

☆مسرت پرویز......کراچی
قریب تر ہے جو فکر و خیال میں میرے
وہی ہے دور بہت دور آسماں کی طرح

☆زرینہ مشتاق......منڈی بہاؤالدین
محترم......! مجھے انصاف چاہیے
دل میرا ہے تو مالک آپ کیوں

☆عروبہ ناز......کوٹلی
دردِ محبت، زخمِ جدائی تم تو دے کر دور گئے
دل سے لگا کر رکھا ہم نے تیری ان سوغاتوں کو

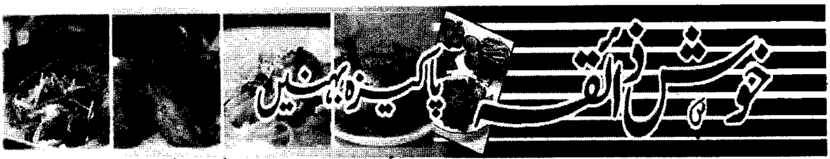
☆سعیدہ بانو......لوئر مال، مری
دنیا کی اور بات ہے دنیا تو غیر ہے
ہوتی ہے اپنے آپ سے وحشت کبھی کبھی

☆کوثر خورشید......یوکے
پھر سے محسوس ہوئی تیری کمی شدت سے
آج پھر دل کو منانے میں بہت دیر لگی

☆شاہینہ مبارک......ہالہ، سندھ
بچھڑتے وقت کبھی ہم نے یہ نہیں سوچا
کہ اس کے ہجر میں ایسی بھی وحشتیں ہوں گی
جدا ہوئے تھے مگر یہ خیال ہی کب تھا
فراق و وصل میں اتنی مسافتیں ہوں گی

☆تسنیم کوثر......کراچی
اپنوں کی دوستی نے سکھایا ہے یہ سبق
غیروں کی دشمنی بھی عنایت سے کم نہیں

☆☆☆



ہری چانپیں

اشیا: چانپ، آدھا کلو۔ گرم مسالا، (پسا ہوا) ایک چائے کا چمچ۔ سفید زیرہ، (پسا ہوا) ایک چائے کا چمچ۔ سرخ مرچ، (پسی ہوئی) حسب ذائقہ۔ انڈے، دو عدد۔ گھی یا تیل، (تلنے کے لیے) حسب ضرورت۔ سوکھا دھنیا، (پسا ہوا) ایک چائے کا چمچ۔ ہرا دھنیا، آدھی گڈی۔ ہری مرچ، چار سے چھ عدد۔

ترکیب: ہرا دھنیا، پودینہ، ہری مرچ، نمک اور سرخ مرچ کو ملا کر چٹنی کی طرح پیس لیں۔ اب دیگچی میں چانپوں کو رکھیں پھر اس چٹنی کو چانپوں پر ڈالیں اور اتنا پانی ڈالیں کہ چانپ کے گلنے تک پانی خشک ہوجائے۔ جب چانپ گل جائیں تو اتار لیں اب ایک پیالے میں انڈے توڑ کر خوب پھینٹ لیں۔ پھینٹے ہوئے انڈوں میں پسا ہوا گرم مسالا، دھنیا اور سفید زیرہ ملائیں۔ ایک کڑاہی میں گھی یا تیل گرم کریں۔ اب انڈے والے آمیزے میں چانپ ڈبو کر تل لیں تمام چانپوں کو سرخ کر کے نکالتے جائیں۔ ایک ڈش میں سلاد سجائیں اور اس کے اوپر چانپیں رکھ کر پیش کریں۔

مرسلہ: نفیسہ آرا، راس الخیمہ

مسالے دار بریانی

اشیا: بکرے کا گوشت، ڈیڑھ کلو۔ چاول، ڈیڑھ کلو۔ تیل، حسب ضرورت۔ لہسن، ادرک پیسٹ، ایک، ایک کھانے کا چمچ۔ دھنیا پاؤڈر، دو کھانے کے چمچ۔ نمک، حسب ذائقہ۔ پیاز، دو عدد۔ (سلائس کاٹ لیں) دہی، ایک کپ۔ گرم مسالا پاؤڈر، دو چائے کے چمچ۔ دار چینی، تین ٹکڑے۔ لونگ، چھ سے آٹھ عدد۔ ثابت سیاہ مرچیں، دس عدد۔ بڑی الائچی، دو عدد۔ جائفل، چھوٹا ٹکڑا۔ جاوتری، تین چھوٹے ٹکڑے۔ چھوٹی الائچی، چار عدد۔ ہری مرچیں، چھ عدد۔ ٹماٹر درمیانے، دو عدد۔ (چھوٹے ٹکڑے کر لیں) زعفران، یا زردے کا رنگ، ایک چائے کا چمچ۔ آلو، تین عدد۔ کیوڑا، چند قطرے۔

ترکیب: ایک پتیلی میں تیل گرم کر کے اس میں پیاز ڈال کر براؤن ہونے تک فرائی کریں اس کے بعد نکال کر الگ رکھ لیں اور چورا کر لیں۔ اب اسی تیل میں دو عدد دار چینی کے ٹکڑے، دو عدد چھوٹی الائچی، تین عدد لونگ، پانچ عدد ثابت سیاہ مرچیں، ایک عدد بڑی الائچی، ایک عدد جاوتری اور تھوڑا سا جائفل ڈال کر چمچہ چلائیں اور اس کے بعد اس میں گوشت، لہسن، ادرک پیسٹ، دھنیا پاؤڈر، لال مرچ پاؤڈر اور نمک ڈال کر گوشت گلنے اور اس کا پانی خشک ہونے تک بھونیں اس کے بعد اس میں دہی، آلو اور براؤن کی ہوئی پیاز کو چورا کر کے ڈالیں۔ گوشت گلنے کے بعد اس میں گرم مسالا پاؤڈر شامل کریں اور پانچ منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔ ایک دوسری پتیلی میں چاول ڈال کر اس میں دار چینی، لونگ، ثابت سیاہ مرچیں، بڑی الائچی، جائفل، جاوتری، چھوٹی الائچی اور نمک شامل کر کے ایک کنی رہنے تک ابال لیں۔ اس کے بعد پانی نتھار کر چاولوں کو ایک طرف رکھ دیں۔ تھوڑے سے گرم دودھ میں زعفران یا رنگ بھگو کر ایک طرف رکھ دیں۔ ایک بڑے پتیلے میں پہلے ابلے ہوئے چاولوں کی تہ لگائیں اس پر تیار کیے ہوئے گوشت کا آمیزہ ٹماٹر، ہری مرچیں اور ہرا دھنیا ڈال کر باقی چاول ڈال دیں آخر میں دودھ میں بھگویا ہوا رنگ یا زعفران اور کیوڑا ڈال کر ڈھکن ڈھک کر دم پر لگا دیں لذیذ مٹن مسالے دار بریانی تیار ہے۔

مرسلہ: سنبل ملک، لاہور

مٹن وائٹ کڑاہی

اشیا: مٹن، آدھا کلو۔ دہی، ایک پاؤ۔ پیاز، ایک عدد۔ ادرک، لہسن کا پیسٹ، دو کھانے کے چمچ۔ ثابت ادرک، ایک درمیانہ ٹکڑا۔ ہرا دھنیا، آدھی گڈی۔ ہری مرچ، چار سے پانچ عدد۔ کٹا ہوا دھنیا، ایک کھانے کا چمچ۔ کٹا ہوا زیرہ، ایک کھانے کا چمچ۔ کالی مرچ، حسب ضرورت نمک، حسب ذائقہ۔ تیل، آدھا کپ۔

ترکیب: ایک پین میں تیل ڈالیں پھر ادرک لہسن شامل کر دیں۔ دو سے تین منٹ پکانے کے بعد اس میں پیاز شامل کر دیں۔ تین سے چار منٹ تک پکانے کے بعد اس میں گوشت شامل کر دیں۔ پیاز لال نہ ہو پھر اتنا بھونیں کہ مٹن براؤن رنگ کا ہوجائے۔ اس کے بعد اس میں ہرا مسالا شامل کر دیں اور چمچ چلائیں۔ پھر دو گلاس پانی شامل کر دیں اور تقریباً آدھے، پون گھنٹے بعد مٹن کو چیک کر لیں کہ گل گیا پھر اس میں باقی کے مسالے اور دہی ڈال کر بھون لیں۔ جیسے ہی تیل نظر آنے لگے آپ کی مٹن کڑاہی تیار ہے۔ اوپر سے بھی ہرا دھنیا ڈال سکتی ہیں۔

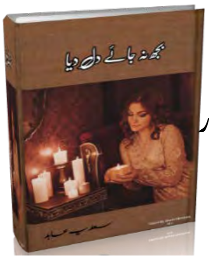
مرسلہ: عرشیہ جنید، کراچی

عہدِ وفا



ایمان پریشے کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا مُنفرد ناول، مُحبت کی داستان جو معاشرے کے رواجوں تلے دب گئی، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

بُجھ نہ جائے دِل دیا



سعدیہ عابد کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا شاہکار ناول، مُحبت، نفرت، عداوت کی داستان، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

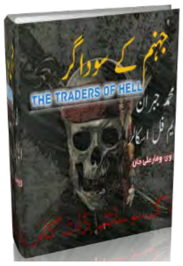
قفس کے پنچھی



سعدیہ عابد کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا شاہکار ناول، علم و عرفان پبلشرز لاہور کے تعاون سے جلد، **کتابی شکل** میں جلوہ افروز ہو رہا ہے۔

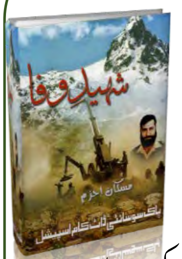
آن لائن پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

جہنم کے سوداگر



مُحمد جبران (ایم فِل) کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا ایکشن ناول، پاکستان کی پہچان، دُنیا کی نمبر 1 ایجنسی آئی ایس آئی کے اسپیشل کمانڈو کی داستان، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

شہیدِ وفا



مُسکان احزم کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا ناول، پاک فوج سے مُحبت کی داستان، دہشت گردوں کی بُزدلانہ کاروائیاں، آرمی کے شب و روز کی داستان پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

آپ بھی لکھیے:

کیا آپ رائٹر ہیں؟؟؟۔ آپ اپنی تحاریر پاک سوسائٹی ویب سائٹ پر پبلش کروانا چاہتے ہیں؟؟؟

اگر آپکی تحریر ہمارے معیار پر پُورا اُتری تو ہم اُسکو عوام تک پہنچائیں گے۔ **مزید تفصیل کے لئے یہاں کلک کریں۔**

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام، پاکستان کی سب سے زیادہ وزٹ کی جانے والی کتابوں کی ویب سائٹ، پاکستان کی ٹاپ 800 ویب سائٹس میں شُمار ہوتی ہے۔



بزمِ پاکیزہ — پاکیزہ بہنیں

پہلا انعام یافتہ سوال

☆ساجدہ ظفر......کمالیہ

سوال﴾بات کو تولنے کا ترازو کہاں سے ملتا ہے؟

جواب﴾دل و دماغ میں ہوتا ہے، ڈھونڈنا تمہارا کام ہے۔

دوسرا انعام یافتہ سوال

☆ثمینہ کوکب......جہلم

سوال﴾اگر کسی امیر کو دولت مل جائے تو اندھا ہو جاتا ہے اگر کسی اندھے کو دولت مل جائے تو کیا ہوگا؟

جواب﴾بیچارہ لُٹ جائے گا اپنوں کے ہی ہاتھوں۔

☆صبا نور......لیہ

سوال﴾وہ ہروقت بچوں کی طرح فرمائشیں کرتے ہیں؟

جواب﴾بیچارے کی ذہنی عمر کم جو ہے کیا کرے۔

☆شائلہ علی......لاہور

سوال﴾آپی کیا محبت میں انا ضروری ہے؟

جواب﴾جی ہاں محبت میں انا، بوا، خانساماں ڈرائیور اور گارڈز سب بہت ضروری ہوتے ہیں۔

☆کوثر شاہین......حیدرآباد

سوال﴾ہماری پڑوسن ساون میں کچے، کچے پکوڑے بھیجتی ہیں؟

جواب﴾تم کسی دن بہت اچھے سے پکوڑے بنا کر ان کے ہاں بھیج دو سمجھ جائیں گی۔

☆سائرہ یزدانی......خانیوال

سوال﴾دل دینا آسان ہوتا ہے یا لینا؟

جواب﴾توڑنا۔

☆فصیحہ آصف خان، ملتان

سوال﴾میں جب بھی ان کے آفس فون کروں، وہ یہی کہتے ہیں؟

جواب﴾اس وقت تو میں میٹنگ میں مصروف ہوں۔

☆ممتاز خانم......کراچی

سوال﴾مرد جب کھانا پکاتا ہے تو چولھا کیوں نہیں پھٹتا؟

جواب﴾یہی تو المیہ ہے کیا کہیں۔

☆گلشاد نذیر......اسلام آباد

سوال﴾وہ باہر جا رہے ہیں، میں کیا کروں؟

جواب﴾آپ گھر میں رہیں اور ان کا انتظار کریں۔

☆ایمن رانی......کمالیہ

سوال﴾اگر محبت اندھی ہوتی ہے تو عاشق حضرات اپنے ہاتھ میں لاٹھی کیوں نہیں رکھتے؟

جواب﴾آج کل تو موبائل کا زمانہ ہے ڈیئر......ویسے لاٹھیاں تو بیچاروں کو پڑتی ہیں۔

☆حمنیٰ قندیل......ٹوبہ ٹیک سنگھ

سوال﴾جو شخص خود سے بچھڑ جائے اور جو شخص خود کو پہچان لے، ان دونوں میں سے کون سا شخص اچھا ہے۔

جواب﴾ارے بھئی کون سا فلسفیانہ سوال لائی ہو جو بچھڑ گیا وہ اچھا کہاں رہا اور جو خود کو پہچان لے تو صدمے سے ہی مر جائے گا۔

☆ساجدہ ظفر......کمالیہ

سوال﴾آسمان کا حسن ستاروں سے ہے اور آپ کا حسن؟

جواب﴾آپ سب کی خوش خط تحریریں دیکھ کر نکھرتا ہے۔

☆ارم کمال، فیصل آباد

سوال﴾دل کے سمندر میں جذبات کا سونامی آئے تو کیا کرنا چاہیے؟

جواب﴾اچھی پیراک بنو۔

☆☆☆



حُسن کیسے نکھاریں؟

فطری حسن قدرت کا عطیہ ہے اس کی حفاظت اور صفائی کا خیال رکھنا آپ کا اوّلین فرض ہے اور اسی کے لیے رہنمائی کا فریضہ انجام دینے ہم ہر پل آپ کے ساتھ ہیں۔ قدرتی اشیا جیسے مختلف پھل، میوے اور سبزیاں اور جڑی بوٹیاں ہیں جو اس مقصد کے لیے آج کل بہت استعمال ہو رہی ہیں۔ ہم بھی زیادہ تر گھریلو ٹوٹکے ہی بتاتے ہیں۔

سب سے پہلے تو قدرت کا بہترین عطیہ سادہ، تازہ میٹھا پانی، (ہاں بھئی پانی کھارا اور نمکین بھی ہوتا ہے......) انسانی صحت کے لیے بے حد اہم ہے۔ چوبیس گھنٹے میں بارہ سے چودہ گلاس پانی تو ضرور پئیں۔ یہ تمام فاسد مادوں کو خارج کرتا ہے اگرچہ اب موسم سرما کی آمد ہے مگر میدانی و ساحلی علاقوں میں گرمی نے ایک دفعہ پھر رنگ جمایا ہے اگر پانی کم مقدار میں پیا جائے تو جسم اپنی بنیادی ضرورتوں کو پوا کرنے کے لیے جسم کے ہی ذخیرے...... کو استعمال کرتا ہے اور ان ذخائر میں جلد بھی شامل ہے چنانچہ وہ خشک اور بے جان ہو جاتی ہے

غیر صحت بخش اشیا مثلاً سفید آٹا، میدہ، سفید چینی بیکری کے آئٹمز، کافی، چائے اور سوفٹ ڈرنکس کا بے دریغ استعمال جلد سے اس کی تازگی اور رونق چھین لیتا ہے اور وزن علیحدہ بڑھنے لگتا ہے لہٰذا اس سے ہر ممکن پرہیز لازمی ہے۔

چہرے کی رونق بحال رکھیں

☆ ایک بڑا چمچ بالائی، آدھا لیموں اور ایک بڑا چمچ گلیسرین ملا کر کریم سی بنالیں اور اسے رات سونے سے پہلے چہرے، گردن اور ہاتھ پاؤں پر مل لیں۔ صبح اٹھ کر نیم گرم پانی سے دھولیں۔

☆ کیلا کھائیں اور اس کا چھلکا اندرونی طرف سے چہرے، گردن اور ہاتھ پاؤں پر ملیں، چھلکا صاف ہو داغی نہ ہو، کچھ دیر بعد تازہ پانی سے دھولیں۔

☆ اب کینو، سنگترے، مالٹے، چکوترے کا موسم آرہا ہے۔ جس طرح پھل کھانا مفید ہے اسی طرح اس کے چھلکوں کے بھی بے حد خواص ہیں، صدیوں کا آزمودہ نسخہ ہے' مالٹے، کینو کے چھلکے سکھا کر پیس کر چٹکی بھر ہلدی اور دودھ کے ساتھ پیسٹ بنا کر چہرے ہاتھ پیر اور گردن کا مساج کریں۔ تازہ چھلکے بھی جلد پر رگڑے جاسکتے ہیں۔

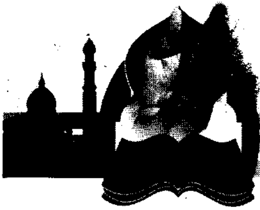
☆ ایک زبردست نسخہ ہے کہ کچے کینو کے بیج دھوپ میں سکھا کر انہیں پیس کر سفوف سا بنالیں پھر جب لگانا ہو تو پانی کے ساتھ ہلکا سا پیسٹ بنالیں اور اسے رات کو پھنسیوں اور ایکنی پر لگائیں تو افاقہ ہوگا۔

☆ گلاب کی تازہ پتیاں، دودھ اور بادام (چھیل کر) ان اشیا کا پیسٹ بنا کر جلد پر کریم کی طرح لگائیں اس سے جلد ملائم تر و تازہ اور بارونق ہو جاتی ہے۔

☆ بیسن تو جلد کا بہترین ڈیٹرجنٹ ہے۔ اگر بالوں میں تیل زیادہ لگا ہوا ہے تو پہلے بیسن سے دھوئیں پھر کسی بھی معیاری شیمپو سے دھولیں۔ تیل چھڑانے کے لیے شیمپو پر شیمپو نہ لگاتی جائیں' فیس واش استعمال کرنے سے قبل چہرے کو بیسن سے دھولیں۔

☆ ٹماٹر اگرچہ آج کل کافی مہنگا ہے مگر یہ جلد کا بہترین ٹانک ہے۔ ایک درمیانہ ٹماٹر فریزر میں رکھیں اور روز اس کا ایک سلائس جیسا ٹکڑا کاٹ کر چہرے پر ملیں۔ یہ قدرتی بلیچ بھی ہے، جلد کی میل بھی اتارتا ہے اور جلد ملائم بھی ہوتی ہے۔

☆☆☆



روحانی مشورے

ادارہ

زوجین کے درمیان موافقت

اکثر دیکھا گیا ہے کہ شوہر، بیوی میں اختلافات ہوجاتے ہیں' بیوی سے بات کرو تو شوہر کی شکایت اور شوہر، بیوی کے عیب گنوانے لگتا ہے۔ اوّل تو گھر کا جھگڑا باہر جائے ہی نہیں اس کے لیے کسی ایک کو تو زبان پر قابو رکھنا ہی ہوگا۔ رسول اکرمؐ کے ایک فرمان کا خلاصہ ہے کہ جو چپ رہا اس نے نجات پائی، غصے کی حالت میں بحث و مباحثہ جلتی پر تیل کا کام کرتا ہے۔ فریقین کو اپنے بچوں کی ذہنی تربیت کے لیے خود ہی سمجھداری سے کام لینا ہوگا۔ اس کے لیے اول تو پنجگانہ نماز کی پابندی کریں ،گھر میں سلام کو رائج کریں۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی یہ آیت 786 مرتبہ پڑھ کر پانی پر دم کریں اور دونوں یہی پانی پئیں ،کم از کم چالیس روز تو ضرور کریں۔ انشاء اللہ جھگڑا اور فضول بحث کا خاتمہ ہوگا۔

☆ ہر نماز کے بعد 313 مرتبہ یارؤفُ پڑھ کر تصور میں بیوی، شوہر پر اور شوہر، بیوی پر دم کرے۔

شادی میں رکاوٹ

حدیث پاکؐ میں آتا ہے کہ جمعرات کا دن (بطور خاص) حاجتوں کے پورا ہونے کا دن ہے۔ اس کے علاوہ روز جمعہ کی آخری ساعتیں، عصر کے کافی بعد جب سورج غروب ہونے کو ہو تو اپنا دامن پھیلا کر گڑگڑا کر اپنے رب کے حضور دعا کریں۔

پیغمبر ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو جناب ہاجرہ کی زوجیت کی خوشخبری جمعرات کو ہی عطا ہوئی...... معلوم ہوا جسے زوج کی تلاش ہو وہ اسی دن اپنی حاجت رب تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کرے، حاجت مند ہر جمعرات کو روزہ رکھے اور عصر تا مغرب جائے نماز پر بیٹھ کر سورۂ احزاب کی تلاوت کرے اور اس کے بعد ستر مرتبہ استغفراللہ واتوب الیہ سچی توبہ کی نیت سے پڑھے اور آخر میں خوب گڑگڑا کر دعا مانگے۔ یہی عمل ماں اپنی بیٹی یا بیٹے کے لیے بھی کرسکتی ہے۔

رزق میں بے برکتی

اللہ تعالیٰ ہمیں گناہوں کی نحوست سے محفوظ فرمائے، گناہ اتنی بڑی آفت ہے کہ اس کی نحوست کی وجہ سے بندہ عبادت سے غافل اور روزی کی قلت کا شکار ہوجاتا ہے جیسا کہ ایک حدیث پاک کا مفہوم ہے۔ ''بندہ گناہ کرتا رہتا ہے اور وہ اس کے سبب رات کے قیام سے محروم ہوجاتا ہے۔ ایک بندہ گناہ کرتا رہتا ہے اور اس کے سبب سے وہ رزق سے محروم ہوجاتا ہے۔ حالانکہ وہ اس کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ ترجمہ: ''وہ اپنے گناہوں کے سبب اپنے باغ کی خیر و برکت سے محروم کردیے گئے۔'' (سورۂ قلم ۳۱) لہٰذا روزانہ فجر کی نماز کے بعد سو مرتبہ یہ تسبیح پڑھ لیا کریں (سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم وبحمدہ استغفراللہ) اس کے ساتھ، ساتھ سورۂ نوح کا ورد گھر میں کروائیں جتنا ممکن ہو صدقہ و خیرات ضرور دیں۔

سر درد یا جان کا روگ

(۱) اگر کسی کو آدھے سر کا درد ہو تو ایک مرتبہ سورۂ اخلاص اول و آخر ایک مرتبہ درود شریف پڑھ کر دم

کیجیے۔ حسب ضرورت تین بار، سات بار گیارہ بار اسی طرح دم کیجیے۔ گیارہ کا عدد پورا ہونے سے قبل ہی انشاء اللہ آدھے سر کا درد ٹھیک ہوجائے گا۔ (۲) گرم دودھ میں دیسی گھی ملا کر پینے سے فائدہ ہوتا ہے۔ (۳) ناریل کا پانی پینے سے آدھے یا پورے سر کے درد میں کمی آجاتی ہے۔ (۴) سورۂ واقعہ کی آیت نمبر 19 تین بار پڑھ کر دم کیجیے۔ (۵) سورۂ ناس سات بار پڑھ کر سر پر دم کیجیے، اگر اب بھی درد باقی ہو تو دوسری بار اور پھر تیسری بار اسی طرح دم کیجیے۔ (۶) زبان پر ایک چٹکی نمک رکھ کر بارہ منٹ کے بعد ایک گلاس پانی پی لیں۔ سر میں کیسا ہی درد ہو، انشاء اللہ افاقہ ہوجائے گا۔ (ہائی بلڈ پریشر کے مریض کے لیے نمک کا استعمال نقصان دہ ہوتا ہے اس لیے احتیاط کیجیے)

سورۂ فاتحہ کی خصوصیت

حدیث مبارک ہے، تم دو شفاؤں کو لازم پکڑلو! شہد اور قرآن مجید۔ (ابن ماجہ) اور اطبا کہتے ہیں کہ امراض سینہ میں شہد کا استعمال بہت ہی مفید ثابت ہوا ہے، خصوصاً کھانسی، نزلہ دمہ، کالی کھانسی اور سانس کی رکاوٹ میں اس کا استعمال شفا بخش ہے۔ ایسے مریض روزانہ نہار منہ سات مرتبہ سورۂ فاتحہ پڑھ کر ایک چمچ شہد پر دم کرکے کھائیں۔ دواؤں اور دیگر غذاؤں پر بھی اسی سورہ کا ورد کرکے استعمال کریں۔ اس سورہ کے اسنادو محاسن بے شمار ہیں یہ وہ سورہ ہے کہ مُردے پر بھی پڑھا جائے تو وہ بھی خدا کے اِذن سے زندہ ہو جائے مگر خلوصِ نیت شرط ہے۔

سورۂ فاتحہ جسے سبع مسانی بھی کہتے ہیں اور الحمد بھی کہتے ہیں، یہ لاتعداد فیوض والی سورہ ہے۔ بخار کے مریض کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سات مرتبہ یہ سورۂ پڑھنے سے شفا ہوگی۔

بے اولادی سے نجات

ہر مسئلے کا حل رب تعالیٰ کی بارگاہ میں موجود ہے، نیک وصالح اولاد کے لیے نمازوں کی پابندی کے ساتھ روزانہ کسی بھی وقت (۱۲۹۱) مرتبہ (یا خالق، یا باری، یا مصور) پڑھ کر پانی پر دم کرکے پئیں۔ علاوہ ازیں سورۂ مریم وسورۂ محمد کی تلاوت کیا کریں۔

رزق میں برکت کے انمول نسخے

تفسیر کشف البیان کی ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص دربارِ نبوت میں حاضر ہوا اور فقر و فاقہ اور تنگی رزق کی شکایت کی تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ جب تو اپنے گھر میں داخل ہو تو السلام علیکم کہہ چاہے کوئی گھر میں ہو یا نہ ہو پھر مجھ پر سلام یوں کر...... ''السلام علیک ایھا النبی ورحمتہ اللہ وبرکاتہ اور ایک مرتبہ قل ھو اللہ احد پڑھا کرو۔ اس شخص نے ایسا ہی کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس پر رزق کے دروازے کھول دیے۔ حتیٰ کہ اس کے ہمسایوں اور رشتے داروں کو بھی اس رزق سے حصہ پہنچا۔ لہٰذا آپ بھی اسی حدیث شریف کے مطابق عمل کریں اور اس کی برکتیں حاصل کریں۔

مٹاپا شادی میں رکاوٹ

سب سے بہترین علاج طبیبوں کے طبیب، اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تجویز کردہ ہے اور وہ یہ ہے کہ بھوک کے تین حصے کرلیے جائیں ایک حصہ غذا ایک حصہ پانی اور ایک حصہ ہوا اور سانس...... (کنز العمال) امام ذہبی رحمتہ اللہ فرماتے ہیں کہ انجیر میں دیگر تمام پھلوں کے مقابلے میں بہتر غذائیت ہے۔ انجیر موٹے پیٹ کو چھوٹا اور مٹاپا دور کرتا ہے...... صبح نہار منہ تین یا پانچ انجیر لے کر سو مرتبہ یا خالقُ پڑھ کر دم کرکے کھایا جائے تو انشاء اللہ بہت جلد موٹاپے سے نجات مل جائے گی۔

☆☆☆



اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔ (اپنے علاقے میں دوا نہ ملنے کی صورت میں ہم سے رجوع کریں)

بلغم و تیزابیت

س۔م۔ع......لاہور

میری شادی کو تین سال ہوئے ہیں اور کوئی اولاد نہیں ہے۔ میرے تین مسئلے ہیں۔ میرے سینے پر سارا سال بلغم جما رہتا ہے جو کہ سردیوں میں شدت اختیار کرجاتا ہے۔ سینے کے درمیان کی ہڈی جو گلے سے نیچے آتی ہے اس میں بہت درد رہتا ہے، سینہ، پھیپھڑے جکڑے رہتے ہیں۔ ناک، کان، منہ، گلا، سب خشک رہتے ہیں اور ناک کان ہر وقت بند رہتے ہیں۔ میرا بیٹھنے کا کام ہے۔ 12 گھنٹے کی ڈیوٹی ہے۔ سارا دن اے سی میں رہتا ہوں۔ رات کو گھر آکر بھی نہا کر اے سی میں لیٹتا ہوں جس کے اثرات سردیوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ پہلے بھی ریشہ بلغم رہتا تھا لیکن اس سال شدت اختیار کرگیا ہے۔ B.P بھی اکثر ہائی رہتا ہے۔ خشکی بھی اتنی ہے کہ سر پر تیل لگاؤ تھوڑی دیر بعد غائب ہوجاتا ہے۔ صبح جب سوکر اٹھتا ہوں تو آنکھیں بھاری ہوتی ہیں۔ میرے دفتر کا سارا راستہ Dust والا ہے جہاں ہر وقت دھول مٹی اڑتی رہتی ہے۔ صبح سات بجے جو ناشتا کرتا ہوں اس کے بعد رات 8 بجے کھانا کھاتا ہوں۔ بعض دفعہ دوپہر میں بھوک لگتی ہے تو پانی پی کر بھوک ختم کرلیتا ہوں۔

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

نومبر 2017ء

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ____________________

پتا: ____________________

____

میری طبیعت گرم مزاج اور حساس ہے۔ ریشہ ختم کرنے کے لیے کوئی گرم دوائی یا غذا کھالوں تو معدے میں گرمی ہوجاتی ہے۔ معدے کے لیے کوئی ٹھنڈی دوائی یا غذا کھالوں تو ریشہ بڑھ جاتا ہے۔ غذا بھی ٹھیک سے ہضم نہیں ہوتی یا تو قبض ہوجاتا ہے یا پھر غذا ایسے ہی نکل جاتی ہے۔ ہاتھ پاؤں بھی جلتے رہتے ہیں۔ کھانے پینے کا شوقین ہوں لیکن ڈر کر بہت احتیاط سے کھاتا ہوں۔ بعض دفعہ اتنی کمزوری ہوجاتی ہے کہ ہاتھ پاؤں میں جان نہیں رہتی۔ معدہ بہت کمزور ہوگیا ہے۔ تین ٹائم کا کھانا قبول نہیں کرتا۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے گیس کی بھی بہت شکایت ہے بعض دفعہ گیس دل کو چڑھتی ہے جس کی وجہ سے دل کی دھڑکن تیز ہوجاتی ہے۔ غصہ بھی مجھے بہت آتا ہے لیکن جتنی شدت سے غصہ آتا ہے اتنی ہی تیزی سے میں برداشت کرلیتا ہوں۔

جواب:۔ رات کو مت نہایا کریں یا پھر اے سی نہ کھولیں۔ معدے کو 12 گھنٹے خالی نہ چھوڑیں اور اسے بھریں بھی نہیں۔ غذا آہستہ، آہستہ چبا کر کھایا کریں، کھانے کے ساتھ یا فوراً بعد چائے، کولڈ ڈرنک اور پانی استعمال نہ کریں، کم از کم 2 گھنٹے بعد پانی پیا کریں۔ گرم، ٹھنڈا اور ٹھنڈا گرم نہ کریں۔ کھانا متوازن اور ایک وقت میں ایک ہی قسم کا کھانا کھائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Bismutem Pentarkan Ptk 16 ایک گولی تھوڑے پانی کے ساتھ دن میں تین مرتبہ لیں اور Sticta Pentarkan Ptk 82 کے 10 قطرے ایک گھونٹ پانی میں دن میں 3 مرتبہ اور Viscum Pentarkan Ptk 89 کے 10 قطرے ایک گھونٹ پانی میں دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔ ایک ماہ بعد اپنی کیفیت سے مطلع کریں۔

پیریڈ کا مسئلہ

س......لاہور

میں نے پہلے بھی آپ کو خط لکھا تھا۔ مجھے دمے اور پیریڈز کا مسئلہ تھا جس کا آپ نے مجھے جواب دیا تھا اور مجھے دوائیاں بھی تجویز کی تھیں۔ میں وہ دوائیاں استعمال کررہی ہوں لیکن ان دوائیوں سے مجھے بہت خشکی ہوگئی ہے۔ ناک، منہ، کان، سر سب بہت خشک ہوگئے ہیں۔ چہرے پر دانے بھی ہوگئے ہیں۔ اب مجھے دو مہینے بعد Periods ہوئے ہیں۔ آپ میری رہنمائی کریں اور مجھے ایسی دوائیں بتائیں جو مجھے خشکی نہ کریں اور میرے اندر طاقت بھی آجائے بعض دفعہ بہت کمزوری ہوجاتی ہے۔

جواب:۔ آپ نے اپنی کیفیات کے بارے میں بیان نہیں کیا جن کے لیے ادویات تجویز کی تھیں۔ جو ایلو پیتھک ادویات آپ استعمال کررہی ہیں یہ ان کے سائیڈ ایفیکٹ ہیں یقیناً ان کو چھوڑ دیں اور Ptk 60 کا استعمال جاری رکھیں ساتھ میں Pulsatilla 30 کے 5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں دن میں تین مرتبہ اور Sticta Pentarkan 82 کے 10 قطرے ایک گھونٹ پانی میں دن میں تین مرتبہ استعمال کریں۔ ایک ماہ بعد پھر حال بتائیں۔

پسینے کی زیادتی

شفیق الرحمن......بہاولپور

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے میرے ہاتھوں اور پیروں پر پسینا آتا ہے۔ اب تک بہت علاج کروایا۔ حکیموں، ڈاکٹروں اور ہومیو پیتھک بھی علاج کیا لیکن فرق نہیں پڑا۔ اب تھک ہار کر 4 سال سے علاج چھوڑ دیا ہے۔ پسینے میں گرمیوں میں شدت زیادہ ہوتی ہے لیکن سردیوں میں بھی پسینا آتا ہے مگر گرمیوں کی نسبت کم۔ بعض اوقات دل کی دھڑکن بھی تیز ہوجاتی ہے اور ساتھ میں پورے جسم میں کپکپی بھی طاری ہوجاتی ہے اور اس وقت پسینا بھی شدت پکڑ جاتا ہے۔ پڑھنے لکھنے میں بہت دشواری ہوتی ہے۔ کوئی بھی کام اعتماد سے نہیں کرپاتا۔ برائے کرم کوئی مستقل علاج تشخیص کیجیے۔

جواب:۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی

کی 200 Calc.Carb ایک خوراک یعنی 5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں ڈال کر لیں اور دو دن بعد سے Iodium 30 کے 5 , 5 قطرے دن میں تین مرتبہ لیں۔ ایک ماہ بعد دوبارہ کیفیت سے مطلع کریں۔

ناک کا مسئلہ

فرحانہ کریم......ساہیوال

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری ناک میں دائیں طرف گوشت سا ہو گیا تھا اور اس سائیڈ سے سبز رطوبت نکلتی رہتی تھی پھر ایک رات وہ پتا نہیں سانس کے دوران ناک کے اوپر چلا گیا جب سے میری ناک میں سونگھنے کا مسئلہ ہو گیا ہے۔ میں نے کافی ڈاکٹرز کو چیک کروایا ہے وہ کہتے ہیں کہ الرجی ہے۔ الرجی سے ناک بند ہو گئی ہے کوئی دوا شروع کرتی ہوں تو کافی اثر ہوتا ہے لیکن آہستہ آہستہ پھر وہی سچویشن ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر نے آپریشن تجویز کیا ہے مگر میں آپریشن نہیں کروانا چاہتی۔ پلیز میرا مسئلہ حل کریں۔ آج کل میں الرجی کی Feret-D لے رہی ہوں اور ساتھ Avamys اسپرے استعمال کر رہی ہوں۔ دونوں نے شروع میں کافی اثر کیا لیکن بعد میں وہی حال ہو گیا۔ صبح اور رات کو ناک بند ہی رہتی ہے۔ سی ٹی اسکین رپورٹ بھیج رہی ہوں۔ پلیز میرا مسئلہ حل کر دیں۔

جواب: ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Cinnabaris Pentarkan Ptk 31 کی دو گولیاں دن میں تین مرتبہ لیں۔ ایک ماہ بعد اپنی کیفیت سے مطلع کریں۔

لیکوریا و بریسٹ

نوشی ملک......بحرین

ڈاکٹر صاحب مجھے لیکوریا کی شکایت کافی عرصے سے ہے۔ پیریڈ سے پہلے اور بعد میں زیادہ ہوتی ہے اور کمزوری بہت ہو گئی ہے اور دوسرا مسئلہ میری نسوانی نشوونما بھی کم ہے۔

جواب: آپ کا وزن تھوڑا زیادہ ہے اس کو کم کریں، میٹھی چیزیں، کولڈ ڈرنکس، آئس کریم، مرغن چیزیں، برگر، پیزا نہ کھائیں۔ ایک گھنٹے کی ورزش کریں۔ متوازن غذا کھایا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ تین ماہ استعمال کے بعد حال بتائیں۔ Sepia-30, Bovista30, Sabal Serr-30, Cal.Carb-30 کے 7، 7 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں تین مرتبہ استعمال کریں۔

بد اثرات

عامر خان......برمنگھم

محترم ڈاکٹر صاحب! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں اندرونی طور پر بہت کمزوری محسوس کرتا ہوں، ہر وقت تھکاوٹ، سستی رہتی ہے۔ کوئی علاج تجویز کریں۔

جواب: اول تو نماز کی باقاعدگی رکھیں اور پھل اور ہری سبزیاں غذا میں شامل رکھیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات دو ماہ تک استعمال کریں پھر حال بتائیں۔ Staphisegria-200 5 قطرے آدھا گلاس پانی میں ہفتہ میں ایک مرتبہ جبکہ Damiana Pentarkan-40 کے 15 قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ کھانے کے بعد لیں۔

موٹاپا

مسز راحیلہ اشرف......کینیڈا

میری بیٹی موٹاپے کا شکار ہے۔ ٹانگیں بھی بہت موٹی ہیں۔ اسے بھوک بھی بہت لگتی ہے۔ اس کی کلاس فیلوز بھی اسے احساس دلاتی رہتی ہیں کہ آپ کمر کے اوپر سے بالکل ٹھیک ہو لیکن کمر سے نیچے بہت پھیلی ہوئی لگتی ہو اور یہ حقیقت بھی ہے۔

جواب: آپ کی بیٹی کو بھوک بہت لگتی ہے لیکن یہ نہیں لکھا کہ وہ کھاتی کیا ہیں اور کتنا کھاتی ہیں۔ بھوک لگنے کی بہت ساری وجوہات ہوتی ہے۔ ۱) تھائرائیڈ غدود

کی خرابی، (۲) ڈپریشن (۳) پیٹ کے کیڑے (۴) ایک وقت میں پیٹ بھر کر کھانا نہ کھانے کی عادت (۵) ہر وقت تھوڑا تھوڑا کچھ کھاتے رہنا (۶) تیزابیت (۷) شوگر وغیرہ۔ کھانا ایک وقت میں مکمل پیٹ بھر کر کھلائیں۔ خصوصاً صبح کا ناشتا بھرپور ہو اور دوپہر کا کھانا اچھا ہو لیکن رات میں کھانا ہلکا پھلکا ہو۔ ورزش کرائیں، کھانے میں میٹھا اور چکنائی نہ ہو، تلی ہوئی اور بھنی ہوئی چیزوں سے پرہیز کرائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کرائیں۔ Calc-Carb-200 ہر ہفتہ ایک خوراک 5 قطرے آدھے کپ پانی میں، اس کے بعد دوسرے دن سے Thyroidinum30, Amonium Mur-30 اور Fucus vers کے 7,7 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں تین مرتبہ دیں۔

موبائل کا غلط استعمال

تبسم بتول......دبئی

ڈاکٹر صاحب میں اسٹوڈنٹ ہوں۔ میں بیماریوں کا ڈھیر بن گئی ہوں۔ جسم بھی خراب ہو گیا ہے۔ میری آنکھیں بھی پیلی ہو گئی ہیں۔ لیکوریا بھی زیادہ رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے مجھے بہت کمزوری محسوس ہوتی ہے۔ ٹانگوں میں درد رہتا ہے۔ بھوک بہت لگتی ہے۔ سردی اور گرمی بھی بہت لگتی ہے۔ دل تیز تیز دھڑکتا ہے۔ سانس پھولتا ہے۔ کندھے کے پٹھے کمزور ہو گئے ہیں ذرا سا بھی وزن نہیں اٹھا سکتی۔ پیٹ باہر نکل آیا ہے۔ روز بروز موٹی ہوتی جا رہی ہوں۔ معدہ بھی خراب رہتا ہے۔ سر ایک دم چکرا جاتا ہے۔ کمر میں درد رہتا ہے۔ سر کے بال جڑوں سے نکلتے ہیں اور اب بہت کم رہ گئے ہیں۔ بلڈ پریشر لو رہتا ہے۔ ماہواری سال میں دو یا تین بار آتی ہے۔ مہربانی فرما کر کوئی ایسی دوائیں بتائیں جو میرے لیے بہترین ہوں اور میرے تمام مسائل حل ہو جائیں۔ میں ہر وقت پریشان رہتی ہوں اپنی صحت کے بارے میں۔

جواب: آپ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات فوراً استعمال کریں۔ Cakc. Carb-200 ہر ہفتہ ایک خوراک پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر لیں۔ Kali Phos-30, Gelsemium-30, Nat. Mur-30 Sepia30, Ferr. Phos-30 کے 7,7 قطرے دن میں 3 مرتبہ آدھا گلاس پانی میں لیں۔ ایک ماہ بعد حال بتائیں۔

نسوانی حسن، لیکوریا

مسز راحیل......کوٹ ادو

میں پاکیزہ کی ایک سال سے قاری ہوں۔ جس طرح آپ لوگوں کے مسئلے حل کر رہے ہیں اس کا اجر آپ کو اللہ دے گا۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں پانچ سال سے لیکوریا کی بیماری میں مبتلا ہوں جب تک علاج جاری رکھوں ٹھیک رہتی ہوں ورنہ پھر بیمار ہو جاتی ہوں۔ اسی بیماری کی وجہ سے میں کمزور ہو گئی ہوں اور میرا نسوانی حسن نہ ہونے کے برابر ہے۔ برائے مہربانی مجھے دوائیں تجویز کر دیں تاکہ میرے مسئلے حل ہو جائیں۔

جواب: آپ نے لیکوریا کی تفصیل نہیں لکھی کہ یہ آپ کو کب، کس مقدار میں، کس رنگ کا ہوتا ہے، کب سے ہوتا ہے؟ بریسٹ کے بارے میں شادی یا بچے کی پیدائش کے بعد کی صورتِ حال تفصیلاً لکھیں پھر آپ کو صحیح دوا تجویز کی جائے گی۔

چھائیاں

رابعہ انعم......منڈی بہاالدین

پاکیزہ تو ہم شروع ہی سے لے رہے ہیں اور ہم سب بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ لیکن لکھنے کی ہمت آج پہلی بار کر رہی ہوں۔ میرا مسئلہ چھائیوں کا ہے آج سے کچھ سال پہلے میری جلد بالکل صاف تھی، کوئی داغ اور چھائیاں نہیں تھیں بلکہ پیاری جلد تھی۔ لیکن پھر کسی کے کہنے پر میں نے کریمیں استعمال کیں تقریباً ۱۶

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

کریمیں تھیں جو کہ مکس کر کے لگائی تھیں۔ پھر اس کے استعمال سے آہستہ، آہستہ میرے چہرے پر جھائیاں نمودار ہونا شروع ہوگئیں۔ میں ان جھائیوں کے خاتمے کے لیے بہت علاج چکی ہوں لیکن کوئی فرق نہیں پڑتا، جھائیوں کو ختم کرنے والی کریم بھی لگا چکی ہوں اس سے یہ ہوتا ہے کہ میرا چہرہ لال ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصہ لگاتی رہوں تو جھائیاں ختم ہو جاتی ہیں اور اگر کریم لگانا چھوڑ دوں تو پھر ظاہر ہو جاتی ہیں۔ دیسی ٹوٹکے بھی کر چکی ہوں لیکن کوئی فرق نہیں پڑا۔ جھائیاں ناک پر بھی ہیں۔ اب یہ جھائیاں داغ چھوڑ چکی ہیں۔

جواب: ہمارے یہاں ایک عام رواج ہے کہ کسی ایک دوا سے کسی کو فائدہ ہوا اور اس نے وہ دوا اپنے دوستوں، عزیزوں کو بتانا شروع کر دی۔ خصوصاً خواتین کہ میں نے یہ دوا استعمال کی تو مجھے بہت فائدہ ہوا تم بھی کرو۔ تمام قارئین نوٹ کرلیں کہ ہر ایک کو ایک ہی دوا سے فائدہ نہیں ہوتا۔ معالج سے مشورہ کرنا بہتر ہے تاکہ بعد کے نقصان اور پریشانی سے بچیں۔ اس لیے اپنے معالج سے ضرور مشورہ کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 45 دن استعمال کریں اور دوبارہ حال بتائیں۔ Calendula-30, Graphites-30, Belladona-30 کے 7,7 قطرے آدھے کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں۔

سنائی نہیں دیتا

میرا دوسرا مسئلہ میرے کان کا ہے۔ بچپن میں مجھے ہائی گریڈ فیور ہو گیا تھا جس سے میرے دائیں کان کی رگ متاثر ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے میں سن نہیں سکتی۔ کان کے ڈاکٹر کے مطابق دائیں کان والی سننے کی رگ متاثر ہوئی ہے۔ دونوں کان کے پردے ٹھیک ہیں۔ میں مکمل بہری نہیں ہوں۔ مجھے دور کی آوازیں سنائی نہیں دیتیں موبائل پر کال آرہی ہو سرگوشی میں کوئی بات کرے تو میں نہیں سن سکتی۔ تعلیمی دور میں بھی مجھے ٹیچرز کی کوئی بات سنائی نہ دیتی تھی۔ میری عمر 28 سال ہے میں اَن میرڈ ہوں۔ اسی نہ سننے کی وجہ سے میں کہیں جاب بھی نہیں کر سکتی۔ میرے دوسرے کان کے ساتھ بھی یہی مسئلہ ہے۔

جواب: ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کا Mullen Oil کے ایک سے دو قطرے دونوں کانوں میں دن میں تین مرتبہ ڈالیں۔ دو ماہ بعد حال بتائیں۔

منہ کے چھالے

ملک خان...... کے پی کے

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے منہ میں ہر وقت چھالے رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے منہ میں بہت درد رہتا ہے۔ کھانا بھی نہیں کھا سکتا۔ معدہ خراب رہتا ہے۔ گھٹنوں میں درد رہتا ہے جس کی وجہ سے روزانہ دو گولی پونستان (فورٹ) کھاتا ہوں، میں گٹکا بھی کھاتا ہوں۔ برائے مہربانی میرے لیے کوئی علاج تجویز فرمائیں، تازیست دعا گو رہوں گا۔

جواب: یاد رکھیں نسوار، تمباکو پینا نقصان دہ ہے۔ اسی طرح گٹکا بھی ہے اس کا استعمال فوراً ترک کر دیں۔ متوازن غذا کھائیں۔ دودھ دہی کا استعمال کریں۔ کھانا آہستہ آہستہ چبا کر کھائیں۔ کھانے کے ساتھ اور فوراً بعد پانی کا استعمال نہ کریں۔ Borax30, Calc.Carb Merc.sol30, Rhustox30 (ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی) کی ہر شیشی سے 5,5 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں۔ ایک ماہ بعد پھر کیفیت سے مطلع کریں۔